SIDDIQUE AKBAR

خلیفۂ اول، رفیقِ غارِ ثور، نام مبارک عبداللہ
لقب صدیق اور عتیق، کنیت ابوبکر

مصنف
محمد حسین ہیکل

مترجم
ڈاکٹر محمد احمد

ترتیب و تحقیق جدید
حکیم سید خاور حسین قادری

بسم اللہ الرحمن الرحیم
سیدنا حضرۃ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
DATA ENTERED

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
DATA ENTERED
مصنف
محمد حسین ہیکل
مترجم
ڈاکٹر محمد احمد
ترتیب و تحقیق جدید
حکیم سید خاور حسین قادری
طاہر سنز پبلشرز
042-37312159 :فیکس 042-37234137 :فون
www.tahirsonspublishers.com
E-mail: info@tahirsonspublishers.com

نام کتاب	:	سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
مصنف	:	محمد حسین ہیکل
مترجم	:	ڈاکٹر محمد احمد
ترتیب و تحقیق جدید	:	حکیم سید خاور حسین قادری
کمپوزنگ	:	طاہر سنز آرٹ سیکشن
پروف ریڈنگ	:	شائستہ عمران (ایم اے)
اہتمام	:	سید فرحان زیدی
ٹائٹل / کلر صفحات	:	عمران زیدی
مطبع	:	سید محمد شاہ پرنٹرنگ پریس

عرض ناشر

اللہ کے فضل و کرم سے کتاب ہذا کی کتابت و طباعت اور جلد بندی وغیرہ میں پوری احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ انسانی بساط کے مطابق کوشش کی گئی ہے کہ اس کے متن اور جلد بندی میں کوئی سہو اور غلطی نہ رہے۔ ہر ممکن احتیاط کے باوجود طباعت کے دوران کبھی کبھی حروف اور زیر زبر ٹوٹ جاتے ہیں یا پھر جلد بندی میں کوئی صفحہ آگے پیچھے لگ جاتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی ایسی بات سامنے آئے تو ازراہِ کرم اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درستگی کی جا سکے۔ ادارہ آپ کے تعاون کا بے حد مشکور و ممنون ہوگا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر مبارک کی اصل عمارت
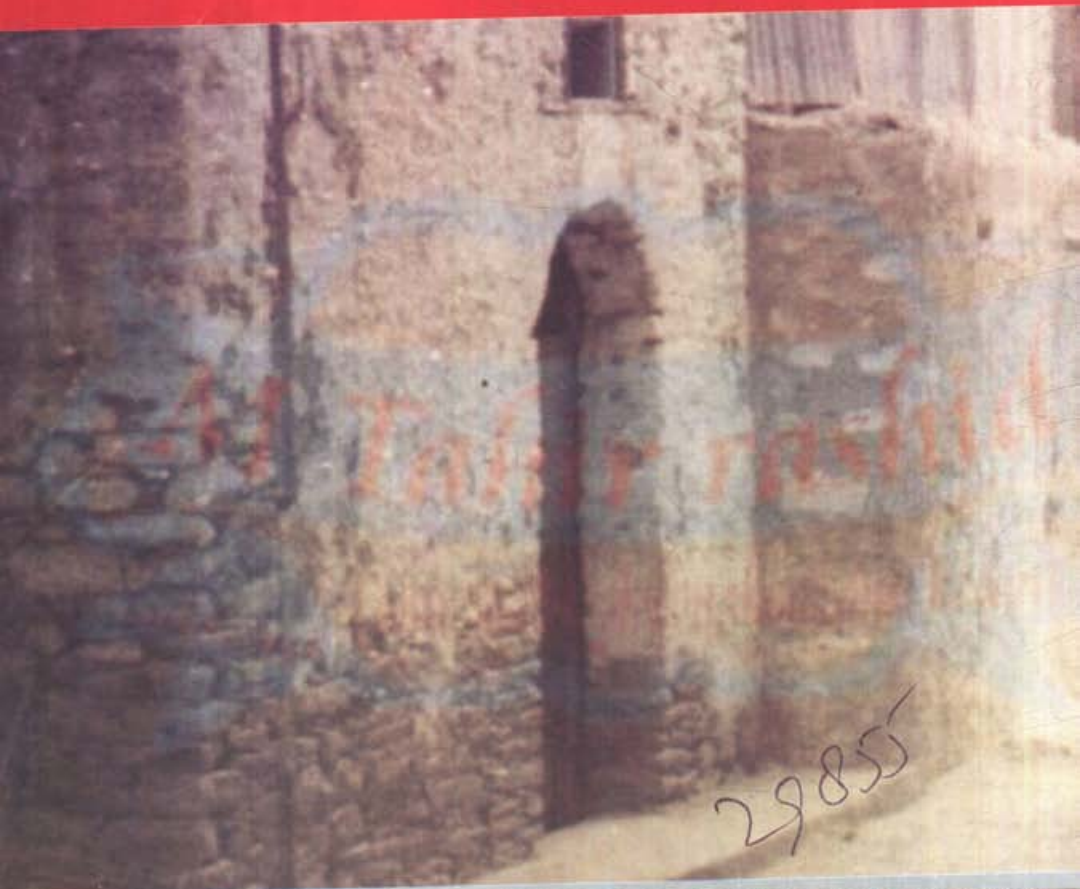
مٹی کی پلیٹ 1943
منسوب بہ
حضرت ابوبکر صدیقؓ
خنجر (منسوب بہ) حضرت ابوبکر صدیقؓ

حضرت ابو بکر صدیق کے گھر کا برتن
چراغ (منسوب بہ) حضرت ابو بکر صدیقؓ
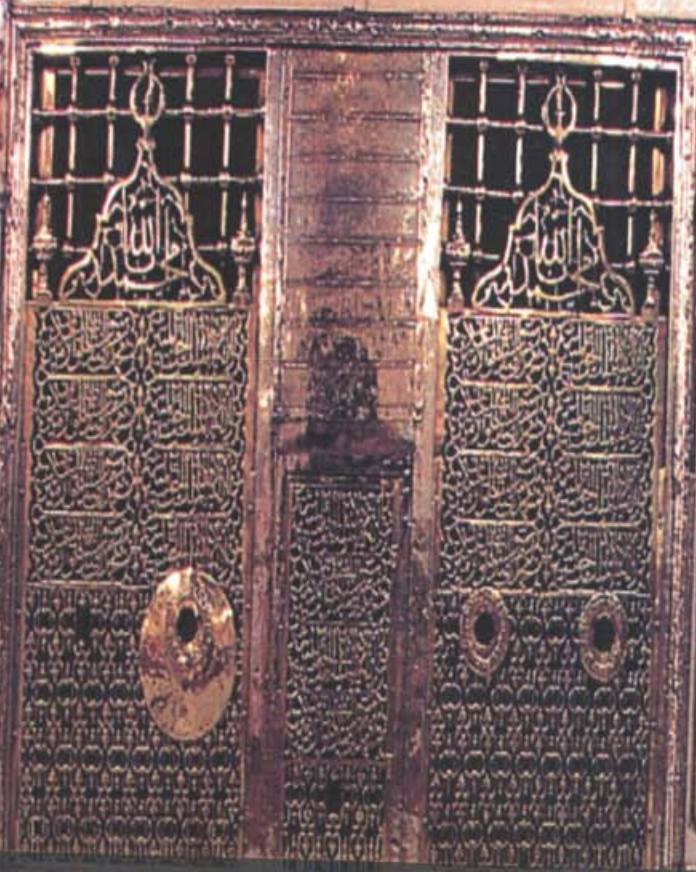
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے روضہ مبارک کے باہر دروازے کا منظرہ۔
جہاں حضور پاک ﷺ اپنے دونوں رفقاء کے ساتھ آرام فرما رہے ہیں۔

فہرست

حرفِ اوّل

عالم اسلام کی تاریخ کا آغاز حقیقتاً اس وقت سے ہوتا ہے جب محمد ﷺ اپنے اہل وطن کے مسلسل مظالم سے نہایت درجہ پریشان ہو کر مکہ کی سرزمین سے ہجرت کرنے اور مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اس عظیم الشان واقعے کو اسلامی تاریخ کا مبدا اس لیے قرار دیا جاتا ہے کہ ترقی اسلام کی بنیاد اسی وقت سے پڑی، اللہ کی تائید و نصرت نہایت شاندار طور پر ظاہر ہوئی اور کفار مکہ کو جو مسلسل تیرہ سال تک اسلام کی سخت مخالفت کرنے اور اپنے مقصد میں ناکام رہنے کے بعد بالآخر محمد ﷺ کے قتل پر متفق ہو چکے تھے، ایک بار پھر زبردست ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ واحد شخص تھے جنہیں محمد ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ اس واقعے کے دس برس بعد جب محمد ﷺ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں تشریف نہ لاسکے تو آپ ﷺ نے اپنی جگہ جس شخص کو امامت کے لیے منتخب کیا وہ بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ یہ عظیم الشان شرف ایسا تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب جیسے جلیل القدر صحابی کو بھی حاصل نہ ہوسکا۔

محمد ﷺ نے ہجرت جیسے نازک موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا ساتھی کیوں چنا اور مرض الموت میں اپنی جگہ نماز پڑھانے کا حکم کیوں دیا؟ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی سب سے پہلے آپ کی رسالت پر ایمان لائے تھے اور دین حق کی خاطر جان و مال اور عزت کی قربانی دینے میں بھی ان کا قدم دوسرے تمام مسلمانوں سے آگے رہا تھا۔ وہ قبول اسلام سے محمد ﷺ کی وفات تک کے طویل عرصے میں برابر آپ کی اعانت دین اسلام کی اشاعت اور کفار کے مظالم سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے میں ہمہ تن مشغول رہے تھے۔ محمد ﷺ کے ارشاد کو انہوں نے اپنے ہر کام پر مقدم رکھا تھا۔ محمد ﷺ کے لیے اپنی جان تک کی مطلق پروانہ کی تھی اور ہر جنگ میں آپ کے دوش بدوش کفار سے مقابلہ و مقاتلہ کیا تھا۔ نہایت پختہ ایمان کے علاوہ ان کے اخلاق حسنہ بھی کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اسی حسن خلق کی بدولت وہ بے حد دلعزیز تھے اور ہر مسلمان ان سے محبت کرتا تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دینی مرتبے اور ان سے لوگوں کی حد درجہ عقیدت ہی کا نتیجہ تھا کہ محمد ﷺ کی وفات کے بعد جب آپ کی جانشینی کا سوال مسلمانوں کے سامنے آیا تو ان کی نظر انہیں پر پڑی اور سب نے انہیں بالاتفاق پہلا خلیفہ تسلیم کر لیا۔ اپنے مختصر عہد خلافت میں اسلام کی سربلندی کے لیے انہوں نے جو اولوالعزمانہ کوششیں کیں ان کی نظیر عالم اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے مبارک زمانے سے

اس اسلامی سلطنت کا آغاز ہوا جس نے پھیلتے پھیلتے دنیا کے کثیر حصے کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس عظیم الشان مملکت کے کنارے ایشیاء میں ہندوستان اور چین تک، افریقہ میں مصر اور تیونس و مراکش تک اور یورپ میں اندلس و فرانس تک پھیل گئے۔ یہی سلطنت تھی جس نے انسانی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے کے لیے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا اثر رہتی دنیا تک رواں دواں رہے گا۔

اپنی کتاب، حیات محمد ﷺ اور فی منزل الوحی، سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ میں اسلامی سلطنت کی تاریخ اور اس کے عروج و زوال کے اسباب کے متعلق بھی کچھ تحقیقی کام کروں۔ اس خیال نے اس وجہ سے اور بھی شدت اختیار کی کہ اسلامی سلطنت کا قیام کلیتہً رسول اللہ ﷺ کا رہین منت ہے۔ محمد ﷺ نے انسانیت کی بقا اور ہدایت کے لیے جو بے مثال تعلیم پیش کی وہی اس عظیم الشان سلطنت کے قیام کا باعث بنی اور اس تعلیم کے مظاہر ہمیں جا بجا اسلامی حکومت کے مختلف ادوار میں نظر آتے ہیں۔

فی الواقع ماضی، حال اور مستقبل آپس میں کچھ اس حد تک مربوط ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اس کے ماضی کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ قوم میں جو خرابیاں راہ پا جاتی ہیں انہیں دور کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ایام گزشتہ پر نظر دوڑائی جائے جیسے کسی مریض کے مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کے لیے مرض سے پہلے کے حالات کی اچھی طرح چھان بین کرنی ضروری ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں پر بھی انحطاط کا دور دورہ ہے۔ جو قوم صدیوں تک بڑی شان سے دنیا کے ایک بڑے خطے پر حکومت کر چکی ہے وہ آج قعر مذلت میں پڑی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم بھی چودہ سو برس پہلے کے حالات و واقعات کا بہ نظر غائر جائزہ لے کر وہ اسباب ڈھونڈیں جو ہمارے انحطاط کا باعث بنے اور وہ راستے تلاش کریں جن پر گامزن ہو کر ہمیں آج بھی اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت اور قدر و منزلت حاصل ہو سکتی ہے۔

میں انہیں افکار میں غلطاں و پیچاں تھا کہ میرے بعض کرم فرماؤں نے میری کتاب حیاتِ محمد ﷺ پڑھ کر مجھ سے یہ اصرار کیا کہ میں اسی طرز پر محمد ﷺ کے خلفا اور اسلام کے جلیل القدر فرزندوں کے سوانح حیات بھی معرض تحریر میں لاؤں۔ میں تو پہلے ہی اس امر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ دوستوں کے اصرار نے میرے سمند شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا اور میں نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں بلکہ اسے انجام دینے کے لیے اہل علم کی ایک پوری جماعت کی ضرورت ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق تو تحقیقی کام بہت ہو چکا ہے اور ان کی بیشتر سوانح عمریاں مختلف اصحاب کی طرف سے لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی مفصل سوانح عمری موجود نہ تھی اس لیے میں نے سب سے پہلے اپنی توجہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ محمد

ﷺ کے قدیم جاں نثار رفیق اور آپ کے کامل متبع تھے۔ پھر انتہائی پرسوز دل اور بے نظیر صفات کے مالک تھے۔ عالم اسلام میں پھیلے ہوئے لاکھوں مسلمان ان سے منسوب ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ محمد ﷺ کی وفات کے بعد انہیں بالاتفاق مسلمانوں کا پہلا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ جب مرتدین کے ہاتھوں اسلام اپنے نازک ترین دور میں سے گزر رہا تھا صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت تھی جس نے مسلمانوں کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچایا۔ ایرانی اور رومی سلطنتوں پر فوج کشی کر کے انہوں نے اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کے اثرات آج تک اقوام عالم کے دلوں سے محو نہیں ہو سکے۔ اسی لیے میں اپنی اس کتاب میں جو کچھ بیان کروں گا اس کا تعلق محض سیرت و سوانح سے نہ ہوگا بلکہ یہ اصل میں اسلامی سلطنت کی تاریخ ہوگی جس کی ابتدا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد سے ہوئی۔

اس بابرکت عہد کے جو واقعات ہمیں مختلف کتابوں میں ملتے ہیں وہ انتہائی تعجب خیز اور مرعوب کن ہیں اور ان سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی عظیم شخصیت کے عجیب و غریب پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف یہ مردِ حق غریبوں اور مسکینوں کی مدد کے لیے ہر لحظہ بے چین نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن جیسا دردمند انسان دنیا کے پردے پر کوئی نہ ہوگا۔ دوسری طرف اعلانِ کلمۃ الحق اور اسلام کی سربلندی کی خاطر وہ بڑے سے بڑا خطرہ قبول کر لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی انہیں ان کے عزم و ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ عزم و استقلال کا یہ عظیم پیکر تردد اور ہچکچاہٹ کے نام سے بھی نا آشنا تھا۔ اس عظیم الشان انسان کو لوگوں کی مخفی صلاحیتوں کو بھانپ کر انہیں اُجاگر کرنے اور ان سے ان کی استعداد کے مطابق کام لینے میں ملکہ حاصل تھا۔

محمد ﷺ کے عہد میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک عاشق صادق کی طرح زندگی بسر کی۔ جب قریش محمد ﷺ کو ایذاؤں اور مظالم کا نشانہ بنا رہے تھے تو کفار کے مقابلے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی سینہ سپر ہوتے تھے۔ محمد ﷺ کی دعوت پر جس شخص نے سب سے پہلے لبیک کہا وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے ہجرت کے نازک ترین موقع پر غار ثور سے یثرب تک پوری جاں نثاری سے محمد ﷺ کی رفاقت کی۔ مدینہ میں محمد ﷺ کو یہود کی مکاریوں اور منافقین کی ریشہ دوانیوں سے واسطہ پڑا اور قریش مکہ اور یہود مدینہ کی پے در پے کوششوں کے نتیجے میں سارا عرب آپ کے مقابلے میں اُٹھ کھڑا ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے خاص الخاص مشیر کار کے فرائض انجام دیے۔

اسلام کی سربلندی کے لیے جو موقف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا اور محمد ﷺ کی رفاقت کے ذیل میں جو بلند پایہ خدمات اُنہوں نے انجام دیں وہ نہ صرف مجموعی طور پر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام کو ابدالآباد تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رفعت شان کو احاطۂ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں کیونکہ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر جو قربانیاں اُنہوں نے پیش کیں ان کا تعلق اصل میں دل سے ہے اور علیم خبیر ہی کو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے

دل میں اسلام اور محمد ﷺ کی محبت کے جو جذبات موجزن تھے وہ ظاہر کے مقابلے میں کتنے شدید تھے اور ان کا اندرونی اخلاص ظاہری اخلاص سے کتنا زیادہ تھا۔

حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جو واقعات پیش آئے ان سے ان کا حسنِ بصیرت اور دوررسی مزید آشکارہ ہوگئی۔مرتدین عرب سے فراغت پانے کے بعد جب آپ نے ایران اور روم پر توجہ مبذول کی تو سب سے بڑا ہتھیار جو انہوں نے اِن دونوں کے خلاف استعمال کیا وہ مساوات کا تھا جسے اسلام نے اصل الاصول کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

اس ہتھیار کا سامنا ایرانی سلطنت کرسکتی تھی نہ رومی مملکت۔ایران اور روم کے باشندے شخصی اقتدار کی چکی میں پس رہے تھے، رعایا کے درمیان مختلف طبقات قائم تھے،نسلی امتیاز کی لعنت بری طرح مسلط تھی،حکمران طبقہ ملک میں بسنے والے دوسرے طبقوں کو اپنے سے کم تر بلکہ اچھوت سمجھتا تھا،اور انہیں ہر لحاظ سے دبانا فرض خیال کرتا تھا۔عین اس وقت اسلامی عدل و انصاف اور مساوات کا علم بلند کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایران اور روم میں جانے والی افواج کے سپہ سالاروں کو خاص طور پر ہدایات فرمائیں کہ وہ عدل و انصاف کا دامن کسی طرح ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور مفتوحہ ممالک کے تمام لوگوں سے بلا امتیاز مذہب وملت، مساوی سلوک کریں۔ اِس طرح جو باشندے ایک عرصے سے جوروستم اور عدم مساوات کا شکار چلے آرہے تھے وہ اسلام کے منصفانہ اصولوں کی جھلکیاں دیکھ کر اس کے گرویدہ ہوگئے اور ان سلطنتوں کو اپنی زبردست عسکری قوت اور عظیم الشان مسلح افواج کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ظاہر ہے کہ ظلم وتشدد اور نسلی امتیاز روا رکھنے والی سلطنت خواہ اس کی ظاہری طاقت کتنی ہی ٹھوس اور اس کی فوج کتنی ہی منظم ہو،ایسی قوم کے مقابلے میں کبھی نہیں ٹھہر سکتی جو عدل و انصاف اور مساوات کی نہ صرف علمبردار ہو بلکہ جس کی زندگی انہیں سانچوں میں ڈھلی ہو۔ یہ طرزِ زندگی محمد ﷺ کے بعد کامل طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دنیا کے سامنے پیش کی۔

عہدِ رسالت اور خلافتِ ثانیہ کے اتصال کے باعث حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے محمد ﷺ کا عہد شادو اصلاح کا عہد تھا۔آپ ﷺ کے عہد میں شریعت کا نزول ہورہا تھا ،اللہ کی طرف سے بندوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسول ﷺ کو مسلسل احکام دیئے جارہے تھے۔اس کے بالمقابل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد تنظیمی تھا۔نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے انتظام و انصرام کے لیے اصول وضوابط مراتب کیے جارہے تھے اور مختلف محکموں کا قیام عمل میں لایا جارہا تھا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دور جہاں ان دونوں دوروں کی درمیانی کڑی تھا وہاں اُن غیر معمولی حالات کی وجہ سے جو آپ کے عہد میں پیش آئے ان دونوں سے بڑی حد تک مختلف بھی تھا۔

اپنے مختصر دور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کے باعث اسلام کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا حضرت محمد ﷺ کی وفات کے معاً بعد ملک میں انتشار کے آثار

نظر آنے لگے جسے محمد ﷺ نے تیئیس برس کی محنت شاقہ کے بعد قائم کیا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار کے آثار محمد ﷺ کی زندگی کے اواخر ہی میں نظر آنے لگے تھے مسیلمہ بن حبیب نے یمامہ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اپنے قاصد کے ہاتھ محمد ﷺ کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ مجھے بھی اللہ نے نبوت کے مقام پر سرفراز کیا ہے اس لیے عرب کی نصف زمین میری ہے اور نصف قریش کی۔

مسیلمہ کی دیکھا دیکھی اسود عنسی بھی نبی بن بیٹھا اور شعبدے دکھا دکھا کر اہل یمن کو اپنی طرف مائل کرنے لگا۔ طاقت حاصل ہونے پر اس نے جنوب کا رخ کیا اور محمد ﷺ کے عمال کو وہاں سے نکال کر اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس کے بعد وہ نجران کی طرف بڑھا اور وہاں بھی تسلط قائم کرلیا۔ یہ حالات دیکھ کر محمد ﷺ کو مجبوراً اپنے عمال کو ان باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کرنا پڑا۔ اصل بات یہ تھی کہ عرب گو توحید کے قائل ہو چکے تھے اور بت پرستی بھی انہوں نے ترک کر دی تھی لیکن ان میں سے بیشتر کو اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ دینی وحدت اور سیاسی اتحاد میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اسلام قبول کرنے کا مطلب مدینہ کی حکومت کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ اہلِ عرب آزاد منش انسان تھے اور کسی منظم حکومت کے آگے سر جھکانا اور دل و جان سے اس کی اطاعت کرنا ان کی سرشت کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جوں ہی محمد ﷺ کی وفات کی خبر پھیلی عرب کے اکثر قبائل نے اسلام سے ارتداد اور مدینہ کی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔

بغاوت کا فتنہ جنگل کی آگ کی طرح عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا۔

جب یہ خبریں مدینہ پہنچیں تو لوگوں میں سخت گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی...... ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نازک موقع پر بغاوت فرو کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ بعض لوگوں کی...... جن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے...... یہ رائے تھی کہ اس موقع پر مانعین زکوٰۃ کو نہ چھیڑا جائے اور جب تک وہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقراری رہیں انہیں ان کے حال پر قائم رہنے دیا جائے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مانعین زکوٰۃ کو بھی مرتدین کے زمرے میں شامل کرلیا گیا تو جنگ کی آگ وسیع پیمانے پر پھیل جائے گی جس کا انجام خدا جانے کیا ہو لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمام خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مرتدین کی طرح مانعین زکوٰۃ سے بھی جنگ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور کوئی طاقت اور کوئی دباؤ انہیں ایسا کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔

جنگ ہائے ارتداد کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ان جنگوں میں فریقین کی تعداد چند سو سے متجاوز نہ ہوتی تھی۔ اس کے برعکس بعض لڑائیوں میں دس دس ہزار لوگوں نے حصہ لیا اور فریقین کے ہزاروں آدمی ان جنگوں میں کام آئے۔ مزید برآں تاریخ اسلام میں انہیں فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اہل مدینہ کی اکثریت کی رائے قبول کر کے ان لوگوں سے جنگ نہ کرتے تو فتنہ فساد میں کمی ہونے کے بجائے اور زیادہ شدت پیدا ہو جاتی اور اسلامی سلطنت کا قیام کبھی عمل میں نہ لایا جاسکتا۔ اگر خدانخواستہ اِن جنگوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوجوں کو کامیابی حاصل نہ ہوتی تو معاملہ انتہائی

خوفناک شکل اختیار کر جاتا اور اس کا نتیجہ اسلام اور مسلمانوں دونوں کی تباہی کی صورت ظاہر ہوتا۔

یہ تمام حالات دیکھ کر بلا شبہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر کے اور ان پر کامل تسلط پا کر تاریخ عالم کے دھارے کا رخ موڑ دیا اور اس طرح گویا نئے سرے سے انسانی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی۔

اگر جنگ ہائے ارتداد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کامیابی نصیب نہ ہوتی تو ایرانی اور رومی سلطنتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا فائز المرام ہونا تو کجا، عراق اور شام کی طرف پیش قدمی کرنا بھی ناممکن تھا۔ اس وقت نہ ان عظیم الشان سلطنتوں کے کھنڈروں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جا سکتی اور نہ ایرانی و رومی تہذیب و تمدن کے بجائے، اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے راستہ ہموار کیا جا سکتا۔

اگر مرتدین کی جنگیں وقوع میں نہ آتیں اور ان میں کثرت سے حفاظ قرآن کا اتلاف جان نہ ہوتا تو غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ نہ دیتے اور اس طرح قرآن کریم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک جگہ محفوظ کرنے کا جلیل القدر کارنامہ عمل میں نہ آتا۔

اگر جنگ ہائے ارتداد خدانخواستہ مسلمانوں کی شکست پر منتج ہوتیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے مدینہ میں بھی نظام حکومت قائم کرنا مشکل ہو جاتا اور اس نظام کی بنیاد پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک رفیع المنزلت عمارت کبھی تعمیر نہ کر سکتے۔ یہ عظیم الشان واقعات ستائیس ماہ کی قلیل ترین مدت میں انجام پا گئے۔ اس قلیل مدت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کو نظر انداز کر کے اپنی تمام تر توجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی جانب منعطف کر دی۔ ان کا خیال ہے کہ گنتی کے چند مہینے کسی طرح بھی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے والے عظیم امور کی انجام دہی کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ وہ انقلاب جنہوں نے انسانیت کو درجہ بہ درجہ اوج کمال تک پہنچایا، بالعموم قلیل وقفوں ہی میں برپا ہوتے رہیں دنیا کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں پیدا ہونے والی بے انتہا مشکلات پر کس طرح قابو پایا اور ان مشکلات کے باوجود ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد کس طرح رکھ دی؟ یہ سوال ہے جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور ہمارے لیے اس کا جواب دینا ضروری ہے۔

لاریب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عدیم النظیر کامیابیوں میں ان کے ذاتی اوصاف کو بھی بڑی حد تک دخل تھا۔ لیکن سب سے بڑا دخل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس پاک صحبت کا ہے جو متواتر بیس سال تک انہیں حاصل رہی۔ اسی وجہ سے مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظمت کلیتہً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی رہین منت ہے۔ آپ ہی کے فیض کا نتیجہ تھا کہ اُن کی رگ رگ میں اسلام کی محبت سرایت کر گئی اور انہوں نے القاء کے ذریعے سے اس حقیقی روح کو پالیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں پنہاں تھی۔ اسی القاء کی روشنی میں انہیں اس حقیقت کا ادراک بھی ہو گیا کہ ایمان ایک ایسی قوت ہے جس پر اس وقت تک کوئی طاقت غالب نہیں آ سکتی جب تک مومن تمام نفسانی خواہشات سے کلیتہً منزہ ہو کر محض تبلیغ حق و صداقت کی خاطر اپنی زندگی وقف کیے رکھتا ہے۔

بلا شبہ اس حقیقت کا ادراک مختلف زمانوں میں اور بھی بہت سے لوگوں کو ہوا ہے لیکن محض عقل و دانش اور غور و فکر کے نتیجے میں۔ اس کے بالمقابل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مصفا اور پاک دل نے بغیر کسی خارجی دباؤ کے خود بہ خود اس حقیقت کی طرف اُن کی رہنمائی کی اور محمد ﷺ کے مطہر نمونے اور عمل نے اس ادراک کو اس حد تک جلا دی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں کسی شک و شبہ کا راہ پانا ممکن ہی نہ رہا۔

یہی ایمان صادق تھا جس کی بدولت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں اس قدر بے نظیر جرأت اور عدیم المثال عزیمت پیدا ہوگئی کہ جب مرتدین سے جنگ کرنے کا سوال پیش ہوا اور تمام صحابہ نے انہیں موقع کی نزاکت کے لحاظ سے نرمی برتنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے نہایت سختی سے اسے رد کر دیا اور فرمایا کہ میں مرتدین سے جنگ کروں گا خواہ مجھے اس کے لیے تنہا ہی کیوں نہ نکلنا پڑے۔

اولوالعزمی کا یہ سبق محمد ﷺ ہی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پڑھایا تھا اور اپنے پاک نمونے کے ذریعے سے ان کے دل میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ حق کے مقابلے میں جھکنے اور کمزوری دکھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وہ وقت بھول سکتے تھے جب شدید مخالفت کے باوجود محمد ﷺ یکہ و تنہا مکہ کی گلیوں میں خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے؟ مال و دولت اور عزت و وجاہت کا کوئی لالچ، ظلم و ستم، بائیکاٹ اور قتل کی کوئی دھمکی آپ کو صراط مستقیم سے بال برابر بھی ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکی اور آپ معجزانہ اولوالعزمی و استقامت سے برابر یہ اعلان فرماتے رہے:

اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں بھی لا کھڑا کریں، تو بھی میں تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے سے باز نہ آؤں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظروں سے وہ واقعہ اوجھل ہوسکتا تھا کہ احد کی جنگ میں صحابہ کی ایک کثیر تعداد کی شہادت کے باوجود جب محمد ﷺ نے یہ سنا کہ کفار قریش پلٹ کر دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ تمام خطرات کو پس پشت ڈالتے اور تمام عواقب کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف جنگِ احد میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو لے کر (جن میں زخمیوں کی خاصی تعداد بھی شامل تھی) کفار کے تعاقب میں روانہ ہوگئے اور حمراء الاسد پہنچ کر قیام فرمایا۔ مسلمانوں کا استقلال دیکھ کر کفار کے حوصلے پست ہوگئے اور انہوں نے مقابلے میں آئے بغیر مکہ کوچ کر جانے ہی میں اپنی خیریت سمجھی۔ اس طرح مسلمانوں کے دلوں سے وہ زخم بھی بڑی حد تک مندمل ہوگئے جو جنگ اِحد کی وجہ سے انہیں پہنچے تھے۔

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس واقعے کو کس طرح فراموش کرسکتے تھے جب غزوۂ حنین کے موقع پر بعض نومسلموں کی بے تدبیری سے اکثر مسلمانوں کی سواریاں بھاگ کھڑی ہوئیں لیکن محمد ﷺ چند صحابہ کے ہمراہ انتہائی پامردی سے دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور ان کے تیروں کی بے پناہ بوچھاڑ کی مطلق پرواہ نہ کی۔ بالآخر جب حضرت عباس نے بلند آواز سے پکارنا شروع کیا: اے گروہ انصار! جنہوں نے محمد ﷺ کو پناہ دی اور ہر موقع پر ان کی مدد کی اور اے گروہ مہاجرین! جنھوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر موت کی بیعت

کی، خدا کا رسول زندہ ہے اور تمہیں بلاتا ہے۔ تو مسلمان پلٹے اور دوبارہ میدانِ جنگ میں دشمن کے سامنے صف آرا ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے محمد ﷺ کے یہی نمونے تھے جو اُنھوں نے آپ کے سچے اور کامل متبع کی حیثیت سے اختیار کیے۔ اس اولوالعزمی ہی کے باعث مٹھی بھر مسلمانوں کو عرب کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے لاتعداد مرتد قبائل کے مقابلے میں زبردست کامیابی نصیب ہوئی اور ان کے دلوں میں یہ بات میخ فولاد کی طرح گڑ گئی کہ ان کی سرشت میں ناکامی کا خمیر ہی نہیں۔ حق و صداقت کے راستے میں شہادت پانے کا جذبہ اس حد تک بڑھ گیا کہ ان کی نظروں میں شہادت ہی کامیابی کے حصول کا ذریعہ قرار پائی۔

آپ کو اس کتاب میں اس قسم کے بہت سے واقعات ملیں گے جن کی نظیر تاریخ میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ محمد ﷺ کے عہد میں مسلمان اپنی کامیابی کی طرف سے پورے طور پر مطمئن تھے کیونکہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ سے فتح و نصرت کا وعدہ فرما رکھا تھا اور ہر موقع پر ملائکہ کے ذریعے سے تائید ربانی کا نزول ہوتا تھا، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وحی کا نزول محمد ﷺ کی وفات کے بعد بند ہو چکا تھا۔ اب صرف دلوں میں جذبہ ایمانی کو قائم رکھنے اور محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو کاملاً اپنانے ہی سے مسلمان کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کامیابی کا یہ گر معلوم کر لیا تھا اور یہی گر اختیار کرنے سے انہوں نے اپنے مختصر عہدِ خلافت میں وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیئے جن پر ایک دنیا انگشت بہ دنداں ہے۔

ایمان کا جو جذبہ آپ کے دل میں موجزن تھا اور دین کی خدمت کی جو روح آپ کے اندر کام کر رہی تھی اس کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ نہایت قلیل عرصے میں ایسے جلیل القدر امور انجام پا گئے جو عام حالات میں سالہا سال کی ان تھک کوششوں کے باوجود پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتے۔

محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پورے طور پر اپنانے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس حقیقت کی تہ تک بھی پہنچ گئے کہ قومی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مشکلات اور مصائب کو صبر و استقلال سے جھیلنے اور اپنے اندر ان پر قابو پانے کا ملکہ پیدا نہ کیا جائے۔ درحقیقت قوموں کی حیات و ممات کا راز اسی گر کو اختیار کر دینے میں مستور ہے۔ ہر وہ قوم جو عزت کی خواہاں اور اقوامِ عالم میں اپنا ایک علیحدہ و ممتاز مقام پیدا کرنے کی خواہش مند ہو، جو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل اپنے پاس رکھتی ہو اور اُسے یقین ہو کہ صرف اس کے پیش کردہ پروگرام پر عمل کرنے میں انسانیت کی نجات اور دنیا کی فلاح و بہبود مضمر ہے اس کے لیے بے حد ضروری ہے کہ اپنے اندر قوت برداشت پیدا کرے۔ اس کے راستے میں خواہ مشکلات کے پہاڑ ہی کیوں نہ حائل ہو جائیں لیکن اُسے عزم و استقلال سے ہر دم اپنا قدم آگے ہی بڑھانا چاہیے۔ مشکلات خواہ کتنی ہی ہیبت ناک اور مصائب کتنے ہی حوصلہ شکن کیوں نہ ہوں لیکن باہمت قوم کو انہیں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دینی چاہیے اور راستے کی تمام دشواریوں اور ادائے حق کی راہ میں تمام رکاوٹوں پر نہایت جرأت مندانہ و اولوالعزمانہ قابو پا کر منزلِ مقصود کی جانب قدم بڑھاتے رہنا چاہیے۔

ان اسباب کی محافظت اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جب اِن قوموں کے لائحہ عمل اور دعوت کی بنیاد مساوات کے قیام اور ظلم وستم کی بیخ کنی پر استوار ہو۔ اکثر سلطنتوں کا قیام محض اس لیے عمل میں آسکا کہ انہوں نے مساوات و جمہوریت کو اپنی اساس بنایا اور اسی کے سہارے استحکام حاصل کیا۔ اس کے برعکس بیشتر سلطنتیں مدت دراز تک اپنی شان وشوکت دکھانے کے بعد محض اس وجہ سے قلیل ترین عرصے میں نابود ہوگئیں کہ انہوں نے مساوات کے اہم ترین رکن کو ترک کر دیا تھا۔ مساوات اسلام کا بنیادی ستون ہے جس کے بغیر اس کی عمارت پایہ تکمیل کو ہی نہیں پہنچ سکتی۔ اِس بنا پر اسلام اصولاً ایک جمہوریت پسند مذہب ہے۔ اس حقیقت کو آج ہم نے محض اپنی عقل کے ذریعے سے معلوم کیا ہے اور ہم سے پہلے اس حقیقت تک جن لوگوں کی رسائی ہوسکی ہے ان کی رہنمائی بھی اُن کی عقل کے ذریعے سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ادراک کے باوجود نہ ہم اور نہ ہمارے پیش رو ہی پوری طرح اسلامی سلطنت کی حفاظت کر سکے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس حقیقت کا علم غور وفکر اور تدبر کے ذریعے سے نہیں بلکہ القاء کے بانی کے ذریعے سے ہوا۔ وہ حق الیقین سے اس پر نہ صرف ایمان لائے بلکہ اپنے ساتھیوں کو اس نصب العین کی تکمیل کے لیے لگا بھی دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مٹھی بھر مسلمانوں کی شبانہ روز جدو جہد کے نتیجے میں جو سلطنت عالم وجود میں آئی اس کی بنیاد کلیتہً مساوات پر تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ دوسری سلطنتوں کے برعکس چند روز بہار دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود نہ ہوگئی بلکہ صدیوں تک اپنی جلوہ افروزی سے دنیا کو منور کرتی رہی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے القاء کی روشنی میں معلوم کرلیا تھا کہ اسلام مساوات کا علم بردار ہے اور ذات پات اور نسل کی بنا پر بنی نوع انسان کے درمیان کسی تفریق کا حامی نہیں۔ اسی وجہ سے اس کی دعوت کسی ایک قوم کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام بنی نوع کے لیے عام ہے۔ محمد ﷺ کے زمانہ مبارک میں عربوں کے علاوہ غلاموں اور عجمیوں کی ایک بڑی تعداد بھی اسلام میں داخل ہوئی لیکن کسی غلام اور عجمی سے نفرت یا حقارت کا برتاؤ کرنا تو کجا اسلام نے اُن کی ذلت ونکبت، عزوشرف میں تبدیل کر دی اور اُن کا رتبہ اس قدر بلند کر دیا کہ آج بھی اُن کا ذکر آنے پر ہر مسلمان فرطِ عقیدت سے سر جھکا دیتا ہے۔ ان لوگوں سے محمد ﷺ کے سلوک کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ سلمان فارسی ذ آپ کے مقربین خاص میں سے تھے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے آزاد کر کے اپنا متبنیٰ بنالیا تھا۔ غزوہ موتہ کے وقت لشکر کا قائد بھی انہیں کو بنایا۔ اس سے پہلے بھی متعدد اہم ذمہ داری کے کام ان کے سپرد کیے۔ زید کے بیٹے اسامہ رکو اپنی وفات سے قبل شام پر حملہ کرنے والی فوج کا سردار مقرر کیا اور تمام بڑے بڑے مہاجرین و انصار کو جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے ان کی ماتحتی میں دیا۔ باذان فارسی کو یمن کا حاکم مقرر فرمایا۔ ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ محمد ﷺ کے نزدیک محض عربی یا معزز قبیلے کا فرد ہونا کسی شخص کی فضیلت کے لیے کافی نہ تھا۔ آپ کے پیش نظر فضیلت کی کسوٹی تقویٰ اور صرف تقویٰ تھی۔ محمد ﷺ کے خاص مشیروں اور مقرب صحابہ پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ کے محبوب صحابی بننے کا شرف صرف انہیں لوگوں کو حاصل ہوا جنہوں نے

ایمان و اخلاص میں قابلِ رشک ترقی کی اور جو دینی و ملی مفاد کی خاطر اپنی جان، مال، عزت اور وقت کو قربان کرنے کے لیے ہر لحظہ مستعد رہتے تھے۔ محمد ﷺ نے عربوں کے دلوں سے ان کی نسبی شرافت، عزت اور فضیلت کا غرور بالکل نکال دیا تھا اور عربی، عجمی آزاد اور غلام کا فرق مٹا کر انہیں ایک سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے آقا کی اس سنت پر پوری طرح عمل کیا اور وہ لوگوں کے درمیان صحیح اسلامی مساوات قائم کرنے میں آخر وقت تک کوشاں رہے۔

اسی مساوات کا اثر تھا کہ مسلمان ایک ایسی متحدہ قوت بن کر اُٹھے جس کا مقابلہ کرنے سے ایرانی اور رومی افواج قاہر و عاجز آ گئیں اور اُنھیں ان مٹھی بھر لیکن آہنی طاقت والے عربوں کے سامنے سے بھاگتے ہی بن پڑی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس حقیقت کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور اس کی دعوت کا دائرہ صرف جزیرۂ عرب تک محدود نہیں بلکہ اس کے مخاطب دنیا کے آخری کناروں تک بسنے والے انسان ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ محمد ﷺ نے بیرونِ عرب کے بادشاہوں اور فرمانرواؤں کو کثرت سے تبلیغی خطوط اور فرامین ارسال فرمائے تھے۔ یہ امر تسلیم کرنے کے ساتھ ہی ہر مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس نے جس عظیم الشان نعمت سے حصہ لیا ہے اسے صرف اپنے تک محدود نہ رکھے بلکہ دوسروں کو بھی اس نعمت سے حصہ عطا کرے اور دین خدا کی اشاعت میں جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہ کرے۔ محمد ﷺ نے خدا کا پیغام بلالحاظ قوم و ملت سب لوگوں تک پہنچایا تھا۔ آپ کی تقلید میں آپ کے خلفاء کا بھی یہی فرض تھا کہ وہ دعوت اسلام کو زمین کے کناروں تک پہنچاتے اور اس راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہی کیا اور اسلام کو اقصائے عالم تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس راہ میں انہیں شدید مشکلات اور مہیب مصائب سے دو چار ہونا پڑا لیکن انہوں نے ابتدائے خلافت ہی سے جو عزم کر لیا تھا اس میں آخری لمحے تک مطلق کمی نہ آنے دی اور اپنی جدو جہد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی چھوڑا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مردانہ وار کوششوں اور اولو العزمی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی سلطنت تھوڑے ہی عرصے میں معلومہ دنیا کے اطراف تک پہنچ گئی اور صدیوں تک اسی سلطنت نے دنیا میں تہذیب و تمدن کا علم بلند اور علم و عمل کا چراغ روشن کیے رکھا۔

لمبے عرصے تک دنیا پر شان و شوکت سے حکمرانی کرنے کے بعد اسلامی سلطنت پر بھی دوسری حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح زوال آنا شروع ہوا اور بالآخر وہ انتہائی نکبت اور پستی کی حالت میں پہنچ گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس نکبت اور پستی کا سبب اسلام کے وہ بنیادی اصول ہیں جن کا وہ علم بردار بن کر کھڑا ہوا تھا یا ان بنیادی اصولوں کو پس پشت ڈال دینے کے باعث مسلمانوں کو اضمحلال اور کمزوری کا سامنا کرنا پڑا؟ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہماری پستی اور کمزوری کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہم نے ان بنیادی اصولوں کو ترک کر دیا ہے جو اسلامی سلطنت کے قیام کا باعث بنے تھے۔ جو بھی شخص اسلامی تاریخ کا مطالعہ

کرے گا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اسلامی سلطنت کا زوال اس وقت سے شروع ہوا جب مسلمانوں نے اتحاد جیسی نعمت کو خیرباد کہا۔

ابتداءً جزیرۂ عرب میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان معرکے سر ہونے لگے۔ بعد ازاں عربوں اور عجمیوں کے درمیان جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس نے مسلمانوں کی طاقت وقوت عزوشرف، شان وشوکت اور رعب و داب کو ملیا میلیٹ کرکے رکھ دیا۔

اس عبرت ناک داستان کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے نہ تو وقت ہے اور نہ گنجائش اس لیے میں اس کی طرف اشارہ کرکے اپنے بیان کو صرف عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تک محدود کروں گا جو اگرچہ بے حد مختصر تھا مگر اثر پذیری کے لحاظ سے بڑی بڑی سلطنتوں پر حاوی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں کی جدوجہد کے بعد قائم ہونے والی سلطنتیں اڑھائی سال کی اس مختصر ترین حکومت کے مقابلے میں ہیچ تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کا حال بیان کرتے ہوئے مجھے قلبی مسرت محسوس ہو رہی ہے اور میں سچے جوش سے یہ تذکرہ لکھ رہا ہوں۔ اگر میں اِس کتاب کے ذریعے سے قارئین کے سامنے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کی واضح تصویر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عاشق صادق کے اپنے حُسن کمال کا پورا نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہوسکوں تو میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف کتابوں کے مطالعے سے انسان ان کے عہد زریں کی بعض جھلکیاں دیکھ کر ان کی رفیع المنزلت شخصیت کا کچھ اندازہ تو کرسکتا ہے لیکن اس کے پہلوؤں کا جائزہ لینا آسان نہیں۔ کام ایک عظیم جدوجہد آزما تحقیق و تدقیق کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق تحقیق کا حق ابھی تک ادا نہیں ہوسکا۔ اس بے نظیر انسان کی زندگی کے سینکڑوں گوشے ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکے اور یہ نورانی شخصیت اپنے پورے جلوے سے دنیا کے سامنے اب تک بے نقاب نہیں ہوسکی۔ اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی سوانح لکھنے کے لیے از سرنو ایک ان تھک جدوجہد کی جائے اور ان کی سیرت وسوانح کے مخفی گوشے اجاگر کرنے کے علاوہ معاصرین سے ان کا کامل موازنہ کیا جائے، یہ بھی بتایا جائے کہ ان کی ہم عصر قومیں تہذیب وتمدن کے کس دور میں سے گزر رہی تھیں، ان کے مقابلے میں اہلِ عرب کی کیا حالت تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں کس طرح ان اقوام کا ہم پایہ بلکہ ہر لحاظ سے ان سے بدرجہا بہتر بنا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ باہمت مورخین مستقبل قریب میں اس اہم کام پر توجہ مبذول کریں گے اور مسلسل جدوجہد اور کاوش کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی کے تمام گوشے اور اس عہد کی تمام تفاصیل واضح طور پر بیان کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد سے متعلق تو بالخصوص انتہائی چھان بین اور تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ قدیم عربی مآخذ جن سے اُن کے عہد کا کچھ حال معلوم ہوسکتا ہے روایات کے لحاظ سے آپس میں

اتنے مختلف ہیں کہ بعض اوقات کسی واقعے کا صحیح صحیح معلوم کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ بعض روایات تو محض لغویت کی پوٹ اور مجموعہ خرافات ہیں۔ بعض روایات کو پڑھ کر انسان پیکر حیرت بن جاتا ہے، اس کی عقل چکرانے لگتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا واقعی ایسے واقعات کا معرض وجود میں آنا ممکن ہے؟

پھر بھی روایات میں تناقض اور اضطراب کے لیے متقدمین کو مجبور ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ جس زمانے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عنان حکومت ہاتھ میں لی تھی وہ کلیتہً جدال وقتال کا دور تھا۔ ہر مسلمان شوق جہاد میں دیوانہ وار میدان جنگ کی جانب دوڑا چلا جا رہا تھا۔ کوئی بھی دن امن اور چین سے نہ گزرتا تھا۔ کسی شخص کو پچھلے واقعات پر نظر دوڑانے اور ان پر غور وفکر کرنے کی فرصت نہ تھی بلکہ ہر ایک کی نظر مستقبل ہی پر جمی رہتی تھی۔ اسی وجہ سے کسی شخص نے اس زمانے میں پیش آنے والے واقعات کو باقاعدہ مرتب کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ کسی کو ایسا موقع میسر آسکا۔ روایات کی تدوین بعد کے زمانوں میں ہوئی لیکن وہ بھی کسی باقاعدگی کے تحت نہیں بلکہ لوگوں نے جو روایات ایک دوسرے سے سن کر سینوں میں محفوظ کر رکھی تھیں انہیں بغیر کسی چھان بین اور نقد وجرح کے ایک جگہ جمع کر دیا گیا۔ ان روایات کے جمع کرنے میں وہ احتیاط بھی نہ برتی گئی جو احادیث رسول ﷺ بیان کرنے میں برتی جاتی تھی۔ اور ایسا ہونا ممکن بھی کس طرح تھا جب اس زمانے میں مسلمان فتوحات میں مصروف اور ایک ایسی عظیم سلطنت کی تشکیل وتعظیم میں مشغول تھے جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

چونکہ اس عہد کی روایات جمع کرنے میں کسی اصول اور قاعدے کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اس لیے کتب تاریخ میں ہر قسم کی رطب ویابس روایات جمع ہو گئی ہیں۔ دور حاضر کے مورخ کے لیے ضروری ہے کہ کسی واقعے کے متعلق اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے وہ کسی ایک روایت پر انحصار نہ کرے بلکہ امکانی حد تک اس واقعے کے متعلق بیان کردہ تمام روایات کی چھان بین کرے، ایک روایت کا دوسری روایت سے موازنہ کرے اور اس طرح اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

قدیم مورخین نے روایات کی جرح وتعدیل میں خاصی محنت کی ہے۔ پھر بھی ان کی کوششوں کو انتہائی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھنے کے باوجود ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کی ایسی روشن تصویر ہمارے سامنے پیش نہیں کی جس کے حسن وجمال سے ہماری آنکھیں فرحت محسوس کر سکیں۔

ہم نے آخر میں ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے۔ قارئین یہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں، انہیں ہمارے دعوے کی صداقت کا علم ہو جائے گا۔ بعض مورخین نے تو اپنی کتابوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر کارناموں اور اس عہد میں رونما ہونے والے عظیم الشان واقعات کو بیان ہی نہیں کیا۔ اگر کہیں کیا بھی ہے تو نہایت معمولی طریقے سے چنانچہ طبری، ابن اثیر اور بلاذری نے جمع قرآن کے متعلق کچھ نہیں لکھا حالانکہ جمع قرآن کا کارنامہ اتنا مہتم بالشان ہے کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس

کے سوا اور کچھ بھی نہ کرتے تو بھی یہ ان کے نام کو بقائے دوام کا خلعت پہنانے کے لیے کافی تھا۔ جنگ ہائے ارتداد، فتح عراق اور فتح شام کے متعلق ان مورخین نے جو روایات بیان کی ہیں ان میں اس قدر اختلاف اور تضاد ہے کہ خدا کی پناہ۔ یہی نہیں ایک کتاب میں کوئی روایت ہے اور دوسری میں کوئی بلکہ ایک ہی کتاب میں ایک واقعے کے متعلق اور باہم متضاد روایات درج ہیں۔ جب انسان یہ روایات پڑھتا ہے تو سر چکرانے لگتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس روایت کو لے اور کس کو چھوڑے۔

واقعات کے زمانہ وقوع کے متعلق بھی اختلاف کی کمی نہیں۔ بعض اوقات تو اس باب میں انتہائی بے پروائی برتی گئی ہے اور آنکھیں بند کر کے روایات درج کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ طبری میں مذکور ہے کہ جنگ ہائے ارتداد ۱۱ھ میں وقوع پذیر ہوئیں، فتوحات عراق ۱۲ھ میں ہوئیں۔ واقعات کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالنے سے یہی خیال ذہن میں آتا ہے کہ عراق کی فتوحات اس وقت تک شروع نہ ہوئیں جب تک جنگ ہائے ارتداد کا خاتمہ نہ ہو گیا اور فتوحات شام کی ابتداء اس وقت تک نہ ہوئی جب تک فتوحاتِ عراق پایہ تکمیل کو نہ پہنچ گئیں حالانکہ واقعتہً ایسا نہیں۔ عراق پر لشکر کشی کی ابتداء جنگ ہائے ارتداد کے دوران ہی میں ہو چکی تھی اور فتوحات شام کا سلسلہ جنگ ہائے ارتداد کے مابعد اس وقت شروع ہو چکا تھا جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوجیں عراق میں ایرانیوں سے برسر پیکار تھیں۔

اختلاف کی حد یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کتابوں میں جہاں واقعات کے وقوع اور زمانہ وقوع کے متعلق اختلافات کی بھرمار ہے وہاں مقامات کے متعلق اختلافات کی بھی کمی نہیں۔ بسا اوقات ان اختلافات کے باعث روایت کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اصل حقیقت سے کس طرح آگاہی حاصل کی جائے۔ بعض اوقات ایک ہی نام کے کئی مقامات مختلف جگہوں پر ہوتے ہیں لیکن روایت سے قطعاً پتہ نہیں چلتا کہ اس جگہ کون سے مقام کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ بعض مقامات کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے اور ان کا حقیقی محل وقوع معلوم کرنا نہایت دشوار ہے گو مستشرقین نے اس مشکل کو بڑی حد تک حل کر دیا ہے اور ایسے نقشے تیار کیے ہیں جن کی مدد سے نابود مقامات کا صحیح محل وقوع معلوم ہو سکتا ہے بعض روایات اس قدر مشکوک ہیں کہ ان کی صحت پر مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر دور حاضر کے بعض مورخین نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں رونما ہونے والے واقعات کے متعلق بے حد تردد کا اظہار کیا ہے اور وہ ان واقعات کی تصدیق کرنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ بیشتر مورخین نے ان کے عہد کا تذکرہ نہایت اختصار سے کیا ہے جس سے نہ واقعات کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، نہ اس جاہ و جلال کا کوئی واضح نقشہ ہمارے سامنے کھنچتا ہے جو عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرۂ امتیاز تھا اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تاریخ اسلام اور اسلامی سلطنت کے قیام میں فیصلہ کن اہمیت حاصل تھی۔

عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ... ایک عجیب و غریب امر کا پتہ چلتا ہے

کہ ہمارے مورخین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق اتنا بھی بیان نہیں کرتے جتنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان کے سپہ سالاروں کے متعلق بیان کرتے ہیں جنہوں نے شام جا کر وہاں کی فتوحات میں حصہ لیا۔ جب کوئی شخص ان کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یادِ الٰہی کے سوا کوئی کام نہ تھا اور وہ مدینہ میں بیٹھے دن رات عبادت و تسبیح و تحمید میں مشغول رہتے تھے۔ امور سلطنت کی دیکھ بھال یا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ کرتے تھے یا قائدین عساکر اور مختلف علاقوں کے عمال۔ حالانکہ یہ بات صریحاً غلط اور گمراہ کن ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں استحکام دین اور تعمیر سلطنت کے سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ سب کچھ محض ان کی ذاتی توجہ اور کوششوں کے نتیجے میں ہوا اور اس کا سہرا ان کے سوا کسی کے سر پر نہیں باندھا جا سکتا۔

ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کا فتنہ اٹھنے پر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو اکثر مسلمانوں نے جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور انتہائی اولوالعزمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا خواہ مجھے اکیلا ہی ان کے مقابلے میں نکلنا پڑے۔ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی جانب سے امداد کی درخواست موصول ہونے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے ان کی مدد کے لیے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق بھیجا۔ جب شام پر فوج کشی کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو سارے عرب سے فوجیں انہوں نے اکٹھی کیں اور جب ابوعبیدہ بن جراح اور شام میں مقیم دوسرے اسلامی سپہ سالاروں نے رومی سلطنت پر یورش کرنے میں سستی دکھائی تو انہیں نے اپنے خاص حکم کے ذریعے سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس اہم کام کی انجام دہی کے لیے مامور کیا۔

ایک طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عراق اور شام کی جانب فوجیں اور کمک پر کمک روانہ فرما رہے تھے اور دوسری جانب بیت المال کی تنظیم، مال غنیمت کی تقسیم، عمال کی تقرری اور سلطنت کے انتظام و انصرام میں ہمہ تن مصروف تھے۔ امور سلطنت کی انجام دہی میں انہیں کسی چیز کا حتیٰ کہ اہل و عیال کا بھی ہوش نہ تھا۔ ایک ہی دھن تھی اور ایک ہی لگن اور وہ یہ کہ اللہ کی طرف سے آپ کو جو ذمہ داری تفویض کی گئی ہے اس کی بجا آوری میں سر مو فرق نہ آنے پائے۔ امور سلطنت میں اس درجہ انہماک ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے انتہائی قلیل مدت میں وہ عظیم الشان کام کر دکھائے جو دوسرے لوگ سالہا سال کی طویل اور مسلسل جدوجہد کے باوجود نہیں کر سکتے اور نہ کر سکے۔

مورخین کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے عہد کی طرف سے اتنی بے پروائی برتنے کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ انہیں مسلسل بیس سال تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک اور پاک صحبت میں زندگی بسر کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس دوران میں ان کا جو تعلق آپ سے رہا اس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں فرمایا: ''اگر میں بندوں میں سے کسی کو اپنا دوست بناتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔''

اس بنا پر مورخین اور راویوں نے یہ خیال کر لیا کہ محمد ﷺ کی پاک صحبت اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں آپ کے ان الفاظ کے مقابلے میں زمانہ خلافت میں رونما ہونے والے تمام واقعات اور کارنامے بالکل ہیچ ہیں، اس لیے ان کا تفصیل سے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

بے شک محمد ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے باہمی تعلقات کی نوعیت معمولی نہیں بلکہ اپنے اندر انتہائی اہمیت رکھتی ہے لیکن ان کی خلافت کا زمانہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بست سالہ صحبت کے دوران میں جو ایقان و ایمان انہیں حاصل ہوا تھا اس کے عملی اظہار کا وقت تو زمانہ خلافت ہی میں میسر آیا تھا اور یہ عملی اظہار انہوں نے جس طرح کیا اور اس امانت کا حق، جو ان کے سپرد کی گئی تھی، جس طرح ادا کیا وہ تاریخ عالم کا ایک فراموش نہ ہونے والا ورق ہے اس لحاظ سے ان کا عہد مستحق ہے کہ اس کی مفصل تاریخ قلم بند کی جائے۔

ماخذوں میں اختلاف اور عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت مندرجہ بالا تاثر کے باعث متقدمین کی کتابوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بہت ہی کم مواد ملتا ہے۔ اس کا اثر متاخرین کی کتابوں میں بھی ظاہر ہوا کیونکہ ان کی بنیاد کلیتہً متقدمین اور ابتدائی مورخین کی کتابوں اور روایات پر تھی بعض متاخرین تو عہد صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر انتہائی اختصار سے کر کے ہمہ تن عہد عمر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن بعض مورخ تو دونوں کے عہد کا موازنہ شروع کر دیتے ہیں حالانکہ یہ انتہائی نامناسب امر ہے۔ ہر بزرگ عظمت و شوکت کے لحاظ سے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے سیاست دان سے کم نہ تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد یقیناً اسلام کا انتہائی درخشاں عہد ہے۔ اس میں سلطنت کی بنیادیں استوار کی گئیں، قواعد مملکت مرتب کیے گئے، نظام حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم کیا گیا، مصر اور دیگر رومی و ایرانی مقبوضات پر پہلی بار اسلامی علم لہرایا گیا۔ لیکن اس امر سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عظیم دور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کا تتمہ و تکملہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دور محمد ﷺ کے عہد کا تتمہ و تکملہ تھا۔

اگرچہ موجودہ زمانے میں بہت کم کتابیں ایسی لکھی گئی ہیں جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے عہد کا ذکر تفصیل و توضیح اور تحقیق و تدقیق سے کیا گیا ہو پھر بھی مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض مستشرقین نے عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اہمیت محسوس کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ اٹھارویں صدی میں ایبے دی مارینی نے تاریخ اہل عرب (History of the Arabins) کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر خصوصیت اور تحقیق سے کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں، کوسین دی پرسیوال، نے ایک کتاب (Essai surl, Historie des Arbes) کے نام سے تالیف کی۔ اس میں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر تفصیل و توضیح سے کیا گیا۔ 1883ء میں سر ولیم میور نے (Annals of the early Caliphate) تالیف کی اور اس کے اندر بڑے فاضلانہ انداز میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد اور ان کے کارناموں پر تبصرہ کیا۔ اس وقت سے آج تک جرمنی، اٹلی، فرانس، انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک کے متعدد مستشرقین تاریخ اسلام کے اس عہد زریں کے متعلق تحقیق و تدقیق میں مشغول رہے ہیں

اور انہوں نے اس ضمن میں نہایت قابل قدر کام کیا ہے۔

جہاں میں نے مستشرقین کی کوششوں کا ذکر کیا ہے وہاں بعض ایسے مسلمان اور عرب مورخین کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اہمیت کو سمجھ کر اپنی کتابوں میں ان کے متعلق تفصیل اور تحقیق سے کام لیا ہے۔

مشہور مورخ رفیق بک العظم نے اپنی کتاب، اشہر مشاہیر الاسلام، کے جزاول میں بالخصوص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے عہد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کے اکثر حصوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مؤلف متقدمین کے طریقوں سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ مرحوم شیخ محمد خضری بک نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کا تذکرہ وتفصیل توضیح سے کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

''ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وجود نہ ہوتا تو تاریخ اسلام کا دھارا کسی اور ہی طرف مڑا ہوا ہوتا۔ جب آپ نے عنان خلافت ہاتھ میں لی تو تمام مسلمانوں کے دلوں پر خوف وخطر طاری اور مایوسی و بددلی محیط تھی۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حیرت انگیز اولوالعزمی سے تمام فتنوں اور شورشوں کا قلع قمع کر ڈالا اور اسلام کا قافلہ شان وشوکت سے دوبارہ اپنے راستے پر گامزن ہوگیا۔''

استاد عمر ابوالنصر نے اپنی کتاب، خلفائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حصہ کلیتہً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات کے لیے وقف کیا۔ اسی طرح شیخ عبدالوہاب نجار اور بعض دوسرے مورخین نے بھی ان کے متعلق بہت حد تک تحقیقی کام کیا ہے۔

میں یہ تمہید اس دعا پر ختم کرتا ہوں، اللہ ہمارے اور مورخین کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حقیقی مقام سمجھیں اور کاوش وجاں فشانی سے ان کے متعلق ایسا تحقیقی مواد تیار کر دیں جس سے ان کی عظیم شخصیت صحیح رنگ میں دنیا کے سامنے آسکے اور اب تک جو ناانصافی آپ سے ہوئی ہے اس کی تلافی ہوجائے...... آخر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے کسی حد تک مجھ ناچیز کو یہ فریضہ بجالانے کی توفیق عطا فرمائی اور حقیقت تو یہ ہے کہ تمام کام اسی کی مہربانی وتوفیق سے انجام پاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات کے بعد اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات بھی اسی نہج پر لکھنے کا ارادہ ہے۔

محمد حسین ہیکل

①

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں

ابتدائی حالات:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بچپن اور جوانی کے متعلق اتنے کم واقعات تاریخ میں ملتے ہیں کہ ان سے نہ اس دور میں ان کی شخصیت کے صحیح خدوخال معلوم ہوتے ہیں اور نہ ان کے والدین کے ناموں کے سوا ان کے بارے میں کسی اور بات ہی کا پتہ چلتا ہے۔ قبول اسلام کے وقت ان کے والد بہ قید حیات تھے لیکن تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ ان کے والدین پر ان کے اسلام لانے کا کیا اثر ہوا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے والدین سے ان کی زندگی میں کیا اثر لیا، البتہ جہاں تک آپ کے قبیلے کا تعلق ہے مورخین نے اس کا ذکر کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے کام لیا ہے اور بتایا ہے کہ قریش میں اس قبیلے کو کیا مرتبہ حاصل تھا۔ مرتبے کا ذکر خصوصیت سے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات محض قبیلے کے ذکر سے کسی شخص کے عادات و اطوار اور اخلاق و خصائل کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

قبیلہ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قبیلہ تیم بن مرہ بن کعب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نسب آٹھویں پشت میں مرہ پر جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے تفصیل یہ ہے:

(کلاب...... قصی...... عبدمناف...... ہاشم...... عبدالمطلب...... عبداللہ...... محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

(مرہ...... تیم...... سعد...... کعب...... عمرو...... عامر...... عثمان ابوقحافہ...... حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

مکہ میں بسنے والے تمام قبائل کو کعبہ کے مناصب میں سے کوئی نہ کوئی منصب ضرور سپرد ہوتا تھا۔ بنو عبد مناف کے سپرد حاجیوں کے لیے پانی کی بہم رسانی اور انہیں آسائش پہنچانے کے انتظامات تھے۔

بنو عبدالدار کے ذمے جنگ کے وقت علم برداری، کعبہ کی دربانی اور دارالندوہ کا انتظام تھا۔ لشکروں کی سپہ سالاری حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اجداد بنو مخزوم کے حصے میں آئی تھی۔ خون بہا اور دیتیں اکٹھا کرنا بنو تیم بن مرہ کا کام تھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جوان ہوئے تو یہ خدمت اُن کے سپرد کی گئی۔ خوں بہا اور دیتوں کے تمام مقدمات اُن کے سامنے پیش ہوتے تھے اور جو فیصلہ وہ کرتے تھے اسے قریش کو منظور کرنا ہوتا تھا۔ خون بہا کے متعلق تمام اموال بھی ان کے پاس جمع ہوتے تھے۔ اگر ان کے سوا کسی اور شخص کے پاس جمع ہوتے تھے تو قریش اسے تسلیم نہ کرتے تھے۔

بنو تیم کے جو اوصاف کتابوں میں بیان ہوئے ہیں وہ دوسرے عرب قبائل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان میں کوئی ایسا مخصوص وصف نہ پایا جاتا تھا جو انہیں ان کے ہم عصر دوسرے قبائل سے ممتاز کر سکے۔ شجاعت، سخاوت، مروت، بہادری اور ہمسایوں کی حمایت و حفاظت کی جو صفات دوسرے قبائل میں موجود تھیں وہی بنو تیم میں بھی تھیں۔

نام، لقب اور کنیت:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ تھا اور کنیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ والد کی کنیت ابوقحافہ تھی اور نام عثمان بن عامر۔ والدہ کی کنیت ام الخیر تھی اور نام سلمیٰ بنت صخر بن عامر۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اسلام لانے سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام عبدالکعبہ تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشرکانہ نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔ بعض روایات کے مطابق انہیں عتیق بھی کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ آپ کی والدہ کے لڑکے زندہ نہ رہتے تھے انہوں نے نذر مانی کہ اگر ان کے لڑکا پیدا ہوا اور زندہ رہا تو وہ اس کا نام عبدالکعبہ رکھیں گی اور اسے کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکر پیدا ہوئے تو انہوں نے نذر کے مطابق ان کا نام عبدالکعبہ رکھا۔ جوان ہونے پر وہ عتیق (آزاد کردہ غلام) کے نام سے موسوم کیے جانے لگے کیونکہ انہوں نے موت سے رہائی پائی تھی۔ بعض راویوں کا خیال ہے کہ عتیق کا لقب انہیں نہایت سرخ و سفید ہونے کے باعث دیا گیا۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ ان کی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بعض لوگوں نے پوچھا کہ ان کے والد کو عتیق کیوں کہا جاتا ہے تو انہوں نے فرمایا: ''ایک مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا، ھذا عتیق اللہ من النار. اللہ کا یہ بندہ آگ سے آزاد شدہ ہے۔''

یہ روایت اس طرح بھی آئی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چند لوگوں کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے انہیں دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو چاہتا ہو کہ آگ سے آزاد شدہ شخص کو دیکھے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی کنیت تھی اور عمر بھر اپنی کنیت ہی سے موسوم کیے جاتے رہے لیکن اس کنیت کا حقیقی سبب معلوم نہ ہو سکا۔ بعد میں آنے والے بعض مورخین کہتے ہیں یہ کنیت اس لیے پڑی کہ آپ سب سے پہلے اسلام

لائے (انه بکر الی الاسلام قبل غیرہ)۔(مورخین نے اس کنیت سے مشہور ہونے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ عربی میں بکر اونٹ کو کہتے ہیں ۔ چونکہ انہیں اونٹوں کی غور و پرداخت سے بہت دلچسپی تھی اور ان کے علاج معالجے میں بہت واقفیت رکھتے تھے اس لیے لوگوں نے انہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنا شروع کردیا جس کے معنی ہیں: اونٹوں کا باپ۔(مترجم))

بچپن اور جوانی:

بچپن کا زمانہ انہوں نے اپنے دوسرے ہم سن بچوں کے ساتھ مکہ کی گلیوں میں کھیلتے گزارا۔ جوان ہونے پر ان کی شادی قتیلہ بنت عبدالعزیٰ سے ہوئی ۔ ان سے عبداللہ اور اسماء پیدا ہوئے ۔ اسماء کا لقب بعد میں ذات النطاقین قرار پایا۔ قتیلہ کے بعد انہوں نے ام رومان بنت عامر بن عویمر سے شادی کی۔ ان سے عبدالرحمن اور عائشہ پیدا ہوئے ۔ اس کے بعد مدینہ آکر پہلے انہوں نے حبیبہ بنت خارجہ سے شادی کی پھر اسماء بنت عمیس سے ۔ اسماء کے بطن سے محمد پیدا ہوا۔

پیشہ، حلیہ اور اخلاق و عادات:

قریش کی ساری قوم تجارت پیشہ تھی اور اس کا ہر فرد اِسی شغل میں مشغول تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی بڑے ہو کر کپڑے کی تجارت شروع کردی جس میں انہیں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور ان کا شمار بہت جلد مکہ کے نہایت کامیاب تاجروں میں ہونے لگا۔ تجارت کی کامیابی میں ان کی جاذبِ نظر شخصیت اور بے نظیر اخلاق کو بھی بڑا خاصا دخل تھا۔

ان کا رنگ سفید، بدن دبلا، ڈاڑھی خشخاشی، چہرہ شگفتہ، آنکھیں روشن اور پیشانی فراخ تھی۔

وہ بہترین اخلاق کے مالک، رحم دل اور نرم خو تھے ۔ ہوش و خرد، عاقبت اندیشی اور بلندی فکر و نظر کے لحاظ سے مکہ کے بہت کم لوگ ان کے ہم پلہ تھے ۔ عقل و خرد جہاں انسان کے قلب و نظر کو بڑا دخل تھا۔ بخشتی ہے وہاں بسا اوقات بے راہ روی کا موجب بھی ہو جاتی ہے ۔ لیکن اللہ کی طرف سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قلب سلیم ودیعت ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی قوم کے اکثر گمراہ کن اعتقادات اور رسوم و عادات سے بالکل الگ رہتے تھے ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں شراب کا قطرہ تک نہ چکھا حالانکہ اہل مکہ شراب کے عادی ہی نہیں بلکہ عاشق تھے ۔ ابن ہشام اپنی سیرت میں ان کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی قوم میں بہت ہر دلعزیز تھے ۔ علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تھے ۔ قریش مکہ کے تمام خاندانوں کے نسب انہیں ازبر یاد تھے اور ہر قبیلے کے عیوب و نقائص اور محامد و فضائل سے بہ خوبی واقف تھے ۔ اِس وصف میں قریش کا کوئی فرد ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ خلیق، ایمان دار اور ملنسار تھے ۔ قوم کے تمام لوگ ان کے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ برتاؤ کے معترف تھے اور انہیں فضائل کے باعث

ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔"

محمد ﷺ سے تعلق اور قبول اسلام:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قیام مکہ کے اس محلے میں تھا جہاں حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا اور دوسرے بڑے بڑے تاجر سکونت پذیر تھے اور جن کی تجارت یمن و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسی محلے میں رہنے کے باعث محمد ﷺ سے ان کا رابطہ پیدا ہوا اور دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ حضرت خدیجہ سے شادی کرنے کے بعد انہیں کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ محمد ﷺ سے دو سال چند ماہ چھوٹے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ہم عمری، پیشے میں اشتراک، طبیعتوں میں یک جہتی، قریش کے عقائد فاسدہ سے نفرت اور بری عادتوں سے اجتناب، ان تمام باتوں نے دونوں کی دوستی کو پروان چڑھانے میں بہت مدد دی۔ مورخین اور راویوں میں دونوں کی دوستی کے متعلق بھی اختلاف ہے بعض تو یہ لکھتے ہیں کہ بعثت سے پہلے ہی محمد ﷺ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گہری دوستی ہو چکی تھی اور یہی دوستی و یک جہتی ان کے سب سے پہلے اسلام لانے کا محرک ہوئی۔ لیکن بعض مورخین کا بیان ہے کہ دونوں کے تعلقات میں استواری اسلام کے بعد ہوئی، اسلام سے پہلے دونوں کے تعلقات صرف ہمسائیگی اور ذہنی میلانات و رجحانات میں یکسانی تک محدود تھے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ بعثت سے قبل محمد ﷺ عزلت اور گوشہ نشینی پسند کرتے تھے اور انہوں نے کئی سال سے لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا تقریباً ترک کر رکھا تھا۔ جب اللہ نے آپ کو رسالت کے شرف سے مشرف کیا تو خیال آیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ نے عقل وخرد سے حصہ وافر دے رکھا ہے اس لیے سب سے پہلے انہیں اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ چنانچہ آپ ان کے پاس گئے اور انہیں اللہ کی طرف بلایا جس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کسی تردد کا اظہار نہیں کیا اور ایک لمحے کے توقف کے بغیر ایمان لے آئے۔ اس وقت سے دونوں کے درمیان تعلقات کا آغاز ہوا اور ان تعلقات میں روز بروز استواری پیدا ہوتی چلی گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے محمد ﷺ کی محبت و الفت میں اپنے آپ کو سرتاپا غرق کر دیا اور ایمان کا وہ نمونہ پیش کیا جس کی نظیر رہتی دنیا تک پیش نہ کی جا سکتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں نے ہوش سنبھالا اپنے والدین کو دین اسلام کی محبت میں ترقی ہی کرتے دیکھا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب محمد ﷺ ہمارے گھر صبح و شام تشریف نہ لاتے ہوں۔

آغاز اسلام ہی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے اندر دین حق کی اشاعت و ترویج میں محمد ﷺ کی امداد واعانت کا غیر معمولی جذبہ رکھتے تھے اور ہر وقت نہایت اخلاص سے اس میں مشغول رہتے تھے۔ چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عوام وخواص میں بہت ہر دلعزیز تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی بے حد عزت و عقیدت تھی اس لیے بہت جلد متعدد اشخاص ان کی تبلیغ سے اسلام لے آئے۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جو اولین صحابہ میں سے ہیں،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی کوششوں سے اسلام لائے تھے۔ بعد میں بھی ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ (یہ سب کے سب بلند پایہ صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جن لوگوں کو مسلمان کیا وہ تمام اپنے ایمان واخلاص و بے نظیر ثابت ہوئے۔ (مترجم))
اور اکثر دوسرے لوگ ان کی تبلیغ کے نتیجے میں مسلمان ہوئے۔

بلاتردد قبولِ اسلام کا سبب:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ پڑھتے ہی طبعاً دل میں خیال آتا ہے، یہ بڑی ہی حیرت انگیز بات ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کرتے وقت کسی ہچکچاہٹ اور تردد کا اظہار نہ کیا اور جونہی محمد ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا انہوں نے فوراً بے پس وپیش اسے قبول کرلیا۔ چنانچہ خود محمد ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا۔

''میں نے جس کسی کو اسلام کی طرف بلایا اس نے کچھ نہ کچھ تردد اور ہچکچاہٹ کا اظہار کیا سوائے حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ کے جب میں نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے بغیر کسی تامل کے فوراً میری آواز پر لبیک کہا۔''

صرف یہی امر تعجب انگیز نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے توحید کی دعوت سنتے ہی اس امر پر لبیک کہا بلکہ جب محمد ﷺ نے غار حرا میں فرشتے کے نزول اور وحی اترنے کا واقعہ انہیں سنایا تو بھی انہوں نے خفیف ترین شک کا اظہار نہ کیا اور بے پس وپیش آپ کی تمام باتوں کا یقین کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ کے ان عقل مند انسانوں میں سے تھے جو ایک طرف بتوں کی عبادت کو حماقت سے تعبیر کرتے تھے اور دوسری طرف دل و جان سے محمد ﷺ کی صداقت، امانت، نیکی اور پاک بازی کے قائل تھے۔ جب محمد ﷺ کی باتیں سنیں تو کوئی شک دل میں لائے بغیر وہ فوراً آپ پر ایمان لے آئے کیونکہ انہیں نہ صرف آپ کی صداقت پر کامل یقین تھا بلکہ آپ کی پیش کردہ تمام باتیں بھی سراسر حکمت پر مبنی نظر آتی تھیں اور وہ انہیں عقل و فکر کے تقاضوں پر پورا اترتے دیکھتے تھے۔

جرأتِ ایمانی:

ہمارے نزدیک ان کے بلاتوقف اور بلاتردد اسلام قبول کرنے سے بھی تعجب خیز امر ان کی وہ بے نظیر جرأت ہے جو اسلام قبول کرتے ہی انہوں نے اس کی اشاعت کے سلسلے میں دکھائی۔ وہ نہ صرف دل و جان سے توحید و رسالت پر ایمان لائے بلکہ اعلانیہ ان باتوں کی تبلیغ بھی شروع کردی اور اس بات کا مطلق خیال نہ کیا کہ اس طرح آئندہ چل کر ان کے لیے کتنے خطرات پیدا ہوں گے۔ ان کا شمار مکہ کے معزز تاجروں میں ہوتا تھا اور ایک تاجر کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے گہرے دوستانہ و روادارانہ تعلقات رکھے اور ان باتوں کے اظہار سے احتراز کرے جو عوام کے مروجہ عقائد و اعمال کے خلاف ہوں، مبادا اس کی تجارت پر

بڑا اثر پڑے۔ دنیا میں اس قسم کے مظاہر عام طور پر نظر آتے ہیں کہ اکثر لوگ عامۃ الناس کے عقائد و خیالات پر اعتقاد نہ رکھنے کے باوجود نہ صرف اپنے فائدے، مصلحت یا عافیت کی خاطر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے خاموش بیٹھے رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے ذاتی خیالات کے برعکس عوام کی انہی باتوں کی تائید کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جنھیں وہ اپنے دل میں غلط، فضول اور لایعنی سمجھتے ہیں۔ عام لوگوں ہی کا یہ حال نہیں بلکہ وہ لوگ بھی جنھیں قوم کی قیادت کا دعویٰ ہوتا ہے اور جو اس کے لیے راہ عمل متعین کرنے کے مدعی ہوتے ہیں، بالعموم رائے عامہ کی کھلم کھلا مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد پہلے ہی دن سے جو عظیم الشان نمونہ دکھایا وہ نظیر نہیں رکھتا۔ اگر وہ خفیہ طور پر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق پر اکتفا کرتے اور تجارت میں نقصان کے ڈر سے اپنے اسلام کو مخفی رکھتے تو بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شاید کوئی اعتراض نہ ہوتا اور آپ ان کی طرف سے محض اسلام کے اظہار ہی کو کافی سمجھتے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسا نہ کیا۔ وہ اعلانیہ اسلام لائے اور مابعد اپنی ساری زندگی اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ انہوں نے نہ اپنی تجارت کا خیال کیا اور نہ کفار مکہ کی مخالفت و ایذا رسانی کا بلکہ بڑے انہماک سے تبلیغ دین میں مشغول ہو گئے۔ ایسا جرأت مندانہ اقدام صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے دین کے راستے میں نہ جان کی پروا ہو نہ مال کی، اور جو مال و منال اور دنیوی وجاہت و عزت کو دین کی خدمت اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھتا ہو۔

خادم اوّلیں:

بے شک حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ؓ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام کی سربلندی اور اس کی اشاعت کے لیے زبردست کوشش کی اور ان کے ذریعے سے دین کو بے حد تقویت پہنچی لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی وہ شخص تھے جنھیں اللہ نے سب سے پہلے اپنے دین کی خدمت کے لیے چنا۔ دین اسلام اور اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نیک نفیس اور انتہائی رقیق القلب شخص کے دل میں وہ قوت ایمانی پیدا کر دی تھی جس کا پیدا کرنا دنیا میں کسی بھی طاقت کے بس میں نہ تھا۔ اور ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مثال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قوتِ ایمانی اپنے اندر کتنا زبردست اثر رکھتی ہے۔

غرباء، مساکین اور مظلوموں کی امداد:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو تبلیغ کرنے اور ان بے کس و مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا جو قریش مکہ کے ہاتھوں میں محض اسلام لانے کی وجہ سے سخت مظالم برداشت کر رہے تھے بلکہ انہوں نے اپنا مال بھی ان غریب لوگوں پر دل کھول کر خرچ کیا جنھیں اللہ نے اسلام کی جانب رہنمائی کی تھی اور دشمنان حق نے انہیں تکالیف پہنچانے اور ان پر نت نئے مظالم توڑنے میں

کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جس روز وہ اسلام لائے ان کے پاس چالیس ہزار درہم موجود تھے۔ تجارت کا سلسلہ انہوں نے اسلام کے لانے کے بعد بھی جاری رکھا اور اس سے وافر نفع حاصل کیا لیکن اس کے باوجود جب دس سال بعد ہجرت کا موقع پیش آیا تو ان کے پاس صرف پانچ ہزار درہم باقی تھے۔ اس دوران میں انہوں نے جو کچھ کمایا اور جو کچھ پہلے پس انداز کر رکھا تھا وہ سب کا سب اللہ کی راہ میں، اسلام کی تبلیغ میں اور ان غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کر دیا جو محض اسلام لانے کے جرم میں اپنے بے دین آقاؤں کے ہاتھوں ہولناک سختیاں برداشت کر رہے تھے۔

ایک روز انہوں نے بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کے آقا نے انہیں دوپہر کے وقت شدید دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹایا اور ان کے سینے پر پتھر رکھ کر کہا ''اسلام چھوڑ دینے کا اعلان کرو ورنہ اسی طرح مار ڈالوں گا۔'' یہ دردناک منظر دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں ان کے آقا سے خرید کر آزاد کر دیا۔ اسی طرح ایک اور غلام عامر بن فہیرہ کو مسلمان ہونے کی وجہ سے سخت تکلیفیں دی جاتی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی خرید کر اپنی بکریوں کی نگہداشت اور چرانے کا کام سپرد کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے اور بھی بیسیوں غلام خرید کر انہیں اللہ کی راہ میں آزاد کیا۔

حضرت محمد ﷺ کی تائید وحمایت:

محمد ﷺ کا مرتبہ قریش میں بلند تھا۔ آپ کا شمار قبیلے کے معزز ترین افراد میں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں بنو ہاشم بھی آپ کی حمایت پر تھے لیکن ان باتوں کے باوجود آپ قریش کی ایذارسانیوں سے بچ نہ سکے۔ یہی حال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ انہیں بھی شہر کا سربرآوردہ فرد ہونے کے باوجود محض اسلام لانے کے جرم میں قریش کے مظالم کا نشانہ بننا پڑتا تھا لیکن اس پر بھی جب کبھی آپ نے دیکھا کہ قریش محمد ﷺ کو تکلیفیں پہنچا رہے ہیں تو انہوں نے جان تک کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو محمد ﷺ کے بچانے کے لیے پیش کر دیا۔ ابن ہشام اپنی سیرت میں لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کو قریش کے ہاتھوں سب سے زیادہ تکلیف اسی وقت پہنچی جب بت پرستی کی مذمت میں آیات نازل ہوئیں۔ وہ لوگ خانہ کعبہ میں اکٹھے ہوئے اور ایک شخص کہنے لگا ''تم نے سن لیا محمد ﷺ ہمارے بتوں کے متعلق کیا الفاظ کہتا ہے۔ یہ محض تمہاری کمزوری کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ تمہارے دین اور تمہارے بتوں کے متعلق جس قسم کے الفاظ چاہتا ہے کہتا ہے لیکن تم خاموش رہتے ہو۔'' ابھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے محمد ﷺ بھی ادھر سے گزرے جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو یک دم آپ پر جھپٹ پڑے اور کہنے لگے ''تم نے ہمارے بتوں کے متعلق یہ یہ الفاظ استعمال کیے ہیں؟'' محمد ﷺ نے فرمایا ''بے شک! میں نے ہی یہ الفاظ کہے ہیں'' اس پر ایک آدمی نے آپ ﷺ کی چادر چھین لی اور اسی سے آپ کا گلا گھونٹنے لگا۔ اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ادھر سے تشریف لے آئے۔ انہوں نے یہ دیکھ کر آپ کو کفار کے نرغے سے چھڑایا اور ان سے کہا ''کیا تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کر ڈالنا

چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟" راوی ذکر کرتا ہے کہ یہ وہ دن تھا جب محمد ﷺ کو کفار کے ہاتھوں سخت ترین تکلیف پہنچی۔

صرف اسی موقع پر نہیں بلکہ بعد میں بھی اکثر مواقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خدا کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان کامل کا ثبوت دیا۔ ان کے اسی جذبہ ایمانی کو دیکھ کر بعض متشرقین کو محمد ﷺ کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو محمد ﷺ سے کسی قسم کی دنیوی فائدے کی توقع نہ تھی۔ اس کے برعکس وہ شب و روز یہ دیکھتے تھے کہ مکہ والے محمد ﷺ کو ہر قسم کی تکلیفیں دیتے آپ کا مذاق اڑاتے آپ کے ماننے والوں کو تنگ کرتے ہیں۔ اگر محمد ﷺ اپنے دعوے میں جھوٹے ہوتے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے عقل مند مدبر شخص کو آپ پر ایمان لانے آپ کے دعاوی کی تصدیق کرنے، آپ کی ہر طرح مدد کرنے اور قریش میں خود اپنی پوزیشن خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ محض اپنی عقل و فراست کے بل بوتے پر اپنے اندر وہ ایمان پیدا نہ کر سکتے تھے جو انسان کو تمام خطرات سے بے پروا کر کے اس میں شدید تڑپ اور دھن پیدا کر دیتا ہے جس ایمان کا مظاہرہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا اور جس طرح انہوں نے محمد ﷺ کے ہر قول و فعل کی تصدیق کی وہ یہی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام یقیناً خدا کی طرف سے ہے کیونکہ ایک باطل مذہب اور ایک جھوٹا شخص کبھی اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا ایمان پیدا نہیں کر سکتا۔

اسراء کے موقع پر:

اسراء کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس قوتِ ایمانی کا ثبوت دیا وہ نہ صرف حیرت انگیز ہے بلکہ اس نے بہت سے مسلمانوں کو ٹھوکر کھانے سے بچا لیا۔ جب محمد ﷺ نے اہل مکہ سے بیان فرمایا کہ رات کو آپ کو خانہ کعبہ سے بیت المقدس لے جایا گیا اور وہاں آپ نے مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی تو مشرکین نے آپ کا مذاق اڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ مکہ سے شام تک کا فاصلہ ایک مہینے کا ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ محمد ﷺ بیت المقدس جائیں اور ایک ہی رات میں دو مہینے کی مسافت طے کر کے واپس آ جائیں۔ بعض مسلمانوں کے دلوں میں بھی تردد پیدا ہو گیا اور انہوں نے جا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر دہشت سی طاری ہو گئی اور وہ کہنے لگے کہ تم محمد ﷺ پر بہتان باندھتے ہو۔ لوگوں نے کہا ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے، آپ نے ابھی مسجد حرام میں یہ بات بیان فرمائی ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے اگر آپ نے واقعی یہی کہا ہے تو بالکل سچ کہا ہے۔ جب اللہ آسمان سے چند لمحوں میں وحی نازل فرما دیتا ہے تو اس کے لیے ایک رات میں آپ کو مکہ سے بیت المقدس لے جانا اور واپس لے آنا کیا مشکل ہے یہ کہہ کر وہ مسجد میں آئے۔ آپ اس وقت بیت المقدس کا حال بیان فرما رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیت المقدس ہو آئے تھے جب آپ مسجد اقصیٰ کا حال بیان کر کے فارغ ہو لئے تو حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا یا محمد ﷺ! آپ بالکل سچ فرماتے ہیں۔ اس وقت آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا لقب عطا فرمایا۔

اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی اسراء کے واقعے میں شک کا اظہار کرتے تو یقیناً بہت سے مسلمان مرتد ہوجاتے اور جو لوگ اسلام پر قائم بھی رہتے ان کے دلوں میں بھی بہرحال شکوک وشبہات گھر کر جاتے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قوتِ ایمانی نے نہ صرف لوگوں کو مرتد ہونے سے بچایا بلکہ ان کے دلوں کو بھی شکوک و شبہات سے پاک کر دیا۔ یہ واقعات دیکھ کر بہ ہر صورت ماننا پڑتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے دین اسلام کو جو تقویت حاصل ہوئی وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے بھی حاصل نہ ہوسکی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے خود محمد ﷺ نے فرمایا تھا لو متخذا من العباد خلیلا لا تخذت ابابکر خلیلا یعنی اگر میں بندوں میں سے کسی کو گہرا اور دلی دوست بناتا تو یقیناً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا (گہرا اور دلی دوست سوا خدا کے اور کوئی نہیں ہوسکتا)۔

اسراء کے بعد:

اسراء کے واقعے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سارا وقت محمد ﷺ کی صحبت، کمزور اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت اور اسلام کی تبلیغ میں گزارنے لگے۔ تجارت صرف اسی حد تک کرتے جس سے اپنا اور اپنے اہل عیال کا گزارہ چلا سکیں۔ اس دوران میں محمد ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں پر قریش کے مظالم میں زیادتی ہی ہوتی چلی گئی...... قریش نے ایذارسانی میں کوئی دقیقہ سعی باقی نہ چھوڑا۔ یہ حالت دیکھ کر محمد ﷺ نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو حبشہ کی جانب ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ متعدد مسلمان ان مظالم سے تنگ آ کر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے محمد ﷺ کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا (اس کے برعکس ایک روایت میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں مکہ کا ایک سردار ابن دغنہ انہیں ملا۔ جب اسے ان کے ارادے کا علم ہوا تو وہ بولا آپ ہجرت نہ کریں آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، نہایت صادق القول ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں اور بے کسوں اور مظلوموں کا دکھ درد دور کرتے ہیں میں آپ کو پناہ دینا چاہتا ہوں، آپ واپس مکہ چلیے۔ چنانچہ وہ مکہ آ گئے۔ ابن دغنہ نے اپنے وعدہ کے مطابق خانہ کعبہ میں اعلان کر دیا کہ میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پناہ دے دی ہے۔ قریش نے بھی اس پناہ کو قبول کرلیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنا رکھی تھی جہاں وہ نماز پڑھتے اور پرسوز لہجے میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ مشرکین کی عورتیں اور بچے تلاوت کی آواز سن کر ان کے اردگرد جمع ہوجاتے اور بڑے انہماک سے قرآن مجید سنتے رہتے تھے۔ جب قریش نے یہ دیکھا تو انہیں ڈر پیدا ہوا کہ کہیں ان کی عورتیں اور بچے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن کر اسلام کا اثر قبول نہ کرلیں انہوں نے ابن دغنہ سے شکایت کی جس پر اس نے اپنی پناہ واپس لے لی اور

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پھر کفار کے مظالم کا نشانہ بن گئے۔)) اور بدستور مکہ میں رہ کر تبلیغ کرنے، مظلوموں کی مدد کرنے اور انہیں بے دینوں سے چھڑانے کے کام میں سرگرمی سے مصروف رہے اور مکہ میں اسلام پھیلانے کا فرض پوری خوبی اور تن دہی سے انجام دیتے رہے۔

جب محمد ﷺ اہل مکہ کی طرف سے مایوس ہو گئے تو آپ نے دوسرے قبائل عرب تک خدائی پیغام پہنچانے کا ارادہ فرمایا۔ اس غرض کے لیے آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے آپ سے جو سلوک کیا وہ محتاج بیان نہیں۔ اس دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ میں رہ کر مسلمانوں کی ہمتیں اور حوصلے بلند رکھنے اور انہیں حتی المقدور کفار کے مظالم سے بچانے میں مشغول رہے۔

کمزور مسلمانوں کی حفاظت:

گو اس سلسلے میں مؤلفین سیرت اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوانح نگاروں نے کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالی پھر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی پر گہری نظر رکھنے والے لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس دوران میں وہ خاموش نہ بیٹھے بلکہ انہوں نے حسب معمول حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے معزز سربرآوردہ مسلمانوں سے مل کر کمزور مسلمانوں کو قریش کے مظالم سے محفوظ رکھا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے وسیع اثر و رسوخ کے ذریعے سے کفار میں ایسے اشخاص سے بھی تعلق قائم کیا جو بتوں کو پوجنے اور اسلام کی مخالفت کرنے کے باوجود قریش کی ان ایذا رسانیوں کو جو وہ غریب و بے کس مسلمانوں پر روا رکھتے تھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے بھائی بندوں کی ان انسانیت سوز حرکات پر برملا نفرت کا اظہار کریں اور انہیں ایسا کرنے سے روکیں۔ چنانچہ کتب سیر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مکہ میں سے بعض ایسے منصف مزاج آدمی اٹھ کھڑے ہوئے تھے جو اپنے ہم مذہب لوگوں کو مسلمانوں پر ظلم کرنے سے روکتے تھے۔ اس کی واضح مثال اس وقت نظر آتی ہے جب قریش نے معاہد کر کے محمد ﷺ اور مسلمانان مکہ کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا اور آپ شعب ابی طالب میں محصور ہونے پر مجبور ہوئے تھے۔ بائیکاٹ کا یہ سلسلہ لگاتار تین سال تک جاری رہا۔ مسلمانوں پر معاش کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے اور انہیں ایسی ایسی تکالیف پہنچائی گئیں جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی قلم تھرتھراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ آخر قریش ہی میں سے بعض لوگ اس ظالمانہ معاہدے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور محمد ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کو مکمل بائیکاٹ اور محاصرے سے رہائی ملی۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے ان نیک دل لوگوں سے مل کر انہیں معاہدے کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تیار کیا ہوگا۔

اسلام کے اولین دور میں مسلمانوں کی مدد کرنے اور ہمہ تن اسلام کی تبلیغ میں مشغول رہنے کے باعث ان کے اور محمد ﷺ کے درمیان ایسا تعلق قائم ہو گیا جس کی نظیر ملنی ناممکن ہے۔ بیعت عقبہ کے بعد جب یثرب میں اسلام پھیل گیا تو محمد ﷺ نے اپنے متبعین کو اجازت دے دی کہ وہ یثرب ہجرت کر جائیں۔

قریش قطعاً لاعلم تھے کہ آیا اس مرتبہ محمد ﷺ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر جائیں گے یا ہجرت حبشہ کی طرح مسلمانوں کو یثرب بھیج کر خود مکہ ہی میں مقیم رہیں گے۔ اس موقع پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کرنے کی اجازت مانگی لیکن محمد ﷺ نے یہ فرما کر انہیں یثرب جانے سے روک دیا:

"ابھی ایسا نہ کرو شاید اللہ تمہارا کوئی ساتھی پیدا کر دے جو ہجرت کے موقع پر تمہارے ہمراہ ہو۔"

ہجرت کی تیاری اور ہجرت:

اس واقعے سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی پختگی ایمان کا ایک اور ثبوت ملتا ہے اور وہ یہ کہ آپ کو پتہ تھا جب سے قریش کو مسلمانوں کی یثرب کی جانب ہجرت کرنے کی خبر ملی ہے وہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمان مکہ سے کسی طرح باہر نہ نکلنے پائیں تاکہ وہ انہیں ستا ستا کر اور عذاب دے دے کر ہوس انتقام کی تسکین کا سامان پیدا کر سکیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ بھی علم تھا کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہو کر محمد ﷺ کے قتل کے منصوبے باندھ رہے ہیں اور اگر وہ (حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ) ہجرت کے موقع پر آپ کے ساتھ ہوئے اور قریش خدانخواستہ آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے تو وہ آپ کے ساتھ انہیں بھی قتل کر دیں گے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب محمد ﷺ نے انہیں ہجرت میں توقف کرنے کا ارشاد فرمایا تو وہ نہ صرف اپنے ارادے سے باز رہے بلکہ ان کے دل میں سرور کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ محمد ﷺ انہیں ہجرت کے موقع پر اپنا ساتھی بنانا چاہتے ہیں۔ محمد ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کرنا وہ نعمت تھی کہ دنیا کی ساری نعمتیں مل کر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ چنانچہ وہ آپ کے حسبِ ارشاد ٹھہر گئے اور سمجھ لیا کہ اس موقع پر شہادت بھی نصیب ہو گئی تو یہ ایسی شہادت ہو گی جو اپنی جلو میں جنت اور اس کی تمام نعمتوں کو لیے ہو گی اور جس پر ہزاروں برس کی زندگی بہ خوشی قربان کی جا سکتی ہے۔

اسی روز حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دو اونٹنیوں کا انتظام کیا اور انتظار کرنے لگے کہ کب ہجرت کا حکم نازل ہو کر انہیں محمد ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ایک روز حسبِ معمول شام کے وقت آپ ﷺ ان کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ نے انہیں یثرب کی جانب ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بے تابی سے رفاقت کی خواہش ظاہر کی جسے آپ نے بڑی خوشی سے قبول فرما لیا۔ اور بعض ضروری ہدایات دے کر واپس اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اسی دن قریش کے نوجوانوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور انتظار کرنے لگے کہ کب آپ باہر نکلتے ہیں انہیں کب آپ کو قتل کرنے کے لیے اپنی تلواروں کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔

آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی سبز خضری چادر اوڑھ لیں اور بے خوف وخطر آپ کے بستر پر سو جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب رات کا تہائی حصہ گزر گیا تو آپ قریش کے لوگوں کو غفلت کی حالت میں پا کر اپنے گھر سے نکلے اور حضرت ابو بکر کے پاس پہنچے۔ وہ جاگ رہے تھے

فوراً دونوں گھر کی پشت کی ایک کھڑکی سے باہر نکلے اور جانب جنوب تین چار میل کی مسافت طے کر کے غار ثور تک پہنچے اور وہاں چھپ گئے۔

صبح ہونے پر جب قریش کو محمد ﷺ کے مکہ سے نکل جانے کا پتہ چلا تو انہوں نے چاروں طرف آپ کی تلاش میں آدمی دوڑائے۔ مکہ کے قریب کوئی وادی کوئی میدان اور کوئی پہاڑ نہ تھا جو انہوں نے نہ چھان مارا ہو۔ وہ لوگ آپ کو تلاش کرتے ہوئے غار ثور تک بھی پہنچ گئے اور ایک آدمی نے غار میں اترنے کا ارادہ بھی کیا۔ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی آوازیں سنیں تو ان کی پیشانی سے پسینہ چھوٹ پڑا اور انہوں نے اپنا سانس روک لیا مبادا کسی قسم کی آواز نکل کر دشمنوں کو ان کے یہاں ہونے کا احساس دلا دے، لیکن محمد ﷺ بڑے اطمینان سے اللہ کے ذکر اور دعاؤں میں مشغول رہے۔ جب آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی گھبراہٹ دیکھی تو جھک کر ان کے کان میں کہا لا تحزن انّ اللہ معنا (ڈرو مت اللہ ہمارے ساتھ ہے) ادھر قریشی نوجوان نے اپنی نظر غار کے ارد گرد دوڑائی تو دیکھا کہ غار کے منہ پر ایک مکڑی نے جالا تن دیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ واپس ہوگیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے اس سے غار میں نہ اترنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ غار کے منہ پر ایک مکڑی نے جالا تن رکھا ہے اگر محمد ﷺ غار میں جاتے تو یقیناً جالا ٹوٹ جاتا اس لیے میں واپس آگیا۔ یہ سن کر وہ لوگ حالتِ مایوسی میں وہاں سے چلے گئے۔ جب وہ دور نکل گئے تو محمد ﷺ نے پکار کر فرمایا: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی خدا کی قدرت کا عجیب تماشا دیکھ کر وجد میں آ گئے۔

غارِ ثور میں گھبراہٹ کی وجہ:

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی گھبراہٹ جس کے باعث ان کی پیشانی سے پسینے چھوٹنے لگے تھے اور ان کا سانس تک رک گیا تھا اپنی جان جانے کے خوف سے تھی یا اس وجہ سے کہ محمد ﷺ کا بال بیکا نہ ہو جائے؟ آیا اس وقت انہیں اپنی جان کا خیال تھا یا رسول اللہ اور صرف محمد ﷺ کی جان کا؟ اس کا تسلی بخش جواب ہمیں مندرجہ ذیل روایات میں ملتا ہے۔

ابن ہشام، حسن بن ابوالحسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ جب محمد ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آدھی رات کو غار پر پہنچے تو آپ ﷺ سے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوئے اور اسے اچھی طرح دیکھا بھالا، مبادا اس میں کوئی سانپ بچھو یا درندہ چھپا بیٹھا ہو اور محمد ﷺ کو خدانخواستہ کوئی ضرر پہنچے۔ بالکل یہی جذبہ ان کا ان نازک لمحات میں تھا جب انہوں نے غار کے سرے پر قریش کے نوجوانوں کو دیکھا۔ اس وقت انہوں نے جھک کر محمد ﷺ کے کان میں کہا "اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کے نیچے نظر کرے تو یقیناً ہمیں دیکھ لے گا، اس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کا مطلق خیال نہ تھا اگر خیال تھا تو صرف محمد ﷺ کا اور اس دین کا جس کی خاطر انہوں نے اپنی جان کی کوئی حقیقت نہ سمجھی تھی۔

انہیں نظر آرہا تھا کہ اگر اس وقت خدانخواستہ کفار نے محمد ﷺ پر قابو پالیا تو دین اسلام کا خاتمہ ہو جائے

گا۔ اپنی ذات کا خیال انہیں آہی کس طرح سکتا تھا۔ جب انہوں نے اپنے آپ کو محمد ﷺ کی محبت اور دین اسلام کے عشق میں بالکل جذب کر لیا تھا۔ وہ تو اپنے نفس کو پہلے ہی عشق محمد ﷺ میں فنا کر چکے تھے۔ اس لیے اللہ کے رستے میں دوبارہ فنا ہونے سے انہیں کیا ڈر ہو سکتا تھا؟

تاریخ کے مطالعے سے متعدد ایسے اشخاص کے حالات معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی جانیں اپنے سرداروں اور بادشاہوں پر قربان کر دیں۔ آج کل بھی اکثر زعماء ایسے ہیں جنہیں ان کے معتقدین انتہائی تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے اور انہیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غار میں جو نمونہ دکھایا وہ ان سب سے الگ اور بالا حیثیت رکھتا ہے۔ کیا بادشاہوں اور لیڈروں کی تاریخوں میں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے کہ ان کی رعایا یا معتقدین میں سے کسی فرد نے ان کے لیے ایسی قربانی پیش کی ہو؟ ایثار اور قربانی کی اس مثال کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے۔

جب کفار کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑا اور انہیں ان دونوں کے ملنے پر مایوسی ہو گئی تو آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے نکلے اور یثرب کا رخ کیا۔ راستے میں بھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جو خطرے کے لحاظ سے اس واقعے سے کم نہ تھے جو غار میں پیش آچکا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مکہ سے نکلتے ہوئے پانچ ہزار درہم بھی ساتھ لے لیے تھے جو تجارت کے منافع میں سے ان کے پاس باقی بچ گئے تھے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو انہوں نے عام مہاجر کی سی زندگی بسر کرنی شروع کی اگرچہ ان کی حیثیت بہ دستور محمد ﷺ کے وزیر اور مشیر کی تھی۔

مدینہ میں:

مدینہ میں ان کا قیام شہر کے نواح میں مقام سخ پر خارجہ بن زید کے ہاں تھا جو قبیلہ خزرج کی شاخ بنو حارث سے تعلق رکھتے تھے۔ جب محمد ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کا سلسلہ قائم کر دیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور خارجہ کو بھائی بنایا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اہل و عیال مکہ سے مدینہ واپس پہنچ گئے تو انہوں نے ان سے مل کر روزی کے وسائل تلاش کرنے شروع کیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رشتہ داروں کی طرح ان کے رشتہ دار بھی انصار کی زمینوں پر ان کے مالکوں سے مل کر کام کرنے لگے جن میں خارجہ بن زید بھی شامل تھے۔ خارجہ کے ساتھ ان کے تعلقات اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے اپنی بیٹی حبیبہ کو ان کے عقد میں دے دیا۔ حبیبہ کے بطن سے ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت حبیبہ حالت حمل میں تھیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اہل و عیال ان کے ساتھ مقام سخ میں خارجہ بن زید کے ہاں ٹھہرے تھے، لکہ ام رومان، ان کی بیٹی عائشہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے تمام لڑکے مدینہ میں ابو ایوب انصاری کے مکان کے قریب مقیم تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سخ سے روزانہ پیدل آیا کرتے تھے البتہ ان کا مستقل قیام اپنی نئی بیوی

کے ساتھ سخ ہی میں تھا۔

ہجرت کے چند روز بعد وہ بخار میں مبتلا ہو گئے۔صرف وہی نہیں بلکہ آب وہوا کی ناموافقت کے باعث اکثر مہاجرین بخار سے بیمار ہو گئے تھے۔مکہ کی آب وہوا، صحرا میں واقع ہونے کے باعث خشک تھی۔ اس کے مقابلے میں مدینہ کی آب وہوا مرطوب تھی کیونکہ وہ بارانی علاقہ تھا اور وہاں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔

جب انہیں اطمینان ہوا اور روزی کی طرف سے بے فکری نصیب ہوئی تو وہ اسلام کی اشاعت محمد ﷺ کی معاونت اور مسلمانوں کے نئے مرکز کے استحکام میں اسی طرح منہمک ہو گئے جس طرح مکہ میں مشغول رہتے تھے۔

غیرت ایمانی:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہایت نرم مزاج تھے لیکن جب وہ یہود اور منافقین کی زبانوں سے دین اسلام کے متعلق تمسخر آمیز باتیں سنتے تھے تو ان کے غصے کی انتہا نہ رہتی تھی۔مدینہ تشریف لانے پر محمد ﷺ اور یہود کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت یہود اور مسلمان دونوں کو اپنے اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت اور اپنے اپنے رسوم ورواج پر عمل کرنے کی آزادی حاصل تھی۔یہود کا شروع میں یہ خیال تھا کہ وہ مہاجرین کو اپنے ڈھب میں لا کر انہیں مدینہ کے قبیلوں، اوس وخزرج کے خلاف استعمال کر سکیں لیکن چند ہی روز میں انہیں پتہ چل گیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اور مہاجرین اہل مدینہ میں ایسا تعلق قائم ہو چکا ہے جو کسی صورت میں ٹوٹ نہیں سکتا۔اس وقت انہوں نے اپنی پہلی روش بدل کر مسلمانوں کی مخالفت پر کمر باندھی اور اسلام کے متعلق تمسخر اور استہزاء کی باتیں کرنی شروع کیں۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ چند یہودی اپنے ایک عالم فنحاص کے گھر میں جمع ہوئے۔اتفاق سے اسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی اس طرف سے آنکلے۔انہوں نے یہودیوں کے اجتماع کو غنیمت جانتے ہوئے انہیں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہی اور فنحاص سے کہنے لگے: ''اے فنحاص! اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اسی کی جانب سے تمہارے پاس وہ حق لے کر آئے ہیں جسے تم توریت میں لکھا ہوا پاتے ہو۔''

یہ سن کر فنحاص کے لبوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگا: ''خدا کی قسم اے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ! ہمیں خدا سے کسی چیز کی حاجت نہیں، خود اسے ہماری حاجت ہے۔ہم اس کی طرف نہیں جھکتے بلکہ وہ ہماری طرف جھکنے پر مجبور ہے۔ہم اس کی مدد سے بے پروا ہیں لیکن وہ ہماری امداد سے مستغنی نہیں۔اگر وہ ہماری امداد سے مستغنی ہوتا تو کبھی ہمارے مال سے ہم سے بہ طور قرض نہ مانگتا جس طرح تمہارے نبی ﷺ کا خیال ہے۔اللہ تمہیں سود لینے سے منع کرتا ہے لیکن خود ہمیں سود دیتا ہے۔اگر وہ ہم سے مستغنی ہوتا تو ہمیں سود کیوں دیتا؟''

اس ناپاک گفتگو سے فنحاص کا مقصد دراصل اس آیت پر چوٹ کرنا تھا جس میں اللہ فرماتا ہے:
من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ اضعافاً کثیرۃ
(کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اس کے بدلے میں اللہ اس کے مال کو کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔)
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فنحاص کو اللہ کے قول اور اس کی وحی کا مذاق اڑاتے دیکھا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور فنحاص کے اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ اس کے حواس بجا نہ رہے۔ اس کے بعد فرمایا:
"اے اللہ کے دشمن! اگر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو اللہ کی قسم! میں تیری گردن اڑا دیتا۔"

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہایت رقیق القلب اور بردبار ہونے کے باوجود اس موقع پر جوش میں آگئے حالانکہ آپ کی عمر بھی پچاس سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور اس مرحلے پر بالعموم انسان میں جوش و خروش باقی نہیں رہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ غیرت ایمانی کا مظاہرہ تھا اور اس بات کا ثبوت کہ آپ اللہ کی آیات اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزاء کرنے کو کسی صورت برداشت نہ کر سکتے تھے۔

رومیوں کے غلبے کی پیش گوئی:

اسی قسم کی ایک اور بھی مثال ہمیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ یہ واقعہ ہجرت سے دس سال قبل رونما ہوا تھا جب ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ کے دوران میں ایرانی رومیوں پر غالب آگئے۔ چونکہ ایرانی مجوسی تھے اور رومی اہل کتاب تھے اس لیے مسلمانوں کو اہل کتاب کے مقابلے میں مشرکوں کے غالب آجانے سے فطرتاً رنج پہنچا تھا۔ ان کی عین خواہش تھی کہ رومی فتح یاب ہوں کیونکہ وہ ان کی طرح اہل کتاب تھے۔ ایک مشرک نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر کیا اور اپنے ہم مذہب لوگوں کے فتح یاب ہونے پر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو طیش آیا۔ اسی زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی: الم۔ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین۔
(اگرچہ رومی ایرانیوں کے ہاتھوں مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند ہی سال میں وہ پھر غالب آجائیں گے) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس پیش گوئی کی بنا پر اس مشرک سے شرط لگائی کہ ایک سال کے اندر اندر رومی ایرانیوں پر غالب آجائیں گے (بعد میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر انہوں نے یہ مدت نو سال متعین کر دی) اور اگر ایسا نہ ہوا تو اسے دس اونٹ دیں گے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے حلیم الطبع اور نرم مزاج انسان کا غصہ صرف اس وقت بھڑکتا تھا جب عقیدے اور ایمان کا سوال درپیش ہوتا تھا۔
جب سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر کے آپ کے دین میں داخل ہوئے اس وقت سے ان کی رگ رگ میں ایمان صادق رچ گیا تھا۔ ان کے تمام اعمال و افعال میں اسی ایمانِ صادق کا رنگ نمایاں تھا۔ تجارت، خاندان، خواہشات غرض دنیا کی کوئی بھی چیز جو لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہو

ان کی نظر میں اللہ اور اس کے محمد ﷺ کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھی۔ ان کا جسم دل و دماغ اور ان کی روح خالص اللہ اور اس کے نبی ﷺ کے لیے تھی۔ یہی جذبہ ایمانی تھا جس نے انہیں روحانیت کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا کر صدیقین کے زمرے میں شامل کر دیا۔

جنگ بدر:

ہجرت کے کچھ عرصے بعد بدر کا معرکہ پیش آتا ہے۔ قریش مکہ اور مسلمان اپنی اپنی صفیں مرتب کیے ایک دوسرے کے بالمقابل میدانِ جنگ میں کھڑے تھے۔ مسلمانوں نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے مشورے سے قریب کی ایک پہاڑی پر ایک شامیانہ لگا دیا اور محمد ﷺ سے عرض کیا کہ آپ اس شامیانے میں تشریف رکھیں اور اگر مسلمانوں کی حالت دگرگوں دیکھیں تو اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ تشریف لے جائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی نبی ﷺ کے ہمراہ تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی اور محمد ﷺ نے دشمن کی کثرت دیکھی تو آپ نے قبلہ رو ہو کر اپنے آپ کو خدا کے حضور گرا دیا اور اس سے اس کے وعدوں کی یاد دلا کر مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگنی شروع کیں۔ آپ فرما رہے تھے: اللهم ان تهلك هذه العصابة اليوم لا تعبد (اے اللہ! یہ قریش اپنے عظیم الشان لشکر کے ہمراہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اے اللہ! اپنے اس وعدے کو پورا فرما جو تو نے مسلمانوں کی فتح کے متعلق کیا ہے۔ اے اللہ! اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک ہوگئی تو آئندہ تیرا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا)۔ آپ اس قدر زاری اور اتنی بے چینی اور گھبراہٹ کی حالت میں اپنے رب کو پکار رہے اور ہاتھ دعا کے لیے پھیلا رہے تھے کہ بار بار آپ ﷺ کی چادر زمین پر گر جاتی تھی۔ بالآخر آپ ﷺ پر غنودگی کی حالت طاری ہوئی اور اللہ کی طرف سے ایک بار پھر بڑے زور سے مسلمانوں کی فتح و نصرت کی خوشخبری دی گئی۔ آپ ﷺ مطمئن ہو کر شامیانے سے باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے مسلمانوں کو کفار پر حملہ کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ آج کے روز جو شخص کفار سے لڑے گا اور اس حالت میں شہید کیا جائے گا اس کے پیش نظر صرف اللہ کی رضا اور اس کے دین کی مدد کا جذبہ ہوگا اور اس نے میدانِ جنگ میں کفار کو پیٹھ نہ دکھائی ہوئی اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔'' گو پہلے ہی سے اللہ نے محمد ﷺ کو فتح کی خوشخبری دے دی تھی لیکن اس کے باوجود آپ برابر گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں مانگتے رہے جب تک ایک بار پھر اللہ کی طرف سے واشگاف الفاظ میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کا وعدہ نہ دے دیا گیا اور آپ کو دلی اطمینان نصیب نہ ہوگیا۔

واقعی ایک پیغمبر کی شان یہی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اللہ کے وعدے سچے ہیں اور وہ ضرور مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا لیکن ساتھ ہی آپ کو یہ علم بھی تھا کہ اللہ غنی عن العالمین بھی ہے۔ ممکن ہے کہ مسلمانوں سے اس دوران جنگ میں کوئی ایسی کوتاہی سرزد ہو جائے جس کے باعث فتح و نصرت کا وعدہ دور جا پڑے اور مسلمان اولین مرحلے میں اپنے مقصود حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس پورے عرصے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ محمد ﷺ کے ساتھ ساتھ رہے انہیں یقین تھا کہ اللہ ضرور مسلمانوں کی مدد کر کے انہیں فتح سے ہمکنار کرے گا۔ اسی لیے وہ حیرت و تعجب سے آپ کی مناجات سن رہے تھے۔ آپ انتہائی عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کر رہے اور اسے اس کا وعدہ یاد دلا رہے تھے۔ آپ کی چادر بار بار زمین پر گر پڑتی تھی اور اسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اٹھا کر آپ کے کندھوں پر ڈالتے اور کہتے تھے:

''رسول اللہ! آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ نے آپ کو فتح و نصرت کا وعدہ دیا ہے، اور وہ اپنے وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔''

اکثر دیکھا گیا ہے بعض لوگ اپنے عقیدے میں اس قدر راسخ ہوتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے جو ان کے عقائد سے اختلاف رکھتے ہوں۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ حقیقی ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ مخالفین سے تعصب، تندی اور سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کامل ایمان ہونے کے باوجود نہایت نرم دل انسان تھے۔ سب وشتم، تندی اور سختی سے وہ کوسوں دور تھے۔ قابو پانے کے بعد مخالف کو معاف کر دینا اور فتح یاب ہونے کے بعد دشمن پر احسان کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اس طرح ان میں حق و صداقت کی محبت اور رحم و کرم کا جذبہ بیک وقت پایا جاتا تھا۔ حق کے راستے میں وہ ہر چیز حتی کہ اپنی جان کو بھی ہیچ سمجھتے تھے اور اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کو بہ خوشی تیار ہو جاتے تھے لیکن جب حق غالب آجاتا تو دشمن سے سختی کا برتاؤ اور اس سے مظالم کی جواب دہی کرنے کے بجائے ان میں رحم و کرم کا جذبہ ابھر آتا تھا۔

اسیران بدر کی سفارش:

مسلمانوں کو جنگ بدر میں فتح نصیب ہوئی اور وہ قریش کے ستر قیدی ہمراہ لے کر مدینہ واپس آگئے۔ یہ قیدی وہی تھے جنھوں نے مکہ میں تیرہ برس تک مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے تھے اور ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ انہیں دکھائی دے رہا تھا کہ ان مظالم کا بدلہ چکانے کا وقت آپہنچا ہے اور اب مسلمان ان پر جس قدر بھی سختی کریں کم ہے۔ اپنے آپ کو مسلمانوں کی سختیوں سے بچانے کی کوئی تدبیر انہیں اس کے سوا سمجھ نہ آئی کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے رحم کی التجا کریں۔ چنانچہ قریش نے انہیں بلایا اور کہا:

''اے حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! تم جانتے ہو کہ ہم قیدیوں میں سے کوئی تم لوگوں کا باپ ہے کوئی بھائی، کوئی چچا ہے اور کوئی ماموں اب اگر تم ہمیں قتل کرو گے یا ایذا پہنچاؤ گے تو اپنے قریبی رشتہ داروں ہی کو قتل کرو گے یا ایذا پہنچاؤ گے ہم رشتہ داری کا واسطہ دے کر تم سے التجا کرتے ہیں کہ تم محمد ﷺ سے کہہ کر ہماری جان بخشی کرا دو۔ وہ ہم پر احسان کر کے ہمیں رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔''

ان کی یہ عاجزانہ التجا سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کی بھلائی کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تدبیر کریں گے۔ قریش کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوئی گڑبڑ نہ کر دیں۔ انہوں نے حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے بھی وہی بات کہی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہی تھی۔ حضرت عمر نے خشمگیں نظر سے انہیں دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے وعدے کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور آپ سے مشرک قیدیوں کی سفارش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان سب قیدیوں کو قتل کر دیا جائے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اصرار کر کے اپنی بات منوالی اور تمام قیدی زرِ فدیہ کے عوض رہا کر دیے گئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ان کی پاکیزگی قلب اور حد درجہ نرم دلی پر دلالت کرتا ہے۔ شاید یہ وجہ بھی ہو، انہوں نے دوربین نظر سے اس امر کا مشاہدہ کر لیا تھا کہ مشرکین مکہ بالآخر رحم کے مظاہروں ہی کے ذریعے سے مغلوب ہوں گے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی طاقت وقوت رکھنے کے باوجود ان سے مروت واحسان کا سلوک کیا ہے تو وہ آپ سے آپ اسلام کی آغوش میں آگریں گے۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ ظاہری قوت کے ذریعے سے مخالف پر جسمانی لحاظ سے تو قابو پایا جا سکتا ہے لیکن اس کے دل کو مطیع نہیں کیا جا سکتا۔ مخالف کے دل پر اسی وقت فتح حاصل کی جا سکتی ہے جب طاقت کے ذریعے سے نہیں بلکہ پیار اور محبت کے ذریعے سے اسے اپنی طرف مائل کیا جائے۔

جنگ بدر:

غزوہ بدر جس طرح مسلمانوں کے لیے ایک نئے دور کا آغاز تھا اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کتاب زندگی کا بھی ایک نیا ورق تھا۔ اس جنگ کے بعد مسلمانوں نے ایک نئے نہج سے اپنی سیاست کو مرتب کرنا شروع کیا۔ بدر کی فتح سے مسلمانوں کو بہت بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور ان کے مخالفین کے دلوں میں ان کی جانب سے حسد اور غصے کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس فتح نے جہاں یہود کو چوکنا کر دیا تھا اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب مسلمان ان کے دستِ نگر بن کر نہیں رہ سکتے وہاں مدینہ کے اردگرد بسنے والے قبائل کو بھی یہ فکر پیدا ہوگیا تھا کہ مبادا مسلمانوں کا رخ ان کی طرف پھر جائے۔ چنانچہ یہود اور مدینہ کے نواحی قبائل نے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ ان امور کی موجودگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ آپ ہر آن اور ہر لحظہ سختی سے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہیں اور صحابہ سے مشورہ لینے کے بعد ان حالات کے مطابق اپنی پالیسی وضع کریں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے خاص الخاص مشیر تھے۔ ان دونوں کی طبیعتوں میں بے حد فرق تھا لیکن بایں ہمہ دونوں نہایت مخلص اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار تھے اور ہر مشورہ انتہائی غور وفکر سے دیتے تھے۔ ان مشوروں کی روشنی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے راہ عمل متعین کرنے میں بہت آسانی رہتی تھی۔ ان دونوں کے علاوہ آپ دوسرے مسلمانوں کو بھی اپنے مشورہ میں برابر کا شریک کرتے تھے جس کا اثر لوگوں پر بہت اچھا پڑتا تھا اور ہر شخص یہ خیال کرتا تھا کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد حاصل ہے اور آپ اسے بھی مشوروں میں شریک کر کے خدمت کا موقع عنایت فرماتے ہیں۔

جنگِ اُحد

یہود کی ریشہ دوانیاں بالآخر رنگ لائیں اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنے ناپاک ارادوں کا اظہار کھلم کھلا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مجبوراً بنو قینقاع کا محاصرہ کر کے انہیں مدینہ سے جلا وطن کرنا پڑا۔ ارد گرد کے قبائل نے بھی مسلمانوں کے خلاف اپنی طاقت مجتمع کرنی شروع کر دیں۔ لیکن ان کی سرگرمیاں بھی مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ جب وہ سنتے کہ مسلمانوں کا کوئی دستہ ان کی سرکوبی کے لیے متعین کیا گیا ہے تو وہ بھاگ جاتے اور مقابلے کے لیے میدان میں نہ نکلتے۔

یہ تمام خبریں تواتر سے مکہ پہنچ رہی تھیں لیکن مسلمانوں کی یہ تمام کامیابیاں مشرکین مکہ کو جنگ بدر کا انتقام لینے کے عزم سے باز نہ رکھ سکیں اور ایک سال بعد انہوں نے پھر ایک لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کر دی جس پر اُحد کا معرکہ پیش آیا۔ شروع میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کفار نے شکست کھا کر بھاگنا شروع کیا لیکن بعض مسلمانوں کی بے تدبیری کے باعث جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ محمد ﷺ نے ان لوگوں کو ایک گھاٹی پر متعین کیا تھا تاکہ دشمن پشت کی طرف سے حملہ نہ کر سکے۔ لیکن جب انہوں نے کفار کو بھاگتے اور مسلمانوں کو مالِ غنیمت جمع کرتے دیکھا تو وہ محمد ﷺ کی ہدایت فراموش کر کے اپنی جگہ چھوڑ کر میدان جنگ میں پہنچ گئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دور سے یہ سارا ماجرا دیکھ کر موقع غنیمت جانا اور پشت کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان اچانک حملہ کی تاب نہ لا سکے اور منتشر ہو گئے۔

اس دوران میں محمد ﷺ کو بھی کفار کی سنگ باری سے زخم آئے۔ قریش نے شور مچا دیا کہ محمد ﷺ مارے گئے۔ اس خبر نے مسلمانوں کی ہمتوں کو بالکل ہی پست کر دیا۔ اگر بعض جاں نثار صحابہ آپ کے چاروں طرف کھڑے ہو کر دشمن کی لگاتار یورش کا مقابلہ نہ کرتے اور آپ خدانخواستہ شہید ہو جاتے تو پھر اسلام کا خاتمہ تھا۔ لیکن اللہ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو دشمنوں کے ناپاک ارادوں سے محفوظ رکھا اور مسلمان عارضی انتشار کے بعد پھر مجتمع ہو گئے۔ اس دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی بہادری کا مظاہرہ کرنے میں دوسروں سے کم حصہ نہ لیا۔

فتح مکہ تک کا پورا عرصہ مسلمانوں کو کفار سے جنگ یا اس کی تیاریاں کرتے گزارنا پڑا۔ ایک طرف یہود حیی بن اخطب کے زیر سرکردگی مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے سوچ رہے تھے۔ دوسری طرف قریش مکہ اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں کو زیر کرنے اور ان پر غالب آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں اور لڑائیوں کے علاوہ بنو نضیر، خندق (احزاب) اور بنو قریظہ کے غزوات یہود کی فتنہ انگیز سیاست اور قریش کے غیظ و غضب کے نمایاں مظاہر ہیں۔ ان تمام لڑائیوں اور غزوات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ محمد ﷺ کے دوش بہ دوش حصہ لیا اور دوسرے تمام مسلمانوں سے زیادہ بہادری، صدق و ثبات اور ایمان کا ثبوت دیا۔

صلح حدیبیہ:

ہجرت کے چھ سال بعد محمد ﷺ نے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کو مکہ چلنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملنے پر قریش نے تہیہ کرلیا کہ وہ کسی صورت آپ اور آپ کے صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ محمد ﷺ مکہ سے کچھ فاصلے پر حدیبیہ میں فروکش ہوئے اور مکہ والوں کو کہلا بھیجا کہ آپ کے آنے کا مقصد جنگ اور قریش مکہ سے چھیڑ چھاڑ کرنا نہیں بلکہ صرف عمرہ کرنا ہے۔ قریش کے سفیر آپ کے پاس آنے شروع ہوئے۔ بالآخر یہ معاہدہ ہوا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال آ کر عمرہ کریں۔

مسلمانوں اور بالخصوص حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو معاہدہ کی شرطیں سخت ناگوار گزریں۔ وہ ان شرائط کو اپنی ہتک سمجھتے اور اپنی کمزوری کا مظاہرہ خیال کرتے تھے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدق دل سے محمد ﷺ کے ہر قول و فعل کے آگے سر تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور انہیں پختہ یقین تھا کہ آپ کی کوئی بات اور کوئی کام حکمت سے خالی نہیں اور جو کچھ آپ نے کیا ہے وہ یقیناً دین اسلام اور مسلمانوں کے فائدے کی خاطر کیا ہے۔ اس طرح آپ نے ایک بار پھر عمل سے اپنا صدیق ہونا ثابت کر دیا۔

بعد ازاں جب سورۃ فتح نازل ہوئی تو مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ صلح حدیبیہ اصل میں ایک فتح مبین ہے جو اللہ نے محمد ﷺ کو عطا فرمائی ہے۔

اب مسلمانوں کو آئے دن قوت اور روز افزوں ترقی حاصل ہونے لگی۔ خیبر، فدک اور تیماء میں یہود کا محاصرہ کیا گیا اور انہیں مطیع ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فارس، روم، مصر، حیرہ، یمن اور دوسرے علاقوں کے بادشاہوں اور امراء کو خطوط لکھے جن میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی۔ فتح مکہ اور محاصرہ طوائف کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی عروج پر پہنچ گئی۔ سارا جزیرہ نمائے عرب اسلام کے نور سے جگمگا اٹھا اور اسلامی سلطنت کی سرحدیں ایران اور روم کی عظیم الشان حکومتوں سے ٹکرانے لگیں جو اس زمانے میں دنیا کے بیشتر حصے پر قابض تھے۔ اس وقت محمد ﷺ اور مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب کوئی طاقت اس نور کو بجھا نہیں سکتی اور اسلام کا غلبہ اب کسی کے روکے رک نہیں سکتا۔

جب عربوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی قوت روز بہ روز ترقی پذیر ہے اور ان کے منصوبے اور کوششیں اسے ضعف پہنچانے کے بجائے اس کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں تو وہ فوج در فوج عرب کے گوشے گوشے سے اسلام قبول کرنے کے لیے دوڑے چلے آنے لگے۔ دیدۂ بینا کے لیے یہ بات کس قدر اثر انگیز ہے کہ ایک شخص یکہ و تنہا ایک مشن لے کر اٹھتا ہے، اس کی قوم اس کے ساتھ نہیں، یہود اس کی مخالف ہیں، قبائل عرب اس کے دشمن ہیں لیکن وہ تمام مخالفتوں، رکاوٹوں اور پے در پے حملوں کے باوجود بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہود، انصاری، مجوس اور مشرکین اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور

ہوجاتے ہیں۔ یقیناً حق ہی غالب ہوتا ہے اور باطل مغلوب۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے محمد ﷺ حق پر تھے یا ناحق پر اور آپ کی دعوت سچی تھی یا جھوٹی، صرف یہی دلیل کافی ہے کہ آپ نے شدید مخالفت کے ہوتے ہوئے ان تمام طاقتوں پر غلبہ حاصل کیا اور یہ طاقتیں اپنا پورا زور لگانے کے باوجود محمد ﷺ کے مقابلے میں خائب و خاسر رہیں۔ آپ کا مقصد ان پر غلبہ حاصل کرنا اور انہیں فتح کر کے ان پر حکومت چلانا نہ تھا بلکہ آپ صرف یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ اللہ پر ایمان لا کر خدائی مملکت میں داخل ہو جائیں اور نیک اعمال بجالا کر جنت کے وارث بنیں۔

امیر الحج:

فتح مکہ کے بعد محمد ﷺ کے سامنے سے تمام رکاوٹیں دور ہو چکی تھیں اور آپ اسلام کے تمام فرائض و واجبات نہایت آسانی سے بجالا سکتے تھے۔ حج بھی ایک دینی فریضہ ہے لیکن وفود کے جوق در جوق مدینہ آنے کی وجہ سے آپ کو مکہ جانے اور بیت اللہ کا حج کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ اس لیے فتح مکہ کے اگلے سال آپ نے اپنی جگہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر الحج مقرر فرما کر روانہ کیا۔ وہ تین سو مسلمانوں کو لے کر مکہ پہنچے اور وہاں حج کے فرائض ادا کیے۔ اسی حج کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب ذ نے اور بعض روایات کے مطابق خود ضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا۔ انہوں نے مشرکین کے لیے چار مہینے کی مہلت کا اعلان کیا کہ اس عرصے میں وہ مکہ چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں چلے جائیں۔ اس وقت سے آج تک کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہیں کر سکا اور نہ آئندہ کر سکے گا۔

حجۃ الوداع:

ہجرت کے دسویں سال محمد ﷺ خود حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اس حج کو حجۃ الوداع کہتے ہیں کیونکہ یہ آپ کا آخری حج تھا۔ آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، دوسرے صحابہ اور آپ کی ازواجِ مطہرات بھی تھیں۔ اس موقع پر عرفات کے میدان میں مسلمانوں کا بے نظیر اجتماع منعقد ہوا۔ یہی جگہ تھی جہاں کبھی کوئی شخص محمد ﷺ کی بات سننے کو تیار نہ ہوتا تھا لیکن آج اسی جگہ ایک لاکھ سے زائد اشخاص آپ کی اونٹنی کے گرد سر جھکائے مؤدبانہ کھڑے تھے اور انتہائی خاموشی سے آپ کے روح پرور ارشادات سن رہے تھے۔

حج سے فارغ ہونے کے بعد آپ مدینہ واپس تشریف لائے۔ مدینہ آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ آپ نے شام پر فوج کشی کرنے کے لیے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا جس کا سردار آپ نے اسامہ بن زید کو بنایا اور بڑے بڑے صحابہ کو، جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے لشکر کے ساتھ جانے کے لیے ارشاد فرمایا۔ یہ لشکر مدینہ کے ایک قریبی مقام جرف ہی تک پہنچا تھا کہ محمد ﷺ کی علالت کی خبر آئی۔ یہ سن کر لشکر نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور وہ آپ کی زندگی میں شام روانہ نہ ہو سکا۔

نماز پڑھانے کا حکم:

جب محمد ﷺ کی علالت نے شدت اختیار کی تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اس ذیل میں حضرت عائشہ ز کی ایک روایت قابل اندراج ہے۔ آپ فرماتی ہیں۔

”جب محمد ﷺ زیادہ بیمار ہوئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نماز کے لیے عرض کرنے آئے۔ آپ نے فرمایا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہہ دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، میں نے کہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت رقیق القلب انسان ہیں ۔ جب وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو ضبط نہ کرسکیں گے اور اس طرح لوگوں کی نماز میں خلل پڑے گا۔ اگر آپ عمر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیں تو بہتر ہو۔ آپ نے یہ سن کر پھر فرمایا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ اس پر میں نے حفصہ سے کہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رقیق القلب ہیں وہ نماز میں رونا شروع کردیں گے اور لوگوں کی نماز میں خلل پڑے گا۔ تم محمد ﷺ سے کہو کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جگہ عمر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیں، چنانچہ حفصہ نے جا کر یہی بات آپ سے کہہ دی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً تم وہی عورتیں ہو جنہوں نے یوسف علیہ السلام کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، اس پر حفصہ نے مجھ سے کہا تم نے مجھے ناحق شرمندہ کرایا۔“

محمد ﷺ کے حسب ارشاد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔

ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تھے کہ نماز کا وقت ہوگیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نہ پا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز تھے۔ جب آپ نے تکبیر کہی تو اس کی آواز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں محمد ﷺ کے کانوں تک پہنچی۔ آپ نے فرمایا: ”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ اللہ اور مسلمان یہ بات پسند کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں۔“ بعض لوگ اس واقعے سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس طرح آپ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ فرما کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ نامزد کردیا تھا کیونکہ لوگوں کو نماز پڑھانا محمد ﷺ کی جانشینی کا پہلا مظہر ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، محمد ﷺ کی نظر میں:

بیماری کے دوران ہی میں ایک روز محمد ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: ”اللہ نے اپنے بندے کو حق دیا کہ خواہ وہ دنیا کو اختیار کرلے خواہ آخر کو لیکن اس نے آخرت میں اللہ کے قرب کو اختیار کیا۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ محمد ﷺ خود اپنا ذکر فرما رہے ہیں۔ وہ زار و قطار رونے لگے یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی اور انہوں نے کہا: ”محمد ﷺ! آپ پر ہماری جانیں اور ہماری اولاد قربان ہو کیا ہم آپ کے بعد زندہ رہ سکیں گے؟“

محمد ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ”مسجد میں لوگوں کے گھروں کے جس قدر دروازے ہیں وہ بند کردیئے

جائیں سوا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے۔" پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "میں نے اپنے صحابہ میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل کسی کو نہیں پایا اور اگر میں بندوں (یہ روایت ابن ہشام کی ہے۔ یہی حدیث صحاح میں مختلف الفاظ سے آئی ہے۔ ان میں سے کسی میں "بندوں" کا لفظ نہیں بلکہ بعض میں "میری امت"، بعض میں "اس امت"، بعض میں "لوگوں"، بعض میں "اہل زمین" کے الفاظ ہیں) سے کسی کو خلیل بناتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے میرا تعلق ہم نشینی، بھائی چارے اور ایمان کا ہے یہاں تک کہ اللہ ہمیں اپنے پاس اکٹھا کرے۔"

وفات کے دن صبح کے وقت محمد ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کا سہارا لیے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ جب لوگوں نے آپ کو دیکھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور وہ نماز ہی میں رستہ بنانے کے لیے ادھر ادھر سمٹنے لگے۔

محمد ﷺ نے اشارے سے انہیں اپنی جگہ رہنے کا حکم دیا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آہٹ سنی تو سمجھ گئے کہ محمد ﷺ تشریف لائے ہیں۔ اس پر وہ اپنی جگہ سے ہٹنے لگے تاکہ آپ کے لیے جگہ خالی کر دیں لیکن محمد ﷺ نے اشارے سے انہیں اپنی جگہ ہی کھڑے رہنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب بیٹھ گئے اور بیٹھے بیٹھے نماز پڑھی۔

نماز کے بعد آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے اور کچھ دیر کے بعد آپ کو دوبارہ بخار آگیا۔ آپ نے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی منگوایا اور اسے اپنے چہرے پر ملنے لگے۔ اس سے تھوڑی دیر بعد آپ کی مقدس روح ملاء اعلا کی طرف پرواز کر گئی۔

(۲)

بیعتِ خلافت

وفات محمد ﷺ پر مسلمانوں میں سراسیمگی:

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۳ جون ۶۳۲ء کو اللہ نے محمد ﷺ کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا۔اس دن صبح کے وقت آپ نے مرض میں کچھ افاقہ محسوس کیا جس پر آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے سے نکل کر مسجد میں تشریف لائے اور لوگوں سے کچھ باتیں کیں، اسامہ بن زید امیر لشکر کی کامیابی کی دعا کی اور انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ روم کی جانب روانہ ہو جائیں۔اس کے بعد آپ ﷺ واپس حجرے میں تشریف لے آئے۔کچھ ہی دیر بعد جب لوگوں کو اچانک معلوم ہوا کہ ان کا محبوب آقا ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تو ان کی حالت مارے غم کے دیوانوں کی سی ہو گئی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار لے کر مسجد میں کھڑے ہو گئے اور کہنا شروع کیا:

”جو شخص کہے گا کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے، میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔آپ ہرگز فوت نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔اسی طرح جیسے موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے تھے اور چالیس رات غیر حاضر رہنے کے بعد واپس اپنی قوم میں آ گئے تھے محمد ﷺ بھی یقینا واپس آئیں گے اور منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔“

محمد ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں واپس پہنچانے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کی صحت کے بارے میں مطمئن ہو کر مدینہ کے نواح میں اپنے گھر تشریف لے گئے تھے جو مقام سخ میں تھا۔جب آپ کی خبر وفات پھیلی تو ایک شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جا کر خبر کی۔وہ فوراً مدینہ آئے۔مسجد نبوی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار لیے لوگوں کو ڈرا دھمکا رہے تھے مگر انہوں نے اس طرف التفات نہ فرمایا بلکہ سیدھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں چلے گئے۔جہاں محمد ﷺ کا جسد اطہر رکھا ہوا تھا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رخ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور رخسار کو بوسہ دے کر فرمایا: ”کیا ہی بابرکت تھی آپ کی زندگی اور کیا ہی پاکیزہ ہے آپ کی موت“ اس کے بعد حجرے سے باہر آئے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا:

"ایھا الناس، من کان یعبد محمداً افان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لایموت" (اے لوگو! جو شخص محمد ﷺ کو پوجتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ تو فوت ہو گئے لیکن جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ یقیناً زندہ ہے اور اس پر کبھی موت وارد نہ ہو گی)۔

اس کے بعد یہ آیت پڑھی:

"وما محمد الارسول قد خلت من قبله الرسول ۔افأن مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم ۔ ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر اللہ شیا و سیجزی اللہ الشاکرین (محمد اللہ کے رسول ہیں۔ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔اگر محمد ﷺ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل کفر کی جانب پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے وہ اللہ کو ذرا سا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو نیک بدلہ دے گا)۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو ان کے دماغ پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا اور بالآخر انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی محمد ﷺ فوت ہو چکے ہیں۔اس یقین کا ان پر اتنا شدید اثر ہوا کہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ نہ سہار سکیں اور بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑے۔

آیئے ذرا غور کریں اور اپنے نفوس میں اس واقعے کا بہ نظر غائر جائزہ لیں جس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا ایک اور عظیم الشان پہلو واضح ہوتا ہے۔مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص ایسا تھا جو محمد ﷺ کی وفات کے صدمے کے اثر سے اس حد تک پہنچ سکتا تھا جس حد تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہنچے تو وہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ آپ کے صفی اور ہم نشین تھے۔انہوں نے اپنی ساری عمر آپ کی خدمت اور آپ کے لائے ہوئے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دی تھی جب محمد ﷺ نے فرمایا: اللہ نے اپنے ایک بندے کو حق دیا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی زندگی اختیار کر لے یا آخرت کی زندگی اور اس نے آخرت کی زندگی اختیار کر لی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی اور آپ نے کہا تھا "یا محمد ﷺ آپ پر ہماری جانیں اور ہماری اولاد قربان ہو، کیا ہم آپ کے بعد زندہ رہ سکیں گے؟" لیکن محمد ﷺ کی وفات کا سخت صدمہ آپ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح بے ہوش نہ کر سکا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ آپ ملاء اعلیٰ کو تشریف لے گئے ہیں تو انہوں نے فوراً مجمع عام میں آ کر اعلان کر دیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ضبط نفس:

جو تقریر انہوں نے اس وقت کی جو آیت اس موقع پر پڑھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل تھا اور ان مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی کتنی زبردست قوت موجود تھی کہ محمد ﷺ کی وفات جیسے عظیم الشان صدمے کی خبر سن کر انہوں نے ہوش و حواس بجا رکھے اور ان پر کسی قسم کی سراسیمگی طاری نہ ہوئی۔ہماری حیرت اور تعجب کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اوصاف ایک ایسے شخص سے ظاہر ہو

ے جو انتہائی رقیق القلب تھا اور جو محمد ﷺ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

یہ گھڑی مسلمانوں کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہ صرف ایسے سخت وقت میں اپنے اوسان بجا رکھے بلکہ بعد میں بھی جب کبھی مسلمانوں پر کوئی برا وقت پڑا تو اسی قوتِ ارادی اور اولوالعزمی سے کام لے کر تمام خطرات کو دور کر دیا۔ یہی قوت ارادی تھی جسے بروئے کار لاکر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں اور اسلام کو ایک ایسے فتنے سے بچالیا جو اگر خدانخواستہ شدت اختیار کر لیتا تو نہ معلوم اسلام کا کیا حشر ہوتا۔

مسئلہ خلافت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور وہ لوگ جو مسجد میں ان کے گرد جمع تھے، انتہائی رنج و الم کے باعث سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ محمد ﷺ کے بعد مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا کیا انتظام ہونا چاہیے لیکن جن لوگوں کو آپ کی وفات کا یقین ہوگیا تھا ان کی نظر سب سے پہلے اسی مسئلے پر پڑی اور حزن و الم انہیں اس اہم معاملے پر غور و فکر کرنے سے روک نہ سکا۔

ہجرت کے بعد مدینہ کا سارا انتظام محمد ﷺ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ کی حکومت صرف مدینہ تک محدود نہ رہی بلکہ آہستہ آہستہ سارے عرب پر محیط ہوگئی۔ عرب کے تقریباً تمام باشندے مسلمان ہوگئے اور جو لوگ مسلمان نہ ہوئے انہوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا۔ اب مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اس سلطنت کا انتظام کون سنبھالے گا اور محمد ﷺ کی جانشینی کا فخر کسے نصیب ہوگا؟

انصار اور مہاجرین میں اختلاف:

انصار کا خیال تھا کہ انہوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور آڑے وقت میں جب ان کی اپنی قوم نے انہیں نکال دیا تھا ان کی مدد کی، اس لیے خلافت کے حق دار وہ ہیں۔ محمد ﷺ کی زندگی میں بھی انصار کے بعض لوگوں کی زبانوں سے اس قسم کے فقرات نکل گئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مہاجرین پر فائق سمجھتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد جب حنین اور طائف کے معرکے پیش آئے اور کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا تو محمد ﷺ نے مکہ کے ان لوگوں کو تالیفِ قلوب کے لیے جو نئے نئے اسلام لائے تھے اور ان جنگوں میں شریک ہوئے تھے مال غنیمت انہیں میں تقسیم کر دیا۔ یہ دیکھ کر انصار کے بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ خون تو ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے اور مال مکہ والے لے گئے ہیں۔ جب محمد ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو حکم دیا کہ وہ تمام انصار کو جمع کریں۔ جب تمام لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا: "اے انصار! تم لوگوں کی طرف سے مجھے ایک بات پہنچی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں تم لوگوں کو شکایت ہے لیکن اس بات سے قطع نظر مجھے اس بات کا جواب دو کیا یہ واقعہ نہیں کہ تم گمراہ تھے میرے ذریعے سے اللہ نے تمہیں ہدایت دی، تم غریب تھے میرے ذریعے سے اللہ نے تمہیں امیر بنایا، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے میرے ذریعے تمہارے درمیان الفت اور محبت پیدا کی۔"

"انصار نے یہ سن کر شرمندگی سے سر جھکا لیا اور کہا:

"یا محمد ﷺ! بیشک اللہ اور اس کے رسول نے ہم پر بڑے بڑے احسانات کیے۔"

"اے انصار! تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

لیکن وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے اور اس کے سوا کچھ نہ کہا: "یا محمد ﷺ! ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ یقیناً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہم پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔"

اس پر خود رسول ﷺ نے ان کی طرف سے جواب دیا: "اللہ کی قسم! اگر تم چاہتے تو کہہ سکتے تھے اور تمہارا کہنا بالکل سچ ہوتا کہ اے محمد ﷺ! آپ کی قوم نے آپ کی تکذیب کی، آپ ہمارے پاس آئے، ہم نے آپ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔ آپ کی قوم نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا تھا ہم نے آپ کو پناہ دی۔ آپ غریبی اور تنگ دستی کی حالت میں ہمارے پاس آئے ہم نے آپ کی ضرورت کا سامان مہیا کیا۔ آپ دل شکستہ تھے ہم نے آپ کی دل جوئی کی۔"

یہ الفاظ ادا کرتے وقت آپ پر ایک خاص قسم کی کیفیت کا تاثر طاری تھا۔ آپ نے فرمایا: "دنیا کی چند حقیر چیزوں کی خاطر تم نے یہ بات کہی ہے۔ میں نے وہ مال قریش کو محض تالیف قلوب کے لیے دیا تاکہ وہ اسلام پر پختہ ہو جائیں۔ تم پہلے ہی سے اسلام پر پختہ ہو۔ تمہیں تالیف قلب کے لیے دینے کی ضرورت نہ تھی۔ اے انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم اپنے ساتھ محمد ﷺ کو لے جاؤ۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار کا ایک فرد ہوتا۔ اگر لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں انصار کے راستے پر چلوں گا۔ اے اللہ! انصار پر رحم فرما، انصار کے بیٹوں پر رحم فرما، انصار کے بیٹوں کی اولاد پر رحم فرما۔"

محمد ﷺ کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ان پردرد باتوں نے انصار پر بے حد اثر کیا۔ وہ اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور سب نے بہ یک زبان کہا: "ہم محمد ﷺ کی تقسیم اور بخشش پر دل و جان سے راضی ہیں۔"

انصار کے اندیشوں کا اظہار حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت نہ ہوا تھا بلکہ اس سے پہلے فتح مکہ کے وقت بھی ہو چکا تھا جب انہوں نے محمد ﷺ کو کوہِ صفا پر اہل مکہ سے خطاب کرتے، خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو توڑتے اور برسوں کے پرانے جانی دشمنوں کو اسلام کی آغوش میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس موقع پر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب محمد ﷺ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ واپس تشریف نہیں لے جائیں گے۔ بعض لوگوں نے اس کا اظہار کھلے لفظوں میں بھی کر دیا اور کہا: "اب کہ محمد ﷺ نے مکہ فتح کر لیا ہے اور آپ کا وطن آپ کے قبضے میں آچکا ہے آپ مدینہ کیوں واپس جانے لگے؟"

جب محمد ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ نے فرمایا: "میرا جینا اور مرنا سب تمہارے ساتھ ہے۔ میں تم سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔"

ان امور کی موجودگی میں محمد ﷺ کی خبر وفات سنتے ہی انصار کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا قدرتی امر تھا کہ آیا مدینہ کا انتظام اور امورِ سلطنت کی دیکھ بھال ان مہاجرین کے ہاتھ میں رہے گی جو مکہ سے بہ حالت تباہ مدینہ پہنچے، اہل مدینہ نے انہیں پناہ دی اور انہیں عزت اور قوت و طاقت بخشی یا یہ کام اہل مدینہ کے سپرد کیا جائے گا جن کے متعلق خود محمد ﷺ فرما چکے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی تکذیب کی جا رہی تھی، آپ ان کے پاس آئے تو انہوں نے آپ کی تصدیق کی۔ آپ کو آپ کی قوم نے چھوڑ دیا انہوں نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا تھا انہوں نے آپ کو پناہ دی۔ آپ دل شکستہ تھے انہوں نے آپ کی دل جوئی کی۔

سقیفہ بنی ساعدہ:

اسی مسئلہ کو طے کرنے کے لیے انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور اپنے ایک سردار سعد بن عبادہ ذکو جو اس وقت بیمار تھے، ان کے گھر سے وہاں لے آئے اور بحث شروع کی۔ پہلے تو سعد ان کی باتیں سنتے رہے پھر انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا: "میں اپنی بیماری کے سبب تمام لوگوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا تم میری بات سن کر انہیں بتا دو۔"

چنانچہ انہوں نے تقریر شروع کی اور ان کا لڑکا ان کی باتیں لوگوں تک پہنچاتا گیا۔ انہوں نے حمد و ثناء کے بعد کہا:

سعد بن عبادہ کی تقریر:

"اے انصار! تمہیں دین برحق کی امداد کرنے کا جو شرف، اسلام کی اعانت کرنے کی جو فضیلت حاصل ہے وہ عرب کے اور کسی قبیلے کو حاصل نہیں۔ محمد ﷺ اپنی قوم کے درمیان تیرہ سال تک مقیم رہے اور اسے اللہ کی عبادت کرنے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی تلقین کرتے رہے لیکن سوا چند لوگوں کے کسی نے آپ کی باتیں قبول نہ کیں۔ مگر وہ لوگ بھی جو آپ پر ایمان لائے، محمد ﷺ کی مدافعت کرنے، دین کو عزت بخشنے اور خود اپنے آپ کو کفار کے مظالم سے بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس وقت اللہ نے تمھیں اپنے انعامات کا وارث بنانے، فضیلت عطا کرنے اور بزرگی سے سرفراز کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس نے تمھیں ایمان کی نعمت سے بہرہ ور کرنے، محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کی حفاظت کرنے، دین کی عظمت قائم کرنے، اپنی جانیں اسلام پر قربان کرنے اور دشمنوں سے جہاد کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ تم محمد ﷺ کے دشمنوں پر سب سے سخت تھے۔ تمہاری تلواروں نے اسلام کی فتح کے دن کو قریب سے قریب تر کر دیا اور عربوں کو بہ امر مجبوری دین خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اب محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں۔ وہ عمر بھی تم سے راضی رہے۔ تم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ اب تم خلافت اپنے ہاتھ میں لے لو کیونکہ تمہارے سوا خلافت کا مستحق کوئی نہیں۔"

حاضرین نے سعد کی باتوں کو غور سے سنا اور بالاتفاق جواب دیا: "آپ نے جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا۔ ہم آپ کی رائے سے اختلاف نہ کریں گے۔ خلافت کا کام ہم آپ ہی کے سپرد کرتے ہیں کیونکہ آپ ہی اس

کے مستحق، صالح اور عبادت گزار بندے ہیں۔“

انصار کی پہلی کمزوری:

انصار نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی لیکن اس پر قائم نہ رہ سکے۔ قبل اس کے کہ ساری قوم سعد بن عبادہ کی بیعت کرنے کے لیے ٹوٹ پڑتی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ان کی بیعت کی دعوت دیتی، ایک شخص نے اٹھ کر کہا: ”اگر مہاجرین نے ہماری بیعت سے انکار کیا اور کہا کہ ہم مہاجرین ہیں، محمد ﷺ کے اولین صحابہ میں سے ہیں۔ آپ کے اہل خاندان ہیں اس لیے ہمیں خلافت کے مستحق ہیں اور انصار کو ہمارے اس حق کا انکار نہ کرنا چاہیے تو کیا ہوگا؟“

یہ بات سن کر مجمع پر سناٹا چھا گیا اور کسی سے اس سوال کا جواب بن نہ پڑا۔ آخر بہت کچھ غور و فکر کے بعد ایک شخص نے اٹھ کر کہا: ”اس وقت ہم ان سے کہیں گے کہ اگر ایسا ہی ہے تو ایک امیر تم میں سے ہو جائے ایک امیر ہم میں سے۔ ہم اس کے سوا اور کسی بات پر راضی نہ ہوں گے۔“

سعد بن عبادہ خوب جانتے تھے کہ یہ تجویز لایعنی ہے اور اس سے انصار کو کسی قسم کا فائدہ نہ پہنچ سکے گا چنانچہ انہوں نے کہا: ”تم نے تو ابتدا ہی میں کمزوری کا مظاہرہ شروع کر دیا۔“

ان کا اشارہ دراصل بنو اوس کی طرف تھا کیونکہ انہیں کے ایک فرد نے یہ بات کی تھی۔ خزرج ایسی بات نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان کے سردار سعد بن عبادہ تھے اور ان کی عین خواہش تھی کہ خلافت کی عنان انہیں کے ایک فرد کے سپرد کی جائے۔

اوس خزرج کی موروثی عداوت:

اسلام سے پہلے اوس اور خزرج ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ان دونوں قبیلوں میں اس وقت سے دشمنی چلی آتی تھی جب سے ان کے آباؤ اجداد یمن سے منتقل ہو کر یثرب میں آباد ہوئے تھے۔ اس وقت یثرب اور اس کے گرد و نواح پر یہودیوں کا تسلط تھا۔ اوس و خزرج بھی مدت دراز تک یہود کے اثر و اقتدار کے تحت غلامانہ حالت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ بالآخر ان کی عزت و حمیت نے جوش مارا اور انہوں نے یہود کے خلاف بغاوت کر کے یہود کو اس مرتبے سے محروم کر دیا جس پر وہ مدتِ دراز سے فائز تھے۔

یہود کے پنجے سے انہوں نے رہائی حاصل کر لی لیکن خود ان کے درمیان اختلاف کی بنیاد پڑ گئی جس نے بڑھتے بڑھتے شدید دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ جنگ بعاث بھی اسی دشمنی کا شاخسانہ تھی جس میں طرفین کے سیکڑوں آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس جنگ کے بعد یہودیوں نے یثرب میں پھر اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کیا۔ اوس و خزرج یہود کے پہلے سلوک نہ بھولے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے آپس میں صلح کر لی اور طے پایا کہ خزرج کے ایک شخص عبداللہ بن اُبی بن سلول کو اپنا سردار بنا لیا جائے۔

وہ لوگ انہیں کاموں میں مشغول تھے کہ ... ان کی

ملاقات محمد ﷺ سے ہوئی۔ آپ نے انہیں توحید کی تبلیغ کی۔ اس پر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا:
''اللہ کی قسم! یہ وہی نبی ہے جس کی خبر ہمیں یہود دیا کرتے ہیں۔ ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہود اسے قبول کر کے ہم سے بڑھ جائیں۔''

چنانچہ انہوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی اور اسلام لے آئے۔ پھر آپ سے کہا: ''ہم اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ کر آئے ہیں کہ عداوت اور بغض وعناد میں کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ امید ہے کہ اللہ آپ کے ذریعے سے انہیں متحد کر دے گا۔ اگر وہ آپ کے ذریعے متحد ہو گئے تو یثرب کا کوئی شخص عزت اور بزرگی میں آپ سے بڑھ کر نہ ہوگا۔''

یثرب واپس آ کر انہوں نے اپنی قوم سے سارا حال بیان کیا اور یہی واقعہ بیعت عقبۃ الکبریٰ کا باعث، یثرب میں اسلام پھیلانے کا موجب اور محمد ﷺ کی ہجرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

اہل یثرب میں اتحاد:

اسلام نے یثرب کے تمام مومنوں کو اکٹھا کر دیا اور محمد ﷺ کی شخصیت نے تمام مسلمانوں کو اس طرح بھائی بھائی بنا دیا کہ دنیوی تعلقات میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ مسلمانوں کے اس عدیم النظیر اتحاد سے یہود کی قوت کو زبردست ضعف پہنچا۔ پھر بھی اوس وخزرج کے دلوں میں پرانی عداوت کے دھندلے دھندلے کچھ نقوش باقی رہ گئے۔ یہود اور منافقین کے جوش دلانے سے یہ عداوت کبھی ظاہر بھی ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سعد بن عبادہ نے دیکھا کہ انصار کے بعض لوگ اس شخص کی باتوں سے متاثر ہو رہے ہیں جس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک امیر قریش میں سے ہو اور ایک امیر انصار میں سے تو انہوں نے کہا: ''یہ پہلی کمزوری ہے جو ابتدا ہی میں تم سے ظاہر ہوئی ہے۔''

کیونکہ یہ بات کہنے والا قبیلہ اوس کا ایک فرد تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ میں گفتگو:

جب انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے متعلق مشغول بحث تھے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور دوسرے بڑے بڑے صحابہ مسجد نبوی میں محمد ﷺ کی وفات کے سانحہ عظیم کا ذکر کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے اہل بیت محمد ﷺ کی تجہیز وتکفین کے انتظامات میں مصروف تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ کی وفات کا کامل یقین ہو گیا تو انہوں نے بھی خلافت کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ انصار پہلے ہی اس معاملے پر بحث وتمحیص میں مشغول ہیں اور اپنے میں سے کسی شخص کو امیر بنانا چاہتے ہیں۔

ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: ''اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں کیونکہ محمد ﷺ کی زبان مبارک سے آپ کو ''امین الامت'' کا لقب

مل چکا ہے۔"

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا: "عمر! تمہارے اسلام لانے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے تمہارے منہ سے ایسی جہالت کی باتیں سنی ہیں۔ کیا تم میری بیعت کرو گے جب ہم میں وہ شخص موجود ہے جسے بارگاہ خداوندی سے 'ثانی اثنین' اور صاحب رسول کا خطاب اور محمد ﷺ سے صدیق کا لقب مل چکا ہے؟"

یہ دونوں انہیں باتوں میں مشغول تھے کہ انہیں سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع کی خبر ملی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تھے، کہلا بھیجا کہ ذرا باہر تشریف لایئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا "میں مشغول ہوں، اس وقت باہر نہیں آسکتا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ پیغام بھیجا کہ فوری طور پر ایسا واقعہ پیش آگیا ہے جس میں آپ کی موجودگی بے حد ضروری ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سقیفہ بنی ساعدہ میں:

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے اور عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا "محمد ﷺ کی تجہیز و تکفین سے زیادہ اس وقت اور کون سا کام ضروری ہے جس کے لیے تم نے مجھے بلایا ہے؟"

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "آپ کو پتہ بھی ہے انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور ارادہ کر رہے ہیں کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنا دیں؟ ان میں سے ایک شخص نے یہ کہا ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر قریش میں سے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سقیفہ کی جانب چل پڑے۔ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔

یہ تینوں ابھی راستے ہی میں تھے کہ انہیں عاصم بن عدی اور عویم بن ساعدہ ملے۔ یہ دونوں سقیفہ سے آرہے تھے اور انصار نے انہیں یہ کہہ کر اپنی مجلس سے رخصت کر دیا تھا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ جو تم چاہتے ہو وہ نہ ہوگا۔ جب انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھا تو کہنے لگے: "آپ لوگ اپنا کام کریں اور انصار کے پاس مت جائیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "یہ نہیں ہوسکتا ہم ضرور جائیں گے۔"

چنانچہ یہ تینوں حضرت سقیفہ میں پہنچے۔ انصار کی گفتگو اور بحث ابھی جاری تھی۔ انہوں نے نہ تو سعد کی بیعت کی تھی اور نہ کسی متفقہ فیصلے پر پہنچے تھے۔

انصار نے جب ان تینوں کو دیکھا تو بڑے پریشان ہوئے اور بالکل خاموش ہو گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "یہ شخص کون ہے جو درمیان میں کمبل اوڑھے بیٹھا ہے؟" لوگوں نے کہا: یہ سعد بن عبادہ ہیں اور اس وقت بیمار ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں ساتھی بھی انصار کے درمیان بیٹھ گئے۔ اب ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ اجتماع کس حد پر جا کر ختم ہوگا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کی اہمیت:

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی زندگی میں اس اجتماع کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ اگر اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی اصابت رائے، قوت ارادی اور ذہانت و فرزانگی کو کام میں نہ لاتے تو خود اسلام کے مرکز میں وہ فتنہ پھیل جاتا جو بعد میں عرب کے دوسرے شہروں میں بھی پھیلتا اور اس عالم میں پھیلتا کہ اسلام کے بانی کی نعش ابھی گھر ہی میں پڑی ہوتی۔

ذرا غور کیجئے اگر انصار سعد بن عبادہ کی باتوں میں آ کر اصرار کرتے کہ خلافت ان کا حق ہے اور انہیں ملنا چاہیے اور دوسری طرف قریش اپنے سوا کسی کی خلافت پر راضی نہ ہوتے تو اس فتنے کا انجام کیا ہوتا؟ خصوصاً اس حالت میں کہ اسامہ کا لشکر ہتھیاروں سے لیس، دشمن سے جنگ کے لیے کوچ کرنے پر بالکل تیار تھا۔ کیا اس صورت میں وہی ہتھیار ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ ہوتے؟ اگر سقیفہ جانے والے مہاجرین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سوا اور دوسرے لوگ جنھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر کار ہونے کا شرف حاصل ہوتا اور نہ امین الامت ہونے کا اعزاز تو انصار و مہاجرین کے درمیان اختلاف کی خلیج بے حد وسیع ہو جاتی اور اس کا جو ہولناک انجام ہوتا اس کا اندازہ بھی آج کا مورخ نہیں کر سکتا۔

واقعات کا صحیح اندازہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس اہم اجتماع کو اسلام کی تاریخ میں اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی بیعت عقبۃ الکبریٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کو۔ یہ بات بھی ان سے پوشیدہ نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جو کارنامہ انجام دیا اس نے صریحاً ثابت کر دیا کہ وہ دینی لحاظ سے نہایت بلند مرتبہ رکھنے کے علاوہ بحر سیاست کے شناور انتہائی دوررس نتائج و عواقب پر گہری نظر رکھنے والے بھی تھے اور ہر معاملے میں ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ بہتر سے بہتر نتائج برآمد ہوں اور ہر ایسی بات سے پہلو تہی کی جائے جس سے شر و فساد پھوٹنے کا امکان ہو۔

حاضرین سقیفہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خطاب:

موجودہ زمانے میں اسلوب بیان کے بعض پہلوؤں کو ماہرین سیاست نو ایجاد سمجھتے ہیں۔ منجملہ دیگر اسالیب بیان کے ایک اسلوب یہ بھی ہے، مدمقابل سے اس طرح گفتگو کی جائے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس بھی نہ لگے اور اسے قائل بھی کر لیا جائے۔ یہ طرز بالکل نو ایجاد سمجھا جاتا ہے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انصار سے جس طرز پر بات کی اور جس خوش اسلوبی سے معاملے کو سلجھایا آج کل کے ماہرین سیاست کو اس کی ہوا تک نہیں لگی۔

جب یہ تینوں مہاجرین اطمینان سے بیٹھ گئے تو انصار کی پریشانی کچھ کم ہوئی اور انہوں نے مہر سکوت توڑ کر اسی قسم کی باتیں شروع کیں کہ خلافت صرف ان کا حق ہے اور یہ حق انہیں کو ملنا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں "میں نے بعض باتیں سوچ رکھی تھیں جنہیں میں اس مجلس میں بیان کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن جب

میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہونے لگا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''ذرا ٹھہرو مجھے بات کر لینے دو اس کے بعد تم بھی اپنی باتیں بیان کر دینا۔''

اصل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ڈر تھا کہ کہیں عمر تیزی میں نہ آجائیں کیونکہ یہ موقع تیزی اور سختی کا نہ تھا۔ بلکہ نرمی اور بردباری برتنے کا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بزرگی اور ان کی سبقت فی الاسلام کا لحاظ کرتے ہوئے بیٹھ گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے حمد وثنا کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کا ذکر کیا پھر فرمایا:

''عربوں کے لیے اپنے آباؤ اجداد کا دین ترک کر دینا نہایت شاق تھا اور وہ ایسا کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہ تھے۔ اس وقت اللہ نے آپ کی قوم میں سے مہاجرین اولین کو آپ کی تصدیق کرنے، آپ پر ایمان لانے، آپ کی دل جوئی کرنے اور اپنی قوم کے مظالم کو صبر سے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہر شخص ان کا مخالف تھا۔ ان پر ظلم وستم توڑے جاتے تھے، انہیں بدترین ایذائیں دی جاتی تھیں لیکن وہ قلت تعداد اور کثرت اعداء کے باوجود مطلق خوفزدہ نہ ہوئے۔ وہ اس سرزمین میں اولین اشخاص ہیں جنھیں اللہ اور اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور اس طرح اللہ کے حقیقی بندے بننے کی توفیق ملی۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محب اور رشتہ دار ہیں اس لیے خلافت کے وہی مستحق ہیں اور اس بارے میں صرف ظالم ہی ان سے جھگڑا کر سکتے ہیں۔

اور تم اے گروہ انصار! وہ لوگ ہو جن کی فضیلت دینی اور اسلام میں سبقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ نے تمہیں اپنے دین اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مددگار بنایا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت تمہاری طرف کی۔ آپ کی اکثر ازواج اور بیشتر صحابہ تمہیں میں سے تھے۔ مہاجرین اولین کے بعد تمہارا ہی مرتبہ ہے۔ اس لیے ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر۔ نہ تمہارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کیا جائے اور نہ تمہیں شریک کیے بغیر کوئی کام انجام دیا جائے گا۔''

اسی سے ملتا جلتا ایک فقرہ پہلے بھی ایک انصاری کے منہ سے نکل چکا تھا یعنی ''ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر مہاجرین میں سے۔'' مگر یہ بات ناقابل عمل تھی لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تجویز نہ صرف قابل عمل بلکہ اعلیٰ سیاست کا کرشمہ بھی تھی جس سے ان کا مقصد بھی پورا ہو جاتا تھا اور انصا کا تردد بھی دور ہو جاتا تھا۔

اوس نے جو خزرج کے خلاف منافست کے جذبات رکھتے تھے اور اپنے آپ پر خزرج کا غلبہ گوارا نہ کر سکتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس تجویز پر اطمینان کا سانس لیا خزرج کے بھی بہت سے افراد نے اس سے دلی اتفاق کیا کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سعد بن عبادہ کی طرح صرف مہاجرین کو سلطنت کا انتظام سنبھالنے کا حق دار نہ ٹھہرایا تھا بلکہ انصار کو وزراء کی حیثیت میں مہاجرین کا شریک کار بھی بنایا تھا کیونکہ دونوں فریق محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لانے، آپ کی مدد کرنے اور جان نثاری کا ثبوت دینے میں مساوی تھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ انہوں نے امارت اور وزارت کا حق دار علی الترتیب مہاجرین و انصار کو ٹھہرایا، کسی اور قبیلے کو جو عرب میں آباد تھا شریک کار نہ بنایا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ دوسرے قبائل کو دین میں وہ سبقت حاصل نہ تھی جو

مہاجرین وانصار کو حاصل تھی۔ نہ انہوں نے دین کے راستے میں وہ کارہائے نمایاں ہی انجام دیئے تھے جو مہاجرین وانصار نے انجام دیے۔

بعض انصار کی مخالفت

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دلائل کی روشنی میں تمام لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کی تمام باتیں مبنی برحق اور قرین انصاف تھیں۔ لیکن بعض لوگوں نے جنھیں مہاجرین کی امارت سرے سے ناپسند تھی، ان کے دلائل سے کوئی اثر قبول نہ کیا کیونکہ ان لوگوں کو خدشہ تھا کہ مہاجرین ان کا حق غصب کر لیں گے اور سلطنت پر قابض ہو کر من مانی کاروائیاں کریں گے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

''ہم اللہ کے انصار اور اسلام کا لشکر ہیں اور تم اے مہاجرین! ہم سے قلیل التعداد ہو لیکن اب تم ہمارا حق غصب کرنا اور ہمیں سلطنت سے محروم کرنا چاہتے ہو، ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔''

یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ماتھے پر بل نہ پڑے اور وہ بہ دستور اپنے دھیمے پن سے مجمع کو خطاب کرتے رہے۔ انہوں نے فرمایا: ''اے لوگو! ہم مہاجرین اولین اشخاص ہیں جو اسلام لائے۔ حسب ونسب اور عزو شرف کے لحاظ سے بھی ہم تمام عربوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ہمیں محمد ﷺ کے قریبی رشتہ دار ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ہم تم سے پہلے ایمان لائے اور قرآن میں ہمارا ذکر تم سے مقدم ہے۔ اللہ فرماتا ہے: (والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان)۔ ہم مہاجرین ہیں اور تم انصار۔ تم دین میں ہمارے بھائی، غنیمت میں ہمارے شریک اور دشمنوں کے مقابلے میں ہمارے مددگار ہو۔ باقی تم نے اپنی فضیلت کا جو ذکر کیا ہے اس سے ہمیں انکار نہیں۔ تم واقعی اس کے اہل ہو اور روئے زمین پر سب سے زیادہ تعریف کے مستحق۔ لیکن عرب اس بات کو کبھی نہ مانیں گے کہ سلطنت قریش کے سوا کسی اور قبیلے کے ہاتھ میں رہے۔ اس لیے امارت تم ہمارے سپرد کرو اور وزرات خود سنبھال لو۔''

حباب بن منذر انصاری:

لیکن اس پر بھی انصار کے ایک طبقے کا جوش وخروش ٹھنڈا نہ ہو سکا چنانچہ حباب بن منذر بن جموح اُٹھے اور کہنے لگے: ''اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو کیونکہ یہ لوگ تمہارے مطیع ہیں۔ کسی شخص میں یہ جرات نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہل عزت وثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بناء پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر:

حباب نے ابھی تقریر ختم بھی نہ کی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔ وہ اس سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے سے مجبوراً خاموش ہو رہے لیکن اب ان سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے کہا: ''ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضا مند نہ ہوں گے۔ جب محمد ﷺ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ سکے جن میں محمد ﷺ معبوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ محمد ﷺ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہل عشیرہ ہیں۔ اس معاملے میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیرو کار گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے تیار ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حباب میں جھڑپ:

حباب نے انصار کو مخاطب کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر کا جواب یہ دیا: ''اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمر رضی اللہ عنہ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔ اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کر لیں گے اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کر دو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ کیونکہ اللہ کی قسم! تم ہی اس کے سب سے زیادہ حق دار ہو تمہاری تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے اس لیے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تم ہی اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فقرہ سنا تو کہا: ''اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔''

حباب نے جواب دیا: ''ہمیں نہیں اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔''

حباب کی باتیں (اگر درست تسلیم کر لی جائیں تو) ایک خطرناک دھمکی کا رنگ رکھتی تھیں۔ اگر انصار کی اکثریت حباب کے ساتھ ہوتی اور وہ سعد بن عبادہ کی بیعت پر رضا مند ہو جاتے تو مہاجرین بھی انصار کے مقابلے میں اپنی من مانی کرتے اور ایک عظیم اور تباہ کن فتنہ برپا ہو جاتا جو کسی کے روکے نہ رکتا۔

بعض منافقین کی شرارت:

کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض منافقین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حباب کی تلخ کلامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شرارت برپا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ طبری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ خود حباب نے باتیں کرتے کرتے تلوار سونت لی

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ جھٹک کر تلوار ان کے ہاتھ سے گرادی اور اسے اٹھا کر سعد بن عبادہ کی طرف بڑھے۔اس وقت ابوعبیدہ بن جراح جواب تک خاموش بیٹھے فریقین کی باتیں سن رہے تھے،اس معاملے میں دخل دیئے بغیر نہ رہ سکے۔وہ اُٹھے اور اہل مدینہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:"اے انصار! تم ہی تھے جنہوں نے اس دین کی نصرت وحمایت کے لیے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا تھا اب تمہیں سب سے پہلے اس کی تباہی کے درپے ہورہے ہو۔"

بشیر بن سعد کی تقریر:

ابوعبیدہ کے اس فقرہ کا قبیلہ خزرج کے ایک سردار بشیر بن سعد ابوالنعمان بن بشیر پر بے حد اثر ہوا۔ وہ کھڑے ہوئے اور یہ تقریر کی:"اللہ کی قسم! اگر چہ ہمیں مشرکین سے جہاد اور دین میں سبقت اختیار کرنے کے معاملے میں مہاجرین پر فضیلت حاصل ہے لیکن ہم نے یہ سب کچھ محض اپنے رب کی رضا، اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اپنے نفس کی اصلاح کے لیے کیا تھا، اس لیے ہمیں زیبا نہیں کہ ہم ان باتوں کی وجہ سے فخر و مباہات کا اظہار کریں اور اپنی دینی خدمات کے بدلے دنیا کا مال ومنال طلب کریں۔اللہ ہی ہمیں اس کی جزا دے گا اور اس کی جزا ہمارے لیے کافی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں سے تھے۔اور آپ کی قوم ہی اس کی سب سے زیادہ حق دار ہے۔اللہ نہ کرے کہ ہم اس بارے میں ان سے جھگڑا کریں۔اس لیے اے انصار! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، مہاجرین کی مخالفت نہ کرو اور ان سے مت جھگڑو۔"

بشیر بن سعد کی یہ باتیں سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انصار کی طرف نظر دوڑائی تاکہ دیکھیں، انہوں نے کہاں تک ان باتوں کا اثر قبول کیا ہے۔انہوں نے دیکھا کہ اوس آپس میں آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ ادھر بنی خزرج کے چہروں سے بھی مترشح ہوتا تھا کہ ان کے دلوں پر بشیر کی باتوں کا بہت اثر ہوا ہے۔یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یقین ہوگیا کہ معاملہ سدھر گیا ہے اور یہی لمحات فیصلہ کن ہیں، انہیں ضائع نہ کرنا چاہیے۔وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ ذ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔انصار کو اتحاد کی تلقین کی اور تفرقے سے خبردار کیا۔پھر فرمایا:"یہ عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں ان میں سے جس کی بیعت چاہو کرلو۔"

عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بیعت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ:

اس وقت شوروشغب بہت بڑھ گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دینی فضیلت سے کسی شخص کو انکار نہیں تھا۔وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد علیہ اور ام المومنین حضرت حفصہ کے والد تھے۔لیکن ان کی سختی اور تیز مزاجی سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔اسی لیے ہر شخص ان کی بیعت سے پس وپیش کررہا تھا۔جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعلق تھا ان میں عمر رضی اللہ عنہ کی سی سختی نہ تھی لیکن انہیں دینی لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سا مقام ومرتبہ حاصل نہ تھا۔اگر چندے اور یہی حالت رہتی تو اختلاف انتہائی شدت اختیار کرلیتا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بڑھنے نہ دیا اور بلند آواز سے

کہا: ”حضرت ابوبکر! اپنا ہاتھ بڑھایئے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً آپ کی بیعت کر لی اور کہا: ”حضرت ابوبکر! کیا آپ کو محمد ﷺ نے حکم نہ دیا تھا کہ آپ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں اس لیے آپ ہی خلیفۃ اللہ ہیں۔ ہم آپ کی بیعت اس لیے کرتے ہیں کہ آپ ہم سے زیادہ محمد ﷺ کے محبوب تھے۔“

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ کہتے ہوئے آپ کی بیعت کر لی: ”آپ مہاجرین میں سب سے برتر ہیں۔ آپ غار میں محمد ﷺ کے ساتھی تھے۔ محمد ﷺ کی غیر حاضری میں آپ ہی نماز پڑھایا کرتے تھے اس لیے آپ سے زیادہ کون شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اسے خلافت کی اہم ذمہ داریاں سپرد کی جائیں۔“

بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ اور دوسرے انصار کی بیعت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بیعت کر لینے کے بعد بشیر بن سعد بھی جلدی سے آگے بڑھے اور بیعت کر لی۔

بشیر بن سعد کو بیعت کرتے دیکھ کر حباب بن منذر سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ کہنے لگے: اے بشیر بن سعد! تم نے اپنی قوم کی ناک کاٹ ڈالی۔ تمہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تم امارت کے معاملے میں اپنے چچیرے بھائی (سعد بن عبادہ) کی مخالفت کرو گے؟

بشیر نے جواب دیا: ”میں نے اپنی قوم کو ذلیل نہیں کیا۔ لیکن مجھے یہ بات ناپسند تھی کہ میں مہاجرین سے اس حق کے بارے میں جھگڑا کرتا جو اور کسی نے نہیں بلکہ خود اللہ نے انہیں دیا تھا۔“

اُسید بن حضیر، رئیس اوس، نے جو بشیر بن سعد کی کاروائی کو بہ نظر غائر دیکھ رہے تھے اپنے قبیلے کی طرف رخ کیا اور کہنے لگے: ”اللہ کی قسم! اگر خزرج ایک بار بھی خلافت پر قابض ہو گئے تو اس کے سبب انہیں تم پر ہمیشہ کے لیے فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ تم انہیں کبھی اس میں حصہ دار نہ بننے دو اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لو۔“

چنانچہ اوس نے آپ کی بیعت کر لی۔ ادھر خزرج اپنے سردار بشیر بن سعد کی باتوں سے مطمئن ہو چکے تھے۔ وہ بھی آگے بڑھ کر بیعت کرنے لگے۔

سعد بن عبادہ کا انکارِ بیعت:

لوگوں کو بیعت کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ ایک کے اوپر ایک گرا پڑتا تھا بیعت کرنے کی عجلت میں انہیں سعد بن عبادہ کا خیال بھی نہ رہا اور وہ انہیں روند کر آگے بڑھنے لگے۔ یہ دیکھ کر بعض لوگوں نے کہا: ”ارے دیکھو! کہیں سعد تمہارے پاؤں کے نیچے نہ روندے جائیں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”وہ ہے ہی روندے جانے کے قابل۔ اللہ اسے ذلت نصیب کرے۔“ ساتھ ہی سعد سے کچھ سخت کلامی کی اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”عمر! کیا کرتے ہو؟ نرمی سے کام لو۔ یہ موقع

سختی کا نہیں۔"

سعد بن عبادہ کو اُن کے ساتھی اٹھا کر ان کے گھر لے گئے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام خاموشی اور تنہائی سے گزار دیئے۔ ان سے کہا گیا: "آپ بھی بیعت کر لیجئے کیونکہ تمام مسلمانوں نے اور خود آپ کی قوم نے بیعت کر لی ہے۔"

لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا: "اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہوسکتا جب تک میرے ترکش کا آخری تیر تم پر وار کرنے میں ختم نہ ہو جائے۔ میرے نیزے کا پھل تمہارے خون سے سرخ نہ ہو جائے۔ میرے تلوار کے جوہر نمایاں نہ ہو جائیں اور میں اپنے خاندان اور پیروکاروں کے ساتھ تم سے جنگ نہ کرلوں۔"

جب ان کی یہ باتیں حضرت ابوبکرؓ تک پہنچیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اب سعد کو اس وقت تک نہ چھوڑنا چاہیے جب تک ان سے بیعت نہ لے لی جائے۔"

لیکن بشیر بن سعد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی اور کہا: "ان کا انکار حد کو پہنچ چکا ہے۔ وہ لڑ کر مر جائیں گے مگر بیعت نہ کریں گے اور وہ اس وقت تک قتل نہیں ہو سکتے جب تک ان کے بیٹے، اہل خاندان اور مددگاران پر نثار نہ ہو جائیں اس لیے تم انہیں چھوڑ دو۔ ایسا کرنے سے تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا کیونکہ اب ان کی حیثیت فردِ واحد کی ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بشیر کی رائے سے اتفاق کیا اور سعد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ سعد نہ ان کے ساتھ نماز پڑھتے اور نہ اُن کے ساتھ شامل ہو کر حج کے ارکان بجالاتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات تک ان کی یہی حالت رہی۔

سقیفہ کی بیعت میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور بعض کبار صحابہ شریک نہ ہوسکے کیونکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ مسجد نبوی میں مہاجرین بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

چونکہ انہیں واقعہ سقیفہ کی خبر نہ تھی اس لیے وہ بھی اس بیعت میں شریک نہ تھے۔ بیعت سقیفہ کے متعلق بعض راوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ یہ بیعت بغیر کسی ارادے کے محض اتفاقاً ہوگئی۔ بعض راوی یہ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ ؓ پہلے ہی سے یہ اتفاق کر کے سقیفہ گئے تھے کہ منصب خلافت پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سرفراز کیا جائے گا۔ بہر حال ان دونوں روایتوں میں سے خواہ کوئی سی بھی صحیح ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ سقیفہ بنو ساعدہ میں جو کچھ ہوا اس نے اسلام کو ایک ایسے ہولناک فتنے سے بچالیا جس کا انجام اللہ جانے کیا المناک صورت اختیار کرتا۔

بیعت پر انصار کا قیام:

اس دن کے بعد پھر کبھی انصار کی طرف سے خلافت کی خواہش نہ کی گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد تخت خلافت پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ متمکن ہوئے لیکن

انصار نے خلافت کا دعویٰ نہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ کے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف برپا ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس اختلاف کے موقع پر انصار کی طرف سے خلافت کے حصول کی کوئی کوشش نہ کی گئی حالانکہ اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تو بہ خوبی اٹھا سکتے تھے۔ لیکن وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس قول پر صدق دل سے ایمان لا چکے تھے: ''عرب سوا قریش کے اور کسی کی خلافت پر راضی نہ ہوں گے۔''

بعد میں وہ ہمیشہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حسب ذیل وصیت کے مطابق مہاجرین کے زیر سایہ اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے: ''اے مہاجرین! انصار سے اچھا سلوک کرنا کیونکہ عرب کے اور قبیلوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا لیکن انصار کی تعداد میں اضافہ نہ ہوگا۔ میں نے انہی میں پناہ لی تھی اس لیے تم بھی ان پر احسان اور ان کی برائیوں سے درگزر کرنا۔''

مسجد نبوی میں بیعتِ عامہ:

سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت ختم ہونے پر مسلمان مسجد نبوی میں واپس آ گئے۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اگلے روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور پچھلے روز کے واقعے پر اظہار افسوس کیا کہ جب انہوں نے تلوار ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ جو شخص کہے گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''میں نے تم سے کل ایسی بات کہی تھی جو نہ کتاب اللہ میں پائی جاتی ہے اور نہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی سنی تھی۔ لیکن میں اپنی محبت کے جوش میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہمارے تمام کاموں کی نگرانی بہ نفس نفیس فرماتے رہیں گے لیکن اللہ نے تمہارے لیے وہ کتاب باقی رکھی ہے جس سے خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت حاصل کی۔ پس اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو اسی طرح ہدایت پاؤ گے جس طرح آپ نے پائی۔ تمہارا خلیفہ اللہ نے اس شخص کو بنایا ہے جو تم میں سب سے بہتر ہے۔ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب ہے اور یہی ہے وہ جسے غار میں آپ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا اس لیے اٹھو اور اس کی بیعت کرو۔''

چنانچہ اس وقت عام بیعت ہوئی جب کہ سقیفہ کی بیعت میں صرف خاص خاص لوگ شریک تھے۔

خلافت کا پہلا خطبہ:

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا جو خلافت کا پہلا خطبہ تھا۔ آپ نے اللہ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا: ''اے لوگو! میں تمہارا حاکم بنایا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں۔ اگر میں نیک کام کروں تو اس میں میری مدد کرو اور اگر برا کام کروں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تمہارا قوی آدمی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک اس کے ذمے جو حق ہے وہ اس سے نہ لے لوں۔ جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد ترک کر دیتی

ہے اُس پر اللہ ذلت وخواری مسلط کر دیتا ہے اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر بلائیں اور عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے محمد ﷺ کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اب نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔"

ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت بالاجماع:

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت مسلمانوں کے اجماع سے ہوئی تھی جس میں سوا سعد بن عبادہ کے (جنھوں نے سقیفہ کی خاص بیعت میں ان کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔) باقی تمام صحابہ کبار شریک تھے یا بعض صحابہ بیعت سے الگ بھی رہے تھے؟

بیعت سے مہاجرین کبار کی علیحدگی:

کچھ روایات میں مذکور ہے کہ بعض مہاجرین کبار بیعت سے علیحدہ رہے تھے جن میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ شیعہ مورخ یعقوبی لکھتا ہے:

"مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، فضل بن عباس رضی اللہ عنہ، زبیر بن عوام العاص رضی اللہ عنہ، خالد بن سعید رضی اللہ عنہ، مقدار بن عمرو رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، برامد بن عازب، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب سے ملئے اور خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔

اس مشورے کے مطابق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ عباس سے ملے۔ دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "آپ محمد ﷺ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی ہو جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔"

لیکن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ پیش کش رد کر دی اور کہا کہ "اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔"

مخالفین کا اجتماع:

ایک اور روایت میں جسے یعقوبی اور دیگر مورخین نے بھی ذکر کیا ہے۔ مذکور ہے کہ مہاجرین اور

انصار کی ایک جماعت حضرت علی ؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمہ الزہرا بنت محمد ﷺ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعید بھی تھے۔ خالد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: "اللہ کی قسم! محمد ﷺ کی جانشینی کے لیے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں اس لیے آپ ہماری بیعت قبول کر لیجیے۔"

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باہر آئیں اور کہا: "یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم! میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی (کیا حضرت فاطمہ بنت محمد ﷺ جیسی باحیاء باعصمت خاتون اپنے منہ سے (نعوذ باللہ) اس قسم کے رکیک الفاظ نکال سکتی تھیں؟ ان الفاظ ہی سے روایت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مترجم) اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی۔"

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی۔ سوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جنہوں نے چھ مہینے تک بیعت نہ کی مگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد انہوں نے بھی بیعت کر لی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی۔

ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنو ہاشم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔

انکار بیعت کی مشہور روایت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیر بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "زبیر کو پکڑ لو۔"

لوگوں نے زبیر کو پکڑ کر ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیر نے جا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی بیعت کا مطالبہ کیا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حق دار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہیے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم محمد ﷺ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز

ہی خلافت کے حق دار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہیے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ محمد ﷺ ہم میں سے تھے اس لیے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کرو؟ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ محمد ﷺ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لیے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرا برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو، تمہیں اختیار ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر جواب دیا: "میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی وقت تیزی میں آگئے اور کہنے لگے: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ! تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ آج تم اس لیے خلافت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئے گی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آجائے انہوں نے کہا: "حضرت علی رضی اللہ عنہ! اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس پر حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا: "بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جہاندیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص محمد ﷺ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجا لا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہ، اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لیے تم ان کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل، دینی رتبے، فہم و ذکاء، سابقیت اسلام، حسب و نسب اور محمد ﷺ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمہیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔"

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے:

"اللہ اللہ اے گروہ مہاجرین! تم رسول اللہ ﷺ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہل بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین اللہ کی قسم! ہمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں۔ کیونکہ ہم اہل بیت ہیں ہم اس وقت تک اس کے حق دار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری، دین کا فقیہ محمد ﷺ کی سنت کا عالم، رعایا کی ضرورت سے واقف، ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے، اس لیے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔"

راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعد بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں، تو کہا: ''اے علی رضی اللہ عنہ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ہیں، انصار کا گروہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔''

اس گفتگو کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ طیش سے بھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس چلے گئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر گھر جاتیں (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان سے یہ بات قطعاً بعید ہے کہ وہ گھر گھر جا کر اپنے خاوند کی بیعت کے لیے لوگوں کو تیار کرتیں۔ مترجم) اور ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں۔ لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا: ''اے بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔''

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ غصے میں آ کر جواب دیتے: ''کیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر لوگوں سے آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟''

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی کہتیں: ''ابوالحسن (علی) نے وہی کیا جو ان کے لیے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔''

انتخابِ متفقہ کے متعلق روایات:

یہ تو ہیں روائتیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ان کے برعکس بعض ایسی روائتیں بھی موجود ہیں جن میں اس امر سے صاف صراحتاً انکار کیا گیا ہے کہ بنو ہاشم اور بعض مہاجرین بیعت سے علیحدہ رہے۔ ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خاص بیعت کے بعد عام بیعت کا وقت آیا تو مہاجرین اور انصار بالاجتماع آپ کی بیعت میں شریک تھے۔ چنانچہ طبری میں مذکور ہے کہ کسی شخص نے سعید بن زید سے پوچھا: ''کیا آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مدینہ میں موجود تھے؟''

انہوں نے جواب دیا: ''ہاں۔''

اس شخص نے پوچھا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کب کی گئی؟''

انہوں نے جواب دیا: ''اسی روز جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ صحابہ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ وہ ایک بھی روز بغیر خلیفہ کے زندگی گزار سکیں۔''

اس پر اس شخص نے پوچھا: ''کیا کسی شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت بھی کی؟''

انہوں نے جواب دیا: ''نہیں، سوا مرتدین کے، یا ان لوگوں کے جو حالت ارتداد کے قریب پہنچ چکے تھے۔''

پوچھا گیا: ''کیا مہاجرین میں سے بھی کسی نے بیعت کرنے سے انکار کیا؟''

جواب دیا: ''نہیں! مہاجرین نے تو اس بات کا انتظار بھی نہ کیا کہ کوئی شخص انہیں آ کر بیعت کے

لیے بلائے بلکہ انہوں نے خود ہی آ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔"

ایک روایت یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں یہ خبر ملی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیعت لینے کے لیے مسجد نبوی میں تشریف فرما ہیں تو ان کے بدن پر ایک قمیص کے سوا کوئی کپڑا نہ تھا لیکن وہ اسی حالت میں گھر سے باہر نکل آئے اور جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے مسجد میں پہنچ گئے مبادا بیعت کرنے میں دیر ہو جائے۔ جب بیعت کر لی تو اس کے بعد گھر سے اور کپڑے منگوا کر پہنے۔

بیعتِ علی رضی اللہ عنہ کے متعلق درمیانی رائے:

بعض روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بارے میں درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے۔ ان روایات کا ملخص یہ ہے کہ بیعت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ نے حاضرین پر نظر دوڑائی تو زبیر کو نہ پایا۔ آپ نے انہیں بلا بھیجا اور کہا: "اے رسول اللہ ﷺ کے برادر عم زاد اور حواری! کیا آپ مسلمانوں کی لاٹھی کو توڑنا چاہتے ہیں؟ (کیا بیعت نہ کر کے مسلمانوں کی قوت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں)۔

انہوں نے کہا: "یا خلیفہ رسول اللہ! مجھے سرزنش نہ کیجئے۔ میں بیعت کرتا ہوں۔"

چنانچہ انہوں نے کھڑے ہو کر بیعت کر لی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پھر ایک نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود نہیں۔ آپ نے انہیں بھی بلایا اور کہا: "اے رسول ﷺ کے برادر عم زاد اور آپ کے محبوب داماد! کیا آپ مسلمانوں کی لاٹھی کو توڑنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "یا خلیفہ رسول اللہ ﷺ! میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔"

اور یہ کہہ کر بیعت کر لی۔

بنو امیہ کی فتنہ کوشی:

بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بنو امیہ نے بنی ہاشم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف پیدا کر کے مسلمانوں میں فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ مذکور ہے کہ جب لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے مسجد میں جمع ہوئے تو ابوسفیان بنی ہاشم کے پاس آئے اور کہنے لگے: "میں ایک غبار دیکھتا ہوں جو خون بہانے ہی سے چھٹ سکتا ہے۔ اے آل عبد مناف! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمہارے امور کے نگران کب سے ہو گئے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو کمزور رہنا پسند کرتے ہیں؟ کہاں ہیں علی رضی اللہ عنہ اور عباس رضی اللہ عنہ جنہیں ذلت و خواری ہی محبوب ہے؟" اس کے بعد یہ شعر پڑھے:

ولا يقيم على ضيم يراد به الا الا ذلان عير الحي والوتد

هذا على الخسف محبوس برمته وذا يشج فلا يبكى له احد

(دو ذلیل چیزوں کے سوا کوئی بھی ظلم پر صبر نہیں کر سکتا۔ ایک تو قبیلے کا گدھا، دوسری میخ۔ گدھا

بوسیدہ رسی سے بندھا ہوا بھی ہر قسم کی ذلت سہتا رہتا ہے اور میخ گاڑتے وقت زخمی کیا جاتا ہے لیکن کوئی اس پر آنسو نہیں بہاتا۔)

میراث کا مطلب:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بیعت نہ کرنے کے متعلق روایات غالباً عباسی عہد میں بعض سیاسی اغراض کی خاطر وضع کی گئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیعہ حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کے ثبوت میں ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ اس واقعے کے درست ہونے میں تو کوئی شک نہیں لیکن اس کا بیعت کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ عم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے اور آپ کی اس میراث کا مطالبہ کیا جو ارض فدک اور خیبر کی جائیدادوں میں آپ کے حصے پر مشتمل تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے: نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ (ہم انبیاء کا گروہ ہیں ہم کوئی میراث نہیں چھوڑتے، اپنے پیچھے ہم جو کچھ چھوڑیں گے وہ صدقہ ہوگا)۔ اس جائیداد کی آمدنی سے جس کا ذکر تم نے کیا ہے، آپ کے اہل وعیال کا گزارہ چلتا تھا اس لیے میں بھی اسے وہیں خرچ کروں گا جہاں آپ خرچ کیا کرتے تھے۔''

اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ناراض ہوگئیں اور آخر وقت تک انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کلام نہ کیا۔ (میراث کے مطالبے پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے آگاہ کر دیا تھا تو ان کے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو یہ کہ وہ اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیتیں یا آپ کے ارشاد پر سر تسلیم خم کر دیتیں۔ کسی روایت میں یہ مذکور نہیں کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث کی صحت سے انکار کیا ہو۔ جب یہ بات نہیں تو فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی پرہیزگار خاتون کس طرح آپ کے ارشاد سے منہ موڑ کر محض زمین کے چند قطعات کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو سکتی تھیں؟ ۔مترجم) وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں رات ہی کو دفن کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ مہینے بعد ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ناراضی کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان سے کشیدہ خاطر تھے۔ لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد انہوں نے مصالحت کر لی۔ یہ ہے وہ اصل روایت جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ناراضی اور ان سے بول چال ترک کر دینے کا بیان ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ٹکڑا بھی ملا دیا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی۔ وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تعزیت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: ''اب ہمیں آپ کی بیعت

کرنے میں کوئی روک نہیں لیکن ہمارے خیال میں خلافت ہمارا ہی حق ہے، آپ نے اس پر قابض ہو کر ہمارا حق چھینا ہے اور اس طرح ہم پر ظلم کیا ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں کہا: "اس مال و جائیداد کے سلسلے میں جو میرے اور تمہارے درمیان وجہ نزاع بنی رہی، میں نے جو کاروائی کی وہ محض تمہاری بھلائی کے لیے تھی۔"

مذکورہ صدر اصحاب یہ کہتے ہیں کہ روایت کا آخری حصہ درایتاً ناقابل قبول ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مطالبہ اسی وقت کر سکتے تھے جب مسلمان بالاتفاق بیعت کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیتے۔ خلافت سے پہلے اس قسم کا مطالبہ کرنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ اگر حضرت علی ذ اور بنو ہاشم نے ان سے بیعت کی ہی نہ تھی اور انہیں خلیفہ تسلیم ہی نہ کیا تھا تو ان سے میراث کا مطالبہ کرنا بے معنی تھا۔

جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بلا توقف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی، ان میں سے اکثر کا خیال ہے کہ ان کی بیعت نہ کرنے سے متعلق روایات عباسیوں کے عہد میں بعض مخصوص سیاسی اغراض کے پیش نظر گھڑی گئیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ روایات عباسیوں سے بھی پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جنگوں کے دوران میں بنی ہاشم اور بنی امیہ کی چشمک کے باعث وضع کی گئیں۔

مؤخر الذکر گروہ کا بیان ہے کہ عراق اور فارس کی فتح کے بعد وہاں ایرانی النسل لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے اپنے فائدے کی خاطر اس قسم کی روایات وضع کرنی شروع کیں۔ سلطنتِ اسلامیہ امویوں کے قبضہ کی وجہ سے یہ لوگ کھلم کھلا ان روایات کی تشہیر تو نہ کر سکتے تھے لیکن خفیہ طور پر ان کی اشاعت وسیع پیمانے پر کرتے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کب موقع ملے اور وہ کھلم کھلا اپنے عقائد کا اظہار کر سکیں۔ ابومسلم خراسانی کے خروج نے ان کی یہ دیرینہ تمنا پوری کر دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جس طرح ان روایات کا سہارا لے کر بنو عباس نے سلطنت حاصل کی وہ تاریخ کا ایک خونیں باب ہے۔

جن لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنو ہاشم نے چالیس دن یا چھ مہینے کے بعد بیعت کی وہ اپنی دلیل میں گذشتہ روایات کے علاوہ یہ امر پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے مددگار لشکر اسامہ میں شامل نہ ہوئے حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور مردانگی ضرب المثل تھی جس کا اظہار وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کر چکے تھے۔

علاوہ بریں مہاجرین نے سقیفہ بنی ساعدہ میں بہ مقابلہ انصار اپنی خلافت کی دلیل یہ پیش کی تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی تعلق کے علاوہ ان کا جسمانی تعلق بھی ہے اور عرب سوائے قریش کے اور کسی کی اطاعت قبول نہ کریں گے کیونکہ وہ کعبہ کے نگہبان ہیں اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام لوگوں کی نگاہیں ہر امر میں قریش ہی کی طرف اٹھتی ہیں۔ یہ دلیل بہ ذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ بنو ہاشم دوسرے لوگوں کی نسبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے زیادہ حق دار تھے۔ اس لیے لازم تھا کہ وہ اپنا حق مقدم سمجھتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت

کرنے سے رکے رہتے اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا بھی۔ اگر بعد پر رضامند ہو گئے تھے تو محض اس لیے کہ کہیں ایسا فتنہ پیدا نہ ہو جائے جو مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ کر دے، خصوصاً اس صورت میں کہ عرب کے طول و عرض میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا تھا اور مدینہ کی حکومت کے خلاف عربوں کی بغاوت سے دین اسلام کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی پر امن خلافت:

خواہ مورخین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنی ہاشم کی بیعت خلافت کے متعلق کتنا ہی اختلاف ہو لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اول روز ہی سے خلافت کا کاروبار بغیر کسی شور و شر اور فتنہ و فساد کے سنبھال لیا۔ اس سلسلے میں ایک بھی روایت موجود نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ بنی ہاشم کے کسی فرد یا کسی اور شخص نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلاف مسلح بغاوت یا اعلان جنگ کرنے کا ارادہ کیا ہو، چاہے اس کا باعث لوگوں کے دلوں میں اس بلند ترین مرتبے کا احساس ہو جو محمد ﷺ کی بارگاہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا یہاں تک کہ آپ نے فرمایا تھا ''اگر میں بندوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بناتا'' یا وہ شرف قربت ہو جو ہجرت کے موقع پر انہیں حاصل ہوا یا ان کے وہ فضائل و محاسن ہوں جن کے باعث لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت کا احساس پیدا ہو گیا تھا، یا وہ مدد ہو جو وہ ہر موقع پر محمد ﷺ سے روا رکھتے تھے۔ یا یہ واقعہ ہو کہ آپ نے اپنی آخری علالت میں انہیں نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ بہر حال ان کی بیعت کا سبب خواہ کوئی بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ ان کے مقابلے میں کوئی شخص اٹھا اور نہ کوئی شخص جس نے ایک مرتبہ ان کی بیعت کر لی تھی، بیعت سے کنارہ کشی کرنے والوں کے پاس گیا۔

یہ امر اس بات کی محکم دلیل ہے کہ اولین مسلمانوں کے دلوں میں خلافت کا جو تصور تھا وہ اس تصور سے بالکل مختلف تھا جو بعد میں بنی امیہ کے زمانے میں پیدا ہو گیا تھا۔ اولین مسلمانوں کے دلوں میں خلافت کا تصور اسی عربی تمدن کے عین مطابق تھا جو محمد ﷺ کی بیعت کے وقت عرب میں رائج تھا۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے وسعت اختیار کی اور عربوں کا اختلاط کثرت سے مفتوحہ قوموں کے ساتھ ہونے لگا تو اس اختلاط اور مملکت اسلامیہ کی وسعت کے نتیجے میں خلافت کے متعلق مسلمانوں کے تصور میں بھی فرق آ گیا۔

مسلمانوں کا تصورِ خلافت:

ابتداء میں مسلمانوں کا تصور خلافت خالص عربی نقطہ نگاہ سے تھا۔ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ محمد ﷺ نے کسی شخص کے لیے خلافت کی وصیت نہ فرمائی۔ اس امر کے پیش نظر جب ہم محمد ﷺ کی وفات کے وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان تنازع اور عام بیعت کے بعد بنی ہاشم اور دوسرے تمام مہاجرین کے درمیان خلافت کے سلسلے میں پیدا شدہ چشمک پر غور کرتے ہیں تو بلاشبہ صریحاً عیاں ہو جاتا ہے کہ خلیفہ اول کا انتخاب کرنے کے موقع پر اہل مدینہ نے اجتہاد سے کام لیا۔ کتاب و سنت میں خلافت کے

لیے کوئی سند نہ تھی۔ اس لیے مدینہ کے مسلمانوں نے جس شخص کو خلافت کی گراں بار ذمہ داری اٹھانے کا اہل سمجھا اسے خلافت سپرد کر دی۔ اگر انتخاب خلیفہ کا معاملہ مدینہ سے باہر دوسرے قبائل عرب تک بھی محیط ہو جاتا تو حالات بالکل مختلف ہوتے اور اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اتفاقیہ اور ناگہانی نہ ہوتی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے موقع پر جو طریقہ استعمال کیا گیا وہ بعد کے دو خلیفوں (حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے انتخاب کے وقت استعمال نہ کیا جا سکا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی وصیت فرما دی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے انتخاب کے لیے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اس کے نتیجے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلافات رونما ہو کر بالآخر خلافت امویوں کے ہاتھ میں آئی تو انتخاب کا طریقہ بالکل بدل گیا اور خلافت باپ کے بعد بیٹے اور بیٹے کے بعد پوتے کی طرف منتقل ہونے لگی۔

ان واقعات اور حوادث کو دیکھتے ہوئے اس قول کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ اسلام نے سلطنت کا نظام سنبھالنے کے لیے باقاعدہ اصول مقرر کیے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر ایک اجتہادی معاملہ ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلتا چلا گیا ہے اور مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوتا چلا آیا ہے۔

اسلام کا نظام حکومت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں جو نظام جاری کیا وہ خالص عربی نظام تھا۔ محمد ﷺ کے زمانے سے اتصال اور خود ان کے آپ سے گہرے تعلق کے باعث ان کے زمانے میں جو نظام رائج ہوا وہ تقریباً وہی تھا جو محمد ﷺ کے زمانے کا تھا۔ لیکن جب حالات متغیر ہوئے اور اسلامی فتوحات میں وسعت پیدا ہوئی تو یہ نظام بھی آہستہ آہستہ مٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ عہد عباسیہ کے زمانہ عروج اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے نظام ہائے حکومت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے بعد میں آنے والے تین خلفاء کے جاری کردی نظاموں میں بھی فرق تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ ان کا زمانہ محمد ﷺ کی دینی سیاست اور حکومت کی دنیوی سیاست کا سنگم تھا۔ یہ درست ہے کہ دین مکمل ہو چکا تھا اور کسی شخص کو اس میں تغیر و تبدل اور اس کی تنسیخ کرنے کا حق حاصل نہ تھا لیکن محمد ﷺ کی وفات کے معاً بعد عرب میں ارتداد کی وباء پھیل گئی اور بہت سے قبائل اسلام سے روگرداں ہو گئے۔ اس صورت حال کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اس عظیم الشان خطرے کو دور کرنے کے لیے ایک مضبوط پالیسی مرتب کریں۔ محمد ﷺ نے اپنی زندگی میں ہمسایہ مملکتوں کے سربراہوں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کا ایک اہم فریضہ بھی شروع کیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اسے بھی پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ انہوں نے یہ کام کس طرح انجام دیا؟ اور یہ اہم ذمہ داری کس طرح ادا کی؟ اس کا تفصیلی ذکر ہم آئندہ ابواب میں کریں گے۔

۳

عرب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت

ادھر مدینہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی جا رہی تھی اُدھر قبائل عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات آگ کی سی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب میں کوئی خبر اتنی تیزی سے نہیں پھیلی جتنی وفات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع۔ جونہی اس حادثے کی شہرت ہوئی عربوں نے فوراً حکومت مدینہ کا جوا کندھوں سے اتارنے اور بعثت نبوی سے قبل کی بدویانہ وغیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آناً فاناً عرب کے قبائل میں ارتداد کی لہر دوڑ گئی، نفاق کا ستارہ اوج پر پہنچ گیا یہودیوں اور نصرانیوں کی بن آئی اور چاروں طرف مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے مسلمانوں کی حالت اس بکری کی سی ہوگئی جو جاڑے کی سرد اور بارش والی رات کو صحرائے لق و دق میں بغیر چرواہے کے رہ جائے اور اسے سر چھپانے کی کہیں جگہ نہ مل سکے۔

قبل ازیں مہاجرین اور انصار کے درمیان قضیۂ خلافت کے بارے میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے اگر اس موقع پر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی آڑے نہ آجاتی تو یہ قضیہ کسی صورت میں دبائے نہ دبتا اور مسلمانوں کو کبھی اتفاق و اتحاد نصیب نہ ہوتا۔

اہل مکہ ارتداد کے دروازے پر:

اگر مدینہ اور مکہ کے حالات کا موازنہ کیا جائے تو مدینہ کے واقعات مکہ کے حالات کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ مدینہ میں تو صرف خلافت پر جھگڑا تھا لیکن اہل مکہ نے تو ارتداد کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور عامل مکہ عتاب بن اسید لوگوں کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ اہل مکہ فتنے کی آگ سے بچے رہیں اس لیے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص صحابی سہیل بن عمرو کی سعی کے بل پر ارتداد سے محفوظ رہے۔ ہوا یہ کہ جب انہوں نے اہل مکہ کے تذبذب کی حالت دیکھی تو تمام لوگوں کو جمع کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کر کے کہا: ''آپ کی وفات سے اسلام کی قوت میں کمی نہیں آئی۔ اس بارے میں جو شخص شک و شبہ میں گرفتار ہوگا، تذبذب کی راہ اختیار کرے گا اور ارتداد کے متعلق سوچے گا ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔''

ممکن تھا کہ دھمکی کا اثر الٹا ہوتا اس لیے سہیل ؓ نے دھمکی کے ساتھ ساتھ ترغیب تحریص سے بھی انہیں اسلام پر قائم رہنے کی تلقین ان الفاظ میں کی: ''یقیناً اسلام بہ دستور قائم رہے گا، اسے کوئی ضعف نہ پہنچے گا اور محمد ﷺ کے حسبِ ارشاد خلافت بھی تمہارے حصے میں آئے گی۔'' (سہیل کا اشارہ محمد ﷺ کے اس قول کی طرف تھا الائمۃ من قریش یعنی خلفاء قریش میں سے ہوں گے)۔

سہیل رضی اللہ عنہ کے اس پر زور دعوے نے اہل مکہ کے دلوں پر دھمکی سے زیادہ اثر کیا، وہ ارتداد اختیار کرنے سے رک گئے اور فوراً بعد انہوں نے یہ بھی سن لیا کہ خلافت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی ہے جو قریش کے ایک معزز فرد ہیں۔ اس پر وہ مطمئن ہو گئے اور بہ دستور اسلام پر قائم رہے۔

فتنہ ارتداد اور قبیلہ ثقیف:

طائف کے قبیلے ثقیف نے بھی ارتداد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جب وہاں کے عامل عثمان بن ابو العاص کو معلوم ہوا تو انہوں نے قبیلے والوں کو اکٹھا کر کے کہا: ''اے ابنائے ثقیف! تم لوگ سب سے پیچھے اسلام لائے تھے۔ اب سب سے پہلے ارتداد اختیار کرنے والے مت بنو۔''

ثقیف کو وہ سلوک یاد تھا جو حنین کی جنگ کے بعد محمد ﷺ نے ان سے کیا تھا۔ پھر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے اور اہل مکہ کے درمیان قرابت ہے اس لیے وہ عثمان بن ابو العاص کے سمجھانے بجھانے پر اپنے ارادے سے باز آ گئے اور بہ دستور اسلام پر قائم رہے۔ غالباً حضرت ابو بکر ؓ کی خلافت نے ثقیف پر بھی وہی اثر کیا جو اہل مکہ پر کیا تھا۔

دیگر قبائل کا طرز عمل:

جس طرح مکہ، مدینہ اور طائف کے درمیان بسنے والے قبائل اسلام پر قائم رہے اسی طرح مزینہ، غفار، جہینہ، بلی، اشجع، اسلم اور خزاعہ نے بھی اسلام کو ترک نہ کیا لیکن ان قبائل کے سوا سارے عرب میں اضطراب برپا ہو گیا۔ جن لوگوں کو اسلام قبول کیے زیادہ دن نہ گزرے تھے یا جن لوگوں کے دلوں نے اسلامی تعلیمات کا اثر قبول نہ کیا تھا انہوں نے کھلم کھلا ارتداد اختیار کر لیا۔ باقیوں کے بھی عقائد میں فرق آ گیا۔ ایک گروہ ایسا تھا جو گو اسلام پر تو قائم تھا لیکن مدینہ کی حکومت اور غلبے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خواہ اس پر مہاجرین فائض ہوں یا انصار۔

یہ لوگ ادائے زکوٰۃ کو جزیہ سمجھتے تھے جو حکومت مدینہ نے ان پر لگا رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ محمد ﷺ کی زندگی تک زکوٰۃ ادا کرنے میں کوئی حرج نہ تھا کیونکہ آپ نبی تھے۔ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور جو کچھ آپ ان سے طلب کرتے تھے وہ آپ کا حق تھا۔ لیکن اب کہ آپ کو اللہ نے جوارِ رحمت میں بلا لیا ہے اہل مدینہ ان سے کسی بات میں بڑھے ہوئے نہیں۔ اور انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ محمد ﷺ کی طرح ان سے ادائے زکوٰۃ کا مطالبہ کریں۔

جن قبائل نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کیا تھا وہ مدینہ کے قریبی قبائل عبس اور ذبیان اور ان سے ملحقہ قبائل بنوکنانہ، غطفان اور فزارہ تھے۔ لیکن جو قبائل مدینہ سے خاصے فاصلے پر واقع تھے وہ ارتداد کی رو میں بہ گئے تھے اور اکثر نے حسب ذیل مدعیان نبوت کاذبہ کی پیروی اختیار کر لی تھی:

طلیحہ جس نے بنی اسد میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

سجاح جس نے بنی تمیم میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

مسیلمہ جس نے یمامہ میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔

ذوالتاج لقیط بن مالک جو عمان میں شورش برپا کرنے کا ذمہ دار تھا۔

ان کے علاوہ یمن میں اسود عنسی نے اپنے حامیوں کی ایک بھاری تعداد جمع کر لی تھی۔ یہ لوگ اس کے قتل ہونے تک لڑتے رہے اور بعد میں بھی جب تک جنگ ہائے ارتداد کا مکمل خاتمہ نہ ہوگیا وہ بدستور فتنہ و فساد میں مصروف رہے۔

بغاوت اور ارتداد کے عوامل:

غلبہ قریش کے خلاف عرب کے شہریوں اور بدویوں کا اٹھ کھڑا ہونا اور کثیر قبائل کا اسلام سے ارتداد اختیار کر لینا صرف اس وجہ سے نہ تھا کہ یہ قبائل مدینہ سے خاصے فاصلے پر واقع تھے اور انہوں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے علم بغاوت بلند کر دیا بلکہ اس کے علاوہ بعض اور عوامل بھی تھے جنھوں نے اس فتنے کو پروان چڑھنے میں مدد دی۔

اسلام عرب کے طول و عرض اور مکہ و مدینہ سے دور دراز کے علاقوں میں اس وقت تک نہ پھیل سکا جب تک فتح مکہ، غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف کے واقعات پیش نہ آ گئے۔ اس عرصے تک محمد ﷺ کا دائرہ کار مکہ، مدینہ اور ان دونوں شہروں کے درمیان بسنے والے قبائل ہی تک محدود رہا۔ اسلام ہجرت مدینہ سے بہت تھوڑا عرصہ قبل مکہ کی حدود سے نکلا تھا ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک محمد ﷺ مدینہ میں اسلام کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ بعد میں جب مسلمانوں نے یہود کے اثر و اقتدار کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور قریش کو زیر کر کے مکہ فتح کر لیا تو دیگر قبائل عرب بھی اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور عرب کے طول و عرض سے وفود مدینہ آ کر قبول اسلام کا اعلان کرنے لگے۔ محمد ﷺ نے بھی اپنے عمال کو دین کا علم سکھانے اور صدقات وغیرہ وصول کرنے کے لیے ان علاقوں میں بھیجنا شروع کیا۔

جغرافیائی عوامل:

یہ طبعی امر تھا کہ ان قبائل کے دلوں میں مکہ، مدینہ اور قریبی علاقوں کے مسلمانوں کی طرح دین اسلام کی حقانیت راسخ نہ ہوئی تھی۔ اسلام کو پوری طرح پاؤں جمانے میں بیس سال صرف ہوئے۔ مسلمانوں کو اپنی ہستی برقرار رکھنے ... بننا اور متواتر

دشمن سے لڑائیوں میں مصروف رہنا پڑا تھا۔ بالآخر مخالف زیر ہو گئے اور مکہ، طائف، مدینہ اور قریبی قبائل کے لوگوں کے دلوں میں جنھیں محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ سے بہ کثرت ملنے جلنے کا موقع ملا، اسلامی تعلیمات راسخ ہو گئیں۔ لیکن ان لوگوں پر اسلامی تعلیمات کا کوئی اثر نہ ہو سکا جو اسلامی مراکز سے دور تھے اور جنھوں نے اسلام کی خاطر مسلمانوں کی جدوجہد کو نہ آنکھوں سے دیکھا تھا اور نہ اُن کی قربانیوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے محمد ﷺ کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے اس نئے دین سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی شروع کر دی جو ان کے خیال میں زبردستی ان پر مسلط کر دیا گیا تھا۔

اجنبی عوامل:

جغرافیائی عوامل کے علاوہ اجنبی عوامل بھی ان قبائل کے خلاف اسلام اُٹھنے میں کم اثر انگیز نہ تھے۔ مکہ مدینہ کے اردگرد کے علاقے تو ایرانیوں اور رومیوں کے دست برد سے محفوظ تھے۔ لیکن عرب کا شمالی حصہ جو شام سے متصل تھا اور جنوبی علاقہ جو ایران سے ملا ہوا تھا ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے زیر اثر تھا۔ ان دونوں سلطنتوں کو ان علاقوں میں بہت اثر و رسوخ حاصل تھا اور یہاں کے سردار بھی براہِ راست رومیوں اور ایرانیوں کے تابع تھے۔ ان امور کی موجودگی میں کچھ تعجب نہیں کہ ارتداد کی رو میں مندرجہ ذیل عوامل کام کر رہے ہوں:

(۱) شخصی آزادی اور خود مختاری کا جذبہ۔

(۲) شمال میں مسیحی اور جنوب و مشرق میں مجوسی سلطنتوں سے قرب کے باعث مسیحیت اور مجوسیت کا دلوں پر اثر۔

(۳) آبائی عقیدے (بت پرستی) کی کشش۔

جونہی محمد ﷺ کی خبر وفات مشہور ہوئی ان عوامل نے اثر دکھانا شروع کر دیا اور جا بجا ارتداد کا فتنہ برپا ہونے لگا۔ بعض علاقوں میں تو محمد ﷺ کی زندگی ہی میں ان عوامل نے اثر کرنا شروع کر دیا تھا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان ہوگی۔ متعدد ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہو گئے جنھوں نے اپنے قبیلوں کو بغاوت کرنے پر اکسانا اور اپنے جھنڈے تلے جمع کرنا شروع کیا اور اس طرح عرب کے طول و عرض میں ایک زبردست فتنہ پھیل گیا۔

منکرین زکوٰۃ کی منطق:

جو لوگ ادائے زکوٰۃ سے انکاری تھے آپس میں کہتے تھے کہ مہاجرین اور انصار چونکہ خلافت کے بارے میں جھگڑا کر چکے ہیں اور محمد ﷺ نے وفات سے قبل کسی شخص کی خلافت کے متعلق وصیت نہیں کی اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام پر قائم رہتے ہوئے خود مختاری کی حفاظت کریں اور ہمیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ انصار و مہاجرین کی طرح ہم بھی اپنے میں سے کسی شخص کو اپنا امیر مقرر کر لیں جو ہمارے لیے جانشین

محمد ﷺ کے طور پر ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا ان کے سوا کسی اور کی اطاعت سے متعلق نہ دین میں کوئی نص موجود ہے اور نہ کتاب اللہ سے اس کا پتہ چلتا ہے اس لیے ہم پر صرف اسی شخص کی اطاعت واجب ہے جسے ہم خود اپنا امیر مقرر کریں۔

یہ لوگ اپنی تائید میں یہ امر بھی پیش کرتے تھے کہ محمد ﷺ نے عرب کے متعدد شہروں کو اپنی زندگی ہی میں بڑی حد تک خود مختاری عطا فرما دی تھی۔ اب اگر آپ کی وفات کے بعد وہ مکمل خود مختاری چاہتے ہیں تو اس میں کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ نے یمن کے عامل بدھان (یا بازان) کو جو ایرانیوں کی جانب سے وہاں حکومت کر رہا تھا۔ مجوسیت ترک کرنے اور اسلام لانے کے بعد بہ دستور وہاں کا حاکم بنائے رکھا۔ اسی طرح بحرین اور حضر موت وغیرہ کے تمام امراء کو بھی قبول اسلام کے بعد ان کے عہدوں پر برقرار رکھا اور اپنی طرف سے کوئی نیا عامل ان علاقوں میں نہ بھیجا۔

زکوٰۃ کے بارے میں ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اصل میں جزیہ ہے جو ان پر عائد کیا گیا ہے حالانکہ جزیہ صرف غیر مسلموں پر واجب ہے۔ اس صورت میں کہ وہ ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے مدینہ والے تو وہ کیوں حاکم مدینہ کو زکوٰۃ ادا کریں؟ ان کے اور اہل مدینہ کے درمیان صرف ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے دین اسلام، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مدینے والے ان پر حکومت کرنے کے بھی حق دار ہیں۔ اہل مدینہ کو بے شک اسلام میں اولیت کا شرف حاصل ہے لیکن دوسرے قبائل پر اپنی اس فضیلت کا اظہار وہ صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ ان کی طرف معلمین بھیجیں جو انہیں دین کا علم سکھائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے رسول ﷺ کیا کرتے تھے۔ وہ اور ہم بے شک ایک ہی امت ہیں۔ لیکن اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ کسی فریق کو دوسرے فریق پر غلبہ تسلط حاصل ہو اور ایک قبیلے کو اس کی آزادی و خود مختاری کی نعمت سے محروم کر دیا جائے۔

اس قسم کے خیالات ان قبائل میں پیدا ہو رہے تھے جو مکہ، مدینہ اور طائف کے قریب واقع تھے۔

لیکن یمن اور دور دراز کے علاقوں کے حالات بالکل مختلف تھے۔ ان لوگوں میں جونہی محمد ﷺ کی خبر وفات مشہور ہوئی ان کے ایمان متزلزل ہونے لگے۔ اور انہوں نے نہ صرف ارتداد اختیار کر لیا بلکہ ان لوگوں کے جھنڈے تلے جمع ہو کر سلطنت اسلامیہ سے بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں جنھوں نے قبائلی عصبیت کی آگ بھڑکا کر لوگوں کے دلوں میں اہل مکہ و مدینہ کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی تھی۔ یہ لوگ کسی تبلیغ کی وجہ سے مسلمان نہ ہوئے تھے بلکہ یہ دیکھ کر کہ محمد ﷺ کا اقتدار نہایت تیزی سے روم و ایران کی سرحدوں تک پھیل گیا ہے اور سارے عرب پر آپ کی حکومت قائم ہو گئی ہے طوعاً و کرہاً اسلام لانے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کے وفود مدینہ میں آتے اور اپنے اور اپنے قبیلوں کی طرف سے اسلام لانے کا اعلان کرتے تھے۔

مدعیان نبوت کا خروج:

فتنے کی آگ سب سے زیادہ بھڑکانے والے لوگ وہ تھے جو نبوت کے مدعی بن کر کھڑے ہوئے

اور دعوے کرنے لگے کہ ان پر اسی طرح وحی نازل ہوتی ہے جس طرح محمد ﷺ پر۔ ان لوگوں نے پہلے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن بعد میں خود نبوت کا دعویٰ کر دیا بعض نے تو محمد ﷺ کے زمانے ہی میں خروج کر دیا تھا۔

بنی اسد میں طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ایک بار وہ اپنی قوم کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ سخت گرمی کے دن تھے اور پیاس کے مارے لوگوں کا دم نکلا جا رہا تھا۔ اچانک انہیں صحرا میں ایک شیریں چشمہ مل گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی نبوت پر لوگوں کا ایمان مستحکم ہوگیا۔

بنی حنیفہ میں مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے صرف دعوائے نبوت پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ محمد ﷺ کے پاس پیغام بھی بھیجا کہ "مجھے نبوت میں آپ کا شریک کیا گیا ہے۔ اس لیے نصف زمین قریش کی ہے اور نصف زمین میری۔ لیکن قریش بڑی بے انصاف قوم ہے۔"

یمن میں اسود عنسی نبوت کا مدعی بن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے طاقت حاصل کر کے یمن پر قبضہ کرلیا اور محمد ﷺ کے عامل کو وہاں سے نکال دیا۔

محمد ﷺ نے ان مدعیان نبوت کی طرف زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ آپ کو یقین تھا۔ دین خدا میں اتنی قوت موجود ہے کہ ان مدعیوں کے کذب و افتراء کے مقابلے میں کافی ہوسکتی ہے اور مسلمانوں کا ایمان اس قدر مضبوط ہے کہ وقت پڑنے پر بہ خوبی ان لوگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اسود عنسی کا فتنہ:

یہ مدعیانِ نبوت بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ محمد ﷺ کی زندگی میں وہ آپ کے مقابلے پر ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے اور اسی احساس کے باعث اسود عنسی کے سوا اور کسی مدعی نبوت نے آپ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرنے کی جرأت نہ کی۔ اسود عنسی کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نے محمد ﷺ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور آپ ہی کے عہد میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس نے بھی اپنے بھائیوں کی سی روش اختیار کیے رکھی اور اندر ہی اندر اپنے لیے زمین ہموار کرتا رہا۔ محمد ﷺ کی وفات کے بعد اس نے اعلانیہ اسلام کے خلاف بغاوت کر دی اور میدان مقابلہ میں آ گیا۔ یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے: "اسود عنسی نے محمد ﷺ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے ترقی کرنا شروع کی اور اس کی قوم کے ہزاروں افراد اس کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے لگے۔ بالآخر دو شخصیتوں: قیس بن مکشوح المرادی اور فیروز دیلمی نے اس کے گھر میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا۔ اس وقت وہ نشے کے عالم میں تھا۔"

طبری بھی اپنی ایک روایت میں لکھتا ہے: "محمد ﷺ کی وفات کے بعد مرتدین سے پہلے جنگ یمن میں اسود عنسی کے خلاف لڑی گئی۔"

محمد ﷺ کی زندگی کے آخری حصے میں عرب کاملاً پرسکون نہ تھا بلکہ اندر ہی اندر فتنے کی آگ سلگ رہی تھی۔ عرب کا شمال مشرقی اور جنوبی حصہ سارے کا سارا اس آگ میں جل رہا تھا۔ اس حالت انتشار کو وہ

روحانی قوت ہی دور کر سکتی تھی جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو مرحمت فرمائی تھی۔ اگر محمد ﷺ کی بالغ نظری، حکمتِ عملی اور حسن تدبیر کے ساتھ اللہ کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو سخت خطرہ تھا کہ یہ آگ آپ کی زندگیوں میں پورے زور سے بھڑکنے لگتی اور سارا عرب اس میں جل کر خاکستر ہو جاتا۔

یمن میں فتنہ اسود:

اغلب گمان یہی ہے کہ اسود عنسی کا فتنہ محمد ﷺ کی زندگی کے آخری حصے میں برپا ہوا تھا مورخین اس بغاوت کا حال جس طرح بیان کرتے ہیں اس سے بعض ایسے پہلو نمایاں ہوتے ہیں جو خاصے غور و فکر کے محتاج ہیں۔

اس واقعے کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ جب محمد ﷺ نے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھنے شروع کیے تو کسریٰ شاہ فارس کو بھی ایک خط لکھا جس میں اسے اسلام لانے کی دعوت دی۔ جب اسے خط کے مضمون کا ترجمہ سنا یا گیا تو اس نے اپنے عامل یمن باذان (بعض روایات میں عامل کا نام باذان کے بجائے بدھیان آیا ہے) کو حکم بھیجا کہ حجاز سے اس آدمی کا سر منگوا کر مابدولت کے پاس بھیج جس نے عرب میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

اس زمانے میں رومی ایرانیوں کے زیر نگیں تھے لیکن کسریٰ کے یہ خط لکھنے کی دیر تھی کہ حالات بدل گئے اور وہ رومی جو اس سے قبل ایرانیوں کی ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے اب ان کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کو تیار ہو گئے۔ نہ صرف انہوں نے ایرانیوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لی بلکہ ان پر غلبہ پا کر ان کی طاقت و قوت کو بے حد کمزور بھی کر دیا۔

جب باذان کو اپنے آقا کا خط ملا تو اس نے اپنے دو آدمیوں کو وہ خط دے کر محمد ﷺ کی خدمت میں بھیجا مگر آپ نے ان آدمیوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا: "میرے اللہ نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے بادشاہ (کسریٰ) کو اس کے بیٹے شیرویہ نے ہلاک کر دیا ہے اور اس کی جگہ خود بادشاہ بن بیٹھا ہے۔"

ساتھ ہی آپ نے باذان کو اسلام لانے کی دعوت بھی دی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اسلام لے آیا تو آپ اسے بدستور یمن کا حاکم بنائے رکھیں گے۔ اسی عرصے میں ایران کی گڑبڑ تخت شاہی پر شیرویہ کے قبضے اور رومیوں کے غلبے کی خبریں بھی باذان کو مل گئیں۔ اس نے محمد ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے اپنے وعدے کے مطابق اسے بدستور یمن کا حاکم بنائے رکھا۔

باذان کی وفات کے بعد محمد ﷺ نے یمن کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے پر مختلف آدمیوں کو حاکم مقرر کر دیا۔ باذان کے لڑکے شہر کو صنعاء اور اس کے گرد و نواح کی حکومت تفویض ہوئی۔ باقی عاملوں میں سے بعض تو یمن ہی کے باشندے تھے اور بعض کو محمد ﷺ نے مدینہ سے حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ ان عمال نے اپنی اپنی ولایت میں پہنچ کر نظم و نسق کو سنبھالا ہی تھا کہ انہیں اسود عنسی کا پیغام ملا کہ وہ فوراً یمن سے نکل جائیں کیونکہ یمن پر حکومت کرنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ یہ تھی اس فتنے کی ابتدا۔

اسود عنسی کے فتنے کا آغاز:

اسود اصل میں ایک کاہن تھا جو یمن کے جنوبی حصے میں رہتا تھا۔اس نے شعبدہ بازی اور مسجع و مقفیٰ گفتگو کی وجہ سے بہت جلد لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ بالآخر وہ نبوت کا مدعی بن بیٹھا اور اپنا لقب رحمان الیمن رکھا۔ بعینہٖ جیسے مسیلمہ نے اپنا لقب رحمان الیمامہ (لغت کی کتاب لسان العرب میں لکھا ہے کہ رحمن اللہ کی صفت ہے جو اس کے سوا اور کسی کے لیے استعمال نہیں ہو سکتی۔اس کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ رحمن کا لفظ عبرانی ہے اور رحیم عربی۔بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام سے قبل عرب کے جنوبی حصے میں ایک معبود کا نام رحمان تھا جس سے اہل حجاز واقف نہ تھے) رکھا تھا۔وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کے پاس ایک فرشتہ آتا ہے جو ہر بات اسے بتا دیتا ہے اور اس کے دشمنوں کے تمام منصوبے طشت از بام کر دیتا ہے۔اس کا قیام مذحج کے علاقے میں ایک غار میں تھا جسے خبان کہتے تھے۔جہلاء کی ایک بہت بڑی جماعت اس کی باتوں سے مسحور ہو کر اس کے گرد اکٹھی ہوگئی۔

اسود اس جماعت کو لے کر نجران کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کے مسلمان حاکموں: خالد بن سعید اور عمرو بن حزم کو شہر سے نکال دیا۔اہل نجران کی ایک بھاری تعداد بھی اسود کے ساتھ مل گئی تھی اور وہ اسے لے کر صنعا روانہ ہوا۔وہاں شہر بن بازان سے مقابلہ پیش آیا۔اسود نے اسے شہید کر دیا اور اس کی فوج کو شکست دی۔ یہ دیکھ کر صنعاء میں مقیم مسلمانوں کو وہاں سے بھاگ کر مدینہ آنا پڑا۔انہیں لوگوں میں معاذ بن جبل بھی تھے۔ ادھر خالد بن سعید اور عمرو بن حزم بھی نجران سے مدینہ پہنچ گئے۔اب یمن پر اسود قابض تھا اور حضر موت سے بحرین، احسا اور عدن تک اسی کا طوطی بول رہا تھا۔

فتنہ عنسی کے عوامل:

جب اسود صنعا میں شہر بن بازان کے مقابلے پر آیا تو اس کے ساتھ سو سوار تھے جن میں سے بعض اس کے ساتھ مذحج سے آئے تھے اور بعض نجران سے ہمراہ ہو لیے تھے۔تعجب ہوتا ہے کہ اس قلیل تعداد سے یہ کاہن اس علاقے کے لوگوں پر کس طرح فتح یاب ہو گیا اور کسی جانب سے بھی اس کے خلاف آواز کیوں نہ اٹھی؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس علاقے کے باشندے ایرانیوں کے زیر نگین تھے، ان کے بعد حجازی مسلمانوں کے زیر تسلط آ گئے۔یمن اور حجاز کے لوگوں میں دیرینہ خصومت اور بغض و عناد پایا جاتا تھا۔جب اسود عنسی نے کھڑے ہو کر یہ نعرہ لگایا کہ یمن صرف یمنیوں کا ہے تو وہاں باشندے اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ کوئی شخص مسلمانوں کی حمایت میں اس کاہن اور شعبدہ باز کے لیے کھڑا نہ ہوا۔یمن مختلف مذاہب کا اکھاڑہ تھا۔ یہاں یہودیت بھی پائی جاتی تھی، نصرانیت کا وجود بھی ملتا تھا اور مجوسیت نے بھی اثر جما رکھا تھا۔ان کے بعد اسلام نے اپنا علم بلند کیا لیکن ابھی تک اصول اسلام یمنیوں کے ذہنوں میں راسخ نہ ہوئے تھے۔جب ایک مدعی نبوت کھڑا ہوا۔ لوگوں کو تحفظ قومیت کا واسطہ دے کر اپنی طرف بلایا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ اجنبی عناصر کو یہاں سے کلیۃً نکال پھینکے

گا تو وہ لوگ جو ایک عرصے سے اجنبی تسلط کے باعث تنگ آ چکے تھے اس کی امداد کو دوڑ پڑے۔ اس صورت میں مسلمانوں کے لیے فرار کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ بقیہ ایرانیوں کے لیے بجز اس کے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ یا تو اسود عنسی کی اطاقت قبول کرلیں یا اپنے آپ کو موت کے منہ میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

فتنے کا مقابلہ:

جب یہ تشویش ناک خبریں مدینہ میں پہنچیں تو محمد ﷺ غزوہ موتہ کا انتقام لینے اور شمالی جانب سے حملوں کا سدباب کرنے کے لیے رومیوں پر چڑھائی کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اسامہ ؓ کے لشکر کو تیاری کا حکم دے چکے تھے، مگر جب یہ خبریں ملیں تو اب آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے، ایک یہ کہ آپ اس لشکر کو بغاوت کے فرو کرنے کے لیے یمن بھیج دیں تاکہ مسلمان وہاں دوبارہ قابض ہوسکیں یا پروگرام کے مطابق اسے رومی سرحد ہی کی جانب روانہ کردیں اور اسود عنسی کا مقابلہ کرنے کے لیے فی الحال انہی مسلمانوں سے کام لیں جو یمن میں موجود تھے۔ اگر وہ اس پر غالب آگئے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہوسکتی ورنہ جب اسامہ کا لشکر رومیوں پر فتح یاب ہو کر آئے گا تو اسود اور دیگر باغیوں کے مقابلے اور ان کا قلع قمع کرنے کے لیے روانہ کردیا جائے گا۔

بہت ہی احتیاط سے معاملے پر غور کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دوسری تجویز پر عمل کرنا مناسب سمجھا اور وبر بن یحنس کو یمن کے مسلمان سرداروں کے نام یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے کی پوری جدوجہد کریں۔ آپ نے یمن کے متعلق فی الحال یہی کاروائی کرنی مناسب سمجھی اور پوری قوت سے لشکر اسامہ کی تنظیم میں مصروف ہوگئے۔

ابھی اسامہ کا لشکر روانہ ہوا تھا کہ محمد ﷺ بیمار ہوگئے اور لشکر رک گیا۔ دریں اثناء اسود اپنی سلطنت مضبوط کرنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ اس نے تمام علاقوں میں اپنے عامل مقرر کیے اور جابجا فوجیں متعین کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اس نے زبردست قوت حاصل کرلی اور عدن تک کا سارا ساحل اور صنعاء سے طائف تک کی تمام وادیاں اور پہاڑ اس کے زیرنگیں آگئے۔

اسود عنسی کے عہدیدار:

قیس بن یغوث کو اسود عنسی نے اپنا سپہ سالار بنالیا اور دو ایرانیوں: فیروز اور داذویہ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس نے شہر بن بازان کی بیوہ آزاد سے شادی کرلی جو فیروز کی چچیری بہن تھی۔ اس طرح عرب اور عجم دونوں اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ جب اس نے اپنی یہ شان وشوکت دیکھی تو خیال کرلیا کہ روئے زمین کا مالک وہی ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کرسکے۔

اسود عنسی کے خلافت بغاوت:

لیکن وہی عوامل جو اس کی فتح مندی کا موجب ہوئے تھے بالآخر اس کے زوال کا باعث بنے۔ انہی قیس، فیروز اور داذویہ سے جنہیں اس نے اعلیٰ عہدوں پر متمکن کیا تھا اسے خطرہ محسوس ہونے لگا اور موخر الذکر شخصوں اور یمن میں مقیم تمام ایرانیوں کے متعلق تو اسے یقین ہوگیا کہ وہ حیلوں، سازشوں اور مکروفریب سے اس کی سلطنت کا تختہ الٹنے کی فکر میں ہیں۔

اسود کی ایرانی بیوی کو بھی اسود کی زبانی ان لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوگیا۔ اس کی رگوں میں بھی ایرانی خون دوڑ رہا تھا اور وہ دل میں اس کاہن کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پنہاں کیے ہوئے تھی جس نے اس کے پیارے خاوند کو اس سے جدا کر دیا تھا۔ پھر بھی اس نے نسوانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نفرت و حقارت کو اس سے چھپائے رکھا اور طرز سلوک سے اس پر ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ وہ اس کی نہایت وفادار بیوی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسود اپنی بیوی کی طرف سے بالکل مطمئن رہا اور اس کے دل میں یہ شائبہ تک نہ گزرا کہ وہ کبھی اسے دغا دے سکتی ہے۔ لیکن وہ اپنے دونوں وزیروں اور قائد لشکر سے مطمئن نہ تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے طرز عمل سے اس وفاداری کا ثبوت بہم نہیں پہنچا رہے جو غلام اپنے آقا اور ولی نعمت سے کیا کرتے ہیں۔ قیس کی طرف سے وہ خصوصاً فکرمند تھا کیونکہ سارا لشکر اس کے ماتحت تھا اور وہ لشکر کی مدد سے اس کے خلاف جو چاہتا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے قیس کو بلایا اور کہا میرے فرشتے نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تو نے قیس کی ہر طرح عزت افزائی کی لیکن جب اس نے ہر طرح عمل دخل کر لیا اور وہی عزت جو تجھے حاصل تھی اسے بھی حاصل ہوگئی تو اب وہ تیرے دشمنوں سے ساز باز کر رہا ہے اور تجھ سے غداری کر کے تیرا ملک چھیننے کے درپے ہے۔

قیس نے جواب دیا: آپ کا خیال درست نہیں۔ میرے دل میں آپ کی قدرومنزلت بہ دستور ہے اور میں آپ کے خلافت بغاوت کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔

اسود نے گہری اور ناقد نظر سے قیس کا جائزہ لیا اور بولا: کیا تو فرشتے کو جھٹلاتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ فرشتے نے ضرور سچ کہا ہے البتہ مجھے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ تو اپنی پچھلی کاروائیوں پر نادم ہے اور جو مخفی ارادے تو نے میرے متعلق کر رکھے تھے ان سے توبہ کرتا ہے۔

قیس کو اسود کی باتیں سن کر یقین ہوگیا کہ وہ اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے اس لیے وہ وہاں سے نکل کر فیروز اور داذویہ سے ملا اور ساری سرگزشت انہیں سنا کر رائے دریافت کی۔ انہوں نے کہا خود ہمیں بھی اسود کی طرف سے خطرہ ہے۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اسود نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم قیس سے مل کر میرے خلاف سازشیں کر رہے تھے لیکن یاد رکھو! میری مخالفت کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ ان دونوں کو بھی یہ باتیں سن کر یقین

ہوگیا کہ اسود کی نیت ان دونوں کی طرف سے ٹھیک نہیں۔

ان واقعات کی خبر یمن کے دوسرے مسلمانوں کو بھی ہوگئی۔ ان کے پاس محمد ﷺ کی طرف سے یہ ہدایت پہلے ہی آچکی تھی کہ جس طرح بھی ہو اسود عنسی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ انہوں نے قیس اور اس کے ساتھیوں کو پیغام بھیجا کہ اسود کے معاملے میں ہم سب کی رائے ایک ہے اس لیے اس کے خلاف بالاتفاق کاروائی کرنی چاہیے۔ نجران اور اس کے قریبی علاقے میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی ان واقعات کا علم ہوگیا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جو اسود کے قریب رہتے تھے لکھا کہ وہ بھی دل و جان سے قتل اسود کے خواہش مند ہیں اور اس کام میں ہر طرح ان کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ادھر سے انہیں جواب ملا کہ فی الحال وہ اپنی اپنی جگہوں پر ہی مقیم رہیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے اسود کو شبہ ہو کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے۔

ان لوگوں کی یہ رائے بالکل درست تھی کہ اسود کے خلاف جو کاروائی کی جائے خفیہ طور پر کی جائے کیونکہ رازداری سے اس کا کام تمام کر دینا کھلم کھلا لڑائی کرنے سے بہرحال بہتر تھا۔ اب ان لوگوں کے مشوروں میں اسود کی بیوی آزاد بھی شامل ہوگئی۔ گو بظاہر وہ اپنے خاوند کو یہی جتلاتی تھی کہ اسے اس سے بے انتہا محبت ہے۔ اس نے فیروز، داذویہ اور قیس کو ساتھ ملایا اور انہیں اسود کے سونے کا کمرہ دکھا کر ہدایت کی کہ وہ رات کو نقب لگا کر محل میں داخل ہو جائیں۔ محل کے ہر گوشے میں اسود کے سپاہی موجود ہوتے ہیں لیکن سونے کے کمرے کی پشت سپاہیوں سے بالکل خالی ہوتی ہے۔ وہ پشت سے داخل ہوں اور اسے خواب کی حالت میں اچانک قتل کر ڈالیں۔ خود بھی اس سے نجات حاصل کرلیں اور اسے بھی ایسے ظالم انسان سے مخلصی دلائیں۔

اسود کا قتل:

چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور رات کو پشت کی طرف سے محل میں داخل ہو کر اسود کو قتل کر ڈالا۔ صبح ہونے پر انہوں نے اذانیں شروع کیں اور بلند آواز سے کہا "ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور عبہلہ (اسود عنسی کا نام) کذاب ہے۔ اسود کا سر بھی انہوں نے محل کے باہر پھینک دیا۔ ان کی آوازیں سن کر محل کے پہرے داروں نے ان کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن اس دوران میں اہل شہر کو اسود عنسی کے قتل ہونے کا پتا چل چکا تھا۔ وہ محل کی طرف بھاگے۔ اس وقت ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور بالآخر فیصلہ ہوا کہ قیس، فیروز اور داذویہ تینوں یمن کا انتظام سنبھالیں گے۔

اس بارے میں مورخین کا اختلاف ہے کہ اسود عنسی محمد ﷺ کی وفات سے قبل قتل ہوا یا بعد میں۔ اس سلسلے میں یعقوبی کی روایت ہم پہلے درج کر چکے ہیں طبری اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ وہ آپ کی وفات سے پہلے ہی جہنم واصل ہوگیا تھا جس رات اس کے قتل کا واقعہ ہوا اسی رات اللہ نے بذریعہ وحی آپ کو اس واقعے

کی اطلاع دے دی۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا: "عنسی قتل کر دیا گیا۔ اسے ایک بابرکت آدمی نے قتل کیا جو خود بھی ایک بابرکت خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

لوگوں نے دریافت کیا: "حضور! اس کا قاتل کون ہے؟"

آپ نے فرمایا "فیروز۔"

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسود عنسی کے قتل کی خبر محمد ﷺ کی زندگی میں مدینہ نہیں پہنچ سکی بلکہ بعد میں پہنچی اور یہ پہلی خوش خبری تھی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ملی۔

ایک روایت خود فیروز کی زبانی مروی ہے جس میں وہ کہتا ہے: "جب ہم نے اسود کو قتل کیا تو وہاں کا انتظام اسی طرح برقرار رکھا جس طرح اسود کے تسلط سے پہلے تھا۔ ہم نے پہلے معاذ بن جبل کو بلا بھیجا کہ ہمیں نماز پڑھائیں اور دین کی تعلیم دیں۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی کیونکہ ہم نے اپنے بہت بڑے دشمن سے نجات حاصل کی تھی۔ یکا یک محمد ﷺ کی خبر وفات پہنچی اور یمن میں دوبارہ اضطراب پیدا ہو گیا۔"

یہ اضطراب کیوں اور کس طرح پیدا ہوا؟ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، یہ بیان مرتدین کی جنگوں کے ذیل میں آئے گا۔

جنوبی عرب میں بغاوت:

یمن کی مذکورہ بالا بغاوت تو اسلام کے خلاف ایک زبردست مظاہرہ تھا ہی لیکن یمامہ اور خلیج فارس سے ملحقہ قبائل میں بھی حالات پرسکون نہ تھے بلکہ وہاں بھی اندر ہی اندر بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ مسلمان اس صورت حال سے خاصے پریشان تھے کبھی تو وہ شورش کے بانیوں سے صلح کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اور کبھی طاقت کے ذریعے سے ان کا سر کچلنے کی تدابیر میں مصروف ہو جاتے تھے تاکہ ان کا غلبہ و اقتدار بدستور قائم رہے اور اسے کوئی ضعف نہ پہنچے۔ یہ علاقے ایک طرف تو مکہ اور مدینہ سے دور تھے اور اسلام کی تعلیم ان لوگوں کے دلوں میں راسخ نہ ہوئی تھی، دوسری طرف یہ فارس سے متصل تھے اور ایرانیوں سے ان لوگوں کا تجارتی رابطہ قائم تھا۔ اس لیے تعجب نہیں کہ ان بغاوتوں اور شورشوں میں ایرانیوں کا بھی خفیہ ہاتھ ہو۔

مسیلمہ کا دعوائے نبوت:

گزشتہ اوراق میں ہم اجمالاً بیان کر چکے ہیں کہ بنی حنیفہ کے مدعی نبوت مسیلمہ حبیب نے دو قاصدوں کے ہاتھ محمد ﷺ کو یہ خط مدینہ بھیجا تھا۔

"من مسیلمة رسول الله الی محمد رسول الله سلام علیك اما بعد فانی قد أشركت فی الامر معك، وان لنا لنصف الارض ولقریش نصف الارض، ولكن قریشاً قوم لا یعدلون۔"

(مسیلمہ رسول اللہ کی جانب سے محمد ﷺ کی طرف آپ پر سلامتی ہو۔ بعد ازاں واضح ہو کہ میں آپ کا شریک بنایا گیا ہوں۔ اس لیے نصف زمین ہماری ہے اور نصف قریش کی لیکن قریش کی قوم انصاف سے کام

نہیں لیتی۔)

محمد ﷺ نے یہ سنا تو قاصدوں سے دریافت فرمایا: "تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا: "ہم وہی کہتے ہیں جو خط میں لکھا ہے۔"

آپ نے غضب ناک نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: "اللہ کی قسم! اگر قاصدوں کا قتل روا ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔"

اس کے بعد مسیلمہ کو یہ جواب لکھوایا:

"بسم الله الرحمن الرحيم من محمد محمد ﷺ الى مسيلمة الكذاب اما بعد فأن الارض لله يرثها من يشاء من عباده المتقين۔"

(محمد ﷺ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کی طرف بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے متقی بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔)

محمد ﷺ اس خط کے مضمرات سے ناواقف نہ تھے۔ آپ نے اہل یمامہ کے دلوں سے مسیلمہ کا اثر زائل کرنے اور انہیں اسلامی تعلیمات سکھانے کے لیے مدینہ سے ایک شخص نہارا الرحال کو یمامہ بھیجا لیکن وہ جا کر مسیلمہ سے مل گیا اور اہل یمامہ کے سامنے گواہی دی کہ واقعی مسیلمہ محمد ﷺ کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہے۔ نہارا الرحال کی تائید نے مسیلمہ کے اثر و نفوذ میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور اہل یمامہ جوق در جوق مسیلمہ کے حلقۂ اطاعت میں شامل ہونے لگے۔ پھر بھی محمد ﷺ خدائی رحمت سے قطعاً ناامید نہ ہوئے۔ آپ کو یقین تھا کہ اللہ مسلمانوں کو رومیوں پر ضرور فتح عطا فرمائے گا اور اس فتح کے نتیجے میں تمام داخلی فتنے اپنی موت آپ ہی مر جائیں گے۔

حضرت محمد ﷺ کی حکمت عملی:

اس وقت محمد ﷺ کی حکمت عملی یہ تھی کہ ہر قیمت پر رومیوں کو زیر کیا جائے اور عرب کی شمالی حدود کو ہرقل کی فوجوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا جائے۔ اس زمانے میں ہرقل کی قوت و طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے وہ تمام علاقے جو کچھ عرصہ قبل ایرانیوں کے قبضے میں چلے گئے تھے واپس چھین لیے تھے اور صلیب اعظم کو بھی ایرانیوں سے چھڑا کر بیت مقدس واپس لے آیا تھا۔ اس بات کا زبردست خطرہ تھا کہ کہیں رومی فوجوں کا رخ عرب کی جانب نہ پھر جائے کیونکہ وہاں کے حکمران سرزمین عرب میں ایک نئی قوت کو ابھرتے دیکھ کر سخت پریشان ہو رہے تھے۔ غزوہ موتہ میں اسلامی لشکر رومیوں کے مقابلے کی تاب نہ لا کر واپس ہونے پر مجبور ہوا تھا (گو اسے ان کے مقابلے میں شکست کا سامنا نہ کرنا پڑا) غزوہ تبوک نے مسلمانوں کے رعب و داب میں خاصا اضافہ کر دیا تھا پھر بھی عرب پر رومیوں کے حملے کا خطرہ کلیۃً دور نہ ہوا محمد ﷺ کا خیال تھا کہ اگر اسلامی فوجیں رومیوں پر غالب آ گئیں تو نہ صرف آئندہ کے لیے عرب علاقوں پر ان کی تاخت و

تاراج کا سلسلہ رک جائے گا بلکہ شوریدہ سر عربی قبائل بھی دبک کر بیٹھ جائیں گے اور طوعاً و کرہاً مسلمانوں کی اطاعت کرنے پر مجبور ہوں گے۔

آپ کا خیال بالکل درست تھا کیونکہ اس زمانے میں عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں ہی کا غلغلہ برپا تھا۔ انہیں عرب کی سب سے بڑی طاقت تسلیم کرلیا گیا تھا۔ یمامہ میں مسیلمہ، عمان میں لقیط اور بنی اسد میں طلیحہ اس قابل نہ تھے کہ مسلمانوں سے کھلم کھلا جنگ چھیڑ کر فتح یاب ہو سکتے۔

لقیط، طلیحہ اور مسیلمہ تینوں ایسے مناسب موقع کے انتظار میں تھے جب باقاعدہ بغاوت کا اعلان کر کے مسلمانوں کا تخت الٹ سکیں۔ ابتداء میں ان تینوں نے محمد ﷺ پر طعن و تشنیع اور آپ کی رسالت پر اعتراض کیے بغیر اپنا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ تینوں کا دعویٰ تھا کہ وہ نبی ہیں اور جس طرح ہر قوم میں اللہ کی طرف سے نبوی مبعوث کیے گئے ہیں، انہیں بھی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ وہ انہیں ہدایت کا راستہ دکھائیں۔ یہ صورت حال ان علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ ان کے زیر پا فتنہ کی آگ سلگ رہی تھی اور کسی کو علم نہ تھا کہ کب یہ آگ زور شور سے بھڑک اٹھے۔

جونہی محمد ﷺ کی خبر وفات مشتہر ہوئی یہ آگ بھڑک اٹھی اور دیکھتے دیکھتے عرب ایک آتش فشاں پہاڑ میں تبدیل ہوگیا جس سے آگ اور سیال لاوا نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ یہ فتنہ مختلف علاقوں کے اندر مختلف صورتوں میں پھیلا اور ہر جگہ اس کے اسباب وعوامل بھی علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان تمام باتوں کا ذکر ہم آگے چل کر وضاحت سے کریں گے لیکن یہاں بعض ضروری باتوں کا بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عرب اور فتنہ مدعیان نبوت:

فتنہ وفساد کے اس طوفان پر نظر ڈالنے سے بعض اہم امور کا علم ہوتا ہے جن پر غور وفکر سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بھی فتنہ اٹھا بڑی تیزی سے اٹھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسود عنسی نے تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا اور اس کی حکومت جنوب میں حضر موت سے مکہ و طائف تک پھیل گئی۔ مسیلمہ اور طلیحہ نے بھی غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ مزید برآں جن علاقوں میں ارتداد کی وباء پھیلی اور جہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کی اطاعت کا جوا کندھوں پر اٹھانے سے انکار کردیا وہ علاقے تہذیب وتمدن اور دولت وثروت کے لحاظ سے تمام قبائل عرب سے بڑھے ہوئے تھے اور ان کی حدود مملکت ایران سے بہت قریب تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس فتنے کو فرو کرنے میں پوری طاقت صرف کردی اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک ان علاقوں میں اسلامی سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر کے امن و امان بحال نہ کردیا۔

اسود عنسی کی بغاوت اور مسیلمہ وطلیحہ کی تیاریوں سے اس امر کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں دینی انحراف اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اگر کوئی شخص مذہب کا نام لے کر ذاتی مفاد کے لیے کوئی تحریک چلانا

چاہتا تو بڑی آسانی سے کامیاب ہوسکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لوگوں میں کسی خاص مذہب کے متعلق تعصب پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس کوئی بھی عقیدہ ان لوگوں کے دلوں میں راسخ نہ تھا۔ نصرانیت، یہودیت، مجوسیت، بت پرستی، غرض ہر مذہب وملت کے پرستار اور مددگار یہاں موجود تھے لیکن سب کے سب باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ہر مذہب کے پرستاروں کا دعویٰ تھا کہ انہیں کا مذہب مبنی برحق ہے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا راستہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ چونکہ ہر مذہب سچائی کا مدعی تھا۔ اس لیے عام انسان کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کس مذہب کو قبول کرے اور کسے چھوڑے۔ اندریں حالات مدعیان نبوت کے لیے یہ بات آسان ہوگئی کہ وہ اپنے اپنے قبیلے میں عصبیت کے جراثیم پھیلا کر اور مختلف شعبدوں کو اپنی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کر کے انہیں اپنی طرف مائل کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان مدعیان نبوت نے کثیر التعداد لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے اسلامی حکومت کے خلاف بہ ظاہر کامیابی حاصل کرلی۔

مدعیان نبوت کی عارضی کامیابی:

ان مدعیان نبوت کی عارضی کامیابی کا راز ان کے دعوے اور لوگوں کے ان پر ایمان لانے میں مضمر نہ تھا بلکہ اس میں بعض اور عوامل بھی کام کر رہے تھے۔ چنانچہ اسود عنسی کی کامیابی کی بڑی وجہ وہ بے پناہ نفرت تھی جو اہل یمن کو اہل فارس اور اہل حجاز سے تھی۔ اسود نے یمنیوں کا یہ جذبہ نفرت اُبھار کر انہیں آسانی سے حجازیوں کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔

مسیلمہ اور طلیحہ نے بھی اسود عنسی کے نقش قدم پر چل کر اپنی اپنی قوم میں عصبیت کے جذبات کو بھڑکایا اور اس طرح لوگوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرلیا۔ اگر ان علاقوں میں اسلام کی بنیاد مضبوط ہوتی اور اس کے اصول لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوتے تو ان مدعیان نبوت کو کبھی حکومت کے مقابلے میں کھڑے ہونے اور کثیر التعداد لوگوں کو اپنے گرد جمع کرلینے کی توفیق نہ ملتی۔ کیونکہ جو عقیدہ دلوں پر غلبہ حاصل کر چکا ہو اسے شاذ و نادر ہی کوئی طاقت مغلوب کرسکتی ہے لیکن مذکورہ بالا علاقوں کے لوگوں کا ایمان چونکہ محض رسمی تھا اور وہ اسلام کی حقیقت و ماہیت سے قطعاً ناواقف تھے۔ اس لیے جونہی قومیت کے نام سے تحریکیں شروع ہوئیں اور عصبیت کا واسطہ دلا کر انہیں ابھارا گیا وہ اسلام کو خیرباد کہہ کر اسود اور مسیلمہ جیسے لوگوں کے پیچھے چل کھڑے ہوئے۔

ہمارے نظریے کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اس عظیم الشان شورش کے وقت مکہ اور طائف والے بہ دستور اسلام پر قائم رہے۔ یہ درست ہے کہ یمن میں اسلام کا چرچا وہاں کے حاکم باذان کے قبولِ اسلام کے وقت سے شروع ہوگیا تھا اور یہ واقعہ فتح مکہ و طائف سے پہلے کا ہے۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ سیزدہ سالہ قیام کے دوران میں محمد ﷺ کے مشن کی سخت مخالفت کے باوجود آپ کی تعلیمات نے اہل مکہ کے دلوں پر اسلام کے متعلق ایسا مخفی لیکن گہرا اثر چھوڑا تھا جو باذان کے قبول اسلام اور معاذ بن

جبل کی تعلیم و تربیت کے باوجود اہل یمن کے دلوں پر نہ ہو سکا۔

تیسری بات جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یمن کی بغاوت ہی نے بنی یمامہ اور بنی اسد کو اسلامی حکومت کے خلاف کھڑے ہونے کی جرأت دلائی۔ طلیحہ اور مسیلمہ، دونوں مسلمانوں کی بے پناہ قوت سے خوف کھاتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کبھی جیت نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے حکومت سے بغاوت اور سرکشی کی جرأت نہ کی۔ لیکن جب اسود عنسی میدان مقابلہ میں آگیا اور اسے ابتداء کامیابی بھی ہوئی تو ان دونوں کو بھی علم بغاوت بلند کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ محمد ﷺ کی وفات سے ان کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔ اگر اسود عنسی مسلمانوں کے خلاف کھڑا نہ ہوتا اور یمن میں فتنہ و فساد اور بغاوت کی آگ نہ بھڑکتی تو ان دونوں کو کبھی مسلمانوں کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوتی۔

جب ایک بار فتنہ برپا ہو گیا تو اسود عنسی کی موت کے باوجود دب نہ سکا۔ بلکہ اس میں زیادتی ہی ہوتی چلی گئی۔ محمد ﷺ کی وفات کے بعد اس نے شدت اختیار کر لی اور سارا عرب اس کی لپیٹ میں آگیا۔

فتنہ ارتداد اور مستشرقین:

بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ فتنے کا اصل باعث وہ عظیم تفاوت تھا جو عرب کے مختلف طبقوں اور علاقوں میں طرز معاشرت کے بارے میں پایا جاتا تھا اور جس کی نظیر عرب کے سوا دوسرے علاقوں میں کہیں نہیں ملتی۔

بدوی اور شہری طرزِ زندگی میں عظیم تفاوت کے باعث عربوں کو ایک قومیت میں ڈھال دینا آسان کام نہ تھا۔ بدویوں کے لیے حاکم کی اطاعت کا وہ تصور بھی محال تھا جو شہریوں کے ذہنوں میں تھا بدو لوگ شخصی آزادی کے مقابلے میں ہر چیز کو ہیچ سمجھتے اور اس پر کبھی آنچ نہ آنے دیتے تھے۔ آزادی ان کے نزدیک متاعِ حیات تھی۔ اگر کبھی وہ اسے خطرے میں دیکھتے تھے تو زبردست قربانی دے کر بھی اس کی حفاظت کرنا اپنا فرض اولین خیال کرتے تھے آزادی کا یہی جذبہ مدتِ دراز تک یمنیوں اور شمالی علاقے کے لوگوں کے لیے وجہ عداوت و خصومت بنا رہا۔

مستشرقین لکھتے ہیں کہ بدوی اور شہری طرز معاشرت، بود و باش اور طبائع میں فرق کے باعث محمد ﷺ کی وفات سے قبل ہی اضطراب پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسلام نے توحید کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور بت پرستی کو مٹانا اس کا مقصد اولین تھا۔ اسلام کی تعلیمات کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ عقیدہ توحید عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا لیکن ساتھ ہی عربوں کو یہ بھی خدشہ لاحق ہو گیا کہ عقیدہ توحید عرب کی سیاسی وحدت پر منتج نہ ہو اور اہل بادیہ آزادی کی نعمت سے محروم ہو جائیں۔

یہی خیالات تھے جن کے باعث یمن اور بعض دوسرے علاقے مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر جدوجہد شروع کر دی۔

ارتداد میں اجنبی ہاتھ:

مستشرقین کا یہ خیال صحیح ہو یا غلط، بہ ہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربوں کی اس بغاوت اور فتنہ ارتداد میں اجنبی ہاتھ ضرور تھا۔ ایرانیوں اور رومیوں کو جب محمد ﷺ کی طرف سے اسلام کی دعوت پہنچی اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے اسلام کے اثر و نفوذ کو بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ قبل اس کے کہ اسلام کا عظیم الشان سیلاب ان کی طرف رخ کرلے خود عربوں میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر دیے جائیں اور انہیں اس نئے دین کے خلاف بھڑکا کر خود عربوں کو اپنے ہم قوم مسلمانوں سے بھڑا دیا جائے۔

اس فتنے کے بانیوں نے محمد ﷺ کی زندگی ہی میں حصول مقصد کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ آپ کی وفات سے مفسدین کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انہوں نے پوری قوت سے بغاوت کے شعلے بھڑکا کر مسلمانوں کو انتہائی نازک مرحلے سے دو چار کر دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنے کا مقابلہ کس طرح کیا، عربوں کا اتحاد دوبارہ کس طرح قائم کیا اور اسلامی سلطنت کی بنیادوں کو دوبارہ استوار کرنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے؟ ان سب باتوں کا جواب آئندہ صفحات میں ملے گا۔

(۴)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی

خلیفہ اول کا پہلا حکم:

عرب قبائل کی بغاوت کے نتائج وعواقب سے نہ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بے خبر تھے اور نہ انصار و مہاجرین کا کوئی فرد۔ اب ان کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ آیا اس موقع پر سب سے پہلے ارتداد کے فتنے کو کچلا جائے یا محمد ﷺ کے احکام کی تعمیل میں سرحدوں کی حفاظت کے لیے اسامہ کے لشکر کو شام روانہ کر دیا جائے؟ اگرچہ وہ وقت مسلمانوں کے لیے نازک تھا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمام خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے بیعت کے بعد پہلا حکم یہ صادر فرمایا کہ اسامہ کا لشکر روانہ ہو جائے۔

اسامہ کے لشکر میں مہاجرین اور انصار کے معزز ترین افراد شامل تھے اور اسے محمد ﷺ نے شام کی سرحدوں پر رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ جنگ موتہ اور غزوہ تبوک کے بعد آپ کو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں اسلام اور مسیحیت کے بڑھتے ہوئے اختلاف اور یہود کی فتنہ انگیزی کے باعث اہل روم عرب پر حملہ نہ کر دیں۔ جنگ موتہ اور غزوہ تبوک میں جو واقعات پیش آچکے تھے ان سے آپ کے ان خدشات کو مزید تقویت پہنچی۔ جنگ موتہ میں محمد ﷺ کے مقرر کردہ تینوں قائدین: زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ بالآخر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے لشکروں کو رومیوں کے نرغے سے نکالا اور انہیں بہ حفاظت مدینہ لے آئے گو انہیں جنگ میں فتح حاصل نہ ہو سکی مگر اتنی قلیل التعداد فوج کو عظیم الشان لشکر کے محاصرے سے نکال لانا بجائے خود نہایت شجاعانہ کارنامہ تھا۔ اس کے بعد محمد ﷺ بہ نفس نفیس مسلمانوں کو ہمراہ لے کر جانب تبوک روانہ ہوئے لیکن دشمن کو میدان میں نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے شام کے اندرونی علاقوں میں گھس کر مسلمانوں کے حملے سے محفوظ ہو جانے میں اپنی خیریت سمجھی۔ ان غزوات کے باعث مسلمانوں کے متعلق رومیوں کے ارادے بہت خطرناک ہو گئے اور انہوں نے عرب کی سرحد پر پیش قدمی کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی وجہ سے محمد ﷺ نے اسامہ کو بہ طور پیش بندی شام روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔

حضرت محمد ﷺ کی ہدایت:

اسامہ بیس برس کے نوجوان تھے۔ محمد ﷺ نے انہیں اس لیے سردار لشکر مقرر فرمایا تھا کہ ایک طرف تو نوجوانوں میں خدمت دین کے لیے آگے آنے اور اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا شوق پیدا ہو، دوسری طرف اسامہ اپنے والد زید بن حارثہ کا انتقام لے سکیں جنھیں رومیوں نے جنگ موتہ میں شہید کر دیا تھا۔ آپ نے اسامہ کو حکم دیا کہ وہ فلسطین میں بلقاء اور داروم کی حدود میں پہنچ کر دشمن پر حملہ کریں اور اس ہوشیاری سے کام انجام دیں کہ جب تک وہ دشمن کے سر پر نہ پہنچ جائیں اسے مسلمانوں کی آمد کا پتہ نہ لگے۔ انہیں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ فتح کے بعد فوراً مدینہ واپس آجائیں۔

حضرت محمد ﷺ کی اسامہ رضی اللہ عنہ سے محبت:

اسامہ رضی اللہ عنہ زمانہ طفولیت ہی سے محمد ﷺ کے منظورِ نظر اور محبوب تھے۔ آپ کو ان کی اس قدر پاس داری تھی کہ صلح حدیبیہ کے اگلے سال جب آپ عمرہ کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو انہیں اپنی سواری کے پیچھے بٹھا لیا اور اسی حالت میں مکہ میں داخل ہوئے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ بھی دلیری اور بہادری میں کسی سے کم نہ تھے اور یہ صفات عہد طفلی ہی سے ان میں نمایاں تھیں۔ جنگ احد کے موقع پر وہ بچے تھے اور بچوں کو لشکر کے ساتھ جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن جب اسلامی لشکر مدینہ سے روانہ ہوا تو اسامہ رضی اللہ عنہ راستے میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن صغرسنی کی وجہ سے انہیں واپس کر دیا گیا۔ جنگ حنین میں انہوں نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے اور ثابت قدمی کا بے نظیر مظاہرہ کیا۔

اسامہ کی امارت پر اعتراض:

ان اوصاف کے باوجود بعض لوگوں کو اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت پر اعتراض تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اسامہ سے محمد ﷺ کی محبت اور اسامہ کی بہادری مسلم لیکن ایسے لشکر کی امارت جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں، ایک بچے کو سپرد کرنا مناسب نہیں۔

ان چہ میگوئیوں کی خبر محمد ﷺ کو بھی عین مرض الموت میں مل گئی۔ اس وقت اسامہ کا لشکر مقام جرف میں مقیم تھا اور کوچ کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ آپ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو حکم دیا کہ وہ آپ کو نہلائیں۔ چنانچہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی گئیں جن سے آپ کا بخار اُتر گیا۔ اس وقت آپ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر حمد وثناء اور اصحاب احد کے لیے دعا کرنے کے بعد فرمایا: ''اے لوگو! اسامہ لے لشکر کو جانے دو۔ تم نے اس کی امارت پر اعتراض کیا ہے اور اس سے پہلے تم اس کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو۔ اس کے باوجود وہ امارت کے قابل ہے اور اس کا باپ بھی امارت کے لائق تھا۔'' جب محمد ﷺ کے مرض میں اضافہ ہوگیا تو اسامہ کا لشکر جرف ہی میں رک گیا۔ اسامہ بیان کرتے ہیں: ''جب محمد ﷺ کی بیماری

بڑھ گئی تو میں اور میرے چند ساتھی مدینہ آئے۔ میں آپ کے پاس گیا۔ آپ کو شدید ضعف تھا اور بول نہ سکتے تھے۔ آپ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے اور مجھ پر رکھ دیتے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ میرے لیے دعا فرما رہے ہیں۔"

محمد ﷺ کی وفات کے روز علی الصباح اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کوچ کی اجازت مانگی آپ ﷺ نے اجازت دے دی لیکن کچھ ہی دیر بعد آپ ﷺ کی وفات ہو گئی اور اسامہ رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ہمراہ جرف سے مدینہ آ گئے۔

محمد ﷺ کی تجہیز و تکفین میں اسامہ رضی اللہ عنہ اہل بیت کے ساتھ شریک رہے۔ وہ اور محمد ﷺ کے غلام شقران آپ کے جسدِ اطہر پر پانی ڈالتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ غسل دیتے تھے۔

بیعت کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو کوچ کا حکم دیا تو معترضین کی زبانیں پھر حرکت میں آ گئیں اور وہ کوئی ایسا حیلہ تلاش کرنے لگے جس کے ذریعے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کے روانہ کرنے یا کم از کم اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے سے باز رکھ سکیں۔ انہوں نے خلافت کے بارے میں مہاجرین اور انصار کے اختلافات اور عرب قبائل کی بغاوت کا سہارا لیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا کر عرض کیا کہ موجودہ دور مسلمانوں کے لیے سخت نازک اور پر خطر ہے، ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں، اس موقع پر لشکر کو شام بھیج کر مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر کرنا مناسب نہ ہو گا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت ثابت قدمی اور اولوالعزمی سے فرمایا: "مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مجھے یہ یقین ہو کہ جنگل کے درندے مجھے اٹھا کر لے جائیں گے تو میں اسامہ کے اس لشکر کو روانہ ہونے سے نہیں روک سکتا جسے محمد ﷺ نے روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔ اگر مدینہ میں میرے سوا کوئی بھی متنفس باقی نہ رہے تو بھی میں اس لشکر کو ضرور روانہ کروں گا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے، جب اُسامہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ان کے خلاف چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں تو انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جائیے اور ان سے کہیے کہ وہ لشکر کی روانگی کا حکم منسوخ کر دیں تاکہ بڑھتے ہوئے فتنوں کے مقابلے میں یہ لشکر ممد و معاون ہو سکے اور مرتدین کو آسانی سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔ ادھر انصار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لشکر کو روانہ کرنے ہی پر مصر ہوں تو ہماری طرف سے ان کی خدمت میں یہ درخواست کریں کہ وہ کسی ایسے آدمی کو لشکر کا سردار مقرر فرمائیں جو عمر میں اسامہ رضی اللہ عنہ سے بڑا ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر سب سے پہلے اسامہ کا پیغام دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر جنگل کے کتے اور بھیڑیے مدینہ میں داخل ہو کر مجھے اٹھا لے جائیں تو بھی میں وہ کام کرنے سے باز نہ آؤں گا جسے محمد ﷺ نے کرنے کا حکم دیا ہے۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ناراضگی:

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار کا پیغام دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غضب ناک ہو کر فرمایا: "اے ابن خطاب! اُسامہ رضی اللہ عنہ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر مقرر فرمایا ہے اور تم مجھے کہتے ہو کہ میں اسے اس کے عہدے سے ہٹا دوں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پشیمان ہو کر سر جھکائے واپس چلے آئے۔ جب لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا جواب دیا؟ تو انہوں نے بڑے غصے سے کہا: "میرے پاس سے فوراً چلے جاؤ۔ محض تمہاری بدولت مجھے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھڑکیاں کھانی پڑیں۔"

اس واقعے سے اس مسلک کی ایک جھلک ہمارے سامنے آتی ہے جس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ابتدائے خلافت سے آخر وقت تک گامزن رہے۔ اسی مسلک کا مظاہرہ آپ نے اس وقت کیا جب فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ رضی اللہ عنہ سے اپنے والد کی میراث کا مطالبہ کرنے آئی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: "واللہ! مجھ پر یہ فرض ہے جو کام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھ چکا ہوں خود بھی وہی کروں اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کروں۔"

اور یہی نمونہ آپ نے اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بھیجتے وقت دکھایا۔

لشکر کو روانگی کا حکم:

معترضین کے اعتراضات کو رد فرمانے کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ مدینہ کا کوئی شخص جو اس لشکر میں شامل تھا، پیچھے نہ رہے بلکہ مدینہ سے نکل کر مقام جرف میں لشکر سے مل جائے۔ آپ نے فرمایا: "اے لوگو! میں تمہاری مانند ایک انسان ہوں۔ میں نہیں جانتا آیا تم مجھ پر وہ بوجھ رکھو گے جس کے اٹھانے کی طاقت صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام جہانوں میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب فرمایا تھا اور تمام آفات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ رکھا تھا۔ میں تو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والا ہوں، کوئی نئی چیز تمہارے سامنے پیش نہیں کرنے والا نہیں۔ اگر میں سیدھا رہوں تو میری پیروی کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔"

یہ تھا خلیفہ اول کا نظریہ سیاست۔ انہوں نے واقعی اس سے کبھی انحراف نہ کیا اور سب لوگوں سے بڑھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کی۔ آپ کی زندگی میں جس قلبی تعلق کا ثبوت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دیا اس کا حال گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ایمان انہیں تھا اسے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی متزلزل نہ کر سکتی تھی اور آپ سے جو قلبی و روحانی تعلق تھا اس کی نظیر روئے زمین پر کوئی نہیں پائی جاتی تھی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کامل ایمان اور یقین سے کرتے تھے اور اس ایمان و

اخلاص میں انہوں نے جس قدر ترقی کی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی گرد کو نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہنچ سکے، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، نہ کوئی اور شخص۔

روانگی لشکر کی تیاریاں:

جرف پہنچ کر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جواب سے مطلع کیا تو انہیں خلیفہ کے احکام کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی جرف تشریف لائے اور اپنے سامنے لشکر کو رخصت کیا۔ روانگی کے وقت لوگوں نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ سوار ہیں اور خلیفہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں اور یہ کچھ اس لیے تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اسامہ رضی اللہ عنہ کی تعظیم و تکریم کا جذبہ پیدا ہو اور وہ آئندہ اپنے سردار کے تمام احکام کی تعمیل بے چون و چرا کیا کریں۔

اسامہ رضی اللہ عنہ کو بڑی شرم آئی کہ وہ تو گھوڑے پر سوار ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے محبوب ساتھی خلیفۃ المسلمین اور مسلمانوں کا سب سے قابل تعظیم بڑھاپے کے باوجود پیدل چل رہا ہے اور انہوں نے کہا: ''اے خلیفہ محمد! یا تو آپ بھی سوار ہو جائیے ورنہ میں اتر پڑتا ہوں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''واللہ! نہ تم اترو گے نہ میں سوار ہوں گا۔ کیا ہوا اگر میں نے ایک گھڑی اپنے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود کر لیے۔''

جب لشکر کی روانگی کا وقت آیا تو انہوں نے اسامہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اگر تم چاہو تو میری مدد کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑتے جاؤ۔''

اسامہ نے بڑی خوشی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس جانے کی اجازت دے دی۔

لشکر کو نصیحتیں:

واپسی کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوج کے سامنے کھڑے ہوئے اور یہ تقریر فرمائی: ''اے لوگو! ٹھہر جاؤ۔ میں تمہیں دس نصیحتیں کرتا ہوں، انہیں یاد رکھنا۔ خیانت نہ کرنا۔ بدعہدی نہ کرنا۔ چوری نہ کرنا۔ مقتولوں کے اعضاء نہ کاٹنا۔ بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درخت کاٹنا نہ جلانا۔ پھل والے درخت نہ کاٹنا۔ کسی بھیڑ، گائے یا اونٹ کو سوا کھانے کے ذبح نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرو گے جنھوں نے اپنے آپ کو گرجاؤں میں عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے اور وہ رات دن انہیں میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے ہیں، تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس پہنچو گے جو تمہارے لیے برتنوں میں مختلف کھانے لائیں گے، جب بھی کھانا شروع کرنا اس پر اللہ کا نام ضرور لے لیا کرنا تم ایسے لوگوں سے ملو گے جنھوں نے سر کا درمیانی حصہ تو منڈوا دیا ہوگا لیکن چاروں طرف بڑی بڑی لٹیں لٹکتی ہوں گی، انہیں تلوار سے قتل کر ڈالنا۔ اپنی حفاظت اللہ کے نام سے کرنا اللہ تمہیں شکست اور وبا سے محفوظ رکھے۔

اسامہ کو یہ نصیحت کی: محمد ﷺ نے تمہیں جو کچھ کرنے کا حکم دیا تھا وہ سب کچھ کرنا۔ جنگ کی ابتداء قضاعہ سے کرنا۔ اس کے بعد آبل جانا محمد ﷺ کے احکام کی بجا آوری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا۔

لشکر، بلقاء کی جانب کوچ:

یہ نصیحتیں فرما کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ واپس آ گئے اور اسامہ شام روانہ ہو گئے۔ مئی کا مہینہ تھا اور سخت گرمی کے دن تھے۔ لشکر تپتے ہوئے صحراؤں اور جنگلوں کو قطع کرتا ہوا بیس روز بعد بلقاء پہنچ گیا۔ بلقاء کے قریب ہی جنگ موتہ ہوئی تھی جس میں اسامہ ؓ کے والد زید بن حارثہ اور ان کے دونوں ساتھی جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ شہید ہوئے تھے۔ اسامہ نے اپنے لشکر کو وہیں ٹھہرایا اور فوج کے مختلف دستوں کو آبل اور قبائل قضاعہ پر دھاوا بولنے کے لیے روانہ کیا۔ ان جنگوں میں مسلمانوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ بے شمار رومی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا اور اس طرح اسامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کا انتقام لینے میں کامیاب ہو گئے۔

محمد ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو حملہ کرنے کے متعلق جو ہدایات دی تھیں انہوں نے ان پر پوری طرح عمل کیا۔ جہاں جہاں جانے کے لیے آپ نے ارشاد فرمایا تھا وہاں گئے اور آپ کی ہدایات کے مطابق دشمن پر اس طرح اچانک حملہ کیا کہ جب تک مسلمانوں کے دستے رومیوں کے سروں پر نہ پہنچ گئے انہیں مسلمانوں کی آمد کا مطلق پتا نہ چل سکا اور فتح کے بعد فوراً مدینہ واپس آ گئے۔

اسامہ رضی اللہ عنہ کی کامیاب واپسی:

دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے اسامہ کی شان اور عزت و توقیر میں بے حد اضافہ ہو گیا وہی مہاجرین اور انصار جنھوں نے اس سے پہلے تقرر اسامہ کی مخالفت کی تھی، اب خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ بڑے فخر سے اسامہ کے کارنامے بیان کرتے اور محمد ﷺ کا یہ قول بار بار دہراتے تھے: ''اسامہ امارت کے لائق ہے اور اس کا باپ بھی امارت کے لائق تھا۔''

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس مہم میں سرحدی جھڑپوں پر اکتفا کی۔ انہوں نے رومیوں کا تعاقب کرنے اور رومی سرحد پر بھرپور حملہ کر کے اندرونی علاقوں میں گھس کر اپنی کامیابی سے مزید فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی کیونکہ ان کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ عرب کی سرحد رومیوں کے حملے سے محفوظ رہے اور رومی مسلمانوں کو کمزور پا کر مدینہ سے یہودیوں کی جلاوطنی کا انتقام لینے کے بہانے عرب کی سرحدوں میں گھس کر اسے اپنے گھوڑوں کے سموں سے پامال نہ کرنے پائیں۔

لیکن اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ رومی ایک وسیع خطہ زمین پر قابض ہونے کی وجہ سے زبردست قوت و طاقت کے مالک تھے مسلمانوں کو بھی اس حقیقت کا پوری طرح علم تھا۔ محمد ﷺ نے اپنی وفات سے تین سال قبل بے دحیہ کلبی کو تبلیغی خط دے کر ہرقل کی جانب روانہ فرمایا۔ ہرقل کا ستارہ اس وقت عروج پر تھا

اور دحیہ کلبی نے روم کے تمام حالات اور رومیوں کی قوت و طاقت کا بہ غور مطالعہ کیا۔ علاوہ بریں اسی سال یہود خیبر، فدک اور تیما میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر فلسطین پہنچے تھے اور ان کے دل جوشِ انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے فلسطین پہنچ کر رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور یہ کہہ کر انہیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی کہ جب رومی ایران جیسی زبردست طاقت پر فتح یاب ہو سکتے ہیں تو مسلمانوں پر بھی ہو سکتے ہیں؟

ان حالات میں بہ ظاہر یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ سرحدی فتوحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندرون ملک میں بھی پیش قدمی کرتے اور جو کام دو سال بعد ہوا اس کا آغاز اسی مہم سے کر دیتے۔

لشکر کا استقبال:

جب اُسامہ اپنے مظفر و منصور لشکر کو لے کر مدینہ کے قریب پہنچے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کبار مہاجرین اور انصار کے ہمراہ شہر سے باہر نکل کر بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ اس وقت سب مسلمانوں کے چہرے فرحت و انبساط سے کھلے ہوئے تھے۔ مدینہ میں داخل ہوتے ہی اسامہ ذ نے مسجد نبوی کا رخ کیا اور شکرانے کے طور پر نماز دوگانہ ادا کی۔ مدینہ کو ان کی واپسی چالیس دن اور بعض روایات کے مطابق ستر دن بعد ہوئی۔ بعض مستشرقین نے اس مہم کی اہمیت گھٹانے اور اس کا شمار معمولی سرحدی جھڑپوں میں کرنے کی ناکام کوشش کی ہے چنانچہ مستشرق فکا جس نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اُسامہ رضی اللہ عنہ کے متعلق مقالہ لکھا ہے، کہتا ہے: ''جنگ ہائے ارتداد کے دوران میں مسلمانوں کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا انہیں دیکھتے ہوئے اُسامہ کی فتح یابی مسلمانوں کی نظروں میں زبردست اہمیت حاصل کر گئی، حالانکہ اُسامہ کی کامیابی کو اس کے سوا اور کوئی اہمیت حاصل نہ تھی کہ وہ بعد میں پیش آنے والی شامی لڑائیوں کی ابتداء ثابت ہوئی۔ اس مہم میں اُسامہ کا کارنامہ صرف اس حد تک ہے کہ انہوں نے بعض قبائل پر اچانک حملہ کر دیا اور کسی بڑے رومی لشکر سے مڈ بھیڑ ہوئے بغیر مال غنیمت لے کر واپس چلے آئے۔ اس کے باوجود مسلمانوں، باغی عربوں اور رومیوں تینوں فریقوں پر اس کا دور رس اثر پڑا۔ جب باغی اور مرتد قبائل نے لشکر اُسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی کی خبر سنی تو وہ کہنے لگے ''اس لشکر کے بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان زبردست قوت طاقت کے مالک ہیں، اگر ان کے پاس قوت و طاقت نہ ہوتی تو وہ ہرگز ایسے موقع پر اس لشکر کو نہ بھیجتے جب سارا عرب ان کے خلاف متحد ہو چکا تھا۔''

ہرقل کو بھی جب اسلامی لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ گھبرا گیا اور اس نے ایک بڑی فوج مسلمانوں سے مقابلے کے لیے بلقاء روانہ کی۔ یہ واقعات صراحتہً اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس غزوہ کے باعث رومی اور مرتد عرب قبائل، دونوں مسلمانوں کی قوت و طاقت سے مرعوب ہو گئے۔ اسی وجہ سے دومتہ الجندل کے سوا عرب کے شمالی حصے کے رہنے والوں نے مدینہ پر حملہ کرنے میں پس و پیش کیا حالانکہ اس سے قبل ان کا مصمم ارادہ تھا کہ مدینہ پر چڑھائی کر کے مسلمانوں کو رومی سرحدوں پر حملہ کرنے کا مزہ چکھایا جائے۔

پھر بھی شمالی عربوں کے سوا عرب کے دوسرے علاقوں کا یہ حال نہ تھا اس سے قبل تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ محمد ﷺ کی زندگی کے آخری دور میں بغاوت کی روح کس طرح عرب قبائل میں سرایت کر گئی تھی اور کئی قبائل میں نبوت کے مدعی پیدا ہو گئے تھے۔ اگر آپ کی غایت درجہ حزم و احتیاط اور مسلمانوں کی جانب سے قوت و طاقت کے مظاہروں کی وجہ سے ان قبائل اور مدعیان نبوت کو خوف و خطر لاحق نہ ہوتا تو آپ کی زندگی ہی میں ہر طرف سے بغاوت کے علم بلند ہو جاتے۔ محمد ﷺ کی وفات کے بعد باغیوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے اپنے خطرناک مخفی ارادوں کا اظہار کھلم کھلا شروع کر دیا۔ اس وقت مسلمان قلت تعداد اور کثرت اعدا کی وجہ سے بے حد مضطرب تھے۔ اگر اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بلند پایہ سیاست کا مظاہرہ نہ کیا جاتا اور مضبوط و محکم پالیسی وضع نہ کی جاتی تو مسلمانوں کا خاتمہ عین ممکن تھا۔

۵
منکرین زکوٰۃ سے جنگ

اُسامہ شام جاتے ہوئے ابھی راستے ہی میں تھے کہ محمد ﷺ کی خبر وفات سارے عرب میں پھیل گئی اور ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ ان شعلوں کی زد میں سب سے زیادہ یمن کا علاقہ تھا، اگرچہ آگ بھڑکانے والا شخص عنسی قتل ہو چکا تھا۔ بنی حنیفہ میں میسلمہ اور بنی اسد میں طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کر کے ہزاروں لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا: "اسد اور غطفان کے حلیف قبیلوں کا نبی ہمیں قریش کے نبی سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ محمد وفات پا چکے ہیں اور طلیحہ زندہ ہے۔"

مدینہ میں بغاوتوں کی خبر:

جب ان بغاوتوں کی خبر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب تک ان علاقوں کے عمال اور امراء کی طرف سے تمام واقعات کی مکمل رپورٹیں موصول نہ ہو جائیں۔ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ امراء کی طرف سے دھڑا دھڑ رپورٹیں پہنچنے لگیں۔ ان رپوٹوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ باغیوں کے ہاتھوں نہ صرف سلطنت کا امن خطرے میں ہے بلکہ ان لوگوں کی جانوں کو بھی سخت خطرہ ہے جنھوں نے ارتداد کی رو میں باغیوں کا ساتھ نہیں دیا اور بہ دستور اسلام پر قائم ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے پوری قوت سے بغاوتوں کا مقابلہ کرنے اور باغیوں کو ہر قیمت پر زیر کر کے صورتِ حالت کو قابو میں لانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس ہمہ گیر شورش کے نتیجے میں بعض قبائل نے کلیۃً اسلام سے انحراف اختیار کر لیا تھا۔ لیکن بعض قبائل اسلام پر تو قائم تھے البتہ زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

موخر الذکر گروہ میں سے بھی بعض لوگ تو ایسے تھے جو دل و جان سے مال و دولت پر فریفتہ تھے اور اللہ کے راستے میں مالی قربانی کرنا ان کے لیے بے حد دشوار تھا۔ لیکن بعض لوگ اسے تاوان کہتے تھے اور ان کے خیال میں محمد ﷺ کی وفات کے بعد اہل مدینہ کے مقرر کردہ امیر کو ان سے زکوٰۃ یا بہ الفاظ دیگر ادائے تاوان کے مطالبے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ چنانچہ ہر دو فریق نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کرتے ہوئے

اعلان کر دیا کہ نہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر تسلیم کرتے ہیں اور نہ ان کے احکام کی بجا آوری کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مدینہ کے نواحی قبائل عبس اور ذبیان منکرین زکوٰۃ میں شامل تھے اور مسلمانوں کے لیے ان قبائل سے عہدہ برا ہونے کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ ان سے لڑائی چھیڑ دینا آسان کام نہ تھا کیونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ لشکر اسامہ کو شام روانہ فرما چکے تھے اور مدینہ میں بہت ہی تھوڑی تعداد میں لڑائی کے قابل افراد رہ گئے تھے۔ اس حالت میں مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ منکرین زکوٰۃ کو ادائے زکوٰۃ کے لیے مجبور نہ کیا جائے اور نرمی و ملائمت سے انہیں ساتھ ملا کر ان قبائل کے مقابلے میں آمادہ پیکار کیا جائے جنھوں نے کھلم کھلا اسلام سے انحراف کیا تھا۔ دوسرا یہ کہ ان سے جنگ کی جائے یہ موخر الذکر راستہ اختیار کرنے سے مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہو جاتی اور اسلامی لشکر کی غیر موجودگی میں بپھرے ہوئے باغی قبائل سے لڑائی چھیڑ دینا آسان کام بھی نہ تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ کو جمع کر کے ان سے منکرین زکوٰۃ کے ساتھ جنگ کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور بیشتر مسلمانوں کی یہ رائے تھی کہ ہمیں اللہ اور اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگوں سے ہرگز نہ لڑنا چاہیے بلکہ انہیں ساتھ ملا کر مرتدین کے خلاف مصروف پیکار ہونا چاہیے۔ بعض لوگ اس رائے کے مخالف بھی تھے۔ لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

بحث طول پکڑ گئی اور بالآخر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خود اس میں دخل دینا پڑا۔ وہ اس رائے کے حامی تھے کہ منکرین زکوٰۃ سے جنگ کر کے بہ زور ادائے زکوٰۃ پر مجبور کرنا چاہیے۔ اس امر میں ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ بحث کرتے ہوئے پرزور الفاظ میں فرمایا:

”واللہ! اگر منکرین زکوٰۃ مجھے ایک رسی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔“

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جن کی رائے میں اس موقع پر منکرین زکوٰۃ سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھا قدرے تیزی میں آ گئے اور کہا: ”ہم ان لوگوں سے کس طرح جنگ کر سکتے ہیں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہہ دیں۔ جو شخص یہ کلمہ زبان سے ادا کر دے گا اس کی حفاظت جان و مال مسلمانوں کے ذمے ہوگی البتہ جو حقوق اس پر واجب ہوں گے ان کی ادائی کا مطالبہ اس سے ضرور کیا جائے گا۔ ہاں اس کی نیت کا حساب اللہ اس سے خود لے گا۔“

لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دلائل کا کچھ اثر نہ ہوا اور انہوں نے فرمایا: ”واللہ! میں

صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے اور محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے ذمے جو حقوق ہوں ان کی ادائی کا مطالبہ ان سے بہ ہر حال کیا جائے گا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: "یہ جواب سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ اللہ نے منکرین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو شرح صدر عطا کیا ہے اور حق وہی ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔"
اس واقعے سے ملتا جلتا ایک واقعہ خود محمد ﷺ کو بھی پیش آیا تھا۔ طائف سے قبیلہ ثقیف کا وفد آپ کی خدمت میں قبولِ اسلام کی غرض سے حاضر ہوا لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ انہیں صلوٰۃ معاف کر دی جائے۔ محمد ﷺ نے ان کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: "اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں صلوٰۃ نہیں۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ محمد ﷺ کے نقش قدم پر چلنا اپنا فرض اولین خیال کرتے تھے، انہوں نے بھی یہی فرمایا: "واللہ! میں ان لوگوں سے ضرور لڑوں گا جو صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں۔"

دشمن قبائل کے وفود:

باغی قبائل عبس، ذبیان، بنوکنانہ، غطفان اور فزارہ نے، جو مدینہ کے گرد و نواح میں آباد تھے، مسلمانوں سے لڑنے کے لیے فوجیں اکٹھی کیں اور مدینہ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ قبائل دو حصوں میں منقسم تھے۔ ایک حصہ ربذہ کے قریب مقام ابرق میں خیمہ زن تھا اور دوسرا ذی القصہ میں جو محلہ کے قریب نجد کے راستے میں واقع ہے۔ ان فوجوں کے سرداروں نے پہلے اپنے وفود مدینہ روانہ کیے جنھوں نے وہاں پہنچ کر بعض لوگوں کے ذریعے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لیے تیار ہیں البتہ انہیں ادائے زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا جو پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے چکے تھے یعنی "اگر انہوں نے زکوٰۃ کی ایک رسی بھی ادا کرنے سے انکار کیا تو میں اس رسی کی خاطر ان سے جنگ کروں گا۔"

وفود کی ناکام واپسی:

چنانچہ وفود خائب و خاسر ہو کر واپس اپنے اپنے لشکروں میں چلے گئے لیکن قیام مدینہ کے دوران میں انہوں نے وہاں کے حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کر لیا تھا اور انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ ان دنوں اہل مدینہ بہت کمزور ہیں اور شہر کو بیرونی طاقت کے حملے سے بچا نہیں سکتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دوربین آنکھ نے ان لوگوں کے ارادوں کو بھانپ لیا چنانچہ وفود کے واپس

جانے کے بعد انہوں نے اہل مدینہ کو جمع کر کے فرمایا:

"تمہارے چاروں طرف دشمن ڈیرے ڈالے پڑا ہے اور اسے تمہاری کمزوریوں کا علم ہو گیا ہے نہ معلوم دن اور رات کے کس حصے میں وہ لوگ تم پر چڑھ آئیں۔ وہ تم سے ایک منزل کے فاصلے پر خیمہ زن ہیں۔ ابھی تک وہ اس امید میں تھے کہ شاید تم ان کی شرائط قبول کر لو گے۔ لیکن اب ہم نے ان کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا ہے اس لیے وہ تم پر حملہ کرنے کی تیاریاں کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو لڑائی کے لیے تیار رکھو۔"

اس کے بعد آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں ایک ایک دستہ دے کر مدینہ کے بیرونی راستوں پر متعین کر دیا۔ دوسرے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مسجد نبوی میں پہنچ جائیں اور لڑائی کی تیاری کریں۔

عہد صدیقی کا پہلا معرکہ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ ابھی تین روز بھی نہ گزرے تھے کہ منکرین زکوٰۃ نے مدینہ پر چڑھائی کر دی اور تہیہ کر لیا کہ خلیفہ سے اپنی بات منوا کر ہی واپس جائیں گے۔

مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے جاسوسوں نے منکرین زکوٰۃ کے ارادوں سے علی رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کو مطلع کر دیا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس خبر بھیجی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں تو ہدایت کی کہ وہ اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہر کر شہر کے تمام ناکوں کی حفاظت کریں، اور خود اونٹ پر سوار ہو کر مسجد نبوی میں تشریف لائے اور تمام مسلمانوں کو جو وہاں جمع تھے ساتھ لے کر ان لوگوں کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے جو بے خبری میں مسلمانوں پر شب کو خون مارنا چاہتے تھے۔

ان قبائل کے وہم میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی ان کے مقابلے میں آئے گا کیونکہ انہیں اپنے وفود کے ذریعے سے اہل مدینہ کی کمزوری کا علم ہو گیا تھا۔ لیکن جب ان کی توقعات کے قطعاً برعکس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان پر اچانک حملہ کر دیا تو ان کی سراسیمگی کی انتہا نہ رہی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ مسلمانوں نے بے ذی حسا تک ان کا تعاقب کیا۔

جب حملہ آور قبائل مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تو انہوں نے اس خیال سے کہ مدینہ میں ان کا مقابلہ کرنے والی کوئی طاقت موجود نہیں اپنے چیدہ بہادروں کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ لیکن جب قبائل شکست کھا کر بھاگے اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کرنا شروع کیا تو وہ لوگ جنھیں پیچھے چھوڑ دیا گیا، موقع کی نزاکت بھانپ کر مسلمانوں کے بالمقابل آ گئے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ رات بھر لڑائی ہوتی رہی لیکن کسی بھی فریق کے حق میں فیصلہ نہ ہو سکا۔ بالآخر مخالفین نے کمندیں پھینک کر مسلمانوں کے اونٹوں کی گردنوں میں ڈالنی شروع کیں تاکہ مسلمانوں کو گرفتار کر سکیں۔ یہ اونٹ جنگی نہ تھے کہ اس چال کو سمجھ سکتے اُنھوں نے خوفزدہ ہو کر مدینہ کی طرف واپس بھاگنا شروع کیا اور اپنے سواروں کو لیے شہر میں داخل ہو گئے۔

عبس، ذبیان اور ان کے مددگار، مسلمانوں کے بھاگ جانے سے بڑے خوش ہوئے اور اسے اپنی فتح مندی اور مسلمانوں کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے مقام ذی القصہ کے خیمہ زن لوگوں کو ان تمام واقعات کی اطلاع دی۔ ذی القصہ والے بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور آپس میں صلاح مشورہ ہونے لگا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ وہ اس وقت تک واپس نہ جائیں جب تک مسلمانوں کو ناکوں چنے چبوا کر اپنی پیش کردہ شرائط قبول کرنے پر مجبور نہ کر دیں۔

ادھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمانوں نے اس رات پلک تک نہ جھپکائی بلکہ دشمن سے لڑنے کی تیاریوں میں مشغول رہے۔ رات کے آخری تہائی حصے میں وہ مسلمانوں کو لے کر دوبارہ دشمن کی جانب روانہ ہوئے۔ پہلے کی طرح اب انہوں نے اس امر کی کامل احتیاط کی کہ دشمن کو کانوں کان مسلمانوں کے آنے کی خبر نہ ہونے پائے۔ صبح صادق کا ظہور ہوا تو مسلمان اور ان کے دشمن قبائل ایک ہی میدان میں تھے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مسلمان لڑائی کے لیے پوری طرح تیار تھے اور دشمن بڑے اطمینان و آرام سے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے بے دھڑک اپنی تلواریں دشمن کے سینوں میں پیوست کرنی شروع کر دیں۔ وہ لوگ اس اچانک حملے سے ہڑبڑا کر اٹھے اور اسی نیم بیداری کی حالت میں لڑنا شروع کر دیا لیکن تابہ کے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے اپنی تلواروں کے خوب جوہر دکھائے اور ابھی سورج نے اپنا چہرہ افق عالم پر ظاہر ہی کیا تھا کہ دشمن کے لشکر نے نہایت بے ترتیبی کی حالت میں بھاگنا شروع کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ذی القصہ تک ان کا تعاقب کیا۔ آخر میں جب یہ دیکھ لیا کہ وہ دوبارہ واپس آنے کی جرأت نہ کریں گے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس جگہ واپس آگئے جہاں تھوڑی دیر قبل میدان کارزار گرم تھا اور نعمان بن مقرن، سالار میمنہ، کو تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ اس جگہ چھوڑ کر خود مدینہ تشریف لے آئے۔

جنگ ذی القصہ اور جنگ بدر میں مشابہت:

اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایمان و یقین، عزم و ثبات اور حزم و احتیاط کا جو مظاہرہ کیا اس سے مسلمانوں کے دلوں میں عہد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی یاد تازہ ہو گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کی یہ پہلی لڑائی بڑی حد تک جنگ بدر سے مشابہ ہے۔ جنگ بدر کے روز مسلمان صرف تین سو تیرہ کی قلیل تعداد میں تھے جبکہ مشرکین مکہ کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی، اس کے بالمقابل عبس، ذبیان اور غطفان کے قبائل بھاری جمعیت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے۔ جنگ بدر کے موقع پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے حیرت انگیز ایمان کا مظاہرہ کیا تھا اور اسی لیے اللہ نے انہیں مشرکین پر فتح عطا فرمائی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں نے ایمان کامل کا ثبوت دیا اور دشمن پر فتح حاصل کی۔ جس طرح جنگ بدر دور رس نتائج کی حامل تھی۔ اسی طرح اس جنگ میں بھی مسلمانوں

کی فتح نے اسلام کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا عزم و ثبات:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عزم و ثبات اور ایمان و ایقان کا جو مظاہرہ کیا وہ چنداں قابل تعجب نہیں کیونکہ انہوں نے آغاز اسلام ہی سے اپنا مقصد اولین یہ قرار دے رکھا تھا کہ وہ ہر کام میں محمد ﷺ کی پیروی اختیار کریں گے اور ان کی ساری زندگی اس امر کی شاہد ہے کہ انہوں نے ہر موقع پر اپنے اس عہد کو پوری طرح نبھایا اور بڑی سے بڑی روک بھی انہیں ان کے بلند مقصد سے علیحدہ نہ کر سکی۔ اس صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ دشمنوں سے ایسے معاملے کے متعلق سمجھوتا کر لیتے جو سراسر احکام الٰہی کے خلاف تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نظروں کے سامنے محمد ﷺ کی زندگی کا ایک ایک ورق کھلا ہوا موجود تھا۔ جب کبھی کسی جانب سے منشائے الٰہی اور تعلیمات نبوی کے خلاف کوئی کام کرنے کے لیے ان پر زور دیا جاتا تو انہیں محمد ﷺ کا وہ فقرہ یاد آجاتا جو ابو طالب کی درخواست پر آپ نے کہا تھا:

''واللہ! اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لاکھڑا کریں اور یہ چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں جو مجھے اللہ کی طرف سے تفویض کیا گیا ہے تو بھی میں اس کام کو نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ یا تو میں دوسروں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لوں یا اپنی کوشش میں ہلاک ہو جاؤں۔''

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی بالکل اسی قسم کا جواب اپنے ساتھیوں کو اس وقت دیا تھا جب انہوں نے اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی منسوخ کرنے پر زور دیا تھا اور یہی موقف انہوں نے اس وقت اختیار کیا جب لوگوں نے انہیں منکرین زکوٰۃ سے جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یہی وہ ایمان صادق تھا جس کے مقابلے میں انہوں نے کسی چیز کی، حتی کہ موت کی بھی پروا نہ کی اور یہی ایمان صادق جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام آسائشیں ان کی نظروں میں ہیچ تھیں، اس نازک وقت میں اسلام کو تباہی و بربادی سے بچانے میں بھی سب سے بڑا ممد و معاون ثابت ہوا۔

مشورہ صحابہ کے عدم قبول کی وجہ:

سوال پیدا ہوتا ہے آخر کیا حرج تھا اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ منکرین زکوٰۃ سے جنگ نہ کرنے کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے بڑے بڑے صحابہ کا مشورہ قبول کر لیتے؟ اس کا جواب بہت سہل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عرب کے اکثر قبائل نے بہت تھوڑا عرصہ قبل بت پرستی سے نجات حاصل کی تھی اور جاہلیت کا دور ختم ہوئے نہایت قلیل عرصہ گزرا تھا۔ اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرائض دینی کو ترک کر دینے کے متعلق قبائل عرب کا کوئی مطالبہ تسلیم کر کے ان سے سمجھوتا کر لیتے تو طلیحہ، مسیلمہ اور دوسرے خود ساختہ نبی فوراً یہ پروپیگنڈا شروع کر دیتے کہ فرائض دینی کی بجا آوری کے متعلق اس سمجھوتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد ﷺ نے جو پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ (نعوذ باللہ) اللہ کی طرف سے نہ تھا ورنہ حضرت

ابو بکر رضی اللہ عنہ اس کے متعلق سمجھوتا کیوں کرتے۔ قبائل عرب پر اس پروپیگنڈے کا زبردست اثر ہوتا اور اس کے نتیجے میں وہ لوگ مدعیان نبوت سے مل جاتے جو ابھی ان پر ایمان نہ لائے تھے اور ان کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔ ذی القصہ میں شرمناک شکست کا انتقام لینے کے لیے بنی ذبیان اور بنی عبس کے مشرکین نے ان تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالا جو ان کی دسترس میں تھے، لیکن اس کا اثر الٹا پڑا اور قبائل کے وہ لوگ جو بہ دستور اسلام پر قائم تھے اپنے عقیدے میں پکے ہو گئے اور انہوں نے بے پس و پیش حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر زکوٰۃ پیش کرنی شروع کر دی کیونکہ انہوں نے تمام حالات و واقعات کا مشاہدہ کر کے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنی قوت ایمانی کی بدولت ان مرتدین پر لامحالہ غالب آجائیں گے، دین حق کا بول بالا ہو گا اور وہ بزدلانہ انتقام جو ہزیمت خوردہ قبائل نے کمزور و بے کس مسلمانوں سے لیا ہے اُن کی ہزیمت کے داغ کو نہ مٹا سکے گا اور ان قبائل کو اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑے گی۔

بیرونی مسلمانوں کی ادائے زکوٰۃ:

ذی القصہ میں مسلمانوں کی فتح پر قبائل کے جو لوگ بہ دستور اسلام پر قائم تھے جوق در جوق زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے مدینہ آنے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے جو لوگ آئے وہ بنی تمیم کے رئیس اور زبرقان اور بنی طیّ کے سردار عدی بن حاتم طائی تھے۔ اہل مدینہ نے بڑی گرم جوشی سے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا لیکن اندر ہی اندر ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کہیں ان لوگوں کا آنا ہمارے لیے مصیبت کا باعث نہ ہو۔ مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ یہ جواب دیتے کہ نہیں یہ لوگ تمہارے لیے مصیبت کا پیغام لے کر نہیں بلکہ خوش خبری لے آئے ہیں۔ یہ تمہارے دشمن نہیں مددگار ہیں۔

اس وقت مسلمانوں کے حوصلے بلند رکھنا بے حد ضروری تھا کیونکہ ہر جانب خطرات کے بادل منڈلاتے دیکھ کر مسلمان کو طبعاً مضبوط سہاروں کی ضرورت تھی۔ عبداللہ بن مسعود ذا اس وقت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم اس مقام پر پر کھڑے تھے۔ اگر اللہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے ہماری مدد نہ فرماتا تو ہماری ہلاکت یقینی تھی۔ ہم سب مسلمانوں کا بالاتفاق یہ خیال تھا کہ ہم زکوٰۃ کے اونٹوں کی خاطر دوسروں سے جنگ نہ کریں گے اور اللہ کی عبادت میں مصروف ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ ہمیں کاملاً غلبہ حاصل ہو جائے۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ سے لڑنے کا عزم کر لیا۔ انہوں نے منکرین کے سامنے صرف دو باتیں پیش کیں، تیسری نہیں، پہلی یہ کہ اپنے لیے ذلت و خواری کی حالت قبول کر لیں اور اگر یہ منظور نہیں تو جلاوطنی یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں اپنے لیے ذلت و خواری قبول کرنے کا مطلب یہ تھا، وہ اقرار کریں کہ ان کے مقتول دوزخی اور ہمارے مقتول جنتی ہیں۔ وہ ہمیں ہمارے مقتولوں کا خون بہا ادا کریں ہم نے ان سے جو مال غنیمت وصول کیا ہے اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کریں لیکن جو مال انہوں نے ہم سے لیا ہے وہ ہمیں واپس کر دیں۔ جلاوطنی کی سزا بھگتنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے علاقوں سے نکل

کر جائیں اور دور دراز مقامات میں جا کر زندگی بسر کریں۔"

شام سے اسامہ ؓ کی واپسی:

مختلف قبائل کے مسلمان زکوٰۃ لے کر مدینہ پہنچ ہی رہے تھے کہ اسامہ ؓ بھی سرزمین روم سے مظفر و منصور واپس آ گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور کبار صحابہ نے مقام جرف میں لشکر کا استقبال کیا۔ عامۃ الناس نے بھی بڑے جوش و خروش سے اس فوج کا خیر مقدم کیا۔ جب لشکر مدینہ میں داخل ہوا تو ہر جانب سے خوشی اور مسرت کے گیتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسامہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے مسجد نبوی میں پہنچے وہ علم جو محمد ﷺ نے دست مبارک سے انہیں مرحمت فرمایا تھا مسجد میں بلند کیا اور نماز شکرانہ ادا کی۔

دوبارہ جنگ:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نہایت دور اندیشی سے فیصلہ کیا کہ دشمن کو تیاری کا موقع نہ دیا جائے بلکہ اس پر پے در پے حملے کر کے اس کی قوت و طاقت توڑ دی جائے۔ انہوں نے اسامہ اور ان کے لشکر کو فی الحال آرام کرنے کا حکم دیا اور خود ان لوگوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے جو اس سے پہلے ذی القصہ کی لڑائی میں شریک تھے۔ لوگوں نے درخواست کی کہ آپ اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالیں کیونکہ اگر خدانخواستہ آپ کو کوئی ضرر پہنچ گیا تو اسلامی سلطنت کا نظام تہ و بالا ہو جائے گا، اس لیے آپ اپنی جگہ کسی اور کو لشکر کا سردار مقرر فرما دیں تاکہ اگر وہ میدان میں کام بھی آ جائے تو مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتے تھے تو جب تک اسے پورا نہ کر لیتے پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ انہوں نے یہ باتیں سن کر فرمایا:

"واللہ! میں ہرگز پیچھے نہ رہوں گا بلکہ تمہارے ساتھ رہ کر تمہاری ہمتوں کو بلند رکھوں گا۔"

مدینہ سے روانہ ہو کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ابرق پہنچے جو ذی القصہ کے قریب واقع ہے۔ وہاں بنی عبس، ذبیان اور بنی بکر سے ان کی مڈ بھیڑ ہوئی۔ جنگ میں موخر الذکر قبائل کو شکست اٹھانی پڑی اور مسلمانوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا تو اعلان کیا کہ "اب یہ سرزمین مسلمانوں کی ملکیت ہے، آئندہ بنی ذبیان اس پر قابض نہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ اللہ نے اسے ہمیں غنیمت میں دے دیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ مقامات مسلمانوں ہی کی ملکیت میں رہے۔ اور حالات معمول پر آنے کے بعد بنو ثعلبہ نے اس جگہ دوبارہ آباد ہونا چاہا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اجازت نہ دی۔

اس طرح منکرین زکوٰۃ کی شکست پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ مدینہ والے بے حد خوش تھے۔ ایک تو اسامہ کا لشکر پہنچ جانے کی وجہ سے شہر پر کسی حملے کا خطرہ باقی نہ رہا تھا، دوسرے غنیمت اور زکوٰۃ کے اموال متواتر پہنچنے کے باعث مسلمانوں کی غریبی و تنگ دستی بھی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔

شکست خوردہ قبائل کی روش:

عبس، ذبیان، غطفان، بنی بکر اور مدینہ کے قریب بسنے والے دوسرے باغی قبائل کے لیے مناسب تھا کہ وہ اپنی ہٹ دھرمی اور بغاوت سے باز آجاتے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کامل اطاعت اور ارکان اسلام کی بجا آوری کا اقرار کرتے اور مسلمانوں سے مل کر مرتدین کے خلاف نبرد آزما ہوجاتے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی تھا اور واقعات بھی اسی کی تائید کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے ان کا زور ٹوٹ چکا تھا، روم کی سرحدوں پر حصول کامیابی کے باعث اہلِ مدینہ کا رعب قائم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی قوت و طاقت بڑھ چکی تھی اور اب وہ اس کمزوری کے عالم میں نہ تھے جو جنگ بدر اور ابتدائی غزوات کے ایام میں ان پر طاری تھی۔ اب مکہ بھی ان کے ساتھ تھا اور طائف بھی اور ان دونوں شہروں کی سیاست سارے عرب پر مسلم تھی۔ پھر خود ان قبائل کے درمیان ایسے مسلمان کثرت سے موجود تھے جنھیں باغی کسی صورت ساتھ نہ ملا سکے تھے اور اس طرح ان کی پوزیشن بے حد کمزور تھی۔

لیکن مسلمانوں کی دشمنی نے ان کی آنکھیں اندھی کر دی تھیں اور سود و زیاں کا احساس دلوں سے اتر رہا تھا۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو چھوڑ دیا اور قبیلہ بنی اسد کے متنبی طلیحہ بن خویلد سے جا ملے۔ جو مسلمان ان کے درمیان موجود تھے وہ انہیں ان کے ارادوں سے باز نہ رکھ سکے۔ ان لوگوں کے پہنچ جانے سے طلیحہ اور مسیلمہ کی قوت و طاقت میں بہت اضافہ ہوگیا اور یمن میں بغاوت کے شعلے زور شور سے بھڑکنے لگے۔ یہ حالات دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ جنگ کا سلسلہ بدستور جاری رکھا جائے اور اس وقت تک دم نہ لیا جائے جب تک یمن کا چپہ چپہ اسلامی حکومت کے زیر نگین نہ آجائے۔ اگر یہ قبائل عقل سے کام لیتے تو طلیحہ اور دوسرے مدعیان نبوت کو اتنا فروغ حاصل نہ ہوتا اور بہت جلد سارا عرب اسلام کی آغوش میں آجاتا۔ لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ اس نے مخالفین کو مزید مہلت دی کہ وہ اس عرصے میں اپنی جمعیت اور مضبوط کرلیں۔

اسلام سے ان قبائل کے عناد اور نفرت کی اصل وجہ وہی تھی جس کا ذکر ہم ابتدا میں کر آئے ہیں یعنی قبائلی عصبیت اور یہ جذبہ کہ ہم کسی طاقت کا غلبہ تسلیم نہیں کر سکتے۔ جب ان قبائل کو مدینہ پر حملہ کرنے میں ناکامی ہوئی بلکہ اس کے برعکس انہیں اپنی بستیوں ہی سے نکلنا پڑا تو بدوی طبائع نے فاتح طاقت کے سامنے سر جھکانا اور اس کی سیادت قبول کر کے اس کے ماتحت زندگی بسر کرنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ وہ اس خیال سے بنی اسد اور طلیحہ سے جا کر مل گئے کہ ممکن ہے ان کا ساتھ دینے سے وہ اپنی عبرت ناک شکست کا داغ دھوسکیں۔

لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام قبائلی عصبیتوں سے دور تھے۔ ان کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ محمد ﷺ کا قائم کردہ طریقہ اختیار کیا جائے اور آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جائے انہوں نے اپنی ساری جدوجہد اسی مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دی۔ یہی سیاست تھی جس کے نفاذ کا اعلان انہوں نے بیعت کے دن کیا تھا اور اپنے عہدِ خلافت میں اسی پر نہایت سختی سے کاربند رہے۔

٦

مرتدین سے جنگ کی تیاریاں

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبائل عبس، ذبیان، بکر اور ان کے مددگاروں کو شکست دے کر جلاوطن کر دیا تھا اور وہ بزاخہ جا کر طلیحہ بن خویلد اسدی سے مل گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ یہ بستیاں چونکہ اللہ نے ہمیں غنیمت میں دی ہیں اس لیے انہیں ان کے مفرور باشندوں کے حوالے نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے ابرق اور ربذہ کے آس پاس کی تمام زمینیں اور چراگاہیں مسلمانوں میں تقسیم کر دیں اور مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ اب ان کے پیش نظر مرتدین کا استیصال تھا جو عرب کے مختلف خطوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکا رہے تھے اور ان کے ہاتھوں اسلام اور مسلمانوں کو سخت خطرہ درپیش تھا۔ منکرین زکوٰۃ کی طرح مرتدین کے متعلق بھی انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ انہیں ہر قیمت پر عبرت ناک شکست دی جائے گی اور ان سے کسی قسم کی مصالحت نہ کی جائے گی۔

جنگ کی تیاری:

جب اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر اچھی طرح آرام کر چکا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسے لے کر مدینہ سے نکلے اور ذی القصہ میں قیام فرمایا۔ انہوں نے گیارہ علم تیار کیے۔ لشکر کو گیارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے پر ایک امیر مقرر کیا۔ پھر ان امراء کو حکم دیا کہ وہ مرتدین کے استیصال کے لیے اپنے اپنے مقرر کردہ علاقے کی جانب روانہ ہو جائیں اور راستے میں جن قبیلوں کے پاس سے گزریں وہاں کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے لیں۔ (مرتدین کے مقابلے میں فوجیں بھیجتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس امر کا خاص خیال رکھا کہ مرتدین کی جمعیت اور قوت و طاقت کا لحاظ رکھ کر ان کی طرف فوجیں روانہ کی جائیں۔ اسی لیے انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو طلیحہ بن خویلد سے لڑنے کے لیے بنی اسد کی طرف روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ طلیحہ سے فراغت حاصل ہونے کے بعد بطاح جا کر بنی تمیم کے سردار مالک بن نویرہ سے جنگ کی جائے۔

بنو اسد اور بنی تمیم مدینہ کے قریب ترین مرتد قبائل تھے اس لیے ضروری تھا کہ جنگ کا آغاز انہیں سے کیا جائے تاکہ ان کی شکست کا اثر دوسرے قبائل پر بھی پڑے اور وہ بہ آسانی زیر ہو سکیں۔ خالد بجا طور پر

مستحق تھے کہ انہیں ان طاقتور قبائل سے جنگ کرنے والی فوجوں کی کمان سونپی جائے۔

عکرمہ بن ابوجہلکو دوسرا جھنڈا دیا گیا اور انہیں یمامہ جا کر بنی حنیفہ کے سردار مسیلمہ سے جنگ کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔

شرجیل بن حسنہ کو تیسرا جھنڈا سپرد کر کے حکم دیا گیا کہ وہ پہلے مسیلمہ کے خلاف عکرمہ کی مدد کریں اور یہاں سے فراغت حاصل ہونے کے بعد حضرت عمرو بن العاص کی امداد کے لیے قضاعہ کی جانب روانہ ہو جائیں۔ عکرمہ اور شرجیل کو یمامہ میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی بلکہ یہ فخر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا اور انہوں نے غزوہ عقرباء میں مسیلمہ کو قتل کر کے بنی حنیفہ کی کمر توڑ دی۔

چوتھا جھنڈا مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے حوالے کر کے حکم دیا گیا کہ وہ یمن جا کر اسود عنسی کے لشکر اور حضرت عمرو بن معدی کرب زبیدی، قیس بن مکشوح مرادی اور ان کے مددگاروں سے جنگ کریں۔ یہاں سے فراغت حاصل ہونے کے بعد کندہ اور حضرت موت جا کر اشعث بن قیس اور اس کے ساتھ مرتدین سے لڑیں۔

پانچواں جھنڈا سوید بن مقرن اوسی کو عطا کر کے انہیں تہامہ یمن جانے کا حکم دیا گیا۔

چھٹا جھنڈا علاء بن حضرمی کو مرحمت کر کے انہیں بحرین میں حطم بن ضبیعہ اور بنی قیس بن ثعلبہ کے مرتدین کی سرکوبی کا حکم دیا گیا۔

ساتواں جھنڈا حمیر کے حذیفہ بن محصن غلغانی کو دیا گیا اور انہیں عمان جا کر وہاں کے مدعی نبوت ذوالتاج لقیط بن مالک ازدی سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔

آٹھواں جھنڈا عرفجہ بن ہرثمہ کو دے کر انہیں مہرہ بھیجا گیا۔

جانب جنوب اتنے کثیر لشکر بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ ارتداد کا فتنہ اسی حصے میں زیادہ پھل پھول رہا تھا اور یہاں کے مرتدین کی سرکوبی کے لیے زیادہ لشکر بھیجنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بالمقابل شمالی جانب تین فوجیں بھیجی گئیں۔

پہلی فوج حضرت عمرو بن العاص کے زیر سرکردگی قضاعہ سے لڑنے کے لیے روانہ کی گئی۔ دوسری فوج معن بن حاجز سلمی کی قیادت میں بنی سلیم اور بنی ہوازن کے شوریدہ سر قبائل کی سرکوبی کے لیے روانہ کی گئی اور تیسری فوج خالد بن سعید بن عاص کی سپہ سالاری میں شام کی سرحدوں پر امن و امان قائم رکھنے کے لیے بھیجی گئی۔)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی حفاظت کے لیے جو فوج رکھ چھوڑی تھی وہ باہر جانے والے لشکروں سے بہت کم تھی کیونکہ اب مدینہ کو فوری حملے کا خطرہ نہ تھا۔ منکرین زکوٰۃ کی سرکوبی کے بعد وہاں کے باشندے بڑے اطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی قبیلے کو مدینہ پر حملہ کرنے کی جرأت بھی کس طرح ہو سکتی تھی جب مسلمانوں کی فتح مندی کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی ... پہنچ چکی تھی اور ان کی

بہادری کا سکہ تمام قبائل پر بیٹھ چکا تھا۔

قیام مدینہ کی وجہ:

ان لشکروں کو رخصت کرنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ واپس تشریف لے آئے اور مستقل طور پر یہیں قیام فرمایا۔ مدینہ میں قیام کی وجہ یہ تھی کہ اب یہ شہر مسلمانوں کا جنگی ہیڈکوارٹر بن چکا تھا اور فوجوں کی نقل و حرکت کے متعلق تمام احکام یہیں سے صادر ہوتے تھے۔ اس لیے خلیفہ کا مستقل طور پر دارالخلافہ میں قیام نہایت ضروری تھا ورنہ فتوحات کا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا اور مسلمانوں کو مخالفین کے مقابلے میں وہ کامیابی ہرگز حاصل نہ ہوتی جو ہوئی۔

سب سے ضروری حکم جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لشکروں کے سپہ سالاروں کی روانگی کے وقت دیا یہ تھا کہ کوئی سپہ سالار مخالف پر فتح پانے کے بعد اس وقت تک کسی دوسری جانب رخ نہ کرے جب تک دربارِ خلافت سے اس کی اجازت حاصل نہ کر لے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خیال میں سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ دورانِ جنگ میں دارالخلافہ کی انتظامی مشینری اور جنگی قیادت میں کامل اتحاد ہونا چاہیے۔

مہاجرین کی قیادت کا سبب:

اس موقع پر انصار کے بعض لوگوں کا خیال ہوا کہ ان لشکروں کے سپہ سالار تمام تر مہاجرین ہی ہیں اور انصار میں سے کسی کو قیادت کا علم سپرد نہیں کیا گیا لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اصل منشاء یہ تھا کہ اہل مدینہ اپنے شہر کی حفاظت خود کریں کیونکہ وہ یہاں کے تمام حالات کو خوب جانتے تھے اور دوسروں کی نسبت اپنے شہر کی حفاظت اچھی طرح کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ خیال سراسر غلط تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ثقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کی روش دیکھتے ہوئے انہیں اس خیال کے تحت قیادت سے محروم کر دیا کہ مبادا ایاہر جا کر وہ بغاوت کا علم بلند کر دیں۔

یہ فوجیں مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کی گئی تھیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خوب جانتے تھے کہ انصار ایمان باللہ اور شیفتگی محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں مہاجرین سے کسی طرح کم نہ تھے اس لیے انہیں انصار سے کسی قسم کا خدشہ کیونکر لاحق ہو سکتا تھا؟

اگر انصار کے متعلق یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اکابر مہاجرین مثلاً علی، طلحہ اور زبیر وغیرہ کے متعلق بھی یہی خیال کیوں درست نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس لیے مدینہ سے باہر نہ جانے دیا کہ ان کی طرف سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے ان لوگوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وجہ سے مدینہ میں رہنے کا حکم دیا تھا کہ ان سے وقتاً فوقتاً مشورہ لیتے رہیں اور ان کے تدبر اور مشوروں سے فائدہ اٹھا کر مرکزِ قیادت کو مضبوط کر سکیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بے تعصبی:

آخر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے ان لوگوں سے ڈرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ انہوں نے خلافت اپنی مرضی اور خواہش سے حاصل نہ کی تھی بلکہ یہ گراں بار ذمہ داری صرف اس لیے قبول کی تھی کہ مدینہ کے اہل الرائے اصحاب ان کی صلاحیتوں کی بناء پر انہی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور ان کے سوا کسی کی خلافت پر راضی نہ تھے۔ اڑھائی برس کے عرصے میں جو واقعات پیش آئے انہوں نے روز روشن کی طرح ثابت کر دیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلافت محض اللہ کے راستے میں قربانی کرتے ہوئے قبول کی تھی۔ چنانچہ بیعت لینے کے بعد انہوں نے پہلی تقریر میں فرمایا: ''اے لوگو! مجھے خلیفہ تو بنا دیا گیا ہے لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں واللہ! میری تو دلی خواہش ہے کہ یہ بار گراں تم میں سے کوئی اور شخص اٹھائے۔''

اسی طرح ایک بار خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''حکمران دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ بد بخت ہیں۔'' یہ سن کر لوگوں نے حیرانی کا اظہار کیا تو فرمایا: ''لوگو! تمہیں کیا ہوا؟ تم اعتراض کرنے والے اور جلد باز ہو۔ جب کوئی شخص حکمران بنتا ہے تو چاہتا ہے کہ دوسروں کا مال بھی اس کے قبضے میں آجائے لیکن اس کی حالت محض سراب کی سی ہوتی ہے۔ وہ ظاہر میں تو خوش و خرم دکھائی دیتا ہے مگر اصل میں حد درجہ غمگین شخص ہوتا ہے۔''

سخ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قیام جس مکان میں تھا وہ بہت معمولی اور دیہاتی طرز کا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو خلافت کے بعد اس کی حالت درست کر سکتے تھے لیکن خلافت کے پورے عہد میں مکان جوں کا توں رہا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی۔ اسی طرح مدینہ کا مکان بھی بہ دستور پہلی ہیئت پر قائم رہا۔ خلافت کے بعد چھ مہینے تک وہ روزانہ پیدل سخ سے مدینہ آتے تھے اور شاذ و نادر ہی کبھی گھوڑا استعمال کرتے تھے۔ خلافت سے پہلے وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ جب خلافت کا کام بڑھا اور سلطنت کی ذمہ داریاں زیادہ ہوئیں تو تجارت کے لیے وقت دینا مشکل ہو گیا۔ اس لیے انہوں نے لوگوں سے فرمایا کہ انصرام سلطنت اور تجارت کا کام ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ چونکہ رعایا کی دیکھ بھال اور اس کی خبر گیری تجارت سے زیادہ ضروری ہے اس لیے میرے اہل و عیال کے واسطے اتنا وظیفہ مقرر کر دیا جائے جو انہیں معمولی طور پر کافی ہو۔ چنانچہ بیت المال سے ان کا اتنا وظیفہ مقرر کر دیا گیا جس سے ان کا اور ان کے اہل و عیال کا گزارہ چل سکے۔ لیکن جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو حکم دیا جو وظیفہ میں نے بیت المال سے لیا ہے وہ سارے کا سارا واپس کر دو، اس کی ادائی کے لیے میری فلاں زمین بیچ دی جائے۔ اور آج تک میں نے مسلمانوں کا جو مال اپنے اوپر خرچ کیا ہے اس زمین کو فروخت کر کے وہ پوری کی پوری رقم ادا کر دی جائے۔ چنانچہ جب ان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور وہ رقم ان کے پاس پہنچی تو وہ رو پڑے اور کہا:

''حضرت ابوبکر! تم نے اپنے جانشین کے سر پر بہت بھاری بوجھ ڈال دیا ہے۔''
جو شخص ان اعلیٰ صفات اور خصائل کا مالک ہو اسے آخر کس چیز کا ڈر ہو سکتا تھا اور کسی شخص کی مجال تھی کہ ان پر زبان طعن دراز کرتا۔ تمام مسلمانوں بلکہ سارے عرب میں ان کی عقل وخرد، اصابت رائے، صدق مقال، ایمان و اخلاص اور قربانی و ایثار کے بے نظیر جذبے کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ اگرچہ ان صفات حسنہ سے ان کی زندگی کا کوئی بھی حصہ خالی نہ رہا لیکن ان کا اظہار جس طرح خلافت کی ذمہ داری تفویض ہونے کے بعد ہوا پہلے نہ ہو سکا۔ انہیں باتوں کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شخص نے ان بلند مقاصد کے بارے میں شک نہ کیا اور کسی بھی جانب سے ان کے احکام کی بجا آوری میں کسی قسم کے تردد کا اظہار نہ کیا گیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس لشکر کی کمان سپرد کی تھی وہ تمام لشکروں سے زیادہ مضبوط تھا اور اس میں مہاجرین و انصار کے منتخب آدمی جمع تھے جن کا انتخاب خود خالد نے کیا تھا۔ صفحات آئندہ میں آپ دیکھیں گے کہ ان لوگوں نے جنگ ہائے ارتداد میں بے نظیر کارنامے انجام دیئے اور عراق و شام کی جنگوں میں تو انہوں نے وہ معرکے سر کیے جنھیں کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔
ان فوجوں کی کامیابی کا راز خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں مضمر تھا۔ خالد کو جو جنگی مہارت حاصل تھی اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سکندر اعظم، چنگیز خان، جولیس سیزر، ہنی بال اور نپولین کی شخصیتیں خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نظر نہ آتی ہوں لیکن حق یہ ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے آگے وہ سب ہیچ ہیں۔ وہ اسلام کے بطل جلیل تھے اور ہر قسم کے خطرات و خدشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دشمنوں کی صفوں میں مردانہ وار گھس جانا ان کا خاص شیوہ تھا۔ فنون جنگ سے گہری واقفیت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ دشمن کی ہر چال اور اس کا ہر منصوبہ ان کی نگاہ میں ہوتا تھا۔ اور مخالف کی کوئی حرکت ان سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ تمام مسلمانوں کو ان کی صلاحیتوں کا علم تھا۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنگ موتہ میں مسلمانوں کی قلیل التعداد فوج کو ہزارہا رومیوں کے نرغے سے نکال لانے کی بنا پر سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ زندگی بھر انہوں نے کبھی شکست نہ کھائی، ہمیشہ فتح یاب ہی ہوتے رہے اور اسی حالت میں وفات پائی۔
اسلام لانے سے قبل بھی خالد کا شمار قریش کے چوٹی کے بہادروں میں ہوتا تھا۔ جنگ بدر، احد اور خندق میں وہ کفار کے دوش بہ دوش مسلمانوں سے لڑے۔ سرتاپا فوجی ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت میں خشونت، تندی اور تیزی آگئی۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر ان سے مطلق صبر نہ ہو سکتا تھا اور چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اللہ کا فضل ہمیشہ ان کے شامل حال رہا ورنہ ممکن تھا کہ اپنی جلد بازی کے باعث انہیں بھاری نقصان سے دوچار ہونا پڑتا۔ دشمن بڑی سے بڑی تعداد اور کثیر اسلحہ کے باوجود کبھی انہیں مرعوب نہ کر سکتا تھا۔ صلح حدیبیہ سے اگلے سال محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو خالد مسلمانوں

سے حد درجہ نفرت کے باعث مکہ چھوڑ کر ہی چلے گئے۔لیکن اچانک اللہ نے ان کے دل پر پڑے ہوئے تاریک پردے ہٹا دیئے اور انہیں حق و صداقت سے آگاہی عطا فرمائی۔محمد ﷺ کے مدینہ واپس تشریف لے جانے کے بعد خالد مکہ واپس آگئے اور ایک روز انہوں نے قریش کے مجمع میں اعلانیہ کہہ دیا کہ اب ہر ذی عقل انسان پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ محمد ﷺ نہ جادوگر ہے نہ شاعر ان کا کلام یقیناً اللہ کی طرف سے ہے، اب قریش کے لیے آپ کا اتباع اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔

خالد رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ کلمات سن کر قریش کو سخت حیرت ہوئی۔ان کے وہم میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ خالد کا میلان اسلام کی جانب ہوسکتا ہے۔عکرمہ بن ابو جہل اور خالد رضی اللہ عنہ کے مابین بحث بھی ہوئی لیکن خلاف معمول اس نے تیزی اختیار نہ کی۔ابوسفیان اس اجتماع میں موجود نہ تھا۔جب اسے اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے انہیں بلا کر پوچھا کیا تمہارے اسلام لانے کی خبر سچ ہے؟ خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:"ہاں میں اسلام لے آیا ہوں اور محمد ﷺ کی رسالت پر یقین رکھتا ہوں۔"یہ سن کر ابوسفیان کو بہت غصہ آیا اور اس نے کہا"لات اور عزیٰ کی قسم! اگر یہی بات ہے تو میں محمد ﷺ سے پہلے تم سے نپٹ لیتا ہوں۔" خالد نے جواب دیا"اسلام بہ ہر حال سچا ہے خواہ کوئی شخص اس بات کو کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کرے۔"

اسلام لانے کے بعد خالد مدینہ چلے آئے۔اپنی جنگی قابلیت کی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں میں خاص قدرومنزلت حاصل کرلی اور اس امر کے باوجود کہ ان کی ساری حضرت عمر اسلام کی مخالفت میں گزری تھی، ہر شخص انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔اس عزت و توقیع میں گراں قدر اضافہ اس وقت ہوا جب جنگ موتہ کے بعد انہیں دربار نبوی سے"سیف اللہ" کا خطاب مرحمت ہوا۔بعد میں انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس خطاب کا پورا پورا مستحق ثابت کیا۔عراق اور شام کی فتوحات انہی کے ذریعے سے ہوئیں۔فارس اور روم کی عظیم الشان سلطنتیں، جو اس زمانے میں روئے زمین کی مالک تھیں، انہی کے ہاتھوں نابود ہوئیں۔ان ہی اوصاف کی بدولت انہیں مرتدین کے مقابلے میں سب سے بڑے لشکر کی سپہ سالاری نصیب ہوئی۔

مرتدین کو آخری پیش کش:

لشکروں کی روانگی سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کو آخری موقع دینے کے لیے انہیں دوبارہ اسلام لانے اور امن سے رہنے کی دعوت دی۔عرب کے ہر حصے میں انہوں نے متعدد خطوط روانہ کیے جن میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد محمد ﷺ کی رسالت اور ان کے بشیر و نذیر ہونے کا ذکر کیا اور بتایا کہ جب وہ کام پورا ہوگیا جس کے لیے آپ دنیا میں تشریف لائے تھے تو اللہ نے آپ کو وفات دے دی۔محمد ﷺ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ان خطوط میں یہ آیات بھی درج کیں،

انك ميت وانهم ميتون

(اے رسول ﷺ! تمہیں بھی وفات دی جانے والی ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی)

وما جعلنا لبشر من قبلك الخلد افأن مت فهم الخالدون

(اے رسول ﷺ! ہم نے تجھ سے پہلے کسی شخص کو ہمیشہ کی زندگی سے نہیں نوازا کیا یہ ممکن ہے کہ تو وفات پا جائے اور دوسرے لوگ زندہ رہیں؟)

وما محمد الارسول قد خلت من قبله الرسل افأن مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیأ و سیجزی الله الشاکرین

(محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اگر دوسرے رسولوں کی طرح محمد ﷺ بھی وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو اپنی ایڑیوں کے بل پھرے گا تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو جزائے خیر دے گا)۔

مرتدین کے نام خطوط:

ان آیات کے درج کرنے سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مقصد ان لوگوں کا فتنہ فرو کرنا تھا جو یہ کہہ رہے تھے کہ اگر محمد ﷺ سچے ہوتے تو کبھی وفات نہ پاتے۔

ان آیات کے علاوہ آپ نے لکھا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ مسلمان ہونے اور اسلام کے احکام پر عمل کرنے کے بعد جہالت اور شیطان کے بہکانے کے باعث دین حق سے پھر گئے ہیں۔ میں تمہاری جانب مہاجرین، انصار اور تابعین کا لشکر بھیج رہا ہوں۔ میں نے اسے حکم دے دیا ہے کہ جب تک وہ تمہارے سامنے اسلام کا پیغام نہ پہنچا دے جنگ نہ کرے۔ پس جو شخص یہ دعوت قبول کرے گا، اسلام کا اقرار کر کے تمام مخالفانہ سرگرمیوں سے باز آجائے گا اور نیک کام کرے گا اس کی جان بخشی کر دی جائے گی، لیکن جو شخص انکار کرے گا اور فساد پر آمادہ ہوگا اس سے جنگ کی جائے گی اور وہ اللہ کی تقدیر کو اپنے اوپر نافذ ہونے سے روک نہ سکے گا۔ ایسے لوگوں کو آگ میں جلایا جائے گا اور بری طرح قتل کیا جائے گا۔ ان کی عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے جائیں گے۔ کسی شخص سے اسلام کے سوا کچھ قبول نہ کیا جائے گا۔ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد جو شخص ایمان لے آئے گا تو یہ ایمان اس کے لیے بہتر ہوگا لیکن جو شخص بہ دستور حالت ارتداد پر قائم رہے گا وہ اللہ کو ہرگز عاجز نہ کر سکے گا۔ میں نے قاصد کو حکم دے دیا ہے کہ وہ میرا خط مجمع عام کو پڑھ کر سنا دے۔ اسلام لانے کی علامت اذان ہوگی۔''

اسی لیے جب مسلمان مرتدین کی بستیوں کے قریب پہنچ کر اذان دیتے اور اس کے جواب میں بستی کی جانب سے بھی اذان کی آواز سنائی دیتی تو مسلمان ان سے کوئی تعرض نہ کرتے لیکن اگر اذان کی آواز نہ آتی تو ایک بار پھر اتمام حجت کرنے کے بعد ان سے جنگ شروع کر دیتے۔

ہدایت کی کوشش:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قاصدوں کے ہاتھ یہ خطوط عرب کے گوشے گوشے میں بھیج دیئے۔ وہ چاہتے

تھے کہ اس طرح مرتد لوگوں کو غور و فکر کی مہلت مل جائے کیونکہ لوگ محض اس خدشے کے باعث مرتدین کے ساتھ ہو گئے تھے کہ اگر وہ اسلام پر قائم رہے تو انہیں مرتدین کے ہاتھوں سخت مظالم برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن اب انہوں نے اپنے آپ کو دو قوتوں کے درمیان گھرا ہوا دیکھا تو دوبارہ اسلام لانے کا اعلان کر دیا یا کم از کم مرتدین کے سرداروں کی حمایت سے دست کشی اختیار کر لی۔ اس وجہ سے ان کی جانیں بچ گئیں۔ یہ خطوط سن کر کثیر التعداد مرتدین کی ہمتیں بھی پست ہو گئیں اور انہوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ غرض حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس پالیسی سے مسلمانوں کو زبردست فائدہ پہنچا۔ پھر بھی اس پالیسی سے کمزوری کا اظہار مطلق نہ ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا منشا یہ نہ تھا کہ پہلے تو مرتدین کو بہلا پھسلا کر اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں لیکن اس پر بھی اگر وہ باز نہ آئیں تو مصالحت کی کوئی اور راہ اختیار کریں۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے خطوط کا لفظ لفظ نہایت سنجیدگی سے تحریر کیا تھا۔ جو دھمکیاں خطوط میں دی گئی تھیں وہ خالی خولی نہ تھیں بلکہ وہ انہیں لباس عمل پہنانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں لکھ دیا تھا امرائے عساکر کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ پہلے مرتد لوگوں کو دوبارہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ان سے درگزر کریں لیکن انکار کی صورت میں ان سے جنگ کریں اور اس وقت تک جنگ کریں کہ وہ اسلام لانے کا اقرار کر لیں، اسلام کا اقرار کر لینے کے بعد وہ ان حقوق سے آگاہ کریں جو ان پر عائد ہوتے ہیں، اور ان حقوق سے باخبر کریں جو حکومت کے ذمہ عائد ہوتے ہیں۔ پھر ان سے جو لینا ہو وہ لیں اور انہیں جو دینا ہو وہ دیں۔ جو شخص یہ دعوت قبول کرے اس پر کسی شخص کو دست درازی کرنے کا حق نہیں۔ اگر وہ اپنے دل میں ان باتوں سے مختلف باتیں چھپائے جو اس نے اپنی زبان سے ادا کی ہیں تو اس کا حساب لینا صرف اللہ کا کام ہے۔ لیکن جو شخص قبول دعوت سے انکار کر دے تو اس سے جہاں کہیں وہ ہو جنگ کی جائے اور اسے قتل کیا جائے۔ اس سے اسلام کے سوا کوئی چیز قبول نہ کی جائے۔ قتل کرنے کے لیے تلوار اور آگ دونوں استعمال کی جائیں۔

بہترین سیاست کا کرشمہ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جو پالیسی اختیار کی وہ بہترین سیاست کا کرشمہ تھی۔ بعض لوگ اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت نرم دل ہونے کے باوجود اس قدر سخت رویہ کیوں اختیار کیا؟ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کامل ایمان تھا اس کے باعث انہیں دین کے معاملے میں نرمی برتنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ یہ درست ہے کہ نرم دل لوگ سختی اور تندی کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اگر کسی جانب سے ان کے عقائد پر زور پڑے تو ان کی سختی کی انتہا نہیں رہتی۔ انسانی فطرت میں ایک خاص حد تک سختی اور نرمی کا مادہ رکھا گیا ہے مگر بعض اوقات جب معاملات اس قدر حد سے بڑھ جائیں تو اس کا رد عمل بالکل الٹ ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے

ہوتے ہیں جن کی طبائع پر سختی غالب ہوتی ہے۔ انہیں دیکھ کر قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کبھی نرمی بھی برت سکتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر نرمی نے پوری طرح قابو پالیا ہوتا ہے اور انہیں دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ کبھی سختی پر بھی اتر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس قسم کے نظارے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ جن لوگوں سے سختی کی توقع نہیں کی جاسکتی وہ انتہائی سختی پر اتر آتے ہیں اور جن سے نرمی کی توقع نہیں کی جاسکتی وہ انتہائی نرمی برتنے لگتے ہیں۔ وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ سختی اور نرمی دونوں کی حدود مقرر ہیں بعض واقعات کے نتیجے میں جب یہ حدود ٹوٹ جاتی ہیں تو ان کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ کیا کوئی شخص خیال کرسکتا تھا کہ اُسامہ کو شام بھیجتے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وہ رویہ اختیار کریں گے جو اکابر مہاجرین اور انصار کی رائے کے بالکل خلاف تھا؟ یا منکرین زکوٰۃ کے مقابلے میں اس قدر سختی برتیں گے کہ اسلامی لشکر کے مدینہ سے غیر حاضر ہونے کے باوجود اُن کے مقابلے کو نکل آئیں گے؟ انہی واقعات پر بس نہیں بلکہ بعد کے واقعات نے بھی بتادیا کہ حضرت ابوبکرؓ جن کی سرشت میں نرم دلی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، مخالفین کے مقابلے میں نہایت سخت دل واقع ہوئے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ بیان کی جاچکی ہے، یہی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ اور اس کے رسول پر کامل ایمان تھا اور انہیں وثوق تھا کہ انہوں نے جو چیز قبول کی ہے وہی حق ہے۔ اس لیے جب بعض لوگ اس چیز کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان سے مطلق صبر نہ ہوسکا اور وہ پورے عزم اور عدیم النظیر ہمت سے دین میں رخنہ اندازی کرنے والے لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اس وقت تک خاموش نہ بیٹھیں گے جب تک منکرین زکوٰۃ اور مرتدین کو حق کی طرف نہ لے آئیں یا ان کا قلع قمع نہ کرلیں اور اگر اس غرض کے لیے انہیں تنہا بھی لڑنا پڑا تو اس سے بھی دریغ نہ کریں گے۔

جنگ ہائے ارتداد کی اہمیت:

مرتدین سے جو جنگیں پیش آئیں ان کا شمار زمانہ اسلام کی فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا ہے۔ اگر ان جنگوں میں مسلمان فتح یاب نہ ہوتے تو تھوڑے ہی عرصے میں عرب دوبارہ اسی پرانی جاہلیت کا شکار ہوجاتے جسے فنا کرنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ لیکن اللہ نے مقدر کردیا تھا کہ اس کا دین غالب رہے گا۔ اس غرض سے اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چنا۔ انہوں نے انتہائی پامردی سے تمام دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کرکے انہیں دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہونے پر مجبور کردیا۔ پوری تاریخ اسلام میں کہیں بھی ایسی نظیر نہیں ملتی جہاں ایسے محکم ایمان کا مظاہرہ کیا گیا ہو جیسا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا اور عزم و استقلال کا ایسا ثبوت دیا گیا ہو جیسا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیا۔

(۷)

طلیحہ اور جنگ بزاخہ

قبائل عبس، ذبیان، بنو بکر اور ان کے وہ مددگار جنھوں نے مدینہ پر چڑھائی میں حصہ لیا تھا داغ ہزیمت دھونے کے لیے طلیحہ بن خویلد اسدی سے جا کر مل گئے تھے۔ مزیں برآں طی، غطفان، سلیم اور وہ بدوی قبائل بھی جو مدینہ کے مشرق اور شمال مشرق میں آباد تھے طلیحہ کے حامی بن گئے تھے۔ یہ سب قبائل عینیہ بن حصن فزاری کی طرح کہتے تھے "حلیف قبائل (اسد اور غطفان) کا نبی ہمیں قریش کے نبی سے زیادہ محبوب ہے۔ محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں لیکن طلیحہ زندہ ہے۔"

ان قبائل کو خوب معلوم تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان پر ضرور حملہ کریں گے لیکن انہوں نے مطلق پروانہ کی اور برابر لڑائی کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ طلیحہ کی مطابقت انہوں نے اس ضد میں آ کر اختیار کی تھی کہ وہ اپنے اوپر مدینہ کی حکومت کیوں تسلیم کریں؟ اپنی آزادی ہاتھ سے کیوں جانے دیں اور زکوٰۃ جو ایک قسم کا تاوان ہے کیوں ادا کریں؟

طلیحہ پہلے سمیراء میں مقیم تھا۔ وہاں سے بزاخہ آگیا کیونکہ اس کے خیال میں لڑائی کے لیے بزاخہ نسبتاً زیادہ مناسب اور محفوظ جگہ تھی۔

طلیحہ کا دعوائے نبوت:

طلیحہ نے محمد ﷺ کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ نہ کیا تھا بلکہ وہ اسود عنسی اور مسیلمہ کی طرح آپ کی زندگی کے آخری دنوں ہی میں یہ دعویٰ کر چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کے برعکس عربوں کو دوبارہ بت پرستی اختیار کرنے کی دعوت نہ دی۔ کیونکہ بت پرستی کو محمد ﷺ عرب سے بالکل مٹا چکے تھے اور اب اس کے پنپنے کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ توحید کی دعوت عرب کے کناروں تک پہنچ چکی تھی اور لوگوں کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ بت پرستی ہذیان کی ایک قسم ہے جس سے ہر شریف انسان کو شرمانا چاہیے۔

مدعیان نبوت نے لوگوں میں یہ بات پھیلانی شروع کی کہ ان پر اسی طرح وحی نازل ہوتی ہے جس طرح محمد ﷺ پر نازل ہوتی ہے اور ان کے پاس بھی اسی طرح آسمان سے فرشتہ آتا ہے جس طرح

محمد ﷺ کے پاس آتا ہے۔ ان میں سے بعض نے آیات قرآنی کے مشابہ کچھ عبارتیں بنانے کی کوشش کی اور جیسی بری بھلی وہ بنیں انہیں لوگوں کے سامنے وحی آسمانی کے طور پر پیش کیا۔ لیکن ان عبارتوں پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے ان کی قلعی کھل جاتی ہے اور حیرت ہوتی ہے ان مدعیان نبوت کو کس طرح جرأت ہوئی کہ انہوں نے ایسی بے سروپا باتوں کو وحی آسمانی کا نام دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور وہ لوگ بھی کسی عجیب قسم کی ذہنیت کے مالک تھے جنھوں نے اس نامعقول اور بے ہودہ بکواس کو وحی الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا۔ ذیل میں نمونۃً اس وحی کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے جو طلیحہ پر اترا کرتی تھی۔

"والحمام والیمام، والصراد الصوام، قد صمن قبلکم بأعوام لیبلغن ملکنا العراق والشام۔"

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کاہن لوگ مسجع و مقفیٰ عبارتیں لوگوں کے سامنے پیش کر کے ان پر رعب بٹھاتے تھے۔ قریش بھی یہ کہہ کر آپ ﷺ کا انکار کرتے تھے کہ یہ شخص کاہن ہے اور جو کچھ اس پر اترتا ہے وہ اسی قسم کی مسجع و مقفیٰ عبارتیں ہیں جو عموماً کاہن لوگ سنایا کرتے ہیں۔ لیکن بالآخر عربوں اور تمام انسانوں پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ قرآن محمد ﷺ کا معجزہ ہے اور جن وانس میں سے کسی کی طاقت نہیں کہ وہ اس کی نظیر پیش کر سکے۔ طلیحہ اور اسود عنسی وغیرہ بھی کاہن تھے اور دوسرے کاہنوں کی طرح انہوں نے بھی بعض مسجع و مقفیٰ عبارتیں بنا کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیا تھا حالانکہ ان عبارتوں کو سننا بھی مذاق سلیم پر گراں گزرتا تھا اور کوئی باذوق ان عبارتوں کو برداشت نہ کرسکتا تھا۔ تعجب ہے کہ یہ خرافات سننے کے بعد لوگ کس طرح ان مدعیان نبوت کے پھندوں میں گرفتار ہوگئے اور ان عبارتوں کو کلام الٰہی یقین کرنے لگے۔

طلیحہ نے لوگوں کے سامنے جو تعلیم پیش کی وہ بیشتر پردہ اخفا میں ہے البتہ تاریخ سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو نماز میں رکوع و سجود کرنے سے منع کر دیا تھا اور کہا تھا اللہ کا یہ منشاء نہیں کہ تم اپنے چہرے زمین پر رگڑو یا نماز میں اپنی پیٹھیں کمان بناؤ۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ عیسائیوں کے طریقہ عبادت سے لیا تھا۔ طلیحہ، مسیلمہ اور ان جیسے دوسرے مدعیان نبوت کی پیش کردہ تعلیمات اور باتیں اس لیے پردہ اخفا میں ہیں کہ اس زمانے کے مسلمانوں نے انہیں مدون کرنے کی کوشش نہ کی۔ بعد میں جو چیزیں مدون ہوئیں وہ بھی صرف ان باتوں پر مشتمل تھیں جن سے دین اسلام کی تائید ہوتی تھی۔

ہر شخص کو علم ہے کہ صدر اول میں قرآن کریم کے سوا، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے یک جا کیا گیا، کوئی چیز مدون نہیں کی گئی۔ احادیث کی تدوین بھی پہلی صدی ہجری کے بعد عمل میں آئی۔ اس حقیقت کے پیش نظر تعجب نہیں کہ طلیحہ اور دوسرے مدعیان نبوت کے متعلق جن روایات کا وجود ملتا ہے وہ بے سروپا ہی ہوں خصوصاً اس صورت میں کہ یہ روایات اس زمانے کے عربی طرز بود و ماند، تہذیب و تمدن اور رسوم کے برعکس ہیں اور اس وقت کے واقعات و حالات سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتیں۔

مرتدین کی سرکوبی اور ضرار رضی اللہ عنہ کی روانگی:

محمد ﷺ کی زندگی ہی میں طلیحہ نے بنی اسد میں، اسود عنسی نے یمن میں اور مسیلمہ نے یمامہ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اسی لیے آپ نے ضرار بن ازور کو بنی اسد کے مسلمان عمال کے پاس یہ ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ وہ مرتدین کے خلاف سخت کارروائی کریں۔ اس حکم کے مطابق مسلمانوں نے واردات کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور طلیحہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سمیراء کے مقام پر فروکش ہوا۔

مختلف میدان ہائے جنگ میں اپنی فتح یابی کی خبریں سن کر مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی اور مرتدین کی تعداد گھٹتی جاتی تھی۔ بالآخر ضرار ذ نے طلیحہ سے جنگ کرنے کے لیے سمیراء کی جانب کوچ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ایک مسلمان، اس خیال سے کہ طلیحہ کو جہنم واصل کرنے کا شرف اس کے حصے میں آئے، فوج سے علیحدہ ہو کر طلیحہ کے کیمپ میں جا پہنچا اور اس پر تلوار سے وار کیا لیکن تلوار چٹ گئی اور طلیحہ بچ گیا۔ یہ دیکھ کر طلیحہ کے حاشیہ برداروں نے یہ بات پھیلانی شروع کر دی کہ ان کے نبی پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا۔

مسلمان طلیحہ سے جنگ کی تیاریاں کرنے میں مصروف ہی تھے کہ محمد ﷺ کی خبر وفات پہنچ گئی۔ اس پر ان میں اضطراب برپا ہو گیا اور ان کی تعداد گھٹنے لگی۔ بعض لوگ اسلامی لشکر سے بھاگ کر طلیحہ سے جا ملے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد جب عبس اور ذبیان کے قبائل بھی طلیحہ سے مل گئے تو اس کی قوت و طاقت اور تعداد میں بے حد اضافہ ظاہر ہو گیا اور ظاہر بین آنکھ کو نظر آنے لگا کہ طلیحہ کو مغلوب کرنا آسان کام نہیں۔

عیینہ اور مسیلمہ کا الحاق:

طلیحہ کی قوت و طاقت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب عبس اور ذبیان کے علاوہ بعض دوسرے قبائل بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بنو اسد، غطفان اور طیئ محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک دوسرے کے حلیف تھے لیکن بعض رنجشوں کی بنا پر اسد غطفان، قبیلہ طیئ کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے طیئ کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ اس واقعے کا اثر اتنا ہی نہ ہوا کہ اسد و غطفان اور طیئ کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی بلکہ بنی اسد اور غطفان میں دوستی کا جو معاہدہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ محمد ﷺ کی وفات کے بعد عیینہ بن حصن فزاری نے غطفان کو جمع کر کے کہا جب سے ہمارے اور بنی اسد کے درمیان اختلاف برپا ہوا ہے ہمیں برابر نقصان پہنچ رہا ہے میں اب دوستی کے پرانے معاہدے کی تجدید اور طلیحہ کی فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہوں۔ واللہ! اپنے حلیف قبیلے کے نبی کی اطاعت کرنا ہمارے لیے قریش کے نبی کی اطاعت کرنے سے بہتر ہے۔ پھر محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں اور طلیحہ زندہ ہے۔

عیینہ کی قوم نے اس کی بات تسلیم کر لی اور طلیحہ کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح مرتدین کی شان و شوکت بہت بڑھ گئی اور ان قبائل میں جو مسلمان آباد تھے وہ بھاگ کر مدینہ پہنچ گئے۔

مرتدین کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دھمکی:

مذکورہ بالا قبائل نے بزاخہ میں جمع ہو کر ارتداد کا اعلان کیا اور مدینہ کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دوسرے قبائل کی طرح ان سے بھی جنگ کرنے کا ارادہ کیا اور انہیں ایک خط بھیج کر دھمکی دی کہ اگر وہ دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے تو ان سے جنگ کر کے انہیں تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ خالد رضی اللہ عنہ کو طلیحہ اور اس کے بعد مالک بن نویرہ سے جنگ کرنے کا حکم ملا تھا چنانچہ وہاں بستیوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ اسی اثناء میں قبیلہ طیئ کے ایک سردار عدی بن حاتم زکوٰۃ لے کر مدینہ آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بلایا اور ہدایت کی کہ وہ اپنے قبیلے میں جائیں اور مرتدین کو ڈرائیں کہ اگر وہ حالت ارتداد پر قائم رہے تو ان کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ ادھر خالد رضی اللہ عنہ نے فی الفور بزاخہ کا قصد نہ کیا بلکہ اُجا کی طرف مڑ گئے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ خیبر کی جانب جا رہے ہیں اور وہاں سے مزید کمک لے کر پھر بزاخہ کی طرف کوچ کریں گے۔

عدی رضی اللہ عنہ کی سعی و جدو جہد:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق عدی نے اپنے قبیلے میں پہنچ کر لوگوں کو سمجھایا بجھایا اور انہیں دوبارہ اسلام لانے کی تلقین کی لیکن لوگوں نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا اور کہا:

''ہم ابوالفصیل (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مخالفوں نے ان کی کنیت مذاقاً ابوالفصیل رکھ چھوڑی تھی) کی اطاعت کبھی نہ کریں گے۔''

اس پر عدی نے ان سے کہا: ''تمہاری جانب ایک ایسا لشکر بڑھا چلا آ رہا ہے جو تم پر ہرگز رحم نہ کرے گا اور قتل و غارت کا بازار گرم کرے گا کسی بھی شخص کو امان نہ مل سکے گی۔ میں نے تمھیں سمجھا دیا ہے۔ آگے تم جانو تمہارا کام۔''

عدی نے مسلمانوں کی قوت و طاقت اور بہادری کا ذکر تفصیل سے کیا اور انہیں سمجھایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام مخالفین کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کا تہیہ کر لیا ہے اس لیے تم اصرار سے باز آ جاؤ اور اسلام قبول کر لو ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔

عدی کی باتوں پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ وہ لوگ مشاہدہ کر چکے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کے مدینہ سے سینکڑوں میل دور سرحد روم پر ہونے کے باوجود عبس، ذبیان اور ان کے مددگار قبائل کو بری طرح شکست دی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بہادری اور تندی و سختی میں ضرب المثل ہیں اور وہ ان کا مقابلہ کسی صورت میں بھی نہ کر سکیں گے۔

بنی طیئ کا دوبارہ قبولِ اسلام:

عدی کی باتیں سن کر بنو طیئ نے باہم مشورہ کیا اور بالآخر طے پایا کہ عدی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ

ہے اور انہیں دوبارہ اسلام لانے کی دعوت دینے سے ان کا مقصد ذاتی فائدہ حاصل کرنا نہیں بلکہ محض اپنی قوم کی خیر خواہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے عدی سے کہا: ''ہم آپ کا مشورہ قبول کرتے ہیں۔ آپ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں اور انہیں ہم پر حملہ کرنے سے روک دیں۔ اس عرصے میں ہم اپنے ان بھائیوں کو بلانے کی کوشش کریں گے جو بزاخہ میں طلیحہ کے لشکر میں موجود ہیں کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم نے کھلم کھلا اس کی مخالفت کی تو وہ ہمارے ان بھائیوں کو قتل کرا دے گا۔''

عدی اپنی قوم کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔ وہ فی الفور سخ پہنچے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے جا کر کہا: آپ تین روز تک ٹھہر جائیں۔ اس عرصے میں آپ کے پاس پانچ سو بہادر جمع ہو جائیں گے جو دشمن کے مقابلے میں آپ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔ تین روز کا یہ انتظار اس امر سے بہتر ہے کہ آپ انہیں آگ میں دھکیل دیں اور خود ان کے جلنے کا تماشا دیکھیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کوئی بات مخفی نہ تھی۔ وہ جنگی حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور جانتے تھے کہ اگر طئی کے آدمی طلیحہ کا ساتھ چھوڑ گئے تو اس کی قوت و طاقت میں معتدبہ کمی واقع ہو جائے گی۔ اور یہ بات مسلمانوں کے لیے بے حد مفید ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے بنی طئی کی جانب کوچ کرنے کا ارادہ تین روز کے لیے ملتوی کر دیا۔ عدی دوبارہ اپنے قبیلے میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ قبیلے کے لوگوں نے طلیحہ کے لشکروں میں اپنے آدمیوں کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ وہ فوراً واپس آجائیں کیونکہ مسلمانوں نے طلیحہ کے لشکر پر حملہ کرنے سے پہلے چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا ہے اس لیے وہ آئیں اور اس حملے کو روکیں۔

یہ پیغام پہنچنے پر طلیحہ کو مطلق شبہ نہ ہوا اور اس نے بنی طئی کے لوگوں کو بڑی خوشی سے اپنے قبیلے کی طرف واپس جانے کی اجازت دے دی۔ قبیلے میں پہنچ کر ان کی بات چیت اپنے آدمیوں سے ہوئی اور بہت کچھ بحث وتمحیص کے بعد انہوں نے بھی عدی کی رائے سے اتفاق کر لیا چنانچہ تمام لوگ دوبارہ اسلام قبول کر کے عدی کے ہمراہ خالد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔

اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انسر کا قصد کیا کیونکہ ان کا ارادہ وہاں جا کر قبیلہ جدیلہ سے جنگ کرنے کا تھا۔ عدی نے پھر مداخلت کی اور کہا:

''قبیلہ طئی ایک پرندے کے مانند ہے اور جدیلہ قبیلہ طئی کا ایک پر ہے۔ آپ مجھے کچھ روز کی مہلت دیں۔ شاید اللہ جدیلہ کو بھی اسی طرح بچا لے جس طرح غوث کو بچایا ہے۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بڑی خوشی سے عدی کی درخواست منظور کر لی اور انہیں جدیلہ کی طرف جانے کی اجازت دے دی۔ وہ وہاں گئے اور سمجھا بجھا کر انہیں بھی دوبارہ قبولِ اسلام پر آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ جدیلہ کے ایک ہزار سوار لے کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ مورخین عدی کے اس کارنامے کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قبیلہ طئی نے عدی جیسا مدبر عقل مند اور بابرکت انسان آج تک پیدا نہیں کیا۔ وہ اس قبیلے کے بہترین فرد تھے۔

مقابلے کے لیے طلیحہ کا اصرار:

طئی اور جدیلہ کے دوبارہ قبول اسلام کی خبریں طلیحہ کو بزاخہ میں ملیں۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سن کر اسے کس قدر گھبراہٹ ہوئی اور کس طرح اس کے عزائم پر اوس پڑ گئی۔لیکن اس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری اور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔طلیحہ تو شاید اس ارادے سے باز بھی آجاتا لیکن عیینہ بن حصن کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکا۔عیینہ کو جو سات سو فزاریوں کے ساتھ لشکر میں موجود تھا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سخت دشمنی تھی اور وہ مدینہ کی حکومت پر کاری ضرب لگانا چاہتا تھا۔

عیینہ وہی شخص ہے جو غزوۂ احزاب کے موقع پر بنی فزارہ کا سردار تھا۔اس غزوے کے دوران میں جب کفار کے تین لشکروں نے بنو قریظہ سے مل کر مدینہ پر زبردست حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا تو ان میں سے ایک لشکر کا سپہ سالار عیینہ تھا۔غزوہ احزاب میں کفار کی شکست کے بعد بھی اس نے مدینہ پر حملے کا ارادہ کیا لیکن محمد ﷺ نے شہر سے نکل کر اس حملے کو روکا اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔یہ غزوہ ذی قرد کہلاتا ہے گو بعد میں حالات سے مجبور ہو کر اسلام قبول کرنا پڑا لیکن اس کا دل بدستور اسلام کے خلاف بغض وعداوت سے بھرا ہوا تھا۔چنانچہ محمد ﷺ کی وفات کے بعد اس نے اعلان کردیا کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت کبھی تسلیم نہیں کرسکتا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے طلیحہ، طئی اور جدیلہ کی جماعت اور ایک کثیر فوج سے محروم ہونے کے باوجود اپنی نبوت سے نہ پھر سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو عیینہ اس کا دشمن بن جائے گا اور اردگرد کے قبائل کو اس کے خلاف بھڑکا کر اس کی زندگی خطرے میں ڈال دے گا۔اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ بہ دستور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا رہے اور منتظر رہے کہ آئندہ کیا وقوع میں آتا ہے۔

طلیحہ کے خلاف پیش قدمی:

قبیلہ طئی کی دونوں شاخوں کو ساتھ ملانے کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے طلیحہ کے خلاف پیش قدمی شروع کردی اور عکاشہ بن محصن اور ثابت بن اقرم انصاری کو دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے لشکر سے آگے بھیجا۔یہ دونوں عرب کے معزز ترین فرد اور بہادری میں ضرب المثل تھے۔راستے میں ان دونوں کو طلیحہ کا بھائی حبل (اہل عرب جنگ کو چکی سے تعبیر کرتے تھے طلیحہ کا مطلب یہ تھا کہ تمھیں بھی ویسی ہی سخت جنگ درپیش ہے جیسی مسلمانوں کو اور اس جنگ کے واقعات تمھیں کبھی نہ بھولیں گے) مل گیا۔انہوں نے اسے قتل کرڈالا۔جب طلیحہ کو بھائی کے قتل کی خبر پہنچی تو وہ اپنے دوسرے بھائی سلمہ کو ساتھ لے کر ان دونوں کی تلاش میں نکلا اور بالآخر انہیں پکڑلیا۔سلمہ نے ثابت کو تو مقابلے کی مہلت ہی نہ دی اور فوراً شہید کرڈالا لیکن حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ نہایت جواں مردی سے طلیحہ کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔طلیحہ کو مجبوراً اپنے بھائی سلمہ سے مدد لینی

پڑی۔ ان دونوں نے مل کر عکاشہ کو بھی شہید کر دیا اور اپنے کیمپ کو لوٹ گئے۔

مسلمانوں میں اضطراب:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لشکر لیے آگے بڑھے چلے آ رہے تھے کہ لوگوں نے ان دونوں شہیدوں کی لاشیں میدان میں پڑی ہوئی دیکھیں۔ اس سے ان میں سخت ہیجان برپا ہو گیا۔ خالد نے یہی مناسب سمجھا کہ سردست دشمن کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے تاکہ لوگوں کے ہیجان میں کمی ہو جائے اور وہ اپنی فوج کو بیش از بیش منظم کر کے زیادہ کامیابی سے دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ وہ لشکر لے کر بنی طئی کی جانب لوٹ آئے اور عدی کی مدد سے لشکر کی تعداد میں مزید اضافے کی تدابیر شروع کر دیں۔ جب مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ ان کی تعداد اور قوت و طاقت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو وہ دوبارہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے چنانچہ انہیں لے کر بزاخہ پہنچے۔

بنی طئی کا اظہارِ معذرت:

قیس اور بنو اسد طلیحہ کے ہمراہ، مسلمانوں سے لڑائی کے لیے جمع تھے۔ بنی طئی کے کچھ لوگوں نے خالد سے درخواست کی کہ ہمیں بنی اسد کے مقابلے سے باز رکھا جائے کیونکہ وہ ہمارے حلیف ہیں البتہ قیس کے مقابلے میں ہم آپ کی ہر طرح امداد کر سکتے ہیں۔ خالد نے فرمایا: ''قیس بھی شان و شوکت اور قوت و طاقت میں بنو اسد سے کم نہیں لیکن میں تمھیں اختیار دیتا ہوں کہ تم کسی قبیلے سے چاہے لڑو چاہے نہ لڑو۔''

مگر عدی نے مومنانہ جذبے کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''واللہ! حلیف ہونے کے باوجود مجھے کوئی چیز بنی اسد کا مقابلہ کرنے سے باز نہ رکھ سکے گی۔ جب انہوں نے دشمنانِ اسلام کا ساتھ دیا تو وہ ہمارے حلیف بھی نہ رہے۔ واللہ! اگر میرا اپنا خاندان بھی اسلام کی مخالفت کرے گا تو میں اس سے بھی جہاد کروں گا۔''

یہ سن کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ایک فریق سے لڑنا بھی جہاد ہی ہے۔ تم اپنے اہل قبیلہ کی رائے کی مخالفت نہ کرو بلکہ وہی کرو جس میں تمہارے قبیلے والوں کی خوشی ہو اور اس قبیلے سے لڑائی کرو جس سے تمہارے قبیلے والے لڑنا چاہیں۔''

چنانچہ بنی طئی قبیلہ قیس سے لڑے اور باقی مسلمان بنو اسد سے۔

آغاز جنگ اور فرار طلیحہ:

طلیحہ کے لشکر کی کمان عیینہ بن حصن کر رہا تھا۔ خود طلیحہ خیمے میں کمبل اوڑھے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے وحی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ جب لڑائی کا بازار خوب گرم ہو گیا اور عیینہ کو خالد اور مسلمانوں کی قوت کا پتا چلا تو وہ طلیحہ کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: ''کیا جبریل آپ کے پاس کوئی وحی لائے؟''

اس نے کہا: ''ابھی نہیں۔''

یہ سن کر وہ واپس چلا گیا اور لڑنے میں مشغول ہوگیا۔ جب لڑائی نے مزید شدت اختیار کی اور مسلمانوں کا دباؤ مرتدین پر برابر بڑھتا چلا گیا تو وہ پھر طلیحہ کے پاس آیا اور پوچھا: ''اب بھی جبریل کوئی وحی لائے یا نہیں؟''

طلیحہ نے وہی جواب دیا کہ ابھی نہیں۔ عیینہ نے جھنجھلا کر پوچھا: ''آخر کب تک آئے گی؟''

طلیحہ نے کہا: ''میری عرض تو ملاءِ اعلیٰ تک پہنچ چکی ہے۔ اب دیکھو کیا جواب ملتا ہے؟''

اس پر وہ میدان جنگ میں آگیا اور لڑنا شروع کر دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ خالد نے اس کے لشکر کا محاصرہ کر لیا اور اب شکست کوئی دم کی بات ہے تو وہ گھبراہٹ کی حالت میں پھر طلیحہ کے پاس آیا اور پوچھا: ''اب بھی کوئی وحی نازل ہوئی یا نہیں؟''

طلیحہ نے جواب دیا ''ہاں!''

اس نے پوچھا ''کیا؟''

طلیحہ نے جواب دیا ''یہ وحی نازل ہوئی ہے: ''ان لك رحا كرحاه وحديثا لا تنساه'' (تیرے پاس بھی ویسی ہی چکی ہے جیسی مسلمانوں کے پاس ہے اور تیرا ذکر بھی ایسا ہے جسے تو کبھی نہ بھولے گا)۔ (اہل عرب جنگ کو چکی سے تعبیر کرتے تھے طلیحہ کا مطلب یہ تھا کہ تمھیں بھی ویسی ہی سخت جنگ درپیش ہے جیسی مسلمانوں کو اور اس جنگ کے واقعات تمھیں کبھی نہ بھولیں گے)۔

یہ سن کر عیینہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا اور چیخ اٹھا:

قد علم الله ان سيكون حديثا لا تنساه (بے شک اللہ کو معلوم ہے کہ عنقریب ایسے واقعات پیش آئیں گے جنھیں تو کبھی نہ بھولے گا۔)

اس کے بعد وہ اپنی قوم کی طرف آیا اور پکار کر کہا: ''اے بنو فزارہ! طلیحہ کذاب ہے۔ اسے چھوڑ دو اور بھاگ کر جانیں بچاؤ۔''

یہ سن کر بنو فزارہ تو بھاگ کھڑے ہوئے باقی لشکر طلیحہ کے گرد جمع ہوگیا اور پوچھا کہ اب آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ طلیحہ نے پہلے سے اپنے لیے ایک گھوڑے اور اپنی بیوی نوار کے لیے ایک اونٹ کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جب اس نے لوگوں کو اس پریشانی کی حالت میں دیکھا تو وہ کود کر گھوڑے پر سوار ہوگیا اور اپنی بیوی کو بھی سوار کر کے یہ کہتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا: ''جو شخص میری طرح اپنے اہل و عیال کو لے کر بھاگ سکے وہ بھاگ جائے۔''

طلیحہ کا دوبارہ قبول اسلام:

اس طرح طلیحہ کی قوت و طاقت، جو اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں جمع کی تھی، ملیامیٹ ہوگئی اور اس کی نبوت کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ بھاگ کر شام پہنچا اور وہاں بنو کلب میں سکونت اختیار کر لی جب اسے

معلوم ہوا کہ ان تمام قبائل نے جو اس سے پہلے اس کے حلقہ اطاعت میں شامل تھے، اسلام قبول کرلیا ہے تو وہ بھی اسلام لے آیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ حضرت عمرہ کرنے کے ارادے سے مکہ آیا۔ جب وہ مدینہ کے قریب سے گزرا تو بعض لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی۔ انہوں نے فرمایا: ''اب میں اس کے خلاف کیا کرسکتا ہوں۔ اس سے تعرض نہ کرو کیونکہ اللہ نے اسے ہدایت دے دی ہے۔''

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو طلیحہ ان کی بیعت کرنے کے لیے آیا۔ اسے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو عکاشہ اور ثابت کا قاتل ہے۔ میرا دل تیری طرف سے کبھی صاف نہیں ہوسکتا۔''

اس نے جواب دیا: ''امیر المومنین! آپ کو ان دونوں کی طرف سے کیا فکر ہے؟ اللہ نے انہیں میرے ہاتھ سے عزت کے مقام تک پہنچا دیا (شہادت دی) لیکن مجھے بھی ان کے ہاتھوں سے ذلیل نہ کرایا۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی بیعت لے لی۔ پھر فرمایا: ''اے دغاباز! تیری کہانت کا کیا بنا؟''

اس نے جواب دیا: ''امیر المومنین! وہ ختم ہوگئی۔ ہاں، کبھی کبھی ایک دو پھونکیں مار لیتا ہوں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رخصت ہوکر وہ اپنی قوم میں چلا آیا اور وہیں مقیم ہوگیا۔ عراق کی جنگوں میں اس نے ایرانیوں کے مقابلے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

عیینہ بن حصن میدان جنگ سے فرار ہوکر اپنی قوم بنو فزارہ میں پہنچ گیا اور اعلان کردیا کہ ''طلیحہ کذاب اور بزدل ہے اور اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی بیوی کے ہمراہ فرار ہوگیا ہے۔''

دوسرے مرتد قبائل کا استیصال:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے چشمہ بزاخہ پر کامل ایک مہینہ قیام فرمایا۔ اس دوران میں ان بقیہ قبائل کی سرکوبی میں مصروف رہے جو ابھی تک ارتداد اور سرکشی پر قائم تھے اور ام زمل سے مل کر مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں کررہے تھے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو چن چن کر قتل کروادیا جن کے ہاتھ بے گناہ مسلمانوں کے خون سے آلودہ تھے اور مرتدین کے متعدد سربرآوردہ اشخاص کو، جو اسلامی فوجوں کے مقابلے کو نکلے تھے، گرفتار کرکے مدینہ بھجوادیا۔ ان لوگوں میں سے مشہور شخص یہ تھے: قرہ بن ہبیرہ، فجاءۃ السلمیٰ، ابوشجرہ بن عبدالعزیٰ السلمی وغیرہ۔ یہ لوگ اس وقت تک حالت اسیری میں رہے جب تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق فیصلہ نہ سنادیا۔

بقیہ مرتد قبائل:

ام زمل اور طلیحہ کے لشکر کے مفرورین کا حال بیان کرنے سے قبل اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کا کیا بنا جو طلیحہ کی قوم، بنی اسد کی طرح دوبارہ اسلام میں داخل نہ ہوئے؟ کیا ان کی عقل یہ تقاضہ نہ کرتی تھی کہ جب طلیحہ کا کذب ان پر ظاہر ہوگیا تھا تو وہ محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لے آتے؟ بات یہ ہے کہ اگرچہ سارے عرب کو محمد ﷺ کے سامنے مجبوراً سر تسلیم خم کرنا پڑا لیکن درحقیقت وہ لوگ صدق دل سے

آپ پر ایمان نہ لائے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو بتوں کی عبادت فضول معلوم ہوئی تو وہ ان کی پرستش چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرنے لگے۔ لیکن اس عبادت کے ساتھ ساتھ محمد ﷺ نے ان پر جو دوسرے فرائض عائد کر دیئے وہ ان کے لیے بڑے تکلیف دہ تھے اور ان کی آزاد طبائع ان فرائض کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اسی لیے انہوں نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو ان لوگوں نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کر دیا کیونکہ مال کی محبت ان کے دلوں میں ہر چیز سے زیادہ رچی ہوئی تھی۔ اسی طرح وہ نماز اور دوسرے فرائض اسلام سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ طلیحہ، مسیلمہ اور دوسرے مدعیان نبوت کی پیروی انہوں نے اسی لیے اختیار کی تھی کہ اپنی گردنوں سے وہ طوق اتار کر پھینک سکیں جو اسلام کی شکل میں ان کی گردنوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ چنانچہ طلیحہ کے فرار ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے پر آمادہ نہ کر سکے اور دوسری جگہ جا کر خالد سے دوبارہ جنگ کرنے کی تیاری شروع کر دی کیونکہ ان کا خیال تھا وہ بالآخر ضرور فتح یاب ہوں گے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مجبور کر سکیں گے کہ فرائض اسلام کی بجا آوری میں ان پر اتنی سختی نہ کریں جتنی وہ اب کر رہے ہیں۔

لڑائی کے لیے دوبارہ تیار ہو جانے کا ایک سبب اور بھی تھا اور اس کا تعلق بدوؤں کی نفسیات سے ہے: ان قبائل اور مہاجرین اور انصار کے درمیان پرانے جھگڑے چلے آ رہے تھے جب محمد ﷺ نے ان پر غلبہ پا لیا تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور آپ کے احکام کی بجا آوری پر بہ ظاہر رضا مند ہو گئے۔ لیکن یہ سب کچھ انہوں نے بہ حالت مجبوری اپنی مرضی کے خلاف محض اس لیے کیا کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب ہو چکے تھے۔ جونہی انہیں کچھ مہلت اور آزادی ملی وہ مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک لمحہ بھی سوچ بچار میں ضائع نہ کیا۔ انہیں جنگ خندق کا واقعہ یاد تھا جب قریب تھا کہ مدینہ اپنے دروازے کفار کے لیے کھول دیتا اگر ایک سخت آندھی کافروں کے تمام منصوبے تہ و بالا کر کے نہ رکھ دیتی۔

بہ ظاہر مسلمان ہونے کے بعد یہ لوگ چپکے ہو رہے اور دیکھتے رہے کہ کیا ہونے والا ہے، یہاں تک کہ محمد ﷺ کی وفات ہو گئی۔ پھر لوگ مرتد ہو گئے اور انہوں نے سارے ملک میں فساد برپا کر دیا۔ جب تک اسلامی فوجیں ان کی سرکوبی کے لیے پہنچیں انہوں نے اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر اپنی جمعیت کو مضبوط تر کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ قسمت ضرور ان کا ساتھ دے گی اور وہ دوبارہ اسی آزادی اور خود مختاری سے بہرہ ور ہو سکیں گے جس سے محمد ﷺ کے عہد میں محروم ہو چکے تھے۔ اگر تمام قبائل اپنے اس موقف پر مضبوطی سے قائم رہتے تو یقیناً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا اور وہ آسانی سے مرتدین پر فتح نہ پا سکتے لیکن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی کوششوں سے قبیلہ طئی کی دونوں شاخیں طلیحہ سے الگ ہو کر مسلمانوں سے مل گئیں۔ یہ دیکھ کر طلیحہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہی گھبراہٹ اور پریشانی اس کی شکست اور فرار کا موجب بنی۔

طلیحہ کے فرار ہونے کے بعد عیینہ بھی اپنے قبیلے میں جا کر بیٹھ رہا۔ اس دوران میں بنو عامر جو طلیحہ

کے طرف داروں میں سے تھے اور بزاخہ سے کچھ فاصلے پر آباد تھے، اس انتظار میں رہے کہ دیکھیں کس فریق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے؟ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بنو اسد اور قیس کو شکست فاش دے دی تو بنو عامر نے باہم مشورہ کرکے طے کیا کہ اب ان کے لیے مسلمان ہو جانا ہی بہتر رہے گا، چنانچہ وہ بھی اسد، غطفان اور طئ کی طرح حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرکے اسلام میں داخل ہو گئے۔

قاتلوں پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سختی:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے غطفان، ہوازن، سلیم اور طئ کے لوگوں کی جان بخشی اس شرط پر کی تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان کے حوالے کر دیں جنھوں نے ان غریب مسلمانوں کو قتل کیا تھا جو بہ زمانہ ارتداد ان کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ان کے سامنے پیش کیے گئے تو انہوں نے دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے ان کے سرداروں کے سوا باقی سب کو قتل کر دیا اور ان کی لاشیں آگ میں جلا دیں۔ اس کے بعد قرہ بن ہبیرہ، عیینہ بن حصن اور دوسرے سرداروں کو بیڑیاں پہنا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کر دیا اور ساتھ ہی حسب ذیل مضمون کا ایک خط بھی ارسال کیا:

"بنو عامر ارتداد کے بعد اسلام لے آئے۔ لیکن میں نے ان کی جان بخشی اس وقت تک نہ کی جب تک انہوں نے ان لوگوں کو میرے حوالے نہ کر دیا جنھوں نے غریب و بے کس مسلمانوں پر سخت ظلم ڈھائے تھے۔ میں نے ایسے تمام لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس خط کے ساتھ قرہ بن ہبیرہ اور اس کے ساتھیوں کو روانہ کر رہا ہوں۔"

حضرت خالد بن ولید کی روش پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خوشنودی:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جن لوگوں کو قتل مسلماناں کی پاداش میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا تھا ان کی طرف سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں قطعاً رحم نہ پیدا ہوا بلکہ انہوں نے ان دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سزا کا قرار واقعی مستحق سمجھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جواب میں لکھا: "اللہ تمھیں اپنے انعامات سے بہرہ ور کرتا رہے۔ میری یہ نصیحت ہے کہ تم اپنے معاملات میں ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہمیشہ تقویٰ کی راہ پر چلو کیونکہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے اور اس کے بندوں پر احسان کرتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں بڑھ چڑھ کر کام کرو اور کبھی سستی نہ برتو۔ ہر اس شخص کو، جس نے مسلمانوں کو قتل کیا ہو، قابو پانے کے بعد قتل کر دو۔ دوسرے لوگوں کے متعلق بھی جنھوں نے اللہ سے دشمنی اور سرکشی اختیار کرکے اس کے احکام کی خلاف ورزی کی اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ ان کا قتل کر دینا مناسب ہے تو تمھیں ایسا کرنے کا اختیار ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ خط حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے مرتدین کو مرعوب کرنے کی پالیسی پر اور زور شور سے عمل شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک مہینے تک وہ بزاخہ کے چشمے پر مقیم رہ کر، مرتدین کا قافیہ تنگ

مرتد قیدیوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معافی:

لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے برعکس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان قیدیوں پر سختی نہ کی جو میدان جنگ سے پابجولاں مدینہ پہنچے تھے۔ عیینہ بن حصن مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا اور طلیحہ کی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں سے جنگ کر چکا تھا۔ وہ قرہ بن ہبیر کے ساتھ قید ہو کر مدینہ آیا۔ اس کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ مدینہ کے لڑکے اسے کھجور کی شاخوں سے مارتے اور کہتے تھے: ''اے اللہ کے دشمن! تو ہی ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا تھا؟''

عیینہ جواب دیتا: ''میں تو کبھی اللہ پر ایمان نہیں لایا۔''

لیکن اس کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی جاں بخشی کر دی اور اسے کچھ نہ کہا۔

قرہ بن ہبیرہ:

قرہ بن ہبیرہ بنو عامر سے تعلق رکھتا تھا۔ محمد ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عمرو بن العاص عمان سے مدینہ آتے ہوئے راستے میں اس کے پاس ٹھہرے تھے۔ اس وقت بنو عامر ارتداد کے لیے پر تول رہے تھے۔ جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کیا تو قرہ نے علیحدگی میں ان سے مل کر کہا: ''عرب تمہیں تاوان (زکوٰۃ) دینے پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ اگر تم ان کے اموال انہیں کے پاس رہنے دو اور ان پر زکوٰۃ عائد نہ کرو تو تمہاری باتیں ماننے اور اطاعت قبول کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تم نے انکار کیا تو پھر وہ ضرور تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

''اے قرہ! کیا تو کافر ہو گیا ہے اور ہمیں عربوں کا خوف دلاتا ہے؟''

جب قرہ اسیر ہو کر مدینہ آیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو اس نے کہا: ''اے خلیفہ رسول اللہ! میں تو مسلمان ہوں۔'' پر حضرت عمرو بن عاص نے سارا واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ جب وہ زکوٰۃ کی بات پر پہنچے تو قرہ کہنے لگا: ''حضرت عمرو بن عاص! اس بات کو جانے دو۔''

حضرت عمرو بن عاص نے کہا: ''کیوں؟ واللہ! میں تو سارا حال بیان کروں گا۔''

جب وہ بات ختم کر چکے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور قرہ کی جان بخشی کر دی۔

علقمہ بن علاثہ:

عفو و درگذر کی یہ پالیسی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جانب سے کمزوری کی آئینہ دار نہ تھی بلکہ اس سے صرف وہ جوش و خروش اس انداز سے سرد کرنا مقصود تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ ہو۔ لیکن جہاں معاملہ محمد ﷺ کی رسالت تک پہنچتا تھا وہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی قسم کی نرمی ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے چند مثالیں کافی ہوں گی۔

بنی کلب کے ایک شخص علقمہ بن علاثہ نے محمد ﷺ کے زمانے میں اسلام قبول کرلیا تھا لیکن آپ کی زندگی ہی میں مرتد ہوگیا اور شام چلا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد وہ اپنے قبیلے میں واپس آیا اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خبر پا کر قعقاع بن حضرت عمرو کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا لیکن مقابلے کی نوبت آنے سے پیشتر ہی علقمہ فرار ہوگیا۔ اس کی بیوی، بیٹیاں اور دوسرے ساتھی اسلام لے آئے اور اس کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ بعد میں علقمہ بھی تائب ہو کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے اس کی توبہ قبول کرلی اور جان بخشی کردی کیونکہ اس نے نہ مسلمانوں سے جنگ کی تھی اور نہ کسی مسلمان کو قتل کیا تھا۔

فجاءہ ایاس:

لیکن اس کے مقابل انہوں نے فجاءہ ایاس بن عبد یالیل کے عذرات قبول نہ کیے اور نہ اس کی جان بخشی ہی کی۔ یہ شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے عرض کی کہ آپ مجھے کچھ ہتھیار دیجئے میں جس مرتد قبیلے سے آپ چاہیں گے لڑنے کو تیار ہوں۔ انہوں نے اسے ہتھیار دے کر ایک قبیلے سے لڑنے کا حکم دیا۔ لیکن فجاءہ نے وہ ہتھیار قبیلہ سلیم، عامر اور ہوازن کے مسلمانوں اور مرتدین دونوں کے خلاف استعمال کیے اور کئی مسلمانوں کو قتل کردیا۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے طریفہ بن حاجز کو ایک دستے کے ہمراہ فجاءہ کی جانب روانہ کیا لڑائی میں فجاءہ گرفتار ہوا اور طریفہ اسے اپنے ہمراہ مدینہ لے آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے جلا دینے کا حکم دیا۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر فجاءہ مسلمانوں کو قتل نہ کرتا تو اتنی ہولناک سزا نہ دی جاتی جس پر بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی افسوس ہوا۔

ابوشجرہ:

اسی ضمن میں ابوشجرہ بن عبد العزی کا واقعہ بیان کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ واقعہ عیینہ، قرہ اور علقمہ کے واقعات سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ ابوشجرہ مشہور شاعرہ خنساء کا بیٹا تھا۔ جس نے اپنے بھائی صخر کی یاد میں بڑے دل دوز مرثیے کہے ہیں۔ ابوشجرہ بھی اپنی والدہ کی طرح شاعر تھا۔ وہ مرتدین سے مل گیا اور ایسے شعر کہنے لگا جس میں اپنے ساتھیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا اور ان سے لڑنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ چنانچہ منجملہ اور اشعار کے اس کا ایک شعر یہ بھی تھا:

فرویت رمحی من کتیبة خالد بن ولید　　　وانی لا رجو بعدها ان اعمرا

(میں نے اپنا نیزہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے خون سے سیراب کردیا ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی میں اسی طرح کرتا رہوں گا۔)

لیکن جب اس نے دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید کے خلاف اس کی ترغیب و تحریص بارآور ثابت نہیں ہوئی اور لوگ جوق در جوق اسلام لا رہے ہیں تو وہ بھی اسلام لے آیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی بھی جان

بخشی کر دی اور اسے معاف کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک دفعہ ابو شجرہ ان کے پاس آیا۔ وہ اس وقت زکوٰۃ کا مال غرباء میں تقسیم کر رہے تھے۔ ابو شجرہ نے کہا:

"امیر المومنین! مجھے بھی کچھ دیجئے کیونکہ میں حاجت مند ہوں"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "تو کون ہے؟"

جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ ابو شجرہ ہے تو فرمایا:

"اے اللہ کے دشمن! کیا تو وہی نہیں جس نے کہا تھا:

فرویت رمحی من کتیبۃ خالد وانی لا رجو بعدھا اف عمرا

اس کے بعد انہوں نے اسے درے مارنے کا حکم دیا مگر وہ بھاگ کر اونٹنی پر سوار ہو کر اپنی قوم بنو سلیم میں آ گیا۔

ام زمل کا خروج:

جب لوگوں میں یہ خبریں مشہور ہوئیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بالعموم ایسے لوگوں کے متعلق عفو و درگزر سے کام لے رہے ہیں جو مرتد ہونے کے بعد اسلام لے آتے ہیں تو ان قبائل کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو گیا جنھوں نے طلیحہ کی مدد کی تھی اور وہ بھی رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ لیکن غطفان طئی سلیم اور ہوازن کے بعض لوگ جنھوں نے بزاخہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں شکست کھائی تھی، بھاگ کر ام زمل سلمٰی بنت مالک کے پاس پہنچے اور وعدہ کیا کہ اس کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور جانیں قربان کر دیں گے لیکن پیچھے نہ ہٹیں گے۔ لاریب یہ مفرورین اتنے آتش زیر پا تھے کہ مسلمانوں کے خلاف ان کا جوش و خروش نہ ان کی عبرت ناک شکست ٹھنڈا کر سکی اور نہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا عفو و درگزر ان پر کچھ اثر کر سکا اور وہ ایک بار پھر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے جمع ہو گئے۔ اگر مسلمانوں سے ان کی نفرت اور ان کے خلاف سخت غیظ و غضب کا جذبہ ان کے دلوں میں موجزن نہ ہوتا تو طلیحہ کے بزدلانہ فرار اور اس کے کذب و افتراء کا حال ظاہر ہو جانے کے بعد وہ ضرور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کر لیتے۔ ام زمل بھی مسلمانوں سے خار کھائے بیٹھی تھی اور اس کے دل پر ایک ایسا چرکا لگا ہوا تھا جو مرور زمانہ کے باوجود مندمل نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے طبعی امر تھا کہ بزاخہ کا شکست خوردہ لشکر ام زمل کے پاس جمع ہوتا اور اپنے مقتولین کا انتقام لینے کی ہر ممکن تدابیر اختیار کرتا۔

ام زمل ام قرفہ کی بیٹی تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قتل کر دی گئی تھی۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ زید بن حارثہ بنی فزارہ کی جانب گئے۔ وادی القریٰ میں ان کا سامنا بنی فزارہ کے چند لوگوں سے ہوا۔ انہوں نے زید کے ساتھیوں کو تو قتل کر دیا اور خود انہیں گہرا زخم پہنچایا۔ وہ اسی حالت میں مدینہ پہنچے۔ ان کے زخم مند

مل ہونے پر محمد ﷺ نے انہیں ایک لشکر کے ہمراہ دوبارہ بنی فزارہ کی جانب روانہ فرمایا۔ اس مرتبہ زید کے لشکر کو کامیابی ہوئی۔ بنی فزارہ کے اکثر آدمی قتل یا مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ ان قیدیوں میں ام قرفہ فاطمہ بنت بدر بھی تھی۔ چونکہ اس نے اپنی قوم کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر انہیں مقابلے کے لیے تیار کیا تھا اس لیے اس جرم کی پاداش میں اسے قتل کر دیا گیا اور اس کی بیٹی ام زمل کو لونڈی بنا لیا گیا۔ یہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حصے میں آئی لیکن انہوں نے اسے آزاد کر دیا۔ کچھ عرصے تک تو یہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے پاس رہی پھر اپنے قبیلے میں واپس چلی آئی۔ والدہ کے قتل نے اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی چنانچہ وہ اس انتظار میں رہی کہ موقع ملنے پر مسلمانوں سے اس قتل کا بدلہ لے۔ فتنہ ارتداد نے اس کے لیے یہ موقع جلد بہم پہنچا دیا اور وہ بزاخہ کے ہزیمت خوردہ لشکر کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے بالمقابل میدان میں نکل آئی۔

اس کی والدہ ام قرفہ اپنی قوم میں بڑی عزت اور شان کی مالک تھی۔ وہ عیینہ بن حصن کی چچی اور مالک بن حذیفہ کی بیوی تھی۔ اس کے بیٹوں کا شمار بنی فزارہ کے معزز ترین افراد میں ہوتا تھا۔ اس کے پاس ایک جنگی اونٹ تھا جس پر سوار ہو کر وہ دوسرے قبائل سے لڑنے کے لیے اپنی قوم کے آگے چلا کرتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد یہ اونٹ ام زمل کے حصے میں آیا۔

عزت و افتخار میں ام زمل بھی اپنی والدہ کی ہم پلہ تھی اور اس کا مرتبہ بھی اپنی قوم میں وہی تھا جو اس کی والدہ کا تھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں شکست کھانے والے مفرورین ام زمل کے گرد جمع ہوئے تو اس نے ان کی ہمت بندھا کر انہیں ایک بار پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج سے ٹکر لینے کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اور لوگ بھی اس کے گرد جمع ہوتے گئے اور اس کی قوت و طاقت میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کا پتا چلا تو وہ بزاخہ سے اس لشکر کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔

ام زمل کی شکست:

دونوں فوجیں میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ہوئیں اور لڑائی شروع ہو گئی۔ ام زمل اونٹ پر سوار اشتعال انگیز تقریروں سے برابر فوج کو جوش دلا رہی تھی۔ مرتدین بھی بڑی بہادری سے جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔ ام زمل کے اونٹ کے گرد سو اونٹ اور تھے۔ جن پر بڑے بڑے بہادر سوار تھے اور وہ بڑی پامردی سے ام زمل کی حفاظت کر رہے تھے۔

مسلمان شہسواروں نے ام زمل کے پاس پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن اس کے محافظوں نے ہر بار انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ پورے سو آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد مسلمان ام زمل کے اونٹ کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور ام زمل کو نیچے گرا کر قتل کر ڈالا۔ اس کے ساتھیوں نے جب اس کے اونٹ کو گرتے اور اسے قتل ہوتے دیکھا تو ان کی ہمت نے جواب

دے دیا اور بدحواس ہو کر بے تحاشا میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ اس طرح فتنے کی آگ ٹھنڈی ہوگئی اور جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرقی حصے میں ارتداد کا خاتمہ ہوگیا۔

جنوبی حصے کے مرتدین:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جس اولو العزمی سے شمال مشرقی عرب کی بغاوتوں کو فرو کیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ باقی حصے اس سے عبرت حاصل کرتے اور اسلامی حکومت کی مخالفت سے باز آجاتے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے لشکر انتہائی نامساعد حالات میں بھی دار الخلافہ سے سینکڑوں میل دور جانے اور دشمن کو زیر کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ انہیں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فتح یابی اور طلیحہ کے انجام کی بھی تمام خبریں معلوم ہو چکی تھیں۔ لیکن ان سب امور کے باوجود انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اصل میں ان کا خیال تھا کہ اگر قریش کا ایک شخص نبوت کا دعویٰ کر کے کامیابی حاصل کر سکتا ہے تو دوسرے قبائل کے لوگ کیوں نہیں کر سکتے۔ لیکن ان قبائل اور مدعیان نبوت نے یہ حقیقت فراموش کر دی تھی کہ محمد ﷺ کا مقصد اولیں اپنی قوم کو توحید کی طرف بلانا تھا، اپنے لیے اقتدار حاصل کرنا اور کسی صلے یا انعام کا مطالبہ کرنا نہ تھا۔ توحید کی تبلیغ کے نتیجے میں تئیس سال تک آپ کو سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ مکہ والوں نے آپ سے دشمنی کا برتاؤ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آپ کا بائیکاٹ کیا گیا۔ آپ کو قتل کرنے کے مشورے کیے گئے اور بالآخر آپ کو مکہ سے نکل کر مدینہ کی جانب ہجرت کرنی پڑی۔ وہاں بھی مکہ والوں نے آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اور بار بار مدینہ پر فوج کشی کی۔ انتہائی جدو جہد کے بعد آخر کار محمد ﷺ کی مساعی بار آور ہوئیں اور عرب کثرت سے آپ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہونے لگے۔ لیکن مدعیان نبوت کی نظروں سے یہ تمام حقائق اوجھل ہوگئے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر محمد ﷺ اپنی قوم کی سخت مخالفت کے باوجود کامیاب ہو سکتے ہیں تو وہ کیوں نہیں ہو سکتے جب کہ ان کی قوم پوری طرح ان کے ساتھ ہے۔ مگر انہیں یہ یاد نہ رہا کہ محمد ﷺ لوگوں کو دین حق کی تبلیغ کرتے تھے اور ان مدعیان نبوت کا سارا کاروبار ہی کذب و افتراء کی بنیادوں پر قائم تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس حالت میں کیونکر کامیاب ہو سکتے تھے؟

شمالی حصے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جنوبی حصے پر توجہ مبذول کی جہاں کے لوگ بہ دستور حالت ارتداد پر قائم تھے اور کسی طرح بھی اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان لوگوں سے عہدہ برآ ہونے اور انہیں راہ راست پر لانے کے لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بزاخہ سے بطاح اور وہاں سے یمامہ جانے کا حکم دیا۔

۸

سجاح اور مالک بن نویرہ

بنو عامر اور ان کے مسکن:

عرب کے جنوبی حصے میں بنی تمیم کے قبائل بنی عامر کے قریب ہی آباد تھے۔ یہ قبائل مدینہ سے جانب شرق خلیج فارس تک پھیلتے چلے گئے تھے اور شمال مشرق میں ان کی حدود دریائے فرات کے دہانے تک تھیں۔ بنو تمیم کو عہد جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں قبائل عرب کے درمیان خاص مقام حاصل تھا۔ یہاں کے لوگ شجاعت اور سخاوت میں مشہور تھے اور شاعری اور فصاحت و بلاغت میں بھی یہ دوسرے قبائل سے کسی طرح کم نہ تھے چنانچہ اب تاریخ اور ادب کی کتابوں میں اس قبیلے کی شاخوں: بنی حنظلہ، دوارم، بنی مالک اور بنی یربوع کے کارناموں کا ذکر محفوظ چلا آتا ہے۔

ادائے زکوٰۃ سے انکار:

چونکہ یہ قبائل دریائے فرات اور خلیج فارس تک آباد تھے۔ اس لیے ایرانیوں سے بھی ان کا تعلق تھا۔ یہ لوگ زیادہ قبر پرست تھے اگرچہ ان میں سے بہت سے عیسائی بھی ہو گئے تھے۔ دوسرے قبائل کی طرح یہ بھی مسلمانوں کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسی لیے جب محمد ﷺ نے اپنی محصلین کو ان قبائل سے جزیہ وصول کرنے کی غرض سے بھیجا تو سب سے پہلے بنو تمیم نے جزیہ دینے سے انکار کیا اور بنو العنبر تو تلواریں اور نیزے لے کر محصل کا استقبال کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ محمد ﷺ نے عیینہ بن حصن کو ان کی طرف بھیجا جنہوں نے ان قبائل کو بہ زور مطیع کیا اور کئی لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے آئے۔ اس پر ان کا ایک وفد مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں داخل ہوا۔ اس وقت محمد ﷺ اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ ان لوگوں نے بہ آواز بلند اپنی شرافت، عزت اور حسب و نسب کا واسطہ دے کر اور جنگ حنین کے واقعات کا ذکر کر کے اپنے قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ محمد ﷺ ان کی آوازیں سن کر باہر تشریف لے آئے۔ انہوں نے کہا ہم آپ سے فخر و مباہات میں مقابلہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا خطیب ان کے

خطیب سے زیادہ فصیح و بلیغ، مسلمانوں کا شاعران کے شاعر سے زیادہ سحر بیان اور مسلمانوں کی گفتگو زیادہ شیریں ہیں تو یہ لوگ اسلام لے آئے۔ محمد ﷺ نے ان کے قیدی رہا کر دیئے اور یہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر خوشی خوشی واپس چلے گئے۔

محمد ﷺ نے بنی تمیم کی مختلف شاخوں کے لیے مختلف امیر مقرر فرمائے تھے۔ ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا جو بنی یربوع کا سردار تھا۔ جب ان عمال نے محمد ﷺ کی خبر وفات سنی تو ان میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں زکوٰۃ بھیجی جائے یا خاموشی اختیار کی جائے۔ اس اختلاف نے یہاں تک شدت اختیار کی کہ آپس ہی میں سخت لڑائی ہونے لگی۔ ایک فریق مدینہ کا تسلط قبول کرنے کو تیار تھا لیکن دوسرے فریق کو اس سے انکار تھا اور وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ بھیجنے پر آمادہ نہ تھا۔ مالک بن نویرہ موخر الذکر فریق سے تعلق رکھتا تھا۔

تمیم میں سجاح کا ورود:

ابھی ان عمال میں یہ اختلاف برپا ہی تھا کہ سجاح بنت حارث عراق کے علاقے الجزیرہ سے اپنے قبیلے تغلب کے ہمراہ وہاں پہنچی۔ تغلب کے علاوہ اس کے ساتھ ربیعہ، نمر، ایاد اور شیبان کے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر بھی تھا۔ سجاح اصل میں بنی تمیم کی شاخ بنو یربوع سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس کی ننھیال عراق کے قبیلہ تغلب میں تھے۔ اس کی شادی بھی بنو تغلب ہی میں ہوئی تھی اور یہ وہیں رہتی تھی۔ یہ بڑی ذکی اور فہیم عورت تھی اور اسے کہانت کا دعویٰ بھی تھا۔ لوگوں کی قیادت اور رہبری کا فن اسے خوب آتا تھا۔ جب اسے محمد ﷺ کی خبر وفات ملی تو اس نے نواحی قبائل کا دورہ کیا اور انہیں مدینہ پر حملہ بولنے کے لیے آمادہ کرنے لگی۔

سجاح کے آنے کی غرض:

بعض مورخین کہتے ہیں اور اپنے خیال میں وہ درست کہتے ہیں کہ سجاح کسی ذاتی لالچ اور کہانت کا کاروبار وسیع کرنے کے لیے شمالی عراق سے سرزمین عرب میں وارد نہ ہوئی تھی بلکہ اصل میں وہ عراق کے ایرانی عمال کی انگیخت پر یہاں آئی تھی تاکہ فتنہ و فساد پھیلا سکے اور اس شورش سے فائدہ اٹھا کر اہل ایران اپنے روبہ انحطاط اقتدار کو سنبھالا دے سکیں جو یمن میں دربار ایران کے مقرر کردہ ایک عامل بدہان کے اسلام لانے کے بعد سے گرنا شروع ہو گیا تھا۔

مذکورہ بالا مورخین اپنی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ سجاح واحد عورت تھی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اس جیسی ہوشیار اور ذکی و فہیم عورتیں ہی اکثر اوقات جاسوسی اور لوگوں کو ورغلانے اور پھسلانے کے کام پر مامور کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہ عرب میں اس وقت تک ٹھہری رہی جب تک اس کی کوششوں سے فتنہ و فساد اور بغاوت کی آگ پورے زور سے نہ بھڑک اٹھی۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو یہ عراق واپس چلی آئی۔ اور اس کے بعد سے ...

ایرانیوں کی سرشت دیکھتے ہوئے کوئی تعجب نہیں کہ انہوں نے اسے بلاد عرب میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کے لیے آلہ کار بنایا اور یہ خیال کیا ہو، بجائے اس کے عرب پر چڑھائی کرنے کے لیے ایرانی فوج روانہ کی جائے، اس ہوشیار عورت کے ذریعے سے خود عربوں کو ایک دوسرے سے بھڑکا کر ان کی طاقت ختم کر دی جائے تاکہ کسی محنت ومشقت کے بغیر جزیرہ نما پر دوبارہ تسلط بٹھا سکیں۔

بنی تمیم کا طرز عمل:

سجاح ان عوامل سے متاثر ہو کر جزیرہ عرب میں داخل ہوئی۔ یہ طبعی امر تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم تمیم میں پہنچی۔ بنی تمیم کا اس وقت جو حال تھا وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ایک گروہ زکوٰۃ ادا کرنے اور خلیفہ محمد ﷺ کی اطاعت کرنے پر آمادہ تھے لیکن دوسرا فریق اس کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔ ایک تیسرا فریق تھا جس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے، اور کیا نہ کرے۔

اس اختلاف نے اتنی شدت اختیار کی بنو تمیم نے آپس ہی میں لڑنا اور جدال وقتال کرنا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں ان قبائل نے سجاح کے آنے کی خبر سنی اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ سجاح مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوجوں سے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پھر تو اس اختلاف نے مزید وسعت اختیار کر لی۔

سجاح اس ارادے سے بڑھی چلی آ رہی تھی کہ وہ اپنے عظیم الشان لشکر کے ہمراہ اچانک بنو تمیم میں پہنچ جائے گی اور اپنی نبوت کا اعلان کر کے انہیں اپنے آپ پر ایمان لانے کی دعوت دے گی۔ سارا قبیلہ بالاتفاق اس کے ساتھ ہو جائے گا اور عیینہ کی طرح بنو تمیم بھی اس کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیں گے کہ بنو یربوع کی نبیہ، قریش کے نبی سے بہتر ہے کیونکہ محمد ﷺ وفات پا گئے اور سجاح زندہ ہے۔ اس کے بعد وہ بنو تمیم کو ہمراہ لے کر مدینہ کی طرف کوچ کرے گی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لشکر سے مقابلے کے بعد فتح یاب ہو کر مدینہ پر قابض ہو جائے گی۔

سجاح اور مالک بن نویرہ:

سجاح اپنے لشکر کے ہمراہ بنو یربوع کی حدود پر پہنچ کر ٹھہر گئی اور قبیلے کے سردار مالک بن نویرہ کو بلا کر مصالحت کرنے اور مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ مالک نے صلح کی دعوت تو قبول کر لی لیکن اسے مدینہ پر چڑھائی کے ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوجوں کا مقابلہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے قبیلے کے مخالف عنصر کا صفایا کر دیا جائے۔ سجاح کو بھی یہ بات پسند آئی اور اس نے کہا جو تمہاری مرضی میں تو بنی یربوع کی ایک عورت ہوں۔ جو تم کہو گے وہی کروں گی۔

مالک بن نویرہ کے اوصاف:

سجاح اپنے ارادے سے فوراً کس طرح باز آ گئی اور مالک کی رائے کو بے پس وپیش کیونکر قبول

کرلیا؟ تاریخ کے مطالعے سے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو سجاح کی رائے کی اس فوری تبدیلی کے راز سے پردہ اٹھاسکے۔ البتہ روایات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مالک اپنے قبیلے کا نہایت معزز اور صاحب اثر شخص تھا۔ اعلیٰ درجے کا شہسوار اور بلند پایہ شاعر تھا۔ تکبر اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی زلفیں لمبی لمبی اور خوبصورت تھیں۔ شیریں مقال، نہایت ہنس مکھ اور آداب مجالس سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کا بھائی متمم بن نویرہ اگرچہ کوئی شعرگوئی میں اس کے ہمہ پلہ تھا۔ لیکن صورت کے لحاظ سے دونوں بھائیوں میں بعد المشرقین تھا۔ جہاں مالک انتہائی خوش شکل اور وجیہ تھا وہاں متمم بن نویرہ انتہائی بدصورت اور کانا تھا۔ ایک مرتبہ عرب کے ایک قبیلے نے چھاپہ مار کر متمم بن نویرہ کو گرفتار کرلیا اور اسے اپنے قبیلے میں لے جا کر اسے رسیوں سے جکڑ دیا جب مالک کو یہ خبر ملی تو وہ اونٹنی پر سوار ہو کر اس قبیلے میں جا پہنچا اور لوگوں میں گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے اس خوبی سے ان کے دل لبھائے کہ انہوں نے متمم کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا۔ زمانہ جاہلیت میں بنو تغلب نے بھی متمم کو قید کرلیا تھا۔ مالک اس کا فدیہ ادا کرنے کے لیے وہاں پہنچا۔ وہ لوگ اس کے حسن و جمال سے بے حد متحیر ہوئے۔ وہاں بھی مالک اپنی خوش گفتاری اور شیریں زبان سے ان کے دل لبھانے میں کامیاب ہوگیا۔ انہوں نے متمم کا فدیہ لینے سے انکار کر دیا اور اسے فوراً چھوڑ دیا چنانچہ وہ رہا ہو کر اپنے قبیلے میں آگیا۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ سجاح بھی مالک کی خوش گفتاری اور مردانہ خوبصورتی سے متاثر ہوگئی ہو اور اس کے کہنے سے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ فسخ کر دیا ہو۔

سجاح نے مالک کے علاوہ بنوتمیم کے دوسرے سرداروں کو بھی مصالحت کی دعوت دی۔ لیکن وکیع کے سوا کسی نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ اس پر سجاح نے مالک، وکیع اور اپنے لشکر کے ہمراہ دوسرے سرداروں پر دھاوا بول دیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں جانبین کے کثیر التعداد آدمی قتل ہوئے اور ایک ہی قبیلے کے لوگوں نے ایک دوسرے کو گرفتار کرلیا لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد مالک اور وکیع نے یہ محسوس کیا کہ انہوں نے اس عورت کا اتباع کر کے سخت غلطی کی ہے۔ اس پر انہوں نے دوسرے سرداروں سے مصالحت کرلی اور ایک دوسرے کے قیدی واپس کر دیئے۔ اس طرح قبیلے تمیم میں امن قائم ہوگیا۔

سجاح کی شکست:

اب یہاں سجاح کی دال گلنی مشکل ہوگئی تھی۔ اس نے بنوتمیم سے بوریا بستر اٹھایا اور مدینہ کی جانب کوچ کر دیا۔ نباج کی بستی پر پہنچ کر اوس بن خزیمہ سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی جس میں سجاح نے شکست کھائی اور اوس بن خزیمہ نے اس شرط پر اسے واپس جانے دیا کہ اس امر کا پختہ اقرار کرے، وہ کبھی مدینہ کی جانب پیش قدمی نہ کرے گی۔

اس واقعے کے بعد اہل جزیرہ کی فوج کے سردار ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے سجاح سے کہا: ”اب آپ ہمیں کیا حکم دیتی ہیں مالک اور وکیع نے اپنی قوم سے صلح کرلی ہے۔ نہ وہ ہمیں مدد دینے کے لیے تیار

ہیں اور نہ اس بات پر رضا مند کہ ہم ان کی سرزمین سے گزریں۔ ان لوگوں سے ہم نے یہ معاہدہ کیا ہے اور مدینہ جانے کے لیے ہماری راہ مسدود ہوگئی ہے۔ اب بتائیے ہم کیا کریں؟"

سجاح نے جواب دیا: "اگر مدینہ جانے کی راہ مسدود ہوگئی ہے تو بھی فکر کی کوئی بات نہیں، تم یمامہ چلو۔"

انہوں نے کہا: "اہل یمامہ شان و شوکت میں ہم سے بڑھے ہوئے ہیں اور مسیلمہ کی طاقت و قوت بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ جب اس کے لشکر کے سرداروں نے سجاح سے آئندہ اقدام کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا:

علیکم بالیمامه. ودفوا دفیف الحمامه. فانها غزوة صرامه. لا یلحقکم بعدها ندامه۔

(یمامہ چلو۔ کبوتر کی طرح تیزی سے ان پر جھپٹو۔ وہاں ایک زبردست جنگ پیش آئے گی جس کے بعد تمھیں پھر کبھی ندامت نہ اٹھانی پڑے گی)۔

یہ مسجع و مقفیٰ عبارت سننے کے بعد، جسے اس کے لشکر والے وحی خیال کرتے تھے، انہیں اس کا حکم ماننے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نے کس مقصد کے لیے یمامہ کا قصد کیا جب خود اسے اپنی قوم بنو تمیم میں رسوائی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد مدینہ کوچ کرتے ہوئے اوس بن خزیمہ کے ہاتھوں اسے شکست اٹھانی پڑی تھی۔ کیا اس کے لشکر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان ناکامیوں کو دیکھنے کے بعد اسے یمامہ نہ جانے کا مشورہ دیتا؟ یا یہ خیال کیا جائے اس کی خرافات پر ان لوگوں کو اس درجہ یقین تھا کہ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اس کی باتوں کو وحی خیال کرتے اور نہایت فرماں برداری سے اس کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہ کرتے تھے؟

سجاح اور مسیلمہ کی شادی:

سچ تو یہ ہے کہ سجاح کا سارا قصہ ہی عجائب و غرائب کا مجموعہ ہے۔ مورخین ذکر کرتے ہیں کہ جب وہ اپنے لشکر کے ہمراہ یمامہ پہنچی تو مسیلمہ کو بڑا فکر پیدا ہوا۔ اس نے سوچا، اگر وہ سجاح کی فوجوں سے جنگ میں مشغول ہوگیا تو اس کی طاقت کمزور ہو جائے گی، اسلامی لشکر اس پر دھاوا بول دے گا اور اردگرد کے قبائل بھی اس کی اطاعت کا دم بھرنے سے انکار کر دیں گے۔ یہ سوچ کر اس نے سجاح سے مصالحت کرنے کی ٹھانی۔ پہلے اسے تحفے تحائف بھیجے پھر کہلا بھیجا کہ وہ خود اس سے ملنا چاہتا ہے۔ سجاح اپنا لشکر لیے پانی کے ایک چشمے پر مقیم تھی، اس نے مسیلمہ کو باریابی کی اجازت دے دی۔ مسیلمہ بنی حنیفہ کے چالیس آدمیوں کے ہمراہ اس کے پاس آیا کیمپ میں پہنچ کر خلوت میں اس سے تملق آمیز گفتگو کی اور کہا کہ عرب کی آدھی زمین کے مالک قریش ہیں اور آدھی زمین کی مالک تم ہو۔ اس کے بعد مسیلمہ نے کچھ مسجع و مقفیٰ عبارتیں سجاح کو سنائیں جن سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ سجاح نے بھی جواب میں اسے اسی قسم کی بعض عبارتیں سنائیں یہ ملاقات خاصی دیر تک

جاری رہی۔ مسیلمہ نے اپنی خوش کلامی اور چال بازی سے سجاح کا دل موہ لیا اور سجاح کو اقرار کرتے ہی بن پڑی کہ مسیلمہ اس سے ہر طرح فائق ہے۔

سجاح کو پوری طرح اپنے قبضے میں لینے اور ہم نوا بنانے کے لیے مسیلمہ نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم دونوں اپنی نبوتوں کو یک جا کرلیں اور باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ سجاح نے جو پہلے ہی اس کی خوش کلامی اور محبت آمیز باتوں سے مسحور ہو چکی تھی، نہایت خوشی سے یہ مشورہ قبول کرلیا اور مسیلمہ کے ساتھ اس کے کیمپ میں چلی گئی۔ تین روز تک وہاں رہی، اس کے بعد اپنے لشکر میں واپس آئی اور ساتھیوں سے ذکر کیا کہ اس نے مسیلمہ کو حق پر پایا ہے اس لیے اس سے شادی کرلی ہے۔

سجاح کا مہر:

لوگوں نے اس سے پوچھا آپ نے کچھ مہر بھی مقرر کیا؟ اس نے کہا مہر تو مقرر نہیں کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا آپ واپس جائیں اور مہر مقرر کر کے آیئے کیونکہ آپ جیسی شخصیت کے لیے مہر کے بغیر شادی کرنا زیبا نہیں۔ چنانچہ وہ مسیلمہ کے پاس واپس گئی اور اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔ مسیلمہ نے اس کی خاطر عشاء اور فجر کی نمازوں میں تخفیف کر دی۔ مہر کے بارے میں یہ تصفیہ ہوا کہ مسیلمہ یمامہ کی زمینوں کے لگان کی نصف آمدنی سجاح کو بھیجا کرے گا۔ سجاح نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ آئندہ سال کی نصف آمدنی میں سے اس کا حصہ اسے دے جسے لے کر وہ جزیرہ واپس چلی گئی۔ بقیہ نصف سال کی آمدنی کے حصول کے لیے اس نے اپنے کچھ آدمیوں کو بنو حنیفہ ہی میں چھوڑ دیا۔ وہ ابھی وہیں مقیم تھے کہ اسلامی لشکر آپہنچا اور مسیلمہ سے جنگ کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ سجاح بدستور بنو تغلب میں مقیم رہی یہاں تک کہ امیر معاویہ نے، قحط والے سال، (عام المجاء) اسے اس کی قوم کے ساتھ بنو تمیم میں بھیج دیا جہاں وہ وفات تک مسلمان ہونے کی حالت میں مقیم رہی۔

یہ ہے سجاح کا قصہ اور جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں بہت ہی عجیب قصہ ہے۔ وہ جزیرہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلے کو روانہ ہوتی ہے لیکن مالک بن نویرہ سے بات چیت کے بعد اس کی رائے بدل جاتی ہے اور وہ مدینہ پر حملہ بولنے کے بجائے یمامہ کا رخ کرتی ہے وہاں مسیلمہ سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور شادی کے فوراً بعد وہ اپنے قبیلے میں لوٹ آتی ہے اور بقیہ ساری حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس طرح بسر کرتی ہے جیسے کبھی وہ اپنے قبیلے سے باہر نکلی ہی نہ تھی اور اپنے خاوند کے سوا کسی سے شادی کی ہی نہ تھی۔

مسیلمہ کا معاملہ بھی سجاح کے معاملے سے کم تر نہیں۔ اگر سجاح سے اس کی شادی کا قصہ درست ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسیلمہ اول درجے کا سیاست دان اور لوگوں کے دلی جذبات بھانپ لینے والا شخص تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس طرح سجاح سے چھٹکارا حاصل کرلے تاکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بھیجی ہوئی افواج کا مقابلہ دل جمعی سے کیا جا سکے۔ اس نے سجاح کو میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں سے رام کرلیا اور چال بازی سے کام

لے کر اسے اس کے قبیلے میں واپس بھیج دیا۔ مالک بن نویرہ اور مسیلمہ کے ساتھ سجاح کے تعلقات جس قسم کے رہے ان پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ سجاح ایک ہوشیار کاہنہ، مسجع مقفیٰ عبارتیں بنانے میں ماہر، بہت نرم طبیعت اور نسوانی خصوصیات کی پوری طرح حامل تھی۔ ادھر مسیلمہ بھی ایک ہوشیار سیاست دان تھا۔ وہ خوبصورت نہ تھا لیکن میٹھی میٹھی باتوں سے لوگوں کے دل موہ لیتا تھا۔ عورتوں سے اسے بہت کم رغبت تھی اور عورت کا حسن و جمال اس پر مطلق اثر نہ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنی شریعت میں یہ بات رکھ دی تھی کہ جس شخص کے بیٹا پیدا ہو اس کے لیے اس وقت تک اپنی بیوی کے پاس جانا ناجائز ہے جب تک وہ بیٹا زندہ ہے۔ اگر بیٹا مر جائے تو دوسرے بیٹے کے حصول کے لیے بیوی کے پاس جا سکتا ہے لیکن جس کا بیٹا موجود ہو اس کے لیے عورتیں حرام ہیں۔

مالک کی پریشانی:

جس زمانے میں مسیلمہ اور سجاح کے درمیان مندرجہ بالا واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بزاخہ میں مرتدین کو شکست دے کر اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں مصروف تھے۔ ام زمل سے جنگ اور اس کے قتل کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ بطاح میں مالک بن نویرہ تک یہ تمام خبریں پہنچ چکی تھیں۔ جنھیں سن کر اس کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ اس نے زکوٰۃ کی ادائیگی بند کر رکھی تھی اور سجاح سے مل کر بنو تمیم کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے باعث حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی نظروں میں مجرم قرار پا چکا تھا۔ اس کے لشکر کی یہ حالت تھی کہ سجاح کے لشکر کی مدد کے باوجود مقابل قبائل کے ہاتھوں اسے شکست ہو چکی تھی۔ وکیع، جو اس کا دست راست شمار ہوتا تھا، اس کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں سے مل گیا تھا اور زکوٰۃ ادا کر دی تھی۔ ان حالات کی موجودگی میں مالک سخت پریشان تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ آیا مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دے اور پہلے کی طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ دینے کا اقرار کر لے یا اپنے ارادے پر قائم رہ کر انتظار کرے کہ آئندہ واقعات کیا رخ اختیار کرتے ہیں؟

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا کوچ:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، اسد، غطفان اور اس علاقے میں بسنے والے دیگر قبائل کی سرکوبی سے فارغ ہو چکے تھے اور ان تمام قبائل نے اسلام قبول کرنا اور مدینہ کی حکومت کو تسلیم کرنا منظور کر لیا تھا۔ چونکہ اب ان قبائل کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا اس لیے انہوں نے بطاح جا کر مالک بن نویرہ اور دوسرے قبائل سے، جو ابھی تک تردد و تذبذب کی حالت میں تھے، لڑنے کا ارادہ کیا جب انصار کو آپ کے اس ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے کچھ تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''خلیفۃ المسلمین نے ہمیں بنی تمیم کی طرف جانے کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ ہدایت کی تھی کہ جب ہم طلیحہ کی سرکوبی سے فارغ ہو جائیں اور اس علاقے کے لوگ اپنا مطیع کر لیں تو ...

لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کی بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: ''تم سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خواہ کچھ ہی عہد لیا ہو لیکن مجھے پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔ میں تمہارا امیر ہوں اور تمام خبریں مجھ تک پہنچتی ہیں۔ اگر دربار خلافت سے میرے پاس کوئی حکم نہ بھی پہنچے لیکن میں دیکھوں کہ دشمن پر قابو پانے کے بعض مواقع مجھے فراہم ہیں تو میں ان سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ اسی طرح اگر میں دیکھوں کہ مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو گو ان سے نپٹنے کے لیے خلیفۃ المسلمین کی جانب سے کوئی ہدایت میرے پاس نہ بھی ہو پھر بھی میں جو قدم مناسب سمجھوں گا اٹھاؤں گا۔ مالک بن نویرہ کی شرارتیں روز بروز زیادہ ہوتی جاری ہیں۔ اس لیے میں اس کے مقابلے کو ضرور جاؤں گا۔ میں تمھیں ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کرتا۔ اگر تم جانا نہیں چاہتے تو نہ جاؤ، میں مہاجرین اور تابعین کو ساتھ لے جاؤں گا۔''

چنانچہ انہوں نے انصار کو بزاخہ ہی میں چھوڑا اور خود بطاح کی جانب روانہ ہوئے۔ بعد میں انصار نے باہم مشورہ کیا اور طے پایا کہ ان کے لے پیچھے رہنا مناسب نہیں۔ انہیں بھی اپنے ساتھیوں سے مل جانا چاہیے کیونکہ اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک بن نویرہ پر قابو پالیا تو وہ اس فتح کے فوائد سے محروم رہ جائیں گے اور اگر خدانخواستہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر پر کوئی ایسی مصیبت پڑی تو لوگ یہ کہہ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کرلیں گے کہ انہوں نے ایسے نازک موقع پر اپنے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک قاصد کے ہاتھ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ وہ بھی آرہے ہیں اس لیے اپنا کوچ ملتوی کر دیں چنانچہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ انصار کے انتظار میں تھوڑی دیر ٹھہر گئے۔

مالک کا اپنی قوم کو مشورہ:

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لشکر کے ہمراہ بطاح پہنچے تو انہوں نے میدان خالی پایا کیونکہ مالک بن نویرہ نے اپنی قوم کو گردونواح میں منتشر کر دیا تھا اور کہا تھا: اے بنو یربوع! ہم نے اپنے امراء کا کہا نہ مانا جنھوں نے ہمیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت کا مشورہ دیا تھا لیکن میں دیکھتا ہوں، ہماری حالت ایسی نہیں کہ ہم مسلمانوں کا مقابلہ کرسکیں اس لیے میں تمھیں صلاح دیتا ہوں کہ تم دوبارہ اسلام قبول کرلو اور منتشر ہوجاؤ تاکہ کسی کو یہ شبہ بھی پیدا نہ ہوسکے کہ تم مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہو۔ اپنی قوم کو منتشر کرنے کے بعد وہ خود بھی روپوش ہوگیا۔

بطاح پہنچ کر جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے میدان خالی پایا تو انہوں نے اپنے لشکر کو مختلف دستوں میں منقسم کر کے اردگرد کے علاقے میں روانہ کر دیا، اور حکم دیا کہ اگر مالک کے قبیلے کا کوئی شخص مل جائے تو پہلے اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرے تو ان کے سامنے حاضر کیا جائے اور جو شخص آنے سے انکار کرے اسے فی الفور قتل کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت اپنے امراء کو یہ تھی کہ جب مسلمان کسی جگہ پڑاؤ ڈالیں تو اذان دیں لیکن اگر جواب نہ آئے تو

ان کا مقابلہ کریں۔ بعد میں اگر وہ اسلام کا اقرار کریں تو انہیں چھوڑ دیں اور ان سے زکوٰۃ کے متعلق دریافت کریں۔ اگر وہ زکوٰۃ دینے کا اقرار کریں فبہا ورنہ انہیں قتل کر دیں۔

مالک بن نویرہ کی گرفتاری:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو دستے نواحی علاقوں میں بھیجے تھے ان میں سے ایک دستہ مالک بن نویرہ کو بنویربوع کے چند آدمیوں کے ہمراہ گرفتار کر کے لے آیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق اگر مالک اور اس کے ساتھی اسلام کا اقرار کرتے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ انہیں چھوڑ دیتے لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے مالک کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور وہ قتل کر دیا گیا۔

مالک کے قتل نے مدینہ میں سخت ہیجان برپا کر دیا اور جو جوش خروش اس موقع پر برپا ہوا وہ عرصے تک ٹھنڈا نہ ہو سکا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے درمیان جو معاملات پیش آئے ان میں مالک بن نویرہ کے قتل کو بھی بہت دخل تھا۔

قتل مالک پر مختلف روائتیں:

مالک بن نویرہ کے قتل کے متعلق روایات میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ خود ان لوگوں میں، جو مالک اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لائے تھے، باہم اختلاف تھا کہ آیا مالک اور اس کے ساتھیوں نے اسلام کا اقرار کر لیا تھا اور اذان کی آواز کا جواب دیا تھا یا نہیں؟ طبری میں ابوقتادہ انصاری (جو خود بھی مالک کو گرفتار کرنے والوں میں شامل تھے) کی زبانی یہ روایت آتی ہے: ہم نے رات کے وقت ان لوگوں پر چھاپہ مارا تو انہوں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ ہم نے کہا ہم مسلمان ہیں۔ انہوں نے جواب دیا ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہم نے پوچھا اگر تم مسلمان ہو تو ہتھیار کیوں اٹھائے ہوئے ہو؟ انہوں نے کہا یہ ہتھیار تمہارے مقابلے کے لیے نہیں۔ ہم نے کہا اگر تم واقعی مسلمان ہو تو ہتھیار رکھ دو۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے اس کے بعد ہم نے نماز پڑھی اور انہوں نے بھی ہمارے ساتھ نماز ادا کی۔

یہاں تک تو سب متفق تھے۔ اختلاف آگے چل کر شروع ہوا۔ ابوقتادہ کہتے تھے کہ ان لوگوں نے ادائے زکوٰۃ کا بھی اقرار کر لیا تھا لیکن دوسرے لوگ کہتے تھے نہیں، انہوں نے زکوٰۃ دینے کا اقرار نہیں کیا اور زکوٰۃ نہ دینے پر اصرار کیا۔ گواہوں کے درمیان اختلاف کی موجودگی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق انہوں نے فی الحال مالک اور اس کے ساتھیوں کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ رات سخت ٹھنڈی تھی اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا خنکی بڑھتی جاتی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قیدیوں پر ترس کھاتے ہوئے یہ اعلان کر دیا۔ دافئو اسرا کم (اپنے قیدیوں کو گرمی پہنچاؤ) لیکن کنانہ کی زبان میں مدافاۃ کا لفظ قتل کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ جب انہوں نے منادی کرنے والوں کی آواز سنی تو خیال کیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ

انہوں نے تلواروں سے ان کا کام تمام کر دیا۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے چیخ و پکار سنی تو وہ اپنے خیمے سے باہر آئے لیکن اس وقت تک تمام قیدیوں کا کام تمام ہو چکا تھا۔ انہوں نے واقعہ سن کر فرمایا: ''جب اللہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ ہو کر رہتا ہے۔''

لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک کو اپنے پاس بلا کر باتیں کرنی شروع کیں تاکہ معلوم کریں کہ دونوں گواہیوں میں سے کون سی درست ہے، اس کے اسلام لانے کی یا ارتداد اور ادائے زکوٰۃ سے انکار کرنے کی۔ جب ادائے زکوٰۃ کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی تو مالک نے کہا: ''میرا تو خیال نہیں کہ تمہارے صاحب نے تمھیں ایسا حکم دیا ہوگا۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ادائے زکوٰۃ سے انکاری ہے۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا: ''کیا تو انہیں اپنا صاحب خیال نہیں کرتا؟''

یہ کہہ کر انہوں نے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی گردنیں مارنے کا حکم دے دیا۔

ابوالفرج اپنی الاغانی میں اس گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ابن اسلام کی روایت ہے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو غلطی پر سمجھنے والے کہتے ہیں کہ گفتگو کے دوران میں مالک نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا تمہارے صاحب (محمد ﷺ) نے تمھیں اسی بات کا حکم دیا ہے؟''

اصل میں اس کی مراد یہ نہ تھی کہ وہ ادائے زکوٰۃ کا منکر ہے بلکہ یہ تھی کیا محمد ﷺ نے تمھیں حکم دیا ہے کہ جو لوگ ادائے زکوٰۃ کے منکر ہوں ان پر چڑھائی کر دو؟ لیکن جو لوگ اس معاملے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بے قصور سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس نے واقعی اسلام سے انکار کیا تھا اور دلیل میں مالک کے یہ اشعار پیش کرتے ہیں:

وقلت خذوا اموالکم غیر خائف ولا ناظر فیما یجیئنی من الغد

فان قام بالامر المخوف قائم منعنا وقلنا: الدین دین محمد

(میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اپنے اموال کو بے دھڑک قبضے میں رکھو اور نہ دیکھو کہ کل کیا وقوع میں آتا ہے۔ پھر اگر خوفناک امر (اسلامی حکومت) کو کوئی قائم کرے تو ہم اس کی مخالفت کریں گے اور کہہ دیں گے کہ دین وہی ہے جو محمد ﷺ لائے تھے۔)

یعنی اس نے اپنی قوم کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی صورت میں بھی زکوٰۃ ادا نہ کرے اور ادائے زکوٰۃ پر اصرار کیا جائے تو یہ کہہ دیا جائے کہ ہم تو محمد ﷺ پر ایمان لائے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دین پر نہیں۔ ابن خلکان یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک کو گفتگو کے لیے بلایا تو اس نے کہا: ''میں نماز پڑھنے کا اقرار کرتا ہوں لیکن زکوٰۃ دینے سے انکاری ہوں۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ ایک ساتھ قبول ہوتی ہیں۔ نماز کے بغیر زکوٰۃ اور زکوٰۃ کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی؟''

مالک نے کہا: ''کیا آپ کے صاحب بھی یہی کہتے تھے؟''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''کیا تو انہیں اپنا صاحب خیال نہیں کرتا؟ اللہ کی قسم! میں نے تیری گردن اڑانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔''

اس کے بعد بحث طول پکڑ گئی اور گفتگو میں تیزی آتی گئی۔ آخر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تو تجھے قتل کر کے رہوں گا۔''

اس نے کہا: ''کیا تمہارے صاحب نے تمھیں یہی حکم دیا تھا۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اب تو میں ضرور قتل کروں گا۔''

یہ کہہ کر آپ نے اپنے آدمیوں کو اس کی گردن مارنے کا حکم دے دیا۔ بعض لوگ مؤخر الذکر روایت کو پہلی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ روایت ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ قصہ قرہ بن ہیرہ، مجارۃ السلمی، ابوشجرہ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی پیش آچکا تھا لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک بن نویرہ کی طرح انہیں قتل نہ کیا بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کردیا کہ وہ ان سے جوسلوک مناسب سمجھیں کریں۔ مالک بن نویرہ کا جرم ان لوگوں سے کسی طرح بھی بڑھ کر نہ تھا پھر انہوں نے اسے کیوں قتل کرادیا۔ اور خلیفۃ المسلمین کے پاس نہ بھیجا؟ حالانکہ بنوتمیم میں اسے جو درجہ اور رسوخ حاصل تھا وہ ان لوگوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس سے خوب واقف تھے۔

ان لوگوں کی رائے میں اس روایت کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک کی بیوی سے عین اس وقت شادی کرلی تھی جب مالک کا خون بھی زمین میں جذب نہ ہوا تھا۔ ان لوگوں کے خیال میں یہ شادی ہی مالک کے قتل کا اصل سبب تھی۔

شیعہ مورخ یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے: ''مالک بن نویرہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے بات چیت کرنے ان کے خیمے میں آیا تو اس کی بیوی بھی ساتھ ہی آئی۔ اس کی خوبصورتی نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بہت متاثر کیا اور انہوں نے مالک سے کہا میں تو تجھے ضرور قتل کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے اسے قتل کردیا اور اس کی بیوی سے شادی کرلی۔''

ابوالفراج اصبہانی کتاب الاغانی میں لکھتے ہیں: ''جب سجاح نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مالک نے اس کی پیروی اختیار کرلی لیکن پھر یہ ظاہر کیا کہ وہ اسلام لے آیا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب اسے قتل کیا تو صحابہ کی ایک جماعت نے اس پر سخت اعتراض کیا کیونکہ انہوں نے مالک کے قتل کے بعد اس کی بیوہ سے شادی کرلی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسے جاہلیت کے زمانے ہی سے پسند کرتے تھے اس لیے ان پر تہمت لگائی گئی، انہوں نے ایک مسلمان کو اس لیے قتل کردیا کہ اس کے بعد اس کی بیوی سے شادی کرسکیں۔''

ہمارے خیال میں اس قسم کی روایات تاریخی واقعات کے بجائے افسانوی روایات کے زمرے

میں شامل کیے جانے کے قابل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب مالک بن نویرہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے باتیں کر رہا تھا تو اس کی بیوی لیلیٰ اس کے ساتھ تھی۔ جب اس نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سنا کہ میں تجھے قتل کرنے والا ہوں اور ضرور قتل کر کے رہوں گا وہ ان کے قدموں میں گر پڑی اور ان سے اپنے خاوند کے لیے عفو و ترحم کی طلب گار ہوئی۔ اس کے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اور آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے جاری تھی۔ اس حال میں اس کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی جس نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مسحور کرلیا۔ جب مالک نے یہ دیکھا تو اس نے کہا: "افسوس میری بیوی ہی میرے قتل کا باعث بنی۔"

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا: "تیری بیوی تیرے قتل کا باعث نہیں بنی بلکہ تیرے اعمال اس کا باعث بنے ہیں۔" یہ کہہ کر اس کی گردن اڑانے کا حکم دے دیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ابوقتادہ کی ناراضی:

ابوقتادہ انصاری حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس فعل سے اتنے ناراض ہوئے کہ وہ یہ قسم کھا کر کہ آئندہ کبھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے جھنڈے تلے نہ لڑیں گے انہیں چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔

اس واقعے کے متعلق روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دافئوا اسرائکم کا حکم دینے کے بعد جب لوگوں نے مالک اور اس کے ساتھی قیدیوں کو قتل کر دیا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بہت ناراض ہوئے پھر بھی یہ فرمایا: "جب اللہ کسی بات کے کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو وہ ہو کر رہتی ہے۔" تو ابوقتادہ نے یہ سمجھا کہ یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا محض ایک بہانہ ہے ورنہ اصل میں ان کا منشاء بھی یہی تھا کہ ان قیدیوں کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا کہ یہ سب کچھ آپ کا کیا دھرا ہے۔ اس پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹا اور وہ ناراض ہو کر مدینہ چلے گئے۔

اس کے بالمقابل دوسری روایات میں یہ مذکور ہے کہ ابوقتادہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ام تمیم سے نکاح کرنے کے بعد مدینہ گئے اور ان کے ساتھ مالک کا بھائی متمم بن نویرہ بھی تھا۔ جب مدینہ پہنچے تو ابو قتادہ سیدھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور انہیں مالک کے قتل اور لیلیٰ سے نکاح کا واقعہ سنایا اور یہ بھی کہا انہوں نے قسم کھالی ہے کہ آئندہ کبھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر نہ لڑیں گے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کارناموں اور فتوحات سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے ابوقتادہ کی بات پر کوئی توجہ نہ کی اور کہا کہ انہیں ایسے شخص کے متعلق ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جسے محمد ﷺ نے سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا ہو۔

اس پر بھی ابوقتادہ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایسے شخص کی شکل میں پیش کیا جس کی نفسانی خواہشات اس کے فرائض پر غالب آجاتی ہیں اور وہ تسکین نفس کی خاطر اللہ کے احکام نظر انداز کر دیتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ ابوقتادہ کو لے کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس جرم کی پاداش میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیں۔ انہوں نے کہا حضرت خالد بن ولید کی تلوار اب ظلم کرنے پر اتر آئی ہے۔ اس لیے آپ انہیں معزول کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ قید بھی کر دیں۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے عمال سے ایسا برتاؤ سخت ناپسند تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی معزولی پر اصرار کیا تو انہوں نے فرمایا: ”حضرت عمر! بس کرو۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تاویل کی۔ یہ بات اور ہے کہ تاویل کرنے میں ان سے غلطی ہوئی۔“

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس جواب سے مطمئن نہ ہو سکے اور برابر اپنے مطالبے پر قائم رہے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت تنگ ہوئے تو انہوں نے فرمایا: ”حضرت عمر! ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس تلوار کو نیام میں نہیں ڈال سکتا جسے اللہ نے کافروں پر مسلط کیا ہو۔“

مدینہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طلبی:

پھر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید کے اس فعل کو ناراضی ہی کی نظر سے دیکھتے رہے اور ان کا دل ان سے صاف نہ ہو سکا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے جواب طلبی کرنے کے متعلق ان کا اصرار برابر جاری رہا۔ آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی مجبور ہو گئے اور انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جواب دہی کے لیے مدینہ طلب فرما لیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ میدان جنگ سے مدینہ پہنچے اور سیدھے مسجد نبوی میں آئے۔ وہ ایک زنگار قبا پہنے ہوئے تھے۔ اور اپنے عمامے میں تیر لگا رہے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو ان کے عمامے سے تیر جھپٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور کہا: ”تم نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ واللہ! میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔“

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بالکل خاموش رہے اور ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا کیونکہ انہیں خیال تھا کہ ان کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بھی رائے وہی ہوگی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ آخر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مالک کا سارا واقعہ انہیں سنایا کہ کس طرح اس نے سجاح کی مدد کی اور جب انہوں نے اس پر قابو پا لیا تو کس طرح اس نے زکوٰۃ ادا کرنے میں تردد کیا۔ انہوں نے اس کے قتل کے متعلق معذرت پیش کی اور جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبول فرما لی اور جنگ میں ان سے جو فروگزاشتیں ہوئی تھیں ان سے درگزر کی۔ لیکن مالک کی بیوی سے شادی کر لینے پر ناراضی کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ عرب ایک تو عورتوں کو میدان جنگ میں لانے ہی کو ناپسند کرتے تھے دوسرے عین لڑائی کے وقت ان سے صحبت کرنے کو عار خیال کرتے تھے۔

مالک بن نویرہ کے معاملے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان جو اختلاف رونما ہوا اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ درحقیقت دونوں اپنے اپنے خیال میں سچے تھے اور دونوں کے مدنظر اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی ہی تھی۔ اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ اختلاف انفرادی نوعیت کا سمجھا

جائے جس کا محور صرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ذات اور ان کا فعل تھا یا ہمہ گیر سیاسی نوعیت کا؟

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف:

میرے نزدیک اس اختلاف کی نوعیت سیاسی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں کے پیش نظر الگ الگ سیاسی راہ تھی جسے وہ ٹھیک سمجھتے تھے اور جس پر انہیں عمل کرنا چاہیے تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو عدل و انصاف کی مجسم تصویر تھے یہ چاہتے تھے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے چونکہ ایک مسلمان پر زیادتی کی ہے اور اس کی بیوی کے ایام عدت گزرنے سے پہلے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ اس لیے انہیں لشکر کی قیادت پر قائم رکھنا ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی نیک شہرت کو دھبا لگے گا اور عرب میں انہیں اس وقت جو قدر و منزلت حاصل ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ ان کے خیال میں صرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی ہی کافی نہ تھی بلکہ لیلیٰ سے نکاح کرنے کے جرم میں انہیں قرار واقعی سزا بھی ملنی چاہیے تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مالک کے معاملے میں اجتہادی غلطی صادر ہوئی تھی (گو اس کا امکان نہیں) تو بھی اس کی بیوی سے نکاح کا معاملہ ایسا ہے جس کے باعث حضرت خالد بن ولید ذ پر حد قائم کرنی ضروری ہو جاتی ہے۔ ان کی صفائی میں یہ عذر پیش نہیں کیا جا سکتا کہ محمد ﷺ نے انہیں سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا اور وہ ایسے سپہ سالار ہیں کہ فتح و نصرت ہر دم ان کے قدم چومتی ہے۔ اگر حضرت خالد بن ولید جیسی حیثیت رکھنے والے اشخاص سے اس قسم کی چشم پوشی برتی گئی تو یہ امر دین میں خلل اندازی کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہوگا۔ مسلمان کتاب اللہ کے احکام کو پس پشت ڈالنے میں دلیر ہو جائیں گے اور احکام الٰہی کا احترام ان کے دلوں میں باقی نہ رہے گا۔ انہیں خیالات کے باعث حضرت عمر رضی اللہ عنہ برابر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر زور دیتے رہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ضرور سزا دینی چاہیے جس پر آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں میدان جنگ سے واپس بلا لیا اور ان کے فعل پر انہیں سرزنش کی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بالمقابل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ ایسے وقت میں، جب مسلمانوں پر چاروں طرف سے خطرات کے مہیب بادل منڈلا رہے ہیں اور سارے عرب میں فتنہ و فساد اور بغاوت کی آگ زور شور سے بھڑک رہی ہے، کوئی سپہ سالار کسی فرد واحد یا جماعت کو غلطی سے قتل کرا دیتا ہے تو اس کا زیادہ خیال نہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسے نازک وقت میں کسی سپہ سالار کو سخت سزا دینا اور اس کے الزام کی تشہیر کرنا مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ کسی مفتوحہ قوم کی کسی عورت سے شادی کر لینا اور وہ بھی اس حالت میں کہ ابھی اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوئے ہوں عربوں کے رسوم و رواج کے خلاف نہیں کیونکہ اس صورت میں مفتوحہ قوم کی عورتیں لونڈیاں شمار ہوں گی جن پر ان کے مالک کو ہر قسم کا اختیار ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ اس وقت مسلمانوں کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی تلوار کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ مسیلمہ بنی حنیفہ کے چالیس ہزار طاقت ور اشخاص کے ساتھ بطاح کے قریب یمامہ میں مقیم تھا اور مسلمانوں کے خلاف اس کی بغاوت نے انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ مسلمانوں کی نظریں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف اٹھتی تھیں۔ مالک بن نویرہ کے قتل اور اس کی بیوی لیلیٰ سے نکاح کرنے کے باوجود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول نہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں مسیلمہ کو اسلامی فوجوں پر بے پناہ غلبہ حاصل ہو جاتا اور دین اسلام کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں طلب فرما کر صرف زبانی سرزنش پر اکتفا کی اور انہیں یمامہ جا کر مسیلمہ کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔

یمامہ پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی چڑھائی:

یہ ہے میرے خیال میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اختلاف کی صحیح تصویر، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بلا کر مسیلمہ پر چڑھائی کرنے کا حکم بھی اس لیے دیا کہ اہل مدینہ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی رائے رکھنے والے اشخاص کو دکھا سکیں کہ اس نازک وقت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہی کی شخصیت ایسی ہے جو میدان جنگ میں مسلمانوں کو تباہی کے خطرات سے بچا سکتی ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو میدان جنگ سے بلا کر سرزنش کرنا اور لیلیٰ کو طلاق دینے کا حکم ہی ان کے لیے کافی سزا سمجھی گئی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یمامہ میں بھی اس طرح ایک عورت سے شادی کی تھی جس طرح بنو تمیم میں لیلیٰ سے کی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس پر سختی سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سرزنش کی۔

مورخین نے ان واقعات پر عجیب و غریب گوہر افشانیاں کی ہیں اور انہیں پیش کر کے حضرت خالد بن ولید ذکو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان مورخین اور مصنفین کی حالت، جو ان واقعات کو پیش کر کے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے چہرے کو سیاہ داغوں سے چھپانا چاہتے ہیں، ان لوگوں سے زیادہ تعجب خیز ہے جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان الزامات سے بالکل بری قرار دیتے اور ان کے لیے عذرات تلاش کرتے ہیں۔ مالک کا قتل اور لیلیٰ بنت مجاعہ سے نکاح کے واقعات ان کارناموں کے مقابلے میں قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتے جو مرتدین کی جنگوں میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئے اور جنھوں نے انہیں سیف اللہ کے خطاب کا قرار واقعی مستحق ٹھہرایا۔

مسیلمہ کے مقابلے میں روانہ ہونے کا حکم ملنے کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مدینہ سے بطاح واپس آ گئے اور وہاں اس کمک کا انتظار کرنے لگے جسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس امداد کے پہنچنے کے بعد وہ لشکر لے کر مسیلمہ کے مقابلے کے لیے روانہ ہو گئے جو جھوٹے مدعیان نبوت میں سب سے زیادہ طاقتور تھا جس کی بغاوت جزیرہ نمائے عرب کے مرتدین کی تمام بغاوتوں سے زیادہ مہیب تھی اور جس کی طرف سے مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطرہ لاحق تھا۔

۹

جنگ یمامہ

مسیلمہ کے خلاف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی چڑھائی:

بطاح سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے لشکر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بھیجی ہوئی کمک لے کر بنی حنیفہ کے متنبی مسیلمہ بن حبیب سے جنگ کرنے کے لیے یمامہ روانہ ہوئے۔ جو کمک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھیجی تھی وہ تعداد اور قوت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اصل لشکر سے کم نہ تھی۔ اس میں ان مہاجرین اور انصار کے علاوہ جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفار سے لڑائیاں کی تھیں، ان قبائل کے لوگ بھی شامل تھے جن کا شمار عرب کے طاقتور اور جنگجو قبیلوں میں ہوتا تھا۔ انصار ثابت بن قیس اور براء بن مالک کے زیر کردگی تھے اور مہاجرین ابوحذیفہ بن عتبہ اور زید بن خطاب کے ماتحت دوسرے قبائل میں سے ہر قبیلے کا سردار علیحدہ علیحدہ تھا جسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی حسن کارکردگی کے باعث اس عہدے پر مقرر فرمایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ کے وقت چالیس ہزار بنو حنیفہ مسیلمہ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں گے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اس لیے اس وقت مدینہ کی جانب سے بھی بہترین آدمیوں کو، جو قیادت اور جنگ کا کامل تجربہ رکھتے ہوں، محاذ جنگ پر نہ بھیجا گیا تو ان مرتدین کا مقابلہ بے حد دشوار ہو جائے گا۔

ان لوگوں میں جنھیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے روانہ کیا تھا، قرآن مجید کے حافظوں اور قاریوں کی بھی بھاری تعداد شامل تھی۔ اسی طرح ایک خاص دستہ ان صحابہ کا تھا جنھوں نے جنگ بدر میں حصہ لیا تھا۔ ایسا کرنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس پالیسی کے خلاف تھا جو انھوں نے اہل بدر کے متعلق وضع کی تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جنگوں میں اہل بدر کو استعمال نہ کروں گا یہاں تک کہ وہ اپنے نیک اعمال کے ساتھ اللہ کے دربار میں حاضر ہو جائیں۔ لیکن اس موقع پر نازک صورت حال کے پیش نظر انھوں نے اپنی پالیسی تبدیل کرتے ہوئے اہل بدر اور دوسرے صحابہ کو جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی جنگوں میں حصہ لیا تھا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے روانہ فرمایا کیونکہ یمامہ میں مسیلمہ کو خوب فروغ ہو چلا تھا اور وہ آسانی سے زیر ہونے والا نہ تھا۔

مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی:

حقیقت یہ ہے کہ یمامہ میں مسلمانوں کی کامیابی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا کارنامہ نہیں۔ یمامہ کی حالت دوسرے قبائل سے بالکل مختلف تھی۔ مدینہ کے قریبی قبائل میں سے، جنھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد مدینہ کا محاصرہ کرنا چاہا تھا، کوئی شخص نبوت کا مدعی نہ تھا اور زکوٰۃ کی معافی کے سوا انہیں اور کوئی خواہش نہ تھی۔ مزید برآں عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کو طلیحہ اسدی کی امدد سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے اس لشکر میں ابتری پھیل گئی اور وہ جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کے لشکر کے مفرور ام زمل کے پاس جا کر اکٹھے ہوئے لیکن ایک ہزیمت خوردہ فوج سے مقابلے کی توقع عبث تھی۔ اس لیے ام زمل کو بھی شکست سے دو چار ہونا پڑا۔

رہ گئے بنو تمیم تو ان میں خود تفرقہ پڑا ہوا تھا۔ مسلمانوں سے کیا مقابلہ کر سکتے تھے!

سجاح کے عزم اور ہمت کو مالک بن نویرہ نے متزلزل کر دیا اور اس نے مدینہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔ مالک بن نویرہ مسلمانوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ وہ حضرت خالد بن ولید ذ کے مقابلے میں آنے کی جرأت ہی نہ کر سکا۔

ان لوگوں کے بالمقابل مسیلمہ اور یمامہ میں اس کے پیروؤں کو اصلاً اس بات ہی سے انکار تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قریش کی طرح نبوت و بہالت پر ان کا بھی حق ہے۔ انہیں بھی عرب میں وہی درجہ حاصل ہے جو قریش کو ہے۔ ان کا لشکر قریش کے لشکر سے کئی گنا بڑا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں کامل اتحاد پایا جاتا ہے۔ آپس کی مخالفت اور شکر رنجی بالکل مفقود ہے۔ عقیدے اور قبیلے کا اختلاف ان میں بالکل نہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر وہ اپنے آپ کو بہت طاقت ور سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوجوں سے بڑی کامیاب ٹکر لے سکتے ہیں۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ کی ہزیمت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظر میں یہ تمام باتیں پہلے ہی سے موجود تھیں اس لیے انہوں نے پوری کوشش کی کہ یمامہ کی جانب سے جو لشکر بھیجے جائیں وہ طاقت ور ہوں۔ مرتدین سے لڑنے کے لیے انہوں نے گیارہ لشکر تیار کیے تھے اور ہر لشکر کو علیحدہ علیحدہ قبیلے کی طرف بھیجا تھا۔ لیکن مسیلمہ کے بارے میں ایسا نہ ہوا بلکہ اس کی جانب انہوں نے عکرمہ بن ابوجہل کو بھیجا اور ان کے پیچھے پیچھے شرجیل بن حسنہ کو ایک لشکر دے کر ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا۔ عکرمہ یمامہ کی جانب بڑھتے چلے گئے اور شرجیل کے پہنچنے کا انتظار نہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسیلمہ پر فتح یاب ہونے کا فخر تنہا انہیں کے حصے میں آئے۔ عکرمہ ایک تجربہ کار ماہر جنگ اور دشمن کو خاطر میں نہ لانے والے شہسوار تھے۔ ان کی فوج میں بڑے بڑے بہادر شامل تھے جو پچھلی جنگوں میں لوگوں پر اپنے کارناموں کی دھاک بٹھا چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ مسیلمہ کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور بنو حنیفہ

نے انہیں شکست دے کر پیچھے ہٹادیا عکرمہ نے اپنی ہزیمت کا سارا حال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا جسے پڑھ کران کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے عکرمہ کو لکھا: ''اے ابن ام عکرمہ! (عکرمہ کی ماں کے بیٹے) میں تمہاری صورت دیکھنے کا مطلق روادار نہیں۔ تم واپس آ کرلوگوں میں بد دلی پھیلانے کا باعث نہ بنو بلکہ حذیفہ اور عرفجہ کے پاس جا کر اہل عمان اور مہرہ سے لڑو۔ اس کے بعد یمن اور حضر موت جا کر مہاجر بن ابی امیہ سے مل جاؤ اوران کے دوش بدوش مرتدین سے جنگ میں حصہ لو۔''

اس خط میں جو غیظ وغضب ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابن ام عکرمہ کا خطاب ہی اس غیظ وغضب کی صحیح کیفیت ظاہر کر رہا ہے۔

مسیلمہ کی قوت کا سبب:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مسیلمہ نے اتنی قوت کس طرح حاصل کرلی؟ مسیلمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں بنی حنیفہ کے ایک وفد کے ہمراہ مدینہ آیا وفد کے باقی ارکان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے اور قبول اسلام کا اعلان کر دیا لیکن مسیلمہ نہ جاسکا کیونکہ وہ لوگ اسے سامان کی حفاظت کے لیے ڈیرے ہی پر چھوڑ گئے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت انہیں کچھ مال و منال عطا فرمایا جس پر انہوں نے مسیلمہ کا حصہ مانگا۔ آپ نے اس کے حصے کا مال بھی ان لوگوں کو دیا اور فرمایا: ''وہ مرتبہ میں تم سے کم تر نہیں۔''

مطلب یہ تھا کہ اس کی حیثیت اتنی کم تر نہیں کہ تم اسے مال کی حفاظت کے لیے ڈیرے پر چھوڑ آئے ہو۔ مسیلمہ محض یہ بات پیش کر کے نبوت کا دعویٰ نہ کرسکتا تھا اس لیے شروع میں بہت ہی تھوڑے لوگوں نے اس کی باتوں پر کان دھرا۔ ورنہ دو سال میں ہزاروں آدمیوں کو اپنے گرد جمع کر لینا کوئی معجزہ قرار نہیں پاسکتا ہے۔ یہ تو محض ایک شعبدہ بازی تھی۔

حقیقی امر، جس نے مسیلمہ کی طاقت بڑھائی، وہ تھا نہار الرجال کا اس سے مل جانا۔ یہ شخص جس کا نام نہار الرجال یا نہار الرجال بن عنفوہ تھا اس علاقے کا رہنے والا تھا اور ہجرت کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ آگیا تھا۔ یہاں اس نے قرآن کریم پڑھا اور دینی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ وہ بہت ذہین شخص تھا اس لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اہل یمامہ کو دین اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرنے اور لوگوں کو مسیلمہ کی متابعت سے روکنے کے لیے بھیجا۔ لیکن نہار مسیلمہ سے بھی زیادہ فتنہ پرور ثابت ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ لوگ مسیلمہ کی اطاعت قبول کرتے جارہے ہیں تو وہ ان لوگوں کی نظروں میں اپنے آپ کو سرخرو کرنے کے لیے ان سے مل گیا اور مسیلمہ کی نبوت کا اقرار کرنے کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ جھوٹا قول بھی منسوب کیا کہ مسیلمہ ان کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہے۔ اہل یمامہ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے ایک شخص مسیلمہ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے اور وہ شخص معمولی آدمی نہیں بلکہ عالم، فاضل اور فقیہ بھی ہے۔ ان کے سامنے قرآن پڑھتا اور اس کی تعلیمات سے انہیں آگاہ کرتا ہے۔ انہیں دین کا علم سکھاتا ہے۔ اب کہ وہ خود

نبوت مسیلمہ کی گواہی دے رہا تھا تو مسیلمہ کی نبوت سے انکار کی گنجائش ہی کہاں رہی تھی چنانچہ بے وقوف لوگ جوق در جوق مسیلمہ کے پاس اور بنی حنیفہ کے رسول کی حیثیت سے اس کی بیعت کرنے لگے۔ اس طرح چند ہی دنوں میں اس کی طاقت کہیں سے کہیں جا پہنچی۔

مسیلمہ نے اس کے صلے میں نہار الرجال کو اپنا خاص معتمد علیہ بنالیا اور اس کے مشورے سے نبوت کا کاروبار انجام دینے لگا۔ اس کے بدلے نہار الرجال کو دنیا بھر کی نعمتیں میسر آگئیں اور وہ ان سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے لگا۔ جب علماء اور فقہاء ہی دنیا کی نعمتوں کے حصول پر تل جائیں اور اپنی غرض کے لیے ذلیل خوشامد اور جھوٹی گواہی سے بھی دریغ نہ کریں تو عوام جو بھی کریں تھوڑا ہے۔

جہاں تک مسیلمہ کے معجزات دکھانے کا تعلق ہے تاریخ سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نہ لوگوں نے اس کا کوئی معجزہ دیکھ کر اسے قبول کیا اور نہ اس کی خود ساختہ وحی سے متاثر ہو کر اس پر ایمان لائے۔ مسیلمہ کا کاروبار چمکنے کا صرف وہی سبب تھا جس کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے۔

مسیلمہ کی اطاعت کیوں قبول کی گئی؟

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ عوام تو خیر جاہل ہوتے ہیں انہیں حق و باطل کی تمیز نہیں ہوتی لیکن دانشوران قوم کی عقلوں پر کیا پتھر پڑ گئے تھے کہ انہوں نے آنکھیں بند کر کے مسیلمہ کی اطاعت قبول کر لی تو بات یہ ہے کہ اس کی تہ میں عربوں کی قومی عصبیت اور قبائلی خود مختاری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

مؤرخین ذکر کرتے ہیں کہ طلیحہ نمری یمامہ آیا اور لوگوں سے پوچھا: ''مسیلمہ کہاں ہے؟''

لوگوں نے کہا: ''تم اس کا نام اس قدر بے ادبی سے لیتے ہو حالانکہ وہ اللہ کا رسول ہے۔''

اس نے کہا: ''میں تو اس وقت تک اسے رسول ماننے کے لیے تیار نہیں جب تک اس سے مل نہ لوں۔ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔''

مسیلمہ کے پاس پہنچ کر طلیحہ نے اس سے پوچھا: ''تمہارے پاس کون آتا ہے؟''

''رحمان'' مسیلمہ نے جواب دیا۔

''روشنی میں یا اندھیرے میں؟''

''اندھیرے میں۔''

اس پر طلیحہ بولا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ تم کذاب ہو اور محمد ﷺ سچے ہیں لیکن اپنا کذاب ہمیں دوسرے کے سچے سے زیادہ محبوب ہے۔''

چنانچہ اس نے مسیلمہ کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے ہمراہ لڑتا ہوا مارا گیا۔

مسیلمہ کی قوت و طاقت بڑھ جانے اور اس کے مقابلے میں عکرمہ کی شکست کھا نے کے باعث

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے شرجیل بن حسنہ کو لکھا کہ وہ جہاں ہیں وہیں رہیں جب تک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان کے پاس نہ پہنچ جائیں، مسیلمہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ (شرجیل) حضرت عمرو بن عاص کے پاس چلے جائیں اور شمالی حصے میں قضاعہ کے خلاف جنگ میں ان کی مدد کریں۔

شرجیل کی شکست:

ابھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یمامہ کے رستے ہی پر تھے کہ مسیلمہ کی فوجوں نے شرجیل کی فوج سے ٹکر لی اور اسے پیچھے ہٹا دیا۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ شرجیل نے بھی وہی کیا جو اس سے پہلے عکرمہ کر چکے تھے یعنی وہ مسیلمہ پر فتح یابی کا فخر خود حاصل کرنے کے شوق میں آگے بڑھے۔ لیکن انہیں بھی شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر بھی میرے خیال میں واقعہ اس طرح نہیں بلکہ خود یمامہ کے لشکر نے اس خیال سے کہ کہیں شرجیل حضرت خالد بن ولید سے مل کر انہیں نقصان نہ پہنچائیں، آگے بڑھ کر لشکر پر حملہ کر دیا اور شکست دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ دونوں میں سے کوئی بات ہوئی ہو مگر واقعہ یہی ہوا کہ شرجیل اپنا لشکر لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ جب حضرت خالد بن ولید ان کے پاس پہنچے اور انہیں تمام واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے شرجیل کو بہت برا بھلا کہا۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر دشمن سے ٹکر لینے کی طاقت نہ ہو تو بے شک اس وقت تک اس کے مقابلے سے گریز کیا جائے جب تک مطلوبہ طاقت حاصل نہ ہو جائے بہ نسبت اس امر کے کہ طاقت نہ ہونے کے باوجود دشمن سے لڑائی چھیڑ دی جائے جس کے نتیجے میں شکست کھانی پڑے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مجاعہ کی مڈبھیڑ:

اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکروں کے ہمراہ یمامہ کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ مسیلمہ کو بھی ان کی نقل و حرکت کی تمام خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس دوران میں یہ واقعہ ہوا کہ بنی حنیفہ کا ایک شخص مجاعہ بن مرارہ، بنی عامر اور بنی تمیم کے چند اشخاص سے اپنے کسی رشتہ دار کے قتل کا انتقام لینے کے لیے چند لوگوں کے ہمراہ نکلا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر مسلمانوں سے جنگ شروع ہوگئی تو انتقام لینے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ چنانچہ اس نے ان قبائل میں پہنچ کر اپنا قصاص لیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس چل پڑا۔ جب یہ لوگ ثنیۃ الیمامہ پہنچے تو تھکاوٹ کی وجہ سے بے خبر پڑ کر سو گئے۔ دریں اثنا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا لشکر وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت یہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ حضرت خالد بن ولید کو معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس خیال سے کہ ان سے لڑنے کے لیے نکلے ہیں، انہیں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ انہوں نے کہا ہم آپ سے لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بنو تمیم سے انتقام لینے کے لیے نکلے تھے۔ اس پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اسلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

انہوں نے کہا: ''ایک نبی تم میں ہے اور ایک نبی ہم میں۔''

اس پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں قتل کرا دیا۔

اس موقع پر ایک آدمی (ساریہ بن عامر) نے عین اس وقت جب تلوار اس کا گلا کاٹنے کے لیے تیار تھی، مجاعہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اگر تم اپنی بھلائی چاہتے ہو تو اس آدمی کو چھوڑ دو۔"

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بھی مجاعہ کو قتل نہ کرایا بلکہ بطور ضمانت اپنے پاس رکھ لیا۔ کیونکہ وہ بنی حنیفہ کے سرداروں میں سے تھے اور وہ لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے آگے چل کر اس کے ذریعے سے کوئی کام نکل سکے۔ انہوں نے اسے لوہے کی بیڑیوں میں جکڑ کر اپنے خیمے میں ڈال دیا اور اپنی نئی بیوی لیلیٰ ام تمیم کو اس کی نگرانی کا کام سونپ دیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور مسیلمہ میں جنگ:

مسیلمہ نے اپنا لشکر یمامہ کی جانب عقرباء میں جمع کیا تھا اور سارا مال اسباب لشکر کے پیچھے رکھا تھا۔ اس کا لشکر بعض روایات کے مطابق چالیس ہزار اور بعض روایتوں کے رو سے ستر ہزار تھا۔ ایسے عظیم الشان لشکر کا ذکر عربوں نے اس سے پہلے بہت ہی کم سنا تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسی روز جب انہوں نے مجاعہ کو قید کیا تھا، مسیلمہ کی فوج کے مقابلے میں آ گئے۔ دونوں لشکر میدان جنگ میں کھڑے آخری اعلان کے منتظر تھے۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ فتح مندی و کامرانی اسی کے حصے میں آئے گی اور وہ دوسرے لشکر کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنگ یمامہ کا دن اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں ایک منفرد دن ہے۔ کیونکہ اس روز اسلام اور نبوت کاذبہ کا آخری مقابلہ ہونے والا تھا۔

مسیلمہ کی طرف یمن، عمان مہرہ، بحرین، حضرموت اور عرب کی جنوبی جانب، مکہ اور طائف سے خلیج عدن تک کے تمام علاقوں کے لوگوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ ایرانی بھی بڑی بے صبری سے اس جنگ کے نتیجے کے منتظر تھے۔ مسیلمہ کا لشکر اس پر کامل ایمان رکھتا تھا اور اس کی راہ میں کٹ مرنے کے لیے تیار تھا۔ علاوہ بریں حجاز اور عرب کے جنوبی علاقوں کی دیرینہ دشمنی بھی مسلمانوں کے خلاف بنی حنیفہ کے اس جوش و خروش میں مزید اضافے کا موجب ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا لشکر بھی اپنی ہیبت کے لحاظ سے کچھ کم طاقت ور نہ تھا۔ اس کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے جو بلاشبہ اپنے زمانے کے سالارِ اعظم تھے۔ لشکر میں کلام اللہ کے حافظوں اور قاریوں کی بھی کمی نہ تھی۔ یہ تمام لوگ اس جذبے سے میدان جنگ میں آئے تھے کہ اللہ کے راستے میں جہاد اور اس کے دین کی مدافعت مومن کا فرض اولین ہے۔ اور علم و بصیرت رکھنے والے کے لیے تو یہ فرض عین ہے۔ اس جذبے نے ان کے ولولوں اور امنگوں کو بھی بہت بڑھا دیا تھا اور وہ تعداد میں مرتدین سے بہت کم ہونے کے باوجود عزم و ہمت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھے۔

ابن مسیلمہ کی آتش بیانی:

لڑائی شروع ہونے سے پہلے مسیلمہ کا لڑکا بنی حنیفہ کی صفوں میں پھر کر اپنے آتشیں الفاظ سے ان کی غیرت وحمیت کی آگ بھڑکاتے ہوئے یہ کہتا پھر رہا تھا: ''اے بنو حنیفہ! آج تمہاری غیرت کا امتحان ہے۔ اگر تم شکست کھا گئے تو تمہارے پیچھے تمہاری عورتیں لونڈیاں بنالی جائیں گی اور ان کے نکاح زبردستی دوسرے لوگوں سے کر دیئے جائیں گے۔ اس لیے اپنے حسب ونسب کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کرو اور اپنی عورتوں کی عزت بچاؤ۔''

ادھر بدقسمتی سے مہاجر اور انصار اور بدویوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ دونوں فریقوں میں کون بہادر ہے۔ مہاجرین اور انصار کہتے تھے: ''ہم لوگ تم بدویوں سے زیادہ جنگ کے ماہر ہیں۔''

اس کے مقابلے میں اہل بادیہ کہتے تھے: ''مکہ اور مدینہ کے لوگ ہرگز اچھی طرح جنگ نہیں کر سکتے بلکہ انہیں تو یہ معلوم نہیں کہ جنگ کہتے کسے ہیں۔''

مسلمانوں پر بنی حنیفہ کا دباؤ:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ شروع ہونے پر مسلمان بنی حنیفہ کے مقابلے میں ثابت قدم نہ رہ سکے اور پیچھے ہٹنے لگے یہاں تک کہ بنو حنیفہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خیمے تک پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے مجاعہ کو بیڑوں میں جکڑا ہوا اور ام تمیم کو اس کی نگرانی کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک آدمی نے لیلیٰ کو قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی لیکن مجاعہ چیخ اٹھا: ٹھہر جاؤ، میں اسے امان دیتا ہوں۔ تم اسے چھوڑ دو اور مردوں سے جا کر لڑو۔

لشکر کے سپاہیوں نے خیمے کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور خیمے کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ لیکن انہوں نے مجاعہ کو آزاد نہ کیا بلکہ اس امید میں کہ وہ ابھی مسلمانوں پر فتح یاب ہو کر واپس آجائیں گے، اسے بیڑیوں میں جکڑا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔

نہار الرجال کا قتل:

مسلمانوں نے پیچھے ہٹنے کے باوجود پہلے ہی ہلے میں بنی حنیفہ کے سینکڑوں آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ ان قتل ہونے والوں میں سب سے پہلا شخص نہار الرجال تھا جو بنی حنیفہ کے مقدمہ پر مقرر تھا اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھائی زید بن خطاب نے قتل کیا تھا۔ اس کے قتل سے فتنہ مسیلمہ کے سب سے بڑے سرغنے کا خاتمہ ہو گیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی:

لشکر اسلام کے پیچھے ہٹنے کے باوجود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے عزم وثبات میں مطلق کمی نہ آئی اور انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی شکست کا خیال پیدا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ بات بھانپ لی تھی کہ لشکر کے پیچھے

ہٹنے کا سبب فخر ومباہات کا وہ جذبہ تھا جو مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں پیدا ہوگیا تھا اور جس کے باعث ان میں کمزوری راہ پاگئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے پکار کر اپنے لشکر سے کہا: ''اے لوگو! علیحدہ علیحدہ ہو جاؤ اور اسی حالت میں دشمن سے لڑو تاکہ ہم دیکھ سکیں، کس قبیلے نے لڑائی میں بہادری کا سب سے اچھا مظاہرہ کیا۔''

مجاہدین اور اسلام کا عزم وثبات:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس حکم کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہر قبیلے نے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ جوش وخروش سے دشمن کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار مسلمانوں کو بھی یہ احساس ہوگیا کہ انہوں نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے فخر ومباہات اور تعلّی کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ نامناسب تھا۔ چنانچہ انصار کے ایک سردار ثابت بن قیس نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے مسلمانو! تم نے بہت بری مثال قائم کی ہے۔''

پھر اہل یمامہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''اے اللہ! جس کی یہ عبادت کرتے ہیں میں اس برات کا اظہار کرتا ہوں۔''

اور مسلمانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے میں اس سے بھی بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔''

اس کے بعد وہ تلوار سونت کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور بڑی بہادری سے لڑنے لگے وہ لڑتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے میری تلوار کا مزہ چکھو، میں تمھیں صبر واستقلال کا حقیقی نمونہ دکھاؤں گا۔

وہ اسی طرح بے جگری سے لڑتے رہے۔ ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں زخم نہ لگے ہوں۔ آخر اسی طرح لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔

براء بن مالک ان صنادید عرب میں سے تھے جو پیٹھ دکھانا جانتے ہی نہ تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں کو بھاگتے دیکھا تو وہ تیزی سے کود کر ان کے سامنے آگئے اور کہا: ''اے مسلمانو! میں براء بن مالک ہوں۔ میری پیروی کرو۔''

مسلمان ان کی بہادری اور شجاعت سے خوب واقف تھے۔ ان کی ایک جامعت براء کے ساتھ ہولی۔ وہ اسے لے کر دشمن کے مقابلے میں آگئے اور اس بہادری سے لڑے کہ دشمن کو پیچھے ہٹتے ہی بن پڑی۔ عین لڑائی کے دوران میں یہ اتفاق ہوا کہ سخت آندھی آگئی اور ریت اڑ اڑ کر مسلمانوں کے چہروں پر پڑنے لگی۔ چند لوگوں نے اس پریشانی کا ذکر زید بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کیا اور پوچھا کہ اب کیا کریں؟ انہوں نے جواب میں کہا: ''واللہ! میں آج کے دن اس وقت تک کسی سے بات نہ کروں گا جب تک دشمن کو شکست نہ دے لوں یا اللہ مجھے شہادت عطا نہ فرمائے۔ اے لوگو! آندھی سے بچاؤ کی خاطر اپنی نظریں نیچی کر لو اور ثابت قدم رہ کر لڑو۔

یہ کہہ کر تلوار سونت لی اور دشمن کی صفوں میں گھس کر بے جگری سے لڑنے لگے۔ ان کا دستہ بھی ان کے پیچھے ثابت قدمی سے لڑ رہا تھا آخر ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ پورے ہو گئے اور انہوں نے اسی طرح لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔

ابو حذیفہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے: "اے اہل قرآن! اپنے افعال کے ذریعے سے قرآن کو عزت بخشو۔" پھر خود بھی دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد جھنڈا ان کے غلام سالم نے اٹھایا اور کہا: "اگر آج ثابت قدم نہ رہوں تو میں بدترین حامل قرآن ہوں گا۔" چنانچہ وہ بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ان آوازوں نے جو ایمان ویقین سے بھرپور قلوب سے نکل رہی تھیں مسلمانوں کے لشکر میں نہادری کی ایک نئی روح پھونک دی۔ زندگی ان کی نظروں میں حقیر بن کر رہ گئی اور شہادت کی تمنا ہر دل میں چٹکیاں لینے لگی چنانچہ وہ بے جگری سے لڑے اور تھوڑی دیر میں مسیلمہ کے لشکر کو اس کی پہلی جگہ پر لا کھڑا کیا۔

جہاں مسلمان دین حق کی حفاظت اور حصولِ جنت کی خاطر لڑ رہے تھے وہاں مسیلمہ کا لشکر اپنے وطن، حسب ونسب اور ایسے کمزور عقیدے کی خاطر لڑ رہا تھا جو ان کے نزدیک وطن اور حسب ونسب سے بھی بہت کم درجے کا تھا۔ اسی لیے مسلمانوں نے بنو حنیفہ سے زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور انتہائی بے جگری سے لڑے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قتل مسیلمہ کے درپے:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب مسلمانوں کو جوش دلانے والی آوازیں سنیں تو انہیں بھی یقین ہو گیا کہ بنی حنیفہ کی سخت مدافعت کے باوجود انجام کار فتح انہیں کے حصے میں آئے گی۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ فتح کا حصول حتی الامکان جلد ہو جائے اس لیے بہت غور سے ایک بار میدان کا جائزہ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ بنو حنیفہ کے لوگ مسیلمہ کے گرد کٹ کٹ کر گر رہے ہیں اور مسیلمہ کی حفاظت میں موت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ فتح کے جلد از جلد حصول کا طریق یہ ہے کہ کسی طرح مسیلمہ کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے آدمی لے کر آگے بڑھے اور مسیلمہ کے آدمیوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اس کے بعد کوشش کی کہ کسی طرح مسیلمہ ان کے سامنے آجائے تاکہ اس کا کام تمام کیا جا سکے۔ لیکن قبل اس کے کہ مسیلمہ ان کے سامنے آتا، اس کے آدمیوں نے بڑھ چڑھ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر حملے کرنے شروع کیے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تو ان کے بس میں کیا آتے البتہ جو شخص ان کے مقابلے میں آتا زندہ واپس نہ جاتا۔ اس طرح بے شمار آدمی قتل ہو گئے۔

مسیلمہ کا تردد واضطراب:

جب مسیلمہ نے دیکھا کہ اس کے آدمی بہت بڑی تعداد میں قتل ہو رہے ہیں تو اس نے خود حضرت

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر آنے کا ارادہ کیا لیکن اس خیال سے رک گیا کہ اگر وہ بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے نکلا تو لامحالہ مارا جائے گا۔ اب اس کے تردد و اضطراب کی انتہا نہ رہی۔ اس کے جاں نثار کٹ کٹ کر گر رہے تھے اور اسے خود بھی اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ اس اضطراب کی حالت میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ یکا یک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کے محافظین پر ایک بھرپور حملہ کر کے تلوار کے جوہر دکھانے شروع کیے۔

یہ دیکھ کر مسیلمہ کے ساتھیوں نے اس سے پکار کر پوچھا: ''آپ کے وہ وعدے، جو اپنی فتح کے متعلق آپ نے ہم سے کیے تھے، کہاں گئے؟''

مسیلمہ کا فرار:

اس وقت مسیلمہ کے حوصلے ختم ہو چکے تھے اور اس نے میدان جنگ سے بھاگنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے پیٹھ پھیرتے ہوئے جواب دیا: ''اپنے حسب و نسب کی خاطر لڑتے رہو۔'' لیکن اب وہ کیا لڑتے جب ان کا سردار انہیں مسلمانوں کی تلواروں کے سپرد کر کے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔ بنی حنیفہ کے ایک سردار محکم بن طفیل نے جب لوگوں کو بھاگتے اور مسلمانوں کو ان کا پیچھا کرتے دیکھا تو پکار پکار کر کہنے لگا: ''اے بنو حنیفہ! باغ میں داخل ہو جاؤ۔''

یہ باغ، جسے حدیقۃ الرحمن کہا جاتا تھا میدان جنگ سے قریب ہی تھا اور مسیلمہ کی ملکیت میں تھا۔ یہ بہت طویل و عریض اور قلعے کی طرح اس کے چاروں طرف بلند دیواریں کھڑی تھیں۔ محکم بن طفیل کی آواز سن کر لوگوں نے اس باغ کی طرف بھاگنا شروع کیا (جس میں مسیلمہ پہلے ہی داخل ہو چکا تھا) لیکن محکم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مسلمانوں کو بنی حنیفہ کے تعاقب سے روکنے کے لیے میدان جنگ ہی میں رہ گیا تھا۔ اس نے بہت بہادری سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور آخر عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے ایک تیر سے، جو اس کے سینے میں لگا، اس کا کام تمام ہو گیا۔

باغ کا محاصرہ:

مسیلمہ اور اس کی قوم باغ میں پناہ گزین ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے لیے باغ کا محاصرہ کر لینے اور کامل فتح کے حصول تک وہاں سے نہ ٹلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ باغ کے چاروں طرف مسلمانوں نے پڑاؤ ڈال دیا اور کسی ایسی کمزور جگہ کی تلاش کرنے لگے جہاں سے باغ میں گھسنے اور دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو سکیں لیکن انتہائی تلاش کے باوجود انہیں ایسی کوئی جگہ نہ ملی۔ آخر براء بن مالک نے کہا: ''مسلمانو! اب صرف یہ راستہ ہے کہ تم مجھے اٹھا کر باغ میں پھینک دو۔ میں اندر جا کر دروازہ کھول دوں گا۔''

لیکن مسلمان یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ان کا ایک بلند ... ہزاروں دشمنوں میں گھر کر اپنی جان

گنوا دے۔ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا لیکن براء نے اصرار کرنا شروع کیا اور کہا: ''میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم مجھے باغ کے اندر پھینک دو۔''

آخر مجبور ہو کر مسلمانوں نے انہیں باغ کی دیوار پر چڑھا دیا۔ دیوار پر چڑھ کر جب براء نے دشمن کی زبردست جمعیت کی جانب نظر دوڑائی تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے لیکن پھر اللہ کا نام لے کر باغ کے دروازے کے سامنے کود پڑے اور دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرتے، دائیں بائیں لوگوں کو قتل کرتے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ آخر بیسیوں آدمیوں کے قتل کے بعد وہ دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور آگے بڑھ کر بڑی پھرتی سے اسے کھول دیا۔

بنی حنیفہ کا قتل:

مسلمان، باہر دروازے کھلنے کے منتظر تھے ہی جونہی دروازہ کھلا وہ باغ میں داخل ہو گئے اور تلوار سونت کر دشمنوں کو بے دریغ قتل کرنے لگے۔ بنو حنیفہ مسلمانوں کے سامنے سے بھاگنے لگے لیکن باغ سے باہر وہ کس طرح نکل سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ اس وقت باغ اس مذبح کی صورت پیش کر رہا تھا جہاں بھیڑ اور بکریاں قصاب کو چھری ہاتھ میں لیے انہیں ذبح کرنے کے لیے اپنی طرف آتا دیکھتی ہوں لیکن بے بسی کی حالت میں کچھ نہ کر سکتی ہوں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف براء نے نہیں بلکہ اور بھی کئی مسلمانوں نے دیواریں پھاند کر دروازے کا رخ کیا تھا۔ چونکہ براء نے دروازے کے بالکل قریب دیوار پھاندی تھی۔ اس لیے دروازے پر سب سے پہلے وہی پہنچے اور لڑتے بھڑتے دروازہ کھول دیا۔ بنو حنیفہ نے ان مٹھی بھر مسلمانوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن دیوار پر مسلمان متعین تھے انہوں نے تیر مار مار کر انہیں مسلمانوں سے دور رکھا۔

مسیلمہ کا قتل:

مسلمانوں نے اگرچہ باغ میں گھس کر بنو حنیفہ کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا تھا مگر بنو حنیفہ نے بھی بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمانوں کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ طرفین کے کثیر آدمی اس معرکے میں قتل ہوئے لیکن بنی حنیفہ کے مقتولوں کی تعداد مسلمانوں سے بیسیوں گنا تھی۔ حبشی غلام وحشی، جس نے جنگ احد میں حمزہ بن عبدالمطلب ذ کو شہید کیا تھا اور جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہو گیا تھا اس موقع پر موجود تھا۔ اس نے مسیلمہ کو باغ میں دیکھا اور اپنا چھوٹا سا نیزہ تاک کر مسیلمہ کے مارا جو سیدھا اسے جا کر لگا۔ اسی وقت ایک انصاری نے بھی مسیلمہ پر تلوار کا وار کیا۔ وحشی کہا کرتا تھا اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم میں سے کس نے اسے قتل کیا لیکن مسیلمہ اگر مرنے کے بعد زندہ ہوتا تو ہمیشہ ہی یہ کہتا کہ اسے اس سیاہ فام غلام نے قتل کیا ہے۔

جب بنو حنیفہ نے مسیلمہ کی خبر موت سنی تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ مسلمانوں نے انہیں بے تحاشا قتل کرنا شروع کیا۔ عرب میں اس وقت تک جتنی جنگیں ہوئی تھیں یمامہ سے بڑھ کر کسی بھی جنگ میں اتنی خونریزی نہ

ہوئی تھی۔ اس لیے حدیقۃ الرحمن کا نام حدیقۃ الموت پڑ گیا اور آج تک تاریخ کی کتابوں میں یہی نام چلا آتا ہے۔

جب باغ کا معرکہ ختم ہو چکا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے خیمے سے مجاعہ کو لے کر آئے اور اس سے کہا کہ وہ مقتولین کو دیکھ کر بتائے ان میں مسیلمہ کون سا ہے۔ مسلمان خود بھی مقتولین کی شناخت کے لیے باغ میں پھرنے لگے۔ جب وہ محکم الیمامہ کے پاس سے گزرے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا یہ ہے تمہارا صاحب؟''

مجاعہ نے جواب دیا نہیں، یہ تو محکم الیمامہ ہے جو مسیلمہ سے بہت بہتر اور نیک انسان تھا آخر پھرتے پھرتے وہ ایک زرد رو ٹھگنے کے لاشے پر پہنچے مجاعہ نے کہا یہ مسیلمہ ہے جسے تم نے قتل کر دیا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ وہی شخص ہے جس نے تمھیں گمراہ کر کے ایک عظیم فتنہ برپا کر دیا تھا۔''

مفرورین کا تعاقب اور محاصرہ:

اگرچہ مسیلمہ کا فتنہ ختم ہو چکا تھا اور وہ خود میدان جنگ میں اپنے ہزاروں آدمیوں کے ہمراہ مارا جا چکا تھا۔ لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ابھی بھی مطمئن نہ تھے۔ جنگوں میں آپ کا طریق کار یہ تھا کہ اس وقت تک دشمن کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے جب تک اس کی مخالفانہ سرگرمیاں دوبارہ شروع ہونے کا معمولی سا خدشہ بھی باقی رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے طلیحہ کے مفرور ہو جانے کے باوجود اس وقت تک بنو اسد سے جنگ بند نہ کی جب تک ام زمل اور اس کے لشکر کا خاتمہ نہ کر دیا۔ پھر بنی تمیم کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے والے ایک ایک شخص کا تیا پانچا نہ کر دیا۔ یہی کام آپ نے اس موقع پر بھی کیا۔

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حدیقۃ الموت کے معرکے سے فارغ ہو چکے تو عبداللہ بن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اب لشکر کو کوچ کا حکم دیجئے اور چل کر بنی حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر لیجئے کیونکہ بقیہ لوگ فرار ہو کر ان قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا فی الحال تو میں دستوں کو ان لوگوں کی تلاش میں روانہ کر رہا ہوں جو قلعوں میں نہیں گئے بلکہ ارد گرد کے علاقوں میں پھر رہے ہیں، اس کے بعد جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے چاروں طرف دستے روانہ کیے جو ارد گرد سے مال غنیمت اور عورتوں، بچوں کو لے آئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں قید کرنے کا حکم دیا اور فوج کو ہدایت کی کہ اب وہ چل کر بنی حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کرے تا کہ ان لوگوں میں جو دم خم باقی ہے وہی بھی ختم ہو جائے۔

صلح کی بات چیت:

لیلیٰ ام تمیم کو بنی حنیفہ کے ہاتھوں سے بچانے اور مسیلمہ کے بارے میں سچی باتیں کہنے کے باعث حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مجاعہ پر پورا بھروسہ ہو گیا تھا۔ جب مسلمان بنی حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر چکے تو وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا آپ سمجھیں کہ آپ نے فتح حاصل کر لی ہے۔

یمامہ کے قلعوں میں ہمارے جنگجوؤں کی ایک بھاری تعداد اسلحہ سے لیس ابھی تک موجود ہے۔ وہ لوگ بہت سختی سے آپ کا مقابلہ کریں گے۔ آپ لڑائی سے بچنا چاہتے ہیں تو مجھے کچھ دیر کے لیے شہر میں جانے کی اجازت دیجئے۔ میں انہیں صلح پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ لشکر کے لوگ لڑائی سے تنگ آچکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بنو حنیفہ پر جو فتح انہوں نے حاصل کی تھی اسی پر اکتفا کریں اور مزید جنگ و جدل سے پرہیز کریں۔ انہوں نے سوچا کہ مجاعہ کی بات مان لینی چاہیے۔ چنانچہ اسے جانے کی اجازت تو مرحمت فرمادی لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ صلح میں بنو حنیفہ کو غلام بنانے کی شرط شامل نہ ہوگی۔

مجاعہ کی چال بازی:

مجاعہ نے شہر میں جا کر دیکھا کہ وہاں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس نے انہیں زرہ بکتر پہنائے اور سکھا دیا کہ وہ سب قلعے کی فصیل پر جمع ہو جائیں تا کہ مسلمان انہیں دیکھ کر ان کی کثرت تعداد سے دھوکا کھا جائیں اور ہماری پیش کردہ شرائط پر صلح کر لیں۔ چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا اور زرہ بکتر پہن کر تلواریں اور نیزے ہاتھ میں لے کر فصیل پر پہنچ گئے۔ جب باہر سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں نے یہ نظارہ دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ مجاعہ نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا۔ واقعی ابھی بنو حنیفہ میں دم خم باقی ہے۔ اور وہ ابھی مزید لڑنے کی تاب رکھتے ہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور بنو حنیفہ میں صلح:

تھوڑی دیر میں مجاعہ بھی پہنچ گیا اور کہا: ''میری قوم آپ کی شرائط پر صلح کرنا نہیں چاہتی اور میں نے آپ سے جو عہد و پیمان کیے تھے وہ انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔'' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دوبارہ لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مجاعہ سے کہا: ''ہم نصف مال و اسباب، نصف مزروعہ اور باغات اور نصف قیدیوں کو بنی حنیفہ کے لیے چھوڑ دیں گے، تم انہیں جا کر سمجھاؤ کہ وہ اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالیں اور صلح کر لیں۔'' مجاعہ دوبارہ شہر میں گیا اور واپس آ کر کہا: ''وہ لوگ ان شرائط پر بھی صلح کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آپ چوتھائی مال اسباب لینے پر رضامند ہو جائیں۔'' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ راضی ہو گئے اور صلح نامہ لکھا گیا۔ صلح کے بعد جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کسی جوان مرد کا نام و نشان بھی نہیں۔ انہوں نے مجاعہ سے پوچھا کہ تم نے مجھ سے دھوکا کیوں کیا؟ اس نے کہا میری قوم تباہ ہو جاتی۔ میرا فرض تھا کہ ان کی جانیں بچاؤں۔ اس لیے میں نے یہ تدبیر اختیار کی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کا عذر قبول کر لیا اور صلح نامہ برقرار رکھا۔ یہ روایت بھی آئی ہے کہ صلح نامہ لکھے جانے سے پہلے جب مجاعہ شہر میں گیا اور لوگوں سے بات چیت کی تو ایک شخص سلمہ بن حضرت عمری الحنفی نے کہا ''واللہ! ہم تمہاری بات کبھی نہ مانیں گے کیونکہ ہمارے قلعے مضبوط ہیں، سامان خورا ک وافر مقدار میں ہمارے پاس موجود ہے، سردی کا موسم بھی شروع ہو چکا ہے،

مسلمان سخت سردی کی تاب نہ لا کر محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

مجاعہ نے جواب دیا: "یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں صلح پر آمادہ کر کے تم لوگوں سے دھوکا کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ یہ بات نہیں تمہیں معلوم ہے کہ ابن مسیلمہ نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے کہا تھا: "اے لوگو! قبل اس کے کہ تمہاری عورتیں قیدی بنالی جائیں اور غیر جگہ ان کے نکاح کر دیئے جائیں، تم مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دو، میں بھی تمہیں اسی خطرے سے بچانے کے لیے آیا ہوں۔ تم صلح کر لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو۔"

جب لوگوں نے مجاعہ کی باتیں سنیں تو وہ صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے اور سلمہ بن عمیر کی بات کو ناقابل عمل سمجھ کر ترک کر دیا۔

بنی حنیفہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں:

دریں اثناء حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قاصد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس یہ حکم لے کر آیا کہ اس شخص کو، جو لڑائی کے قابل ہو، قتل کر دیا جائے لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان سے صلح کر چکے تھے۔ انہوں نے صلح توڑنا اور بدعہدی کرنا نہ چاہا۔ اس کے بعد بنو حنیفہ بیعت کرنے اور مسیلمہ کی نبوت سے براءت کا اظہار کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ یہ تمام لوگ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس لائے گئے جہاں انہوں نے بیعت کی اور اپنے دوبارہ اسلام لانے کا اعلان کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کا ایک وفد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ روانہ فرمایا۔ جب وہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "آخر تم لوگ مسیلمہ کے پھندے میں پھنس کر کس طرح گمراہ ہو گئے؟"

انہوں نے جواب دیا: "اے خلیفہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارا سارا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ مسیلمہ نہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچا سکا اور نہ اس کے رشتہ داروں اور قوم کو اس سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکا۔"

مجاعہ کا فریب اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مصالحت:

اس موقع پر شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ آخر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مجاعہ کی فریب دہی کے باوجود کس طرح مصالحت پر تیار ہو گئے حالانکہ ان کی سختی ضرب المثل بن چکی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح مبین حاصل ہونے کے علاوہ بنی حنیفہ کی جنگوں میں اس قدر خونریزی ہو چکی تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آخر ان سے درگزر کرنا اور رعایات سے بہرہ ور کرنا ہی مناسب خیال کیا۔

بنی حنیفہ کے مقتولین کی تعداد:

روایات سے پتا چلتا ہے کہ حدیقۃ الموت کی لڑائی میں سات ہزار بنی حنیفہ قتل ہوئے تھے میدان جنگ میں بھی ان کے مقتولین کی تعداد سات ہزار تھی۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے

دستوں کو مفرورین کے تعاقب میں روانہ کیا تو بھی سات ہزار آدمی قتل ہوئے۔ جو صلح مجاعہ کے ذریعے سے پایہ تکمیل کو پہنچی اس کی رو سے سارا مال غنیمت، جو مال سونے چاندی اور ہتھیار پر مشتمل تھا، مسلمانوں کی ملکیت ٹھہرا، اس کے علاوہ چوتھائی قیدی بھی ان کے حصے میں آئے۔ بنی حنیفہ کی بستیوں اور علاقے میں جو باغات اور مزروعہ زمینیں تھیں ان پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔

یہ درست ہے کہ مجاعہ نے اپنی قوم سے بقیہ السیف لوگوں کو قتل ہونے سے بچایا تھا لیکن یہ تمام لوگ دوبارہ اسلام قبول کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت تسلیم کر چکے تھے۔ اس لیے اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے واسطے کوئی وجہ ایسی باقی نہ رہی تھی جس سے وہ مجاعہ پر ناراض ہوتے یا اس سے انتقام لیتے۔

مسلمان شہداء کی تعداد:

اس جنگ میں جہاں بنی حنیفہ کے مقتولین کی تعداد پچھلی تمام جنگوں سے زیادہ تھی وہاں مسلمان شہداء کی تعداد پچھلی تمام جنگوں کو مات کر گئی تھی۔ اس جنگ میں مسلمان شہداء کی تعداد بارہ سو تھی۔ تین سو ستر مہاجرین، تین سو انصار اور باقی دیگر قبائل کے لوگ، شہداء میں تین سو ستر صحابہ کبار اور قرآن کے حافظ بھی تھے جن کا مقام اور درجہ مسلمانوں میں بے حد بلند تھا۔ اگرچہ ان حافظوں کی شہادت سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا لیکن بعض اوقات ایک نقصان دہ چیز بھی آخر فائدے کا موجب بن جاتی ہے چنانچہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس ڈر سے کہ کہیں آئندہ جنگوں میں بقیہ حافظوں سے بھی مسلمانوں کو ہاتھ نہ دھونے پڑیں، قرآن جمع کرنے کا حکم دے دیا اور اس طرح پہلی مرتبہ قرآن ایک جلد میں مدون ہو گیا۔

مسلمانوں کو حزن والم:

مسلمانوں کی بھاری تعداد شہید ہو جانے سے ان کے رشتہ داروں کو جس صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا اس کی تلافی صرف یہ چیز کر سکتی تھی کہ گو مسلمانوں کو کئی قیمتی جانوں کا نقصان اٹھانا پڑا پھر بھی فتح کا شرف انہیں کے حصے میں آیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ جنگ یمامہ میں بہادری کے عظیم کارنامے انجام دینے کے بعد مدینہ واپس آئے تو ان کے والد نے کہا: ''جب تمہارے چچا زید شہید ہو گئے تھے تو تم واپس کیوں آ گئے اور کیوں نہ اپنا چہرہ مجھ سے چھپا لیا؟''

صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا یہ حال نہ تھا بلکہ مکہ اور مدینہ کے سیکڑوں گھرانے اپنے بہادروں اور سپوتوں کی شہادت پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔

بنت مجاعہ سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شادی:

کیا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی غم اور حزن سے اسی طرح بے تاب تھے جس طرح دوسرے مسلمان؟ اور کیا انسانی خون کے مہیب و دہشت ناک منظر اور لاشوں کی کثرت نے ان کے دل میں گھبراہٹ کا کوئی جذبہ پیدا کیا تھا؟ ہرگز نہیں اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بھی یہ حالت ہوتی تو وہ آئندہ کبھی

سپہ سالاری کے قابل نہ رہتے اور انہیں عراق و شام کا فاتح بننے کا فخر کبھی حاصل نہ ہوتا۔ اسی لیے نہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس دوران میں کسی قسم کا خوف لاحق ہوا اور نہ انہوں نے کبھی گھبراہٹ اور بے چینی کا اظہار کیا تھا۔

جونہی وہ صلح نامے کی تکمیل سے فارغ ہوئے انہوں نے مجاعہ کو بلا بھیجا اور کہا اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔ مجاعہ نے لیلیٰ ام تمیم کا واقعہ، دارالحکومت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طلبی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ناراضی کا حال سنا تھا اس لیے اس نے جرأت کر کے کہا مجھے اس سے معاف کیجیے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو میری کمر توڑ دینے کا موجب بنیں گے اور خود بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عتاب سے نہ بچ سکیں گے۔

لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کی ایک نہ سنی اور کہا: ''تمھیں اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنی پڑے گی۔''

اس پر مجبوراً مجاعہ کو اپنی بیٹی کی شادی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کرنی پڑی۔

اس شادی پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ناراضی:

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی اطلاع حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہیں شدید غصہ آیا۔ ام تمیم کے واقعے پر تو انہوں نے یہ کہہ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مدافعت کی تھی کہ انہوں نے مالک کی بیوی سے شادی کرنے کے لیے اسے قتل نہ کیا تھا بلکہ یہ محض غلط فہمی کی بناء پر ہوا تھا۔ پھر اس موقع پر کسی ایک بھی مسلمان کی جان ضائع نہ ہوئی تھی لیکن مجاعہ کی بیٹی سے شادی تو اس حال میں ہوئی کہ بارہ سو مسلمانوں کی لاشیں خاک و خون میں غلطاں میدانِ جنگ میں پڑی تھیں اور تمام قبائل عرب میں ایک ماتم برپا تھا۔ وہ بے حد حلیم الطبع ہونے کے باوجود اپنے غصے پر قابو نہ پا سکے۔ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک سخت خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے طبری کے قول کے مطابق خون ٹپکتا تھا۔ انہوں نے تحریر فرمایا: ''اے حضرت خالد بن ولید بن ولید! تمھیں کیا ہوا؟ تم عورتوں سے نکاح کرتے پھرتے ہو حالانکہ تمہارے خیمے کے سامنے بارہ سو مسلمانوں کا خون زمین پر پھیلا ہوا ہے جس کے خشک ہونے کی بھی نوبت نہیں آئی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خط سے بہت رنج ہوا۔ انہوں نے سر ہلا کر کہا ہو نہ ہو یہ سب کچھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی کارستانی ہے۔ لیکن یہ معاملہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خط اور اس پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اظہار افسوس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

یمامہ کی جنگ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مرتدین کی کمر توڑ ڈالی تھی اور اب ان کے لیے خاموشی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت اور دوبارہ قبول اسلام کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تھا۔ مہرہ، عمان اور یمن کی جنگیں، جو جنگ یمامہ کے بعد وقوع پذیر ہوئیں، جنگ یمامہ سے زیادہ خطرناک نہ تھیں۔ اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قدرے اطمینان کا سانس لینے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تھوڑا آرام کرنے کا موقع مل گیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مجاعہ کی بیٹی اور ام تمیم کو لے کر یمامہ کی ایک وادی میں وبر میں مقیم ہو گئے تا آنکہ انہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جانب سے عراق جا کر ایرانیوں سے لڑنے کا حکم ملا۔

⑩

بقیہ محارباتِ ارتداد

بحرین، عمان، مہرہ، یمن، کندہ اور حضرموت:

شمالی عرب کے منکرین زکوٰۃ اور مرتدین قبائل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج کشی کے نتیجے میں خلیفہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کر کے دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ان قبائل کی حدود عرب کے شمال مشرقی حصے سے شروع ہو کر انتہائی مشرق میں خلیج فارس تک اور وہاں سے نیچے اتر کر مکہ کے جنوب مشرق تک پھیلی ہوئی تھیں حالانکہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زمامِ حکومت سنبھالی تھی تو ان کا دائرہ اقتدار مدینہ، مکہ اور طائف کے درمیان ایک چھوٹے سے مثلث نما خطے تک محدود تھا۔

مدینہ کے شمالی علاقے کے قبائل کی بغاوت نے بنی اسد اور بنی حنیفہ کی طرح خطرناک رنگ اختیار نہ کیا اور دومۃ الجندل کے سوا باقی تمام علاقوں نے کسی خاص قسم کی جدوجہد کے بغیر آسانی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کر لی۔

دومۃ الجندل کا حاکم اس زمانے میں اکیدر کندی تھا۔ وہ بہ دستور اسلامی حکومت کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ آخر عراق کی فتوحات کے دوران میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے زیر کیا۔

جنوبی قبائل کا اصرارِ بغاوت:

جہاں تک جنوبی علاقے کا تعلق ہے۔ وہاں کے قبائل نے شمالی علاقے کے واقعات سے مطلق نصیحت حاصل نہ کی اور بہ دستور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ اور ارتداد پر جمے رہے۔ اسی سبب سے جنوبی قبائل اور مسلمانوں کے درمیان مدت دراز تک جدال و قتال کا سلسلہ جاری رہا۔

جنوبی علاقہ جو نصف عربی پر مشتمل ہے، خلیج فارس سے یمن کے شمال میں بحیرہ احمر تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں بحرین، عمان، مہرہ، حضرموت، کندہ اور یمن کے صوبے واقع ہیں۔ مشرقی علاقوں سے مغربی علاقوں تک آنے جانے کے لیے مذکورہ بالا تمام صوبوں سے گزرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ تمام صوبے خلیج فارس، خلیج عدن اور

بحیرہ احمر کے ساحلی علاقوں پر واقع ہیں اور یمن کے سوا باقی تمام کی چوڑائی بہت کم ہے۔ اتنی کم کہ ان کی حدود اور ساحل بحر کا فاصلہ چند میل کا ہے۔ عرب کا سارا جنوبی علاقہ، جو ان صوبوں کو گھیرے ہوئے ہے، ایک خوفناک لق و دق صحراء پر مشتمل ہے جسے عبور کرنا کسی صورت ممکن نہیں۔ اس صحراء کو دیکھ کر آج بھی اسی طرح دہشت طاری ہو جاتی ہے جس طرح پہلے زمانوں میں ہوتی تھی۔ اسے ربع الخالی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جنوبی عرب میں ایرانی اثر و نفوذ:

ان صوبوں کے محل وقوع پر ایک نظر ڈالنے سے صاف پتا چل جاتا ہے کہ ان میں ایرانی اثر و نفوذ بہت آسانی سے راہ پا سکتا تھا۔ شمالی اور جنوبی علاقوں کے مابین آمدرفت کا سلسلہ بے حد دشوار تھا کیونکہ درمیان کے ہولناک اور ویران صحراء کو قطع کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ حجاز سے عمان و بحرین تک پہنچنے اور عمان و بحرین سے حجاز تک جانے کے لیے طول طویل ساحلی علاقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ اس لحاظ سے بحرین، عمان، حضرموت اور یمن کے مشرقی و جنوبی صوبے حجاز کے شمالی علاقے سے تقریباً کٹ کر رہ گئے تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایرانی شہنشاہی نے ان علاقوں پر توجہ مبذول کی اور یہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

ہم یہاں پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ یمن بدھان کے اسلام قبول کرنے تک ایرانی عملداری میں شامل رہا۔ بدھان ابتداء میں کسریٰ کی جانب سے اس علاقے کا عامل تھا۔ اسلام لانے کے بعد محمد ﷺ نے اسے بدستور یہاں کا حاکم مقرر کیے رکھا۔ بحرین اور عمان بھی ایرانی عملداری میں شامل تھے اور کثیر التعداد ایرانیوں نے بحرین اور عمان میں سکونت اختیار کر کے انہیں اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اس وجہ سے ایرانی اقتدار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب کبھی سلطنت ایران کو عربوں کی جانب سے بغاوت کا خطرہ ہوتا اور عرب ان کے اثر و اقتدار کو زائل کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ان ایرانی نژاد لوگوں سے کام لے کر اس بغاوت کو فرو کر دیتی اور آزادی کی جدوجہد کو ناکام بنا دیتی یہی وجہ ہے کہ محمد ﷺ کے عہد میں عرب کے جن علاقوں کو سب سے آخر میں اسلام لانے کی توفیق ملی وہ عمان اور بحرین کے علاقے تھے۔ محمد ﷺ کی وفات کے بعد انہیں نے سب سے اول ارتداد اختیار کیا مگر جب سخت جنگوں کے بعد فتنہ ارتداد پاش پاش ہو گیا اور اہل عرب دوبارہ ایک دینی اور سیاسی وحدت پر جمع ہو گئے تو یہی لوگ تھے جو سخت مجبور ہو کر سب سے آخر میں اسلام لائے۔

ان علاقوں میں جنگہائے ارتداد کے زمانہ وقوع کے متعلق مؤرخین میں خاصا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جنگیں ۱۱ھ میں وقوع پذیر ہوئیں اور بعض کہتے ہیں کہ ۱۲ھ میں۔ پھر بھی یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ یہ جنگیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اوائل سے شروع ہوئیں اور اس وقت تک ختم نہ ہوئیں جب تک سارے عرب نے کاملاً ان کی اطاعت قبول نہ کر لی۔ ابتداء شمالی عرب سے ہوئی اور وہاں کے مرتدین کا قلع قمع ہونے کے بعد جنگوں کا رخ جنوبی علاقے کی طرف پھر گیا۔

جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ جنوبی علاقوں

میں سرگرمیوں کی ابتداء یا تو بحرین سے کرتے اور عمان، مہرہ، حضر موت کے علاقوں کو زیر کرتے ہوئے یمن تک پہنچ جاتے یا اپنی کارروائیاں یمن سے شروع کرتے اور حضر موت، مہرہ اور عمان کے لوگوں کی سرکوبی کرتے ہوئے ان کارروائیوں کا اختتام بحرین پر کرتے۔

جنگی کارروائی کا آغاز:

تمام حالات کے پیش نظر مسلمانوں نے بحرین سے جنگی کارروائی کا آغاز کرنا مناسب خیال کیا۔ کیونکہ اول تو بحرین یمامہ سے بالکل نزدیک تھا اور یمامہ میں عقرباء کے مقام پر وہ ابھی ابھی بنی حنیفہ کے مقابلے میں عظیم الشان فتح حاصل کر چکے تھے جس کی وجہ سے ان کی دھاک تمام قبائل عرب پر بیٹھ چکی تھی۔ دوسرے یمن کے مقابلے میں یہاں سے کارروائی کا آغاز کرنا نسبتاً سہل بھی تھا۔ اگر یہاں کامیابی حاصل ہو جاتی تو اس کا اثر دوسرے قبائل پر پڑنا لازم تھا۔

پھر بھی اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بحرین پر مسلمانوں کا تسلط کسی خاص کوشش کے بغیر ہو گیا تھا۔ بحرین اصل میں ہجر سے ملحق ایک تنگ ساحلی پٹی ہے۔ جو خلیج فارس کے کنارے سے قطیف سے عمان تک پھیلی ہوئی ہے۔ بعض جگہوں پر تو صحراء اس پٹی کو قطع کرتا ہوا خلیج تک پہنچ گیا ہے۔ شمال مغربی جانب سے وہ یمامہ سے ملحق ہے۔ یمامہ اور بحرین کے درمیان اونچے نیچے ٹیلوں کا ایک سلسلہ ہے جسے عبور کرنا چنداں دشوار نہیں۔ ربیعہ کے قبائل: بنی بکر اور بنی عبدالقیس کا قیام بحرین اور ہجر کے علاقوں میں تھا۔ ان علاقوں میں تاجروں کی ایک جماعت بھی مقیم تھی جو ہندوستان اور ایران سے آئے تھے اور دریائے فرات کے دہانے سے عدن کے ساحلی علاقے تک کے درمیانی خطے میں آباد ہو گئے تھے۔ ان تاجروں نے یہاں کے مقامی باشندوں سے سلسلہ ازدواج بھی قائم کر لیا تھا اور ان سے جو نسل پیدا ہوئی تھی اسے الابناء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بحرین کے علاقے کا ایک بادشاہ ایک عیسائی، منذر بن ساوی العبدی تھا۔ ۹ ھ میں جب محمد ﷺ نے اپنے قاصد علاء بن حضرمی کو اس کے پاس بھیجا تو یہ اسلام لے آیا جس پر محمد ﷺ نے اسے بدستور بحرین کا حاکم مقرر کیے رکھا۔ اسلام لانے کے بعد اس نے اپنی قوم کو بھی دین حقہ کی دعوت دینی شروع کی اور جارود بن معلی کو دینی تربیت حاصل کرنے کے لیے محمد ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔ جارود نے مدینہ پہنچ کر اسلامی تعلیمات اور احکام سے واقفیت حاصل کی اور اپنی قوم میں واپس جا کر لوگوں کو دین کی تبلیغ کرنے اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا کام شروع کر دیا۔

بحرین میں ارتداد کا آغاز:

جس مہینے محمد ﷺ نے وفات پائی اسی مہینے منذر بن ساوی کا بھی انتقال ہوا اور عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح بحرین والے بھی سب کے سب مرتد ہو گئے۔ محمد ﷺ کے ایلچی علاء حضرمی کو بحرین سے نکلنا پڑا لیکن جارود بن معلی عبدی بدستور اسلام پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنی قوم بنو عبدالقیس سے ارتداد کا سبب

پوچھا۔ انہوں نے کہا: "اگر محمد ﷺ نبی ہوتے تو کبھی وفات نہ پاتے۔"

جارود نے پوچھا: "تم جانتے ہو محمد ﷺ سے پہلے بھی اللہ اپنے انبیاء کو معبوث فرماتا رہا۔ وہ سب کے سب کہاں گئے؟"

انہوں نے جواب دیا: "فوت ہو گئے۔"

جارود نے کہا: "جس طرح دیگر انبیاء فوت ہو گئے اسی طرح محمد ﷺ بھی فوت ہو گئے۔ اگر دوسرے انبیاء کے فوت ہونے سے ان کی نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑا تو محمد ﷺ کے فوت ہونے سے آپ کی نبوت کس طرح زائل ہو سکتی ہے؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

جارود کی باتوں کا ان کی قوم پر بہت اثر ہوا اور وہ لوگ دوبارہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ بنو عبدالقیس کو اسلام لے آئے لیکن بحرین کے دوسرے قبائل حطم بن ضبیعہ کے زیر سرکردگی بہ دستور حالتِ ارتداد پر قائم رہے اور انہوں نے بادشاہی کو دوبارہ آلِ منذر میں منتقل کر کے منذر بن نعمان کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ سب سے پہلے انہوں نے جارود اور قبیلہ عبدالقیس کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں اس کوشش میں یکسر ناکامی ہوئی۔ اس پر حطم بن ضبیعہ نے طاقت کے زور سے انہیں زیر کرنا چاہا۔ اس نے قطیف اور ہجر میں مقیم غیر ملکی تاجروں اور ان لوگوں کو، جنہوں نے اس سے قبل اسلام قبول نہ کیا تھا، اپنے ساتھ ملا لیا اور قصبہ جواثی کے قریب جارود اور ان کے ساتھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ نہایت سخت تھا۔ بھوک اور پیاس کی وجہ سے بنو عبدالقیس جاں بہ لب ہو چکے تھے لیکن انہوں نے انتہائی ثابت قدمی دکھائی اور دوبارہ ارتداد اختیار کرنا قبول نہ کیا۔

علاء بن حضرمی کی روانگی:

بحرین سے ارتداد کی خبریں موصول ہونے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے علاء بن حضرمی کو مرتدین کے مقابلے کے لیے روانہ فرمایا۔ دریں اثناء حضرت خالد بن ولید، مسیلمہ اور اس کے پیروؤں کو عقرباء میں عبرت ناک شکست دے چکے تھے۔ اس لیے جب علاء یمامہ سے گزرے تو بنی حنیفہ کی ایک کثیر جمعیت ثمامہ بن آثال اور قیس بن عاصم منقری کے زیر سرکردگی ان کے ساتھ ہولی۔ اہل یمن اور بعض دیگر قبائل کے لوگ بھی کثیر تعداد میں ان کے لشکر میں شامل تھے جنھیں یقین تھا کہ مسلمان آخر سارے عرب پر قابض ہو جائیں گے اور ان کی مخالف طاقتوں کو لامحالہ زیر ہونا پڑے گا۔

ہر زمانے میں یہی ہوتا رہا ہے کہ لوگ قوت و طاقت ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ چنانچہ قیس بن عاصم جو اپنے قبیلے بنو تمیم کو لے کر علاء کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، اس سے پہلے منکرین زکوۃ کی صفِ اول میں شامل تھے۔ قبیلے کی زکوۃ انہوں نے مدینے بھیجنی بالکل بند کر دی تھی اور زکوۃ کا جمع شدہ مال لوگوں کو واپس

کر دیا تھا لیکن جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بنو حنیفہ کو زیر کر لیا اور ان کے سب کس بل نکال دیئے تو قیس کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ خاموشی سے مسلمانوں کے آگے سر اطاعت خم کر دیں۔ چنانچہ جب علاء بن حضرمی یمامہ سے گزرے تو موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے انہوں نے قبیلے سے زکوٰۃ دوبارہ اکٹھی کی اور اسے لے کر علاء سے مل گئے اور ان کے ساتھ ہی اہل بحرین سے جنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔

مرتدین بحرین کی شکست:

علاء بن حضرمی لشکر لے کر بحرین پہنچے اور حطم کے قریب خیمہ زن ہوئے۔ وہاں سے انہوں نے جارود کو، جو بنی عبد القیس کے ساتھ قلعہ بند تھے پیغام بھیجا کہ اسلامی لشکر آ پہنچا اس لیے گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں۔ خود انہوں نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ محاذ جنگ اور دشمنوں کا جائزہ لینے سے انہیں معلوم ہوا کہ مرتدین اس قدر بھاری تعداد میں ان کے مقابلے میں موجود ہیں کہ بے سوچے سمجھے ان پر حملہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے لشکر کے ارد گرد خندق کھدوائی اور اس کے پیچھے لشکر لے کر پڑاؤ ڈال دیا۔ کبھی کبھی وہ خندق عبور کر کے مرتدین پر حملہ کرتے اور تھوڑی دیر کی لڑائی کے بعد پھر خندق کے پیچھے ہٹ آتے۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ کسی فریق کو معلوم نہ تھا کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا۔ آخر ایک رات مسلمانوں کو مرتدین پر بھرپور حملہ کرنے کا موقع مل ہی گیا جس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے دشمن کو تہس نہس کر ڈالا۔

واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک رات لشکر گاہ مشرکین کی طرف سے سخت شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ علاء بن حضرمی نے اپنے جاسوسوں کو خبر لانے کے لیے دشمنوں کے کیمپ میں روانہ کیا۔ انہوں نے آ کر خبر دی کہ مشرکین کا لشکر شراب میں دھت ہے اور واہی تباہی بک رہا ہے۔ علاء نے موقع غنیمت جان کر فوج کو ہمراہ لیا اور خندق عبور کر کے دشمن کے لشکر میں داخل ہوتے ہی اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

دشمن نے کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ سیکڑوں لوگ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے خندق میں گر پڑے۔ بیسیوں لوگوں کو گھبراہٹ اور دہشت کی وجہ سے کہیں جائے فرار نہ ملتی تھی اور وہ اسی حالت میں قتل کر دیئے گئے۔ ہزاروں لوگوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ اسی ہنگامے کے دوران میں قیس بن عاصم نے حطم کو زمین پر گرا پایا۔ اس نے جھٹ تلوار نکال کر آن کی آن میں اس کا کام تمام کر دیا۔ عفیف بن منذر والغرور کو مسلمانوں نے زندہ گرفتار کر لیا۔ جب وہ علاء کے سامنے پیش کیا گیا تو علاء نے کہا: ''تمھیں تھے جنھوں نے ان لوگوں کو دھوکا دیا تھا؟''

عفیف بن مغرور نے کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیا اور کہا: ''میں دھوکا دینے والا نہیں البتہ اپنی طاقت پر ناز ضرور تھا۔'' یہ سن کر علاء نے اسے معاف کر دیا۔

دارین میں مفرورین کی پناہ:

جو لوگ قتل ہونے سے بچ گئے تھے انہوں نے کشتیوں میں سوار ہو کر جزیرہ دارین میں پناہ

لی۔علاء نے فی الحال ان سے تعرض نہ کیا بلکہ اپنی توجہ بحرین کے دوسرے علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے پر مبذول کی۔ جب سارے علاقے میں امن قائم ہو گیا، قبائل نے اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی اور علاء کے لشکر میں بھی معتد بہ اضافہ ہو گیا تو انہوں نے لشکر کو دارین پر حملہ کرنے کا حکم دیا تاکہ کسی مرتد کے لیے کوئی جائے فرار اور جائے پناہ باقی نہ رہے۔

دارین کی فتح:

دارین خلیج فارس کا ایک جزیرہ ہے جو بحرین کے بالمقابل چند میل کے فاصلے پر واقع ہے وہاں بعض عیسائی خاندان آباد تھے۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ علاء نے جب مسلمانوں کو اس جزیرے پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو ان کے پاس کشتیاں نہ تھیں جن پر وہ سوار ہو کر جزیرے تک پہنچتے۔ یہ دیکھ کر علاء کھڑے ہوئے اور کہا: ''اے لوگو! تمھیں اللہ نے خشکی میں اپنے نشانات دکھائے ہیں۔ کیا وہ سمندر میں اپنے نشانات نہیں دکھا سکتا؟ اس نے خشکی کے نشانات اسی لیے دکھائے ہیں کہ سمندر کی مہموں میں بھی تمہارے حوصلے قائم رہیں۔ اس لیے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور بے دھڑک سمندر میں کود پڑو، اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہوگا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمام مرتدین کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور تم آسانی سے ان پر غلبہ حاصل کر سکتے ہو۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور کمر ہمت کس کر سمندر کی موجوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' ''اے ہمارے سردار! ہم ہر وقت آپ کا حکم بجا لانے کے لیے تیار ہیں۔ جب ہولناک صحراء ہمیں مرعوب نہ کر سکے تو سمندر ہمارے آگے کیا چیز ہے۔''

چنانچہ لشکر نے تیاریاں شروع کر دیں۔ ساحل بحر پر پہنچ کر وہ گھوڑوں، گدھوں، خچروں، اونٹوں پر سوار ہوئے اور اللہ کا نام لے کر انہیں سمندر میں ڈال دیا۔ لیکن اللہ کی قدرت سے انہیں مطلق نقصان نہ پہنچا۔ ان کی سواریاں سمندر میں اس طرح جا رہی تھی جیسے خشکی پر سفر کر رہی ہوں۔ سمندر کا پانی اونٹوں کے صرف پاؤں تک تھا۔

ممکن ہے کہ اس وقت خلیج فارس میں جزر آیا ہوا ہو یا روایات میں مبالغہ ہو اور در حقیقت مسلمانوں کو مقامی باشندوں کے ذریعے سے کشتیاں دستیاب ہو گئی ہوں جن پر سوار ہو کر انہوں نے سمندر عبور کیا ہو (اگرچہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں) پھر بھی اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان دارین تک پہنچ ہی گئے اور مفرورین کا سخت مقابلہ کر کے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا۔ اس جنگ میں انہیں کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کی کثرت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سوار کے حصے میں چھ ہزار درہم اور پیدل کے حصے میں دو ہزار درہم آئے۔ (ایک روایت میں مذکور ہے کہ علاء نے اس موقع پر یہ جنگ نہیں کی اور یہ جزیرہ بہ دستور اسلامی سلطنت سے الگ تھلگ رہا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی فتح عمل میں آئی)۔

بحرین کو علاء کی واپسی:

دارین سے فراغت حاصل کر کے علاء بن حضرمی بحرین واپس پہنچے۔ لشکر کے چند لوگوں نے دارین

ہی میں رہنا پسند کیا، باقی علاء کے ساتھ ہو گئے۔ بحرین پہنچ کر انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں فتح کی خوش خبری بھیجی اور خود مزید احکام ملنے تک بحرین میں مقیم رہے۔ اب اگر انہیں خطرہ تھا تو بعض ان بدوی قبائل کی طرف سے جن کا پیشہ ہی لوٹ مار اور غارت گری تھا، یا ایرانیوں کی فریب کاریوں کا جن کے اثر و نفوذ کو مسلمانوں کی پیش قدمی کے نتیجے میں سخت دھچکا لگا تھا۔ پھر بھی وہ اس طرف سے بڑی حد تک مطمئن تھے کیونکہ دارین جانے سے پہلے ہی بحرین کے متعدد قبائل اور ابناء نے سچے دل سے ان کی اطاعت قبول کر کے اپنے آپ کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان لوگوں میں پیش پیش عتیبہ بن نہاس اور مثنیٰ بن حارثہ شیبانی تھے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے شکست خوردہ قبائل اور فسادی عنصر کو دوبارہ سر اٹھانے کی جرات نہ ہوئی۔

عراق کی جانب پیش قدمی:

مثنیٰ بن حارثہ نے تو ایرانی فریب کاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی اور اس غرض کے لیے خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر کے دریائے فرات کے دہانے تک پہنچ گئے۔ مثنیٰ کا عراق کی سرحد پر پہنچ کر دشمنانِ اسلام کی سرگرمیوں کی روک تھام کرنا اور اس علاقے میں تبلیغ اسلام کی جدوجہد کرنا عراق کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

عمان میں جنگ و جدل:

بحرین کے واقعات کے بعد اب ہم عمان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں ارتداد کا فتنہ دوسرے علاقوں کے فتنوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔

عمان محمد ﷺ کے عہد میں ایرانیوں کی عمل داری میں شامل تھا۔ ایرانیوں کی جانب سے یہاں جیفر نامی ایک شخص عامل مقرر تھا۔ محمد ﷺ نے اسلام کا پیغام اس تک پہنچانے کے لیے حضرت عمرو بن عاص کو اس کے پاس بھیجا۔ جیفر نے کہا مجھے اسلام لانے میں تو کوئی عذر نہیں لیکن یہ ڈر ضرور ہے کہ اگر میں نے یہاں سے زکوٰۃ اکٹھی کر کے مدینہ بھیجی تو میری قوم مجھ سے بگڑ جائے گی۔ اس پر حضرت عمرو بن عاص نے اسے پیش کش کی کہ اس علاقے سے زکوٰۃ کا جو مال وصول ہوگا وہ اسی علاقے کے غرباء پر خرچ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جیفر اسلام لے آیا۔ حضرت عمرو بن عاص نے بھی یہیں سکونت اختیار کر لی۔ محمد ﷺ کی وفات کے بعد جب اہل عمان نے بھی ارتداد اختیار کیا تو حضرت عمرو بن عاص مدینہ چلے آئے اور جیفر پہاڑوں میں بھاگ گیا۔

عمان میں فتنہ ارتداد کا بانی:

عمان میں فتنہ ارتداد کا بانی ذوالتاج لقیط بن مالک ازدی تھا جس نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حمیر کے ایک شخص حذیفہ بن حصن غلفانی کو عمان اور قبیلہ ازد کے ایک شخص عرفجہ بن

ہرثمہ البارقی کو مہرہ بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ سفر کریں اور جنگوں کا آغاز عمان سے کریں۔ جب عمان میں جنگ ہو تو حذیفہ قائد ہوں گے اور جب مہرہ میں جنگ پیش آئے تو عرفجہ سپہ سالاری کے فرائض انجام دیں گے۔

اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عکرمہ بن ابوجہل کو یمامہ میں فتنہ ارتداد کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا اور شرجیل بن حسنہ کو ان کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ لیکن عکرمہ نے شرجیل کا انتظار کیے بغیر مسیلمہ کی فوجوں پر حملہ کر دیا تاکہ فتح کا فخر تنہا ان ہی کے حصے میں آئے۔ لیکن مسیلمہ نے انہیں شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی جلد بازی پر ملامت کرتے ہوئے انہیں مدینہ آنے سے منع کر دیا اور حکم دیا کہ عمان جا کر باغیوں کے مقابلے میں حذیفہ اور عرفجہ کی مدد کریں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سرداروں کو بھی اس کی اطلاع دے دی اور حکم دیا کہ وہ کوئی کام عکرمہ سے مشورہ کیے بغیر نہ کریں۔ عکرمہ ان دونوں سرداروں کے پہنچنے سے پہلے ہی عمان پہنچ گئے۔ جب یہ تینوں قائد اکٹھے ہوئے تو باہم صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ جیفر اور اس کے بھائی عباد (کامل ابن اثیر میں جیفر کے بھائی کا نام عباد کے بجائے عیاذ لکھا ہے) کو جو پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں، لکھا جائے کہ وہ آ کر اسلامی لشکر سے مل جائیں۔

مسلمانوں کی کامیابی:

جب لقیط کو مسلمانوں کے آنے کا پتہ چلا تو وہ لشکر لے کر دبا میں خیمہ زن ہو گیا۔ ادھر جیفر اور عباد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑوں سے نکل کر پہلے صحار پہنچے اور وہاں سے چل کر اسلامی فوج سے آ کر مل گئے۔ دبا کے میدان کارزار میں دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ ابتدا میں لقیط کا پلہ بھاری تھا۔ مسلمان شدید اضطراب کی حالت میں تھے اور ان کی صفوں میں انتشار کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ قریب تھا کہ انہیں شکست ہو جاتی کہ اللہ کی نصرت بنو عبدالقیس اور بحرین کے دوسرے قبائل کی جانب سے بھاری کمک کی صورت میں نمودار ہوئی جس سے جنگ کا پانسا بالکل پلٹ گیا۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان کی قوت و طاقت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا اور وہ بڑھ چڑھ کر لقیط کی فوج پر حملے کرنے لگے۔ اس جنگ میں انہوں نے دشمن کے دس ہزار آدمی قتل کیے، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا اور کثیر مال غنیمت پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح عمان میں بھی ارتداد کے فتنے کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں کی حکومت پائیدار بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ جنگ کے بعد حذیفہ نے عمان ہی میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے حالات کی درستی اور امن و امان قائم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ عرفجہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خمس پیش کرنے کے لیے مدینہ چلے گئے اور عکرمہ اپنا لشکر لے کر بغاوت فرو کرنے اور اسلام کا علم دوبارہ بلند کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

مہرہ میں جنگ:

عکرمہ نے [illegible] عمان میں چھوڑا تھا اور خود مہرہ کی بغاوت

فرو کرنے اور ارتداد کا فتنہ مٹانے کی غرض سے بہ جانب عرب روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے ہمراہ مسلمانوں کی بھاری جمعیت تھی جو زیادہ تر ان قبائل کے لوگوں پر مشتمل تھی جو ارتداد سے تائب ہو کر دوبارہ اسلام کی آغوش میں آچکے تھے۔ مہرہ پہنچ کر انہیں دو جماعتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ ہر جماعت چاہتی تھی کہ ملک کا اقتدار اسی کے ہاتھ میں رہے اور دوسری جماعت اس کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کرے۔ یہ صورت حال دیکھ کر عکرمہ نے مناسب سمجھا کہ وہ کمزور جماعت کو ساتھ ملا کر اس کی مدد سے طاقت ور جماعت پر غلبہ حاصل کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور کمزور جماعت کے ساتھ گفت وشنید کا سلسلہ شروع کر کے اسے اسلام لانے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔

عکرمہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے اپنی فوج اور اہل مہرہ کے نومسلم لوگوں کو لے کر طاقت ور جماعت کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس موقع پر دبا سے بھی زیادہ گھمسان کا رن پڑا۔ جس میں انجام کار مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور انہیں کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔

عکرمہ نے فتح کی خوش خبری اور خمس ارسال کرنے کے علاوہ حلیف جماعت کے سردار کو بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا اور خود امن وامان بحال کرنے کی غرض سے کچھ عرصے کے لیے مہرہ ہی میں ٹھہر گئے۔ جب یہاں کے حالات کے متعلق انہیں کامل اطمینان ہو گیا تو خلیفۃ المسلمین کے احکام کے مطابق بھاری فوج کے ہمراہ جس میں دیگر قبائل کے علاوہ اہل مہرہ بھی شامل تھے۔ مہاجر بن ابی امیہ کی مدد کے لیے یمن کی جانب روانہ ہو گئے۔

یمن میں قیام امن کی مساعی:

عکرمہ ساحل کے ساتھ ساتھ مہرہ سے حضرموت اور کندہ کی جانب بڑھے۔ اس سفر میں انہیں کسی خاص دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ حضرموت مہرہ سے ملحق ہے۔ البتہ مہاجر بن ابی امیہ کو وہاں تک پہنچنے میں سخت مشکلات پیش آئیں کیونکہ انہیں شمال جانب سے یمن پہنچنا تھا۔ عکرمہ مہاجر سے ملنے کی خاطر تیزی سے سفر کرتے یمن پہنچے۔ یمن کی بغاوت کو مدت دراز گزر چکی تھی اور فتنے کے جراثیم نے سارا علاقہ سخت مسموم کر رکھا تھا۔ اس لیے اب کہ دوسرے علاقوں سے بغاوت اور فتنہ وفساد کے شعلے سرد کیے جا چکے تھے، ضروری تھا کہ یمن میں بھی امن وامان قائم کرنے کی سعی بلیغ کی جاتی تا کہ نہ صرف اس علاقے کی جانب سلطنت اسلامیہ کو اطمینان نصیب ہوتا بلکہ کندہ اور حضرموت کے بقیہ مرتدین کے استیصال میں بھی آسانی پیدا کی جاسکتی۔

یمن میں بغاوت کے اسباب:

صفحات ماقبل میں اسود عنسی کی بغاوت کا حال بالتفصیل بیان کیا گیا تھا کہ کس طرح اس نے نبوت کا دعویٰ کر کے صنعاء کی طرف کوچ کیا، کس طرح انتہائی سرعت سے مکہ اور طائف تک اس کا اثر جا پہنچا اور کس طرح اس کی بیوی آزاد کی سازش سے جو قبل ازیں صنعاء کے بادشاہ شہر بن باذان کی زوجیت میں تھی، عنسی

کیفر کردار کو پہنچا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عنسی کے قتل کی خبر مدینہ میں عین اس روز پہنچی جس روز محمد ﷺ کا وصال ہوا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیروز کو یمن کا حاکم مقرر فرمایا لیکن محمد ﷺ کی خبر وفات سن کر بغاوت کے شعلے ایک بار پھر زور وشور سے بھڑک اٹھے۔ مزید برآں کئی عوامل اس قسم کے پیدا ہو گئے جنھوں نے اس آگ کو بھڑکانے میں اور زیادہ مدد دی۔

شورش یمن کا پہلا سبب:

بغاوت کی آگ کو زیادہ بھڑکانے کا پہلا سبب یہ بنا کہ اس علاقے میں ایک متحدہ حکومت قائم کرنے کے بجائے اسے مختلف عمال کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ چنانچہ بازان کی وفات کے بعد یمن کی حکومت میں اس کے بیٹے شہر کے علاوہ دیگر عمال کو بھی شریک کر لیا گیا۔ شہر کو صنعاء کی ولایت سپرد کی گئی۔ اور دیگر عمال کو نجران اور ہمدان وغیرہ کی۔ اس صورت حال نے اسود عنسی کو بغاوت کرنے پر مزید جرأت دلائی۔ صرف یمن کا یہ حال نہ تھا بلکہ یمن کے شمالی علاقے میں بھی جو مکہ اور طائف تک پھیلتا چلا گیا تھا، سلطنت کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اسے مختلف عمال کے زیر حکومت دے دیا گیا، چنانچہ تہامہ کا وہ علاقہ جو ساحل بحر کے متوازی واقع تھا ایک حاکم کے ماتحت تھا اور اندرونی علاقہ دوسرے عمال کے ماتحت۔ اسود عنسی کا فتنہ فرو ہو جانے کے بعد ان عمال میں سے ہر ایک نے یہی چاہا کہ وہ اپنی جگہ واپس جا کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھالے اور اگر اس مقصد کے لیے لڑنا بھی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔

دوسری طرف اسود عنسی کے مددگاروں کو یہ صورت حال گوارا نہ تھی کہ جو علاقہ عنسی نے سخت کوشش اور جدوجہد کے بعد قبضے میں کیا تھا وہ دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا جائے۔ اس لیے انہوں نے بھی مسلمان حکام کو دوبارہ اپنے اپنے علاقوں پر مسلط ہونے سے روکنے اور اسود عنسی کی جگہ لینے کے لیے کاروائی شروع کر دی۔

تیسری جانب محمد ﷺ کی وفات کے بعد عرب میں ارتداد کا فتنہ وبا کی طرح پھوٹ پڑا تھا اور ہر قبیلے کی یہ کوشش تھی کہ وہ مسلمانوں کی اطاعت سے آزاد ہو کر اور اسلامی حکومت کا جوا گردن سے اتار کر خود مختاری حاصل کر لے۔ ان تمام اسباب نے مل کر یمن اور اس کے ملحقہ علاقے میں، جو اسودِ عنسی اور اس کے مددگاروں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا، شدید ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا۔

اسود کے بعد مددگاروں کی سرگرمیاں:

اسودِ عنسی کی موت کے بعد بھی اس کے مددگاروں کا جوش وخروش ٹھنڈا نہ ہو سکا تھا اور انہوں نے نجران اور صنعاء کے علاقے میں سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دی تھیں۔ حضرت عمرو بن معدی کرب نے جو شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کا بہادر بھی تھا، جس کی شجاعت اور جواں مردی کی دھاک سارے عرب پر بیٹھی ہوئی تھی اور جس نے عنسی کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ یہ موقع غنیمت جان کر مسلمانوں کے خلاف علم شورش

بلند کر دیا اور قیس بن عبد یغوث کو ساتھ ملا کر فیروز کو یمن سے نکال دیا، ساتھ ہی داذویہ کو بھی ملک بدر کر دیا۔ اس طرح یمن میں دوبارہ فتنہ برپا ہو گیا اور اس علاقے میں امن کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سب سے ضروری امر یہ تھا کہ مدینہ اور یمن کے درمیانی راستے میں امن و امان قائم کیا جائے۔ اس راستے پر، جو ساحل بحر کے ساتھ ساتھ چلا گیا تھا، عک اور اشعریین کے بعض قبائل آباد تھے۔ انہوں نے شورش پسندوں سے مل کر مسلمانوں کے لیے راستہ مسدود کر دیا۔ طائف اس راستے کے بالکل قریب واقع تھا۔ وہاں کے حاکم طاہر بن ابی ہالہ نے تمام واقعات کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی اور خود ایک لشکر جرار لے کر ان لوگوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہو گیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں مفسدین کو شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ ان کے بے شمار آدمی قتل ہوئے۔ مورخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ ان لاشوں سے سارا راستہ پٹ گیا اور آمدرفت معطل ہو کر رہ گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فتح کی خوش خبری پہنچنے سے پہلے ہی طاہر کو خط لکھ چکے تھے جس میں اسے ڈھارس دیتے ہوئے ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کی تلقین اور ہدایت کی گئی تھی کہ جب تک اس راستے میں، جس پر خبیث لوگ قابض ہیں، امن و امان قائم نہ ہو جائے اس وقت تک وہ علاب (اعلاب: مکہ اور ساحل بحر کے درمیان ایک مقام ہے جہاں بنو عک بن عدنان آباد تھے) میں مقیم رہے۔ اس روز سے قبیلہ عک کی فوجوں کا نام جموع الاخابث، اور اس راستے کا نام طریق الاخابث، پڑ گیا۔ بعد میں لمبے عرصے تک یہ نام عربوں میں رائج رہے۔

شورش و اضطراب کا دوسرا سبب:

یمن میں فتنے کے بھڑکنے اور اس میں شدت پیدا ہونے کا دوسرا بڑا سبب قومیت کا اختلاف تھا۔ شہر کے قتل ہونے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صنعاء میں فیروز کو حاکم مقرر فرمایا تھا۔ اسود کے قتل کی سازش میں فیروز کے ساتھ شہر کے دو وزیر، داذویہ اور خشبنس اور سپہ سالاری قیس بن عبد یغوث، شریک تھے۔ فیروز، داذویہ اور خشبنس فارسی الاصل تھے۔ لیکن قیس عربی النسل اور یمن اور کے قبیلہ حمیر سے تھا۔ اس لیے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیروز کو حاکم مقرر کیا تو قیس کو یہ بات بری لگی اور اس نے فیروز کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا۔

قیس کی فتنہ انگیزی:

لیکن جب قیس نے گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ فیروز کا قتل آسان کام نہیں کیونکہ اس صورت میں تمام ابناء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ابناء ان ایرانی النسل لوگوں کو کہا جاتا تھا جنھوں نے سلطنت ایران کے دور اقتدار میں یمن کو وطن بنا لیا تھا۔ یہاں انہوں نے بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا حتیٰ کہ حکومت میں بھی ان کا عمل دخل ہو گیا۔

ابناء کی طاقت و قوت کے پیش نظر قیس کے لیے ضروری تھا کہ وہ یمن کے تمام عربی قبائل کو ساتھ ملا کر وہاں کے ایرانی النسل باشندوں کا پوری طرح قلع قمع کرنے کی کوشش کرتا ورنہ اسے بھی ایسے ہی انجام

سے دو چار ہونا پڑتا جس سے اسود کو ہونا پڑا اور اسے بھی اپنی جان اسی طرح کھونی پڑتی جس طرح اسود کی جان گئی۔ چنانچہ اس نے ذوالکلاع حمیری اور یمن کے دوسرے عربی النسل سربرآوردہ اشخاص اور سرداروں کو لکھا کہ ابناء نے زبردستی تمہارے علاقے پر تسلط جما لیا ہے اور ناجائز طور پر ایران سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اگر تم نے ان کی طرف سے لاپروائی برتی تو عنقریب تم پر پورے طور سے غالب آجائیں گے۔ میری رائے ہے کہ ان کے سرداروں کو قتل کر کے انہیں ملک سے نکال دیا جائے۔ تم اس کام میں میری مدد کرو۔

قیس کے جواب میں ذوالکلاع اور اس کے ساتھیوں نے غیر جانب داری کی پالیسی اختیار کیے رکھی، نہ قیس سے مل کر ابناء کے خلاف کاروائی کی اور نہ ابناء کی مدد کر کے قیس کو زک پہنچانی چاہی۔ قیس کو انہوں نے کہلا بھیجا کہ ہم اس معاملے میں دخل دینے سے معذور ہیں۔ تم اپنے ساتھیوں سے مل کر جو مناسب سمجھو کرو۔ انہیں ابناء کے خلاف قیس کی مدد کرنے میں غالباً کوئی عذر نہ بھی ہوتا لیکن انہیں معلوم تھا کہ اس صورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یقیناً ابناء کی مدد کریں گے کیونکہ ابناء بہ دستور اسلام پر قائم اور مدینہ کی حکومت کے کامل فرنبردار تھے۔ اس صورت میں ان کے خلاف محاذ قائم کرنا اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں پھنسا لینے کے مترادف تھا جس کے متعلق کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ارتداد کی وبا پھیل جانے کے باعث یمن اسلامی فوجوں کی آماجگاہ بننے والا تھا اور اس سے پہلے مسلمان ہر میدان پر فتح یاب ہو چکے تھے۔

معاونین عنسی سے قیس کی استمداد:

ذوالکلاع اور اس کے ساتھیوں کے انکار کے باوجود قیس شکستہ خاطر نہ ہوا بلکہ اب اس نے خفیہ طور پر ان گروہوں سے خط و کتابت کرنی شروع کی جنھوں نے اسود عنسی کے خروج کے زمانے میں اس کی (عنسی کی) مدد کی تھی اور ابناء کو یمن سے نکالنے میں ان کی مدد کا طالب ہوا۔ وہ لوگ پہلے ہی سے چاہتے تھے کہ انہیں اس غیر ملکی عنصر سے نجات ملے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے قیس کا ساتھ دینا منظور کر لیا اور اسے لکھ دیا کہ ہم تمہاری مدد کے لیے جلد از جلد پہنچ رہے ہیں، مطمئن رہو۔

چونکہ یہ خط و کتابت انتہائی خفیہ تھی اور فوجوں کی نقل و حرکت میں بھی نہایت رازداری برتی گئی تھی اس لیے اہل صنعاء کو ان فوجوں کی اطلاع اس وقت تک نہ مل سکی جب تک وہ شہر کے بالکل قریب نہ پہنچ گئیں۔ جب ان فوجوں کے آنے کی خبر شہر میں پھیلی تو قیس فوراً فیروز کے پاس پہنچا اور اس پر یہ ظاہر کیا کہ اسے بھی یہ خبر ابھی ابھی اچانک ملی ہے۔ چہرے پر بھی اس نے گھبراہٹ اور سراسیمگی کی علامات پیدا کر لیں اور انتہائی مکاری سے کام لیتے ہوئے اس نے فیروز اور داذویہ سے موجودہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ مزید صلاح مشورے کے لیے فیروز، داذویہ اور جشنس کو اگلے روز صبح اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔

داذویہ کا قتل:

داذویہ حسب قرارداد اگلے روز قیس کے گھر پہنچ گیا۔اس کے دونوں ساتھی فیروز اور جشنس ابھی تک نہ آئے تھے۔جوں ہی داذویہ نے گھر میں قدم رکھا قیس نے تلوار کا ہاتھ مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔تھوڑی دیر بعد فیروز بھی آپہنچا مگر دروازے میں داخل ہوتے ہی اس نے سنا کہ اس کے ساتھیوں کے قتل کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔یہ سنتے ہی وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ بھاگا۔راستے میں اسے جشنس ملا۔یہ ماجرا معلوم ہونے پر وہ بھی اس کے ساتھ ہو گیا اور انہوں نے کسی ایسی جگہ کی تلاش شروع کی جہاں وہ دونوں پناہ لے سکیں۔قیس کے آدمیوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کا پیچھا کیا لیکن وہ انہیں نہ پا سکے اور ناکام واپس آگئے۔فیروز اور جشنس جبل خولان پہنچے جہاں فیروز کی ننھیال تھی لیکن انہیں اب تک یقین نہ تھا کہ وہ ہلاکت سے بچ گئے ہیں۔

صنعاء پر قیس کا تسلط:

قیس صنعاء پر قابض ہو گیا اور بڑے اطمینان سے وہاں حکومت کرنی شروع کر دی۔اسے یہ خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ اب کوئی شخص اس کے اقتدار کو چیلنج اور اسے حکومت سے محروم کر سکتا ہے۔اسے معلوم ہوا کہ فیروز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مدد طلب کرنے اور بنو خولان کو ساتھ ملا کر اس پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔یہ سن کر اس نے از راہ تمسخر کہا: "خولان کو دیکھو اور فیروز کو دیکھو۔اس احمق کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ خولان کی قوت و طاقت کتنی ہے جس کے بل بوتے پر وہ مجھ سے مقابلہ کرنے کا خواہش مند ہے۔"

قبیلہ حمیر کے عوام بھی قیس کے ساتھ مل گئے البتہ قبیلہ کے سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور گوشہ عزلت میں مقیم ہو گئے۔

ابناء سے قیس کا سلوک:

جب قیس کو اپنی قوت و طاقت کا پوری طرح اندازہ ہو گیا تو اس نے ابناء پر توجہ مبذول کی اور انہیں تین گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ سلوک روا رکھا۔جن لوگوں نے قیس کی اطاعت قبول کر لی اور فیروز کی طرف میلان ظاہر نہ کیا انہیں اس نے کچھ نہ کہا، وہ اور ان کے اہل وعیال بہ دستور اپنی اپنی جگہ مقیم رہے۔لیکن جو لوگ بھاگ کر فیروز کے پاس چلے گئے ان کے اہل وعیال کو اس نے دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ایک گروہ کو عدن بھیج دیا تاکہ وہ جہازوں میں سوار ہو کر اپنے وطن چلے جائیں اور دوسرے گروہ کو خشکی کے راستے خلیج فارس کی جانب روانہ کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے شہروں کو چلے جائیں اور ان میں سے کوئی یمن میں نہ رہے۔

قیس کی شکست:

فیروز کو اہل وطن پر جو کچھ بیتی اس کا سارا حال معلوم ہو گیا۔اس نے اپنی مدد کے لیے ان قبائل کو

ابھارنا شروع کیا جو بہ دستور اسلام پر قائم تھے اور اس طرح مذہبی عصبیت کے ذریعے سے وطنی عصبیت کا سدباب کرنا چاہا۔ بنو عقیل بن ربیعہ اور بنو عک نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ایک فوج مرتب کر کے قیس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ صنعاء سے کچھ دور قیس کی فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں قیس کو شکست ہوئی۔ فیروز نے دوبارہ صنعاء پر قبضہ کر لیا اور خلیفۃ المسلمین کی طرف سے دوبارہ وہاں کی امارت سنبھال لی۔

قیس اپنے ہزیمت خوردہ لشکر کے ساتھ بھاگ کر اسی جگہ جا پہنچا جہاں وہ اسود عنسی کے وقت موجود تھا۔ اس کی شکست سے اس قومی عصبیت کا خاتمہ ہو گیا جس کے بل بوتے پر اس نے اپنی دعوت کی بنیاد رکھی تھی۔

فیروز کی فتح اور تخت امارت پر اس کے دوبارہ متمکن ہونے سے بھی یمن میں متوقع امن قائم نہ ہو سکا۔ صنعاء میں تو بے شک فیروز کی حکومت قائم ہو گئی لیکن باقی یمن بہ دستور بغاوت کی آگ میں جل رہا تھا اور وہاں کے مرتدین مسلمانوں کے مقابلے میں جمے ہوئے تھے۔

یمن اور حجاز کی دیرینہ دشمنی:

اس جگہ ایک تیسرے سبب کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہے جس نے اس علاقے میں بغاوت کے شعلے بھڑکانے میں مدد دی اور وہ تھا یمن اور حجاز کا دیرینہ جذبہ عناد و مخاصمت۔ محمد ﷺ کے عہد میں حجازیوں کے ہاتھوں یمن کے بنی حمیر کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اگرچہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عکرمہ بن ابوجہل رضی اللہ عنہ کی فتوحات نے اہل یمن کے دلوں پر اثر ضرور کیا تھا اور وہ مسلمانوں سے دہشت زدہ ہو گئے تھے پھر بھی ان میں ابھی ایک بہادر شخص ایسا موجود تھا جس کی ہیبت سے بڑے بڑے بہادر کانپتے تھے اور وہ تھا عرب کا مشہور شہسوار اور بطل جلیل حضرت عمرو بن معدی کرب۔ یہ شخص قبیلہ بنو زبید سے تعلق رکھتا تھا اور اس پر اہل یمن کو بجا طور پر فخر تھا۔ بعد میں یہ شخص مسلمان ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی فتوحات کے دوران میں اس نے مسلمانوں کی جانب سے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا ذکر آج تک کتب تاریخ میں محفوظ چلا آتا ہے۔ باوجود پیرانہ سالی کے اس کی بہادری میں مطلق کمی نہ آئی۔ جنگ قادسیہ کے وقت اس کی عمر رضی اللہ عنہ سو سال سے بھی متجاوز تھی لیکن اس نے معرکے میں جوانوں سے بڑھ کر شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

حضرت عمرو بن معدی کرب کی بغاوت:

حضرت عمرو بن معدی کرب نے اپنی بہادری کے زعم میں اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور قیس بن عبد یغوث کو بھی ساتھ ملا لیا۔ یہ دونوں ہر قبیلے میں جاتے اور انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے نجران کے عیسائی باشندوں کے، جنھوں نے محمد ﷺ سے عہد مودت باندھا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی اپنے اسی معاہدے پر بہ دستور قائم رہے، باقی تمام قبائل نے حضرت عمرو بن معدی کرب کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

عکرمہ اور مہاجر یمن میں:

مسلمان اس صورت حال سے مطلق نہ گھبرائے۔ ایک طرف عکرمہ بن ابو جہل مہرہ سے یمن پہنچے اور اپنے لشکر کے ہمراہ مقام ابین میں فروکش ہوئے۔ دوسری جانب سے مہاجر بن ابی امیہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عطا کردہ علم کے ہمراہ مکہ اور طائف سے گزرتے ہوئے جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ بیماری کے باعث ان کی روانگی یمن میں چند ماہ کی تاخیر ہوگئی تھی۔ مکہ، طائف اور نجران سے سیکڑوں آزمودہ کار آنے کی اطلاع ہوئی اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاجر بن ابی امیہ نے راستے میں اپنے ایک مدمقابل قبیلے کو کلیتہً تہ تیغ کر دیا ہے تو انہیں یقین ہوگیا کہ ان کی یہ بغاوت خود انہیں کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔ اگر انہوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تو ہرگز تاب مقاومت نہ لاسکیں گے۔ سیکڑوں لوگ قتل ہوجائیں گے اور بقیۃ السیف کو مسلمان غلام بنا کر ساتھ لے جائیں گے۔

قیس اور حضرت عمرو میں پھوٹ:

ابھی اہل یمن اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ ان کے سرداروں، قیس اور حضرت عمرو بن معدی کرب، میں پھوٹ پڑ گئی اور اس امر کے باوجود کہ دونوں نے مہاجر سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ دونوں درپردہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔

قیس اور حضرت عمرو کی گرفتاری:

آخر حضرت عمرو بن معدی کرب نے مسلمانوں سے مل جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک رات اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ قیس کی فرودگاہ پر حملہ کیا اور اسے گرفتار کر کے مہاجر کے سامنے لے جا کر پیش کر دیا۔ مہاجر نے قیس ہی کو گرفتار کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ساتھ ہی حضرت عمرو بن معدی کو بھی گرفتار کر کے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا کہ وہ ان کے متعلق جو چاہیں فیصلہ صادر فرمائیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جانب سے معافی:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے داذویہ کے قصاص میں قیس کو قتل کرنا چاہا اور اس سے کہا: "اے قیس! تو اللہ کے بندوں اور بے گناہ لوگوں کو ناحق قتل کرتا ہے اور مومنین کو چھوڑ کر مرتدین و مشرکین کی پناہ امداد کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔"

قیس نے داذویہ کے قتل سے انکار کیا۔ چونکہ اس کے خلاف واضح شہادت مہیا نہ ہوسکی۔ (کیونکہ یہ قتل انتہائی رازداری سے اور لوگوں کی نظروں سے چھپا کر کیا گیا تھا) اس لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کو معاف کر دیا اور قصاص میں قتل نہ کیا۔

اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن معدی کرب کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا:

"تجھے شرم نہیں آتی۔ تجھے روزانہ ذلتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تو اپنے کرتوت سے باز نہیں آتا۔ اگر تو دین اسلام کی سربلندی کے لیے اپنے مساعی صرف کرتا تو اللہ بھی تجھے سربلند کر دیتا اور عزت بخشتا۔"

حضرت عمرو بن معدی کرب نے جواب دیا: "بے شک مجھ سے قصور ہوا۔ میں آپ سے اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ مجھ سے اس قسم کی حرکات سرزد نہ ہوں گی اور میں مملکت اسلامیہ کا نیک شہری بن کر زندگی بسر کروں گا۔"

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے بھی معاف کر دیا اور ان دونوں کو ان کے قبیلوں میں واپس بھجوا دیا۔

یمن میں امن و امان کا قیام:

ادھر مہاجر نجران سے چل کر صنعاء پہنچے اور اپنے لشکر کو ان سرکش گروہوں کی سرکوبی کا حکم دیا جو اسود عنسی کے زمانے سے اس خطہ ملک میں فتنہ فساد برپا کر کے ملک کے امن و امان کو غارت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو یہ ہدایت بھی دی کہ ان لوگوں میں سے وہ جس پر بھی قابو پائیں اسے بے دریغ قتل کر ڈالیں تاکہ فتنے کی جو کٹ سکے اور لوگوں میں دوبارہ فساد کے جراثیم نہ پھیل سکیں۔

عکرمہ نے اپنا قیام جنوبی یمن ہی میں رکھا اور وہاں قبائل نخع اور حمیر کی سرکوبی میں مصروف رہے۔ شمالی یمن کی طرف بڑھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

ان دونوں سرداروں کی پیہم مساعی سے سارے یمن میں کاملاً امن و امان قائم ہو گیا اور یہاں کے باشندوں نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ اب سارے جزیرہ عرب میں حضرموت اور کندہ کے سوا کسی جگہ مرتدین کا نام و نشان نہ رہا۔

ایرانیوں کی حمایت کا سبب:

یہاں ہم بعض ان لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یمن کے عربوں کے مقابلے میں ایرانیوں کی حمایت کیوں کی اور فیروز اور اس کے ساتھیوں نے کس مصلحت کے پیش نظر قیس کے مقابلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدد کی؟ اس شبہ کا جواب بہت آسان ہے۔

ساری دنیا کو معلوم ہے کہ اسلام عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک بڑائی کا معیار صرف ایک ہے اور وہ ہے تقویٰ۔ یمن میں ایرانی النسل لوگ سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور اسلام میں سبقت حاصل کرنے کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظر میں ان کی قدر و منزلت تھی۔ لیکن ان کے بالمقابل اس علاقے کے عرب باشندوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ زور شور سے بھڑکا رکھی تھی۔ محمد ﷺ کے عہد میں یہاں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اسود نے کچھ کم حصہ نہ لیا۔ حضرت عمرو بن معدی کرب اور قیس بن عبد یغوث اس آگ کو ہوا دینے میں پیش پیش تھے۔ لیکن باذان، شہر، فیروز اور دوسرے ایرانی النسل باشندے نہ صرف بہ دستور اسلام پر قائم رہے بلکہ اس خطہ زمین میں صرف وہی لوگ ایسے تھے کہ جب سارا

عرب بغاوت اور ارتداد کی آگ سے جل رہا تھا اور مرتدین اور باغیوں کی جرار فوجیں اسلامی فوجوں کے مقابلے میں آرہی تھیں تو انہوں نے کامل وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہر طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مدد کی اور اس فتنے کو فرو کرنے میں اسلامی فوجوں کے دوش بہ دوش حصہ لیا۔ اس صورت میں اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجوں اور سپہ سالاروں کے ذریعے سے فیروز کی مدد کی اور باغیوں پر فتح یاب ہونے کے بعد اسے دوبارہ صنعاء کا امیر مقرر فرمایا تو اس پر کسی اعتراض کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے؟ خود محمد ﷺ اس سے قبل شہر بن باذان کو سارے یمن کا حاکم مقرر فرما چکے تھے۔

کندہ اور حضر موت میں جدال وقتال:

ان حوادث وواقعات کے ذکر کے بعد اب ہمیں کندہ اور حضر موت کے حالات کا جائزہ لینا ہے جہاں کے باشندے بھی ارتداد اختیار کر چکے تھے اور جہاں مہاجر بن ابی امیہ اور عکرمہ کے زیر قیادت مرتدین سے آخری جنگیں پیش آئیں۔

محمد ﷺ نے اپنی وفات سے قبل زیاد بن لبید کو حضر موت، عکاشہ بن محصن کو سکاک اور سکون، اور مہاجر بن ابی امیہ کو کندہ کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ مہاجر بیماری کے باعث زمام کار سنبھالنے کے لیے کندہ روانہ نہ ہو سکے۔ ان کی غیر موجودگی میں زیاد بن لبید وہاں کے امور کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

مہاجر کی امارتِ کندہ کا واقعہ:

مہاجر کی امارت کندہ کا واقعہ بھی اک گونہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ مہاجر ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے اور جنگ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے۔ اس پر محمد ﷺ ان سے ناراض ہو گئے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بہت رنج ہوا۔ ایک دن وہ آپ ﷺ کا سر دھو رہی تھیں کہ باتوں باتوں میں انہوں نے آپ سے رقت آمیز لہجے میں اپنے بھائی کی سفارش کرتے ہوئے ناراضی دور کرنے کی درخواست کی۔ محمد ﷺ نے مہاجر کا قصور معاف کر کے انہیں کندہ کا امیر مقرر فرما دیا۔ ان کے وہاں پہنچنے تک زیاد بن لبید ان کی قائم مقامی کرتے رہے۔

اہل کندہ کا ارتداد:

کندہ یمن کے متصل واقع تھا۔ اسی لیے جونہی اسود عنسی نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا اہل کندہ نے بھی اہل یمن کی طرح اس کی دعوت پر لبیک کہنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر محمد ﷺ نے حکم دیا کہ حضر موت کے بعض صدقات اور اموال زکوٰۃ کندہ میں تقسیم کیے جائیں۔

زیاد نے زکوٰۃ کے حصول میں کچھ سختی برتی جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں میں ان کے خلاف جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ زیاد نے سکون کے ان لوگوں کے ذریعے سے، جو بہ دستور اسلام پر قائم تھے، کندہ کے شوریدہ سر عناصر کو مغلوب کرنا چاہا لیکن سکون کے کسی بھی شخص نے ان کا ساتھ نہ دیا اور کوئی بھی شخص اہل کندہ

کے مقابلے کے لیے نہ اٹھا۔

مسلمانوں سے اشعث کی جنگ:

محمد ﷺ کی وفات کے بعد جب عرب میں ارتداد کا فتنہ پھیلا اور اس کے شعلے حضر موت اور کندہ تک پہنچنے لگے تو زیاد نے اس فتنے کے جڑ پکڑنے سے پہلے ہی اس کی بیخ کنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ انہوں نے ان قبائل کو اپنے ساتھ ملایا جو بہ دستور اسلام پر قائم تھے اور غفلت کی حالت میں بنو حضرت عمرو بن معاویہ پر حملہ کر کے ان کے مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں کو غلام بنا لیا۔ قیدی عورتیں اور مال غنیمت لے کر وہ اس راستے سے واپس ہوئے جو اشعث بن قیس رئیس کندہ کے قبیلے کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ ان عورتوں میں بعض نہایت معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب یہ قافلہ اشعث کے قبیلے کے پاس سے گزرا تو انہوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا: "اے اشعث! تیری خالاؤں کی عزتیں خطرے میں ہیں۔ تیرا فرض ہے کہ انہیں ذلت و رسوائی سے بچائے۔" یہ فریاد سن کر اشعث کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے قسم کھالی کہ یا تو وہ ان عورتوں کو مسلمانوں کے پنجے سے چھڑا لے گا یا خود لڑ کر جان دے دے گا۔

اشعث بن قیس اپنی قوم کا محبوب اور بلند مرتبہ سردار تھا۔ محمد ﷺ کی زندگی کے آخری زمانے میں وہ آپ کی خدمت میں بنی کندہ کے ۸۰ آدمیوں کے ہمراہ مدینہ آیا جو سب کے سب قیمتی ریشمی لباس پہنے ہوئے تھے۔ محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اشعث نے اسلام قبول کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام فروہ کے لیے شادی کا پیغام دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ پیغام قبول کر لیا اور اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ عورتوں کی فریاد سن کر اشعث نے زبردست اثر و رسوخ سے فوراً ساری قوم کو اکٹھا کر لیا۔ وہ سب مسلمانوں سے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے اور اپنی عورتوں کو مسلمانوں کی قید سے چھڑا کر ہی دم لیا۔

کندہ کو عکرمہ و مہاجر کی روانگی:

اس دن سے اشعث نے کندہ اور حضر موت میں بغاوت کی آگ بھڑکانی شروع کی اور بیشتر قبائل کو ساتھ ملا لیا۔ یہ حال دیکھ کر زیاد بہت گھبرائے اور انہوں نے مہاجر بن ابی امیہ کو فوراً کندہ پہنچنے کے لیے لکھا۔ مہاجر اور عکرمہ اس وقت یمن کی بغاوت فرو کر چکے تھے اس لیے وہ دونوں فوراً زیاد کی مدد کو روانہ ہو گئے۔ مہاجر صنعاء سے روانہ ہوئے اور عکرمہ عدن سے۔ مأرب میں دونوں قائد مل گئے اور صہید کا ریگستان قطع کرتے ہوئے کندہ کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ مہاجر کو زیاد کی حالت کا بہ خوبی علم تھا۔ انہوں نے عکرمہ کو تو لشکر کے ساتھ چھوڑا اور خود ایک مختصر دستہ لے کر تیزی سے سفر کرتے ہوئے بہت قلیل عرصے میں زیاد کے پاس پہنچ گئے۔ جاتے ہی اشعث کی فوجوں پر حملہ کر کے اسے شکست فاش دی۔ اشعث بھاگ گیا اور اس نے اپنے لشکر کے دیگر مفرورین کے ہمراہ قلعہ بخیر میں پناہ لی۔

قلعہ بخیر کا محاصرہ:

بخیر ایک مضبوط قلعہ تھا اور اس پر حملہ کرنا آسان نہ تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے تین راستے تھے۔ ایک راستے پر تو زیاد نے قبضہ کرلیا۔ دوسرے راستے کی ناکہ بندی مہاجر نے کی۔ تیسرا راستہ کھلا تھا۔ اس کے ذریعے سے قلعے والوں کو سامانِ رسد اور فوجی مدد برابر پہنچتی رہتی تھی۔ آخر عکرمہ بھی اپنی فوج کے ہمراہ آپہنچے اور انہوں نے اس تیسرے راستے پر قبضہ کرلیا جس سے قلعے والوں تک مدد پہنچنی بند ہوگئی اور وہ مکمل طور پر محصور ہو کر رہ گئے۔ عکرمہ نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے شہسواروں کو کندہ سے ساحل تک پھیلا دیا اور حکم دے دیا کہ انہیں جو بھی باغی ملے اسے بے دریغ قتل کر ڈالیں۔ بخیر میں محصور لوگوں نے اپنی قوم کی تباہی آنکھوں سے دیکھ لی تھی۔ اب خود ان کے سامنے بھی موت گردش کر رہی تھی۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا: تمہاری موجودہ حالت سے موت بہرحال بہتر ہے۔ تم اپنی پیشانیوں کے بال کاٹ ڈالو اور اس طرح یہ ظاہر کرو کہ تم نے اپنی جانوں کو اللہ کے حضور پیش کر دیا ہے۔ شاید اس طرح اللہ تمہاری مدد کرے اور تمھیں مصیبت سے نجات دے۔ چنانچہ تمام لوگوں نے اپنی پیشانیوں کے بال کاٹ ڈالے اور عہد کیا کہ کوئی بھی شخص اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مقابلے میں راہ فرار اختیار نہ کرے گا۔

اپنے قبیلے سے اشعث کی بدعہدی:

صبح ہونے پر وہ لوگ تینوں راستوں سے باہر نکلے اور مسلمانوں سے جنگ شروع کر دی۔ ان لوگوں کی تعداد صرف چھ سو تھی۔ اس کے بالمقابل مہاجر اور عکرمہ کے لشکر کا شمار ہی نہ تھا۔ جب اہل بخیر نے دیکھا کہ مسلمان بھاری تعداد میں ان کے مقابلے کے لیے موجود ہیں تو انہیں یقین ہوگیا کہ وہ کسی صورت فتح حاصل نہیں کرسکتے۔ مایوسی نے ان پر غلبہ پالیا اور وہ زندگی سے بالکل ناامید ہوگئے۔ اس وقت ان کے سرداروں کو اپنی جانیں بچانے کی سوجھی۔ اشعث عکرمہ کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مہاجر سے کہہ کر اس کی اور اس کے نو ساتھیوں کی جان بخشی کرادیں۔ اس کے بدلے وہ قلعے کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دے گا۔

مہاجر نے اشعث کی درخواست منظور کرلی اور اسے ہدایت کی کہ وہ ان لوگوں کے نام جن کی وہ جان بخشی کرانا چاہتا ہے، ایک کاغذ پر لکھ کر ان کے حوالے کردے۔ اشعث نے اپنے اہل وعیال اور بھائیوں کے نام تو لکھ دیئے لیکن اپنا نام لکھنا بھول گیا اور اسی طرح وہ کاغذ پر مہر لگا کر مہاجر کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ان نو آدمیوں کو قلعہ سے نکال لیا اور اس کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دیئے۔ مسلمانوں نے قلعے میں داخل ہو کر ہر اس شخص کو قتل کر دیا جس نے لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ اور ان کی عورتوں کو، جن کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی، قیدی بنالیا۔ پھر اشعث کو ان پر نگران مقرر کرکے اموال خمس کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کردیا۔

زمانہ کے تصرفات بھی کس قدر عجیب ہوتے ہیں۔ اشعث جو محض اپنی جان بچانے کی خاطر بدترین بدعہدی اور خیانت کا مرتکب ہوا تھا اور جس نے اپنی قوم کو تلواروں کی دھاروں اور ایک ہزار عورتوں کو لونڈیاں بننے کے لیے مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا، وہی اشعث تھا جو بنی حضرت عمرو بن معاویہ کی عورتوں کی اس فریاد کی تاب نہ لا سکا تھا کہ اے اشعث! تیری خالاؤں کی عزتیں خطرے میں ہیں۔ یہ آواز سنتے ہی اس کا خون کھول اٹھا اور اس نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک ان میں سے ایک ایک عورت کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑا نہ لیا۔ پھر یہی اشعث تھا کہ جب محمد ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو اس کی وجاہت اور اپنی قوم میں ہر دلعزیزی کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہ کیا تھا۔ لیکن جب اس سے یہ شرمناک فعل صادر ہوا تو مسلمان تو علیحدہ رہے خود اس کی قیدی عورتوں نے اس پر لعنت بھیجی اور اس کا نام عرب النار رکھ دیا جس کے معنی یمنی زبان میں غدار کے ہیں۔ لیکن جب موت کا خوف کسی شخص کو لاحق ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بچاؤ کی غرض سے ہر قسم کی ذلت برداشت کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور محض اپنی جان کی سلامتی کی خاطر ذلیل ہتھکنڈے اختیار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اشعث کی روانگی مدینہ:

مہاجر نے ان لوگوں کو جن کے نام اشعث نے کاغذ پر لکھے تھے بلایا اور انہیں رہا کر دیا۔ لیکن اشعث کا اپنا نام چونکہ اس فہرست میں نہ تھا جو خود اس نے مہر لگا کر مہاجر کے حوالے کی تھی اس لیے مہاجر نے اسے قتل کرنا چاہا اور کہا: ''اللہ کا شکر ہے جس نے تیرے دل پر پردے ڈال دیئے اور تو اپنا نام فہرست میں لکھوانا بھول گیا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ اللہ تجھے ذلیل کرے۔ اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

لیکن عکرمہ نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا: آپ اسے قتل نہ کریں بلکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیں۔ وہ اس کے متعلق جو فیصلہ چاہیں گے صادر فرمائیں گے۔ اگر یہ شخص اپنا نام لکھنا بھول گیا ہے تو اسے اپنا عذر خلیفہ کے سامنے پیش کرنے دیں۔

مہاجر کو یہ بات ناگوار تو بہت گزاری پھر بھی انہوں نے عکرمہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے دوسرے قیدیوں کے ہمراہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا۔ لیکن اشعث کا جینا مرنے سے بدتر تھا کیونکہ راستہ بھر اس کی قوم کے قیدی اور مسلمان محافظ اس پر پھٹکار ڈالتے رہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اشعث کو معافی:

مدینہ پہنچنے پر اشعث کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حضور پیش کیا گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اشعث سے پوچھا: ''تیرا کیا خیال ہے۔ میں تجھ سے کیا برتاؤ کروں گا؟''

اشعث نے جواب دیا: ''مجھے آپ کے ارادے کا علم کیا ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں معافی کا خواستگار اور رحم کا امیدوار ہوں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میرا ارادہ تو تجھے قتل کرنے کا ہے۔“

اشعث نے کہا: ”میں وہی ہوں جس نے قلعے کے دروازے مسلمانوں کے کے لیے کھولے تھے۔ کیا اس کے باوجود مجھے قتل کر دیا جائے گا؟“

بات طول پکڑ گئی۔ آخر اشعث نے محسوس کیا کہ واقعی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ارادہ قتل کرنے کا ہے اس پر اس نے ان سے کہا: ”میں آپ سے عاجزانہ التماس کرتا ہوں کہ مجھ پر رحم فرمائیں۔ میری قوم کی قیدی عورتوں کو چھوڑ دیں۔ میری لغزش سے درگزر فرمائیں۔ میرا اسلام قبول فرمائیں اور مجھ سے وہی سلوک کریں جو مجھ جیسی شخصیت رکھنے والے اشخاص سے آپ کرتے ہیں۔ میری بیوی بھی، جو آپ کی صاحبزادی ہیں، مجھے واپس دے دیں۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے درخواست کو منظور کرنے میں کچھ تردد کیا۔ اس پر اشعث نے پھر عاجزانہ التجا کرتے ہوئے کہا: ”آپ مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں آئندہ سچے دل سے اسلام پر قائم رہوں گا اور آپ مجھے بہترین مسلمان پائیں گے۔“

بہت کچھ غور و فکر کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی جان بخشی کرنے کا فیصلہ کیا، اپنی بیٹی کو دوبارہ اس کے عقد میں دے دیا اور فرمایا: ”اپنے قبیلے میں واپس چلے جاؤ۔ امید ہے کہ آئندہ مجھے تمہارے متعلق کوئی شکایت موصول نہ ہوگی۔“

لیکن اپنی قوم سے بدعہدی کرنے کے باعث اشعث اپنے قبیلے میں واپس جانے کی جرأت نہ کر سکا اور قید سے چھوٹنے کے بعد ام فروہ کے ساتھ مدینہ ہی میں قیام پذیر رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب عراق اور شام کی جنگیں پیش آئیں تو وہ بھی اسلامی فوجوں کے ہمراہ ایرانیوں اور رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے باہر نکلا اور کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اس کا وقار پھر بلند ہو گیا اور اس کی گم گشتہ عزت اسے پھر واپس مل گئی۔

حضر موت اور کندہ میں امن:

مہاجر اور عکرمہ اس وقت تک حضر موت اور کندہ میں مقیم رہے جب تک وہاں پوری طرح امن و امان قائم نہ ہو گیا اور اسلامی حکومت کی بنیاد مستحکم نہ ہو گئی۔

مرتدین کے ساتھ یہ آخری جنگیں تھیں۔ ان کے بعد عرب سے بغاوت کا خاتمہ ہو گیا اور تمام قبائل کامل طور پر اسلامی حکومت کے زیر نگیں آ گئے۔

مہاجر نے اس علاقے میں امن و امان قائم رکھنے اور بغاوت و سرکشی کے اسباب کو پوری طرح مٹانے کے لیے اسی سختی سے کام لیا جس سختی سے وہ یمن میں کام لے چکے تھے۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعے کا ذکر کرنا کافی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مہاجر باغیوں اور مسلمانوں کے مخالفوں کے ساتھ کیسی سختی سے پیش

آتے تھے۔ کندہ میں دو گانے والیاں تھیں۔ ایک مغنیہ اپنے اشعار میں محمد ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی، اور دوسری مغنیہ مسلمانوں کی ہجو کرتی تھی۔ مہاجر نے دونوں گانے والیوں کے ہاتھ کاٹ دیئے اور اگلے دو دانت نکلوا دیے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے مہاجر کو خط لکھا جس میں ان کی غلطیاں واضح کیں۔ انہوں نے لکھا کہ جو مغنیہ محمد ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی اسے قتل کرنا مناسب تھا کیونکہ شتمِ انبیاء کی سزا دوسری سزاؤں سے مشابہ نہیں ہو سکتی۔ دوسری مغنیہ جو مسلمانوں کی ہجو کیا کرتی تھی، اگر وہ ذمی تھی تو اس سے درگزر کرنا مناسب تھا۔ آدمیوں کا مثلہ کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ سخت گناہ ہے اور قصاص کے سوا کسی صورت میں جائز نہیں۔ ان دو گانے والیوں سے مہاجر نے جو برتاؤ کیا اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے سرکش اور باغی لوگوں سے انہوں نے کس قسم کا سلوک کیا ہوگا اور کس سختی سے ان کے ساتھ پیش آئے ہوں گے۔

مہاجر کی امارتِ یمن:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مہاجر کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ حضرموت اور یمن کی امارت میں سے جسے چاہیں اختیار کر لیں۔ انہوں نے یمن کی امارت پسند کی اور صنعاء چلے گئے جہاں فیروز سے مل کر کاروبارِ حکومت چلانا شروع کر دیا۔ زیاد بن لبید بہ دستور حضرموت کے حاکم رہے۔

بنتِ نعمان سے عکرمہ کی شادی:

عکرمہ نے مدینہ لوٹنے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن ان کے ہمراہ نعمان بن الجون کی بیٹی بھی تھی جس سے انہوں نے میدان جنگ میں شادی کر لی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ام تمیم اور مجاعہ کی بیٹی سے شادی کر لینے کے باعث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر سخت ناراض ہوئے تھے لیکن انہوں نے مطلق پروانہ کی اور بنت نعمان سے شادی کر ہی لی۔ اس واقعے سے ناراض ہو کر عکرمہ کی فوج کے بعض لوگوں نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔

یہ معاملہ مہاجر کے سامنے پیش کیا گیا لیکن وہ بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور تمام حالات حضرت ابوبکر ر کی خدمت میں لکھ کر ان کی رائے دریافت کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لکھ بھیجا کہ ان کی رائے میں عکرمہ نے شادی کر کے کوئی نامناسب کام نہیں کیا۔ اصل میں واقعہ یہ تھا کہ نعمان بن الجون نے محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی تھی کہ آپ اس کی بیٹی کو اپنے عقد زوجیت میں لے لیں لیکن آپ نے انکار فرما دیا اور اس کی بیٹی کو اس کے والد کے ساتھ عدن واپس روانہ کر دیا۔ چونکہ محمد ﷺ اس لڑکی کو رد فرما چکے تھے۔ اس لیے عکرمہ کی فوج کے ایک حصے کا خیال تھا کہ آپ کے اسوہ مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے عکرمہ کو بھی اس سے شادی نہ کرنی چاہیے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ استدلال تسلیم نہ کیا اور عکرمہ کی شادی کو جائز قرار دیا۔ عکرمہ اپنی بیوی کے ہمراہ مدینہ آگئے اور لشکر کا وہ حصہ بھی، جو اس شادی کی وجہ سے ناراض ہو کر ان سے علیحدہ ہو گیا تھا، دوبارہ ان سے آملا۔

عرب کی بغاوتوں کا اختتام:

اب عرب کی تمام بغاوتیں فرو ہو چکی تھیں۔ مرتدین کا قلع قمع کیا جا چکا تھا۔ اللہ نے اپنے دین کو عزت دے کر اسے غلبہ عطا فرما دیا تھا اور اسلامی حکومت کی بنیادیں اقصائے عرب میں مضبوطی سے قائم ہو چکی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اسلام کے غلبے سے بے حد مسرت تھی لیکن اس مسرت میں غرور اور فخر و تکبر کا شائبہ تک نہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کے فضل اور اس کی مہربانی سے ہوا۔ ان کی یہ طاقت نہ تھی کہ وہ گنے چنے مسلمانوں کے ذریعے سے سارے عرب کے مرتدین کی جرار فوجوں کا مقابلہ کر سکتے اور انہیں شکست دے کر اسلام کا علم نہایت شان سے دوبارہ بلند کر سکتے۔

آئندہ اقدام:

اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ دین کی وحدت کو تقویت دینے اور اسلام کو عروج تک پہنچانے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیاست کا محور صرف اعلائے کلمۃ الحق تھا۔ یہی خواہش تھی جو ہر آن ان کے دماغ میں گردش کرتی رہتی تھی۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے انتہائی بے سروسامانی کے باوجود مرتدین کے عظیم الشان لشکروں سے جنگیں لڑیں اور یہی جذبہ تھا جو عراق اور شام کی لڑائیوں میں کارفرما رہا۔

(۱۱)

اسلامی فتوحات کی ابتداء

عرب کی شمالی حدود:

جزیرہ عرب کا وہ حصہ، جو ایک طرف خلیج عقبہ اور دوسری طرف خلیج فارس سے شروع ہو کر بجانب شمال پھیلتا جاتا ہے، اہل عرب کے لیے ہمیشہ ہی سے پرکشش بنا رہا ہے۔ خلیج عقبہ کا شمال مشرقی حصہ شام سے اور خلیج فارس کا شمال مغربی حصہ عراق سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دونوں خلیجوں کے درمیانی علاقے میں پہاڑوں کا ایک سلسلہ واقع ہے جو صحرائے نفوذ (صحرائے سماوہ کا جدید نام) اور دشت شام کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ جوف کے علاقہ میں دومۃ الجندل وہ مقام ہے جہاں قدیم زمانے میں شام، عراق اور عرب کی سرحدیں ملتی تھیں۔

اہل شام نسلاً فنیقی تھے اور عراق کے قدیم باشندے اشوری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ شام اور عراق کے درمیان دشت شام واقع تھا جس نے دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا۔ خوفناک صحراؤں کو عبور کر کے دوسرے علاقوں میں جانا شہری باشندوں کے نزدیک جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ وہ ان گوناگوں خطرات میں پڑنا نہ چاہتے تھے۔ جو صحراؤں میں بالعموم پیش آتے رہتے ہیں۔ علاوہ بریں صحراؤں میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو ان کے لیے کسی قسم کی کشش کا باعث ہو۔ آج بھی جب ذرائع رسل و رسائل میں بے حد ترقی ہو چکی ہے وہاں کے لوگ موٹر میں بیٹھ کر بھی اس صحرا کو عبور کرنے سے گھبراتے ہیں اور عراق و شام کے درمیان ہوائی جہاز سے سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

صحرائے شام کی جانب نقل مکان:

اس صحرا نے، جس کی طرف قدیم زمانے میں نہ شام کے فنیقی باشندے متوجہ ہو سکے اور نہ عراق کے اشوری، عرب کے بادیہ نشین لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کیونکہ صحراؤں اور میدانوں میں حضرت عمریں گزارنے کے باعث ان کی سرشت ہی اسی قسم کی ہو گئی تھی کہ دنیا بھر کی خوب صورتی اور دلکشی انہیں صحرا میں نظر آتی تھی۔

شہری زندگی کو اس کے تمام لوازم کے باوصف وہ قید تصور کرتے تھے۔ مورخین ذکر کرتے ہیں کہ شمالی جانب عربوں کی نقل وحرکت سب سے پہلے اس وقت شروع ہوئی جب یمن میں واقع مشہور سد مآرب کے ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ بعد میں جب اس خدشے نے یقین کی صورت اختیار کر لی تو ازدی قبائل نے یمن سے نقل وطن شروع کر دیا اور بہ جانب شمال حجاز اور شام میں جا کر آباد ہو گئے۔

عربوں کی شمالی جانب منتقل ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ رومیوں نے تجارت کے لیے خشکی کا راستہ ترک کر کے سمندری راستہ اختیار کر لیا تھا جس کے باعث جنوبی عرب میں بسنے والے لوگوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بھی بہتر طریق پر زندگی گزارنے کے لیے یمن سے حجاز اور شام چلے گئے۔ مورخین کے نزدیک ترکِ وطن کا یہ سلسلہ دوسری صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ اگر یہ خیال درست سمجھ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ عرب قبائل نے مدت دراز سے صحرائے شام میں آباد ہونا شروع کر دیا تھا اور وہ نہ صرف باقاعدہ ٹولیوں کی صورت میں وہاں سکونت پذیر ہونے لگے بلکہ لوٹ مار اور تجارت کی غرض سے عربوں کے جو قافلے شام اور عراق جاتے تھے ان میں سے بھی اکثر لوگ وطن واپس جانے کے بجائے وہیں آباد ہو جاتے تھے۔

شام اور عراق میں جا کر بسنے والے عربوں کا قیام گو شہروں کے بجائے صحرائی علاقوں میں تھا پھر بھی انہوں نے سکونت کے لیے جن خطوں کو پسند کیا تھا وہ شہری آبادی کے قریب واقع تھے۔ اس کی وجہ محض جذباتی تھی نہ یہ کہ ملکی حالات انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ بدوی ہونے کے باعث فطرتاً صحرائی زندگی کے دلدادہ تھے اور اسے کسی طرح چھوڑ نہ کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ضروریاتِ زندگی انہیں مجبور کرتی تھیں کہ وہ شہری آبادی کے قریب رہیں تاکہ آسانی سے انہیں حاصل کر سکیں۔ یہ ہر زمانے میں بدوی لوگوں کا یہی حال رہا ہے۔ آج بھی مصر کے قریب، شام کے قریب اور عراق میں بسنے والے بدو شہروں اور صحراؤں کے درمیان ایسی جگہوں پر آباد ہیں جہاں وہ صحرا کے قدرتی اور دلکش نظاروں سے بھی لطف اندوز ہو سکیں اور روزی کے وسائل تلاش کرنے کے لیے شہروں تک پہنچنے میں بھی انہیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

قبائل عرب کی شمالی حدود میں جوق در جوق جا کر آباد ہونے سے شام بھی گویا عرب کا ایک حصہ بن گیا۔ ان قبائل میں سب سے طاقت ور قبیلہ غسانیوں کا تھا۔ اس قبیلے نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر شام کی سرحد پر ایک سلطنت قائم کر لی۔ بنی غسان کی طرح لخمیوں نے بھی دریائے فرات کے ساحل پر مملکت حیرہ کے نام سے حکومت قائم کر رکھی تھی۔

صحرائے عرب میں بسنے والے ان کے ہم وطنوں کے ابتداء سے جو عادات و اطوار چلے آ رہے تھے، شام اور عراق میں بسنے والے عربوں نے ان میں مطلق کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ عربوں کا یہ خاصہ تھا کہ جس ملک میں اقامت پذیر ہوتے تھے وہاں کے باشندوں سے تمام معاملات میں گہرے اشتراک سے کام لیتے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شام میں رومی حکومت اور عراق میں ایرانی سلطنت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ چونکہ

اطاعت وفرمانبرداری کا یہ جذبہ محض تعاون کی پالیسی کے تحت تھا اور اس میں کسی حاکم کے تسلط کا سوال نہ تھا اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا عرب ایک غیر قوم کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے بھی شخصی آزادی اور خودمختاری پر حرف نہ آنے دیتے تھے اور اگر کسی جگہ ان کی شخصی آزادی کو ذرا سا بھی خطرہ لاحق ہوتا تھا تو وہ بڑی شدت سے اس کی مدافعت کرتے تھے۔

یہ امر تعجب خیز ہے کہ بدوی لوگ صحرائی زندگی کے عادی ہونے اور دشت نوردی میں مشغول ہونے کے باوجود شہری زندگی کے بھی بے حد دلدادہ تھے، چنانچہ جب وہ صحراء سے دور ہوتے تھے تو دن رات اس کی تعریف وتوصیف کے گیت گایا کرتے تھے، لیکن شہری زندگی میں جو سہولتیں اور راحت وآرام کے جو وافر اسباب میسر تھے انہیں بھی وہ ہمیشہ رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ شام کے دل کش مرغزاروں اور پرفضا باغات، تاکستانوں اور وہاں کی حسین وجمیل عورتوں کے تذکرے مکہ ومدینہ اور سارے حجاز میں بکثرت لوگوں کی زبانوں پر رہتے تھے جب کبھی کوئی قافلہ شام کے تجارتی سفر سے واپس آتا تو اہل سفر اپنے ہم جلیسوں، دوستوں اور رشتہ داروں اور واقف کاروں سے وہاں کے حالات بالتفصیل بیان کرتے۔ بعد میں مختلف راویوں کے ذریعے سے یہ باتیں دور دراز کے قبائل تک پہنچ جاتیں۔ جب کبھی وہاں کے مرغزاروں اور حسین وجمیل وادیوں کا ذکر آتا تو تعجب کے مارے سامعین کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگتے جو ان سے یہ حالات بیان کر رہا ہوتا تھا اور بے اختیار ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش! انہیں بھی اپنے ملک میں آسائشیں اور نعمتیں میسر ہوتیں اور وہ بھی ان دل کش مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے۔

عرب طرز معیشت سے وابستگی:

عراق اور شام میں آباد ہونے والے عربی قبائل کا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ انہیں مرفہ الحالی اور شہری آسائشوں سے حصہ وافر ملا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ سب کے سب عربی بودوباش کے دلدادہ تھے۔ کیونکہ عربی النسل ہونے کے علاوہ جزیرہ عرب سے ان کے صدیوں کے تعلقات قائم تھے۔ ان حالات کے بیان کرنے سے میری غرض عراق اور شام کے عربوں کے متعلق کوئی تفصیلی مقالہ لکھنا نہیں بلکہ بعض ان اسرار ورموز کو آشکارا کرنا ہے جو لخمیوں اور غسانیوں کے ذریعے سے عربی فتوحات اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی سلطنت کی تشکیل کا باعث بنے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جنوب سے شمال کی جانب عربوں کا نقل مکان سد مآرب کے انہدام اور رومی تجارتی راستوں کا رخ خشکی کے بجائے سمندر کی طرف تبدیل ہونے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ ان ہر دو واقعات کو عربوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پھر بھی نقل مکانی کا یہ سلسلہ ان واقعات سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ عربوں کے اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ قدیم زمانے سے گہرے تعلقات قائم تھے

کیونکہ مشرق اقصیٰ کی تجارت ساری انہیں کے ہاتھ میں تھی اور وہ تجارت کے سلسلے میں اکثر شام، مصر اور روم وغیرہ ممالک میں جاتے رہتے تھے۔ حضر موت سے تجارتی قافلے دو راستوں سے شام جایا کرتے تھے۔ ایک راستہ بحرین اور خلیج فارس سے ہوتے ہوئے شام جاتا تھا دوسرا راستہ یمن اور حجاز سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ مکہ موخر الذکر راستے کے وسط میں پڑتا تھا۔

اس تجارتی سلسلے کا آغاز سب سے پہلے عرب کے جنوبی علاقوں یعنی حضر موت، یمن، عمان اور بحرین کے لوگوں نے کیا کیونکہ وہ سرسبز و شاداب علاقوں کے مالک ہونے اور ایرانیوں سے گہرے تعلقات رکھنے کی وجہ سے شمالی علاقوں کی نسبت زیادہ مہذب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عراق اور شام کی طرف جن لوگوں نے نقل مکانی کی اور وہاں جا کر آباد ہوئے ان میں زیادہ تر جنوبی قبائل کے لوگ تھے۔ غسانی جنھوں نے مشرقی شام میں اپنی مملکت قائم کر رکھی تھی، عمان کے ایک قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح قضاعہ، تنوخ اور کلب کے قبائل، جو شام کی حدود پر آباد تھے، یمن کے مشہور قبیلے حمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی حال عراق میں بھی تھا۔ عراق کی سرحد پر جو عربی قبائل آباد تھے وہ زیادہ تر حضر موت سے آئے ہوئے تھے۔

ان قبائل نے ابتدائی زمانوں میں صحرائے شام کی طرف نقل وطن کیا تھا اور عراق و شام کی سرحدوں پر اپنی نیم مختار سلطنتیں قائم کر لی تھیں۔ سد مآرب کے ٹوٹنے اور تجارت کے صحرائی اور سمندری راستوں میں منقسم ہونے کے باعث جنوبی علاقوں کے بعض قبائل حجاز میں جا کر آباد ہو گئے۔ پھر ان قبائل میں سے بعض نے روزی کے بہتر وسیلے تلاش کرنے اور صحرائی زندگی سے اکتا کر شہری زندگی کا لطف اٹھانے کی خاطر شام کا رخ کیا۔

ایرانیوں سے رومیوں سے تعلقات کی نوعیت:

عراق اور شام اس زمانے میں ایرانی اور رومی سلطنتوں کے درمیان پس رہے تھے۔ کبھی ایرانی شام پر چڑھائی کر کے اسے رومیوں سے چھین لیتے اور عراق سے ملحق کر کے اسے اپنے ماتحت کر لیتے اور کبھی رومی عراق کو ایرانیوں سے چھین کر شام میں ملا لیتے۔ اور وہاں اپنی حکومت قائم کر دیتے۔ صحرائے شام میں آباد ہونے والے عربوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ طبیعتوں کی افتاد کے باعث کبھی ایرانی لشکر سے مل جاتے کبھی رومیوں کی افواج سے ملحق ہو جاتے اور لوٹ مار میں خوب حصہ لیتے۔

آخر ان دونوں سلطنتوں نے ارادہ کیا کہ اپنی حفاظت کے لیے صحرا نشین لوگوں کو بہ طور ڈھال کے استعمال کیا جائے تاکہ کوئی سلطنت دوسری سلطنت پر حملہ نہ کر سکے اور شام کلی طور پر رومیوں کے لیے اور عراق خاص طور پر ایرانیوں کے لیے وقف ہو جائے۔

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی پالیسی کے تحت شامی حدود کے قریب بسنے والے عرب قبائل کو رومیوں نے اپنے ساتھ اور عراق کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بسنے والے قبائل کو ایرانیوں نے اپنے ساتھ ملا لیا اور ان قبائل نے بھی اندرونی خود مختاری، بدوی معیشت اور عربی معاشرت برقرار رکھتے ہوئے اپنی ہمسایہ سلطنتوں کی بالادستی تسلیم کر لی

شام میں مقیم عربی قبائل اپنے قومی خصائص برقرار رکھنے کے باوجود رومی تہذیب وتمدن اور سیاسی اثرات قبول کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ مگر انہوں نے جہاں ایک طرف رومی تہذیب وتمدن کو اپنایا وہاں دوسری طرف رومیوں پر بھی اثر ڈالنے اور مملکت میں نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مورخین ذکر کرتے ہیں کہ مشہور رومی شہنشاہ فلپ دراصل عربی النسل اور قبیلہ سمیذع سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قبیلے کے متعلق تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے اسی نے عرب سے شام کی طرف نقل مکان کیا۔ تخت شاہی پر متمکن ہونے سے پہلے فلپ اپنی قوم کا سردار تھا اس کی وجہ سے شام میں مقیم عربوں کو بے حد عزت وقعت حاصل ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے صحرا کو چھوڑنا اور رومیوں میں مدغم ہوجانا پسند نہ کیا۔

شامی عربوں کے برعکس عراق کی سرحدوں پر آباد ہونے والے عربوں نے صحرا کو چھوڑنے اور عراقی حدود میں داخل ہونے سے پرہیز کیا۔ کیونکہ اس طرح انہیں کلیتہً ایرانیوں کا مطیع وفرمانبردار ہوکر رہنا پڑتا تھا جسے ان کی آزاد منش طبیعت کسی طرح گوارا نہ کرسکتی تھی لیکن بعد میں جب ایرانی سلطنت میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگی پھیل گئی اور مختلف قبائل کے سردار اپنے اپنے علاقے میں خود مختار حاکم بن بیٹھے تو ان عربوں نے عراقی حدود میں داخل ہونے اور وہاں آباد ہونے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا کیونکہ اب ان کے دلوں سے ایرانی سلطنت کی غلامی کا خوف کافور ہوچکا تھا۔ انہوں نے عراق کی حدود میں داخل ہوکر دریائے فرات کے کنارے ابناء کا شہر اور اس سے کچھ ہٹ کر حیرہ کا شہر آباد کیا اور یہاں سکونت پذیر ہوگئے۔

اس روایت کے برعکس دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائے فرات کے ساحل پر بسنے والے عرب قبائل اصل میں وہ قیدی تھے جنھیں ایرانیوں نے عرب کے جنوبی علاقوں سے تاخت وتاراج کے دوران میں پکڑا تھا۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ شہنشاہ بخت نصر دوم نے عرب پر حملے کے دوران میں جن لوگوں کو قیدی بنایا تھا انہیں وہ ساتھ لے گیا اور عراق پہنچ کر انہیں دریائے فرات کے کنارے مقام انبار میں آباد کیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں انبار سے بہ جانب جنوب منتقل کردیا۔ وہاں ان عربوں نے شہر حیرہ کی بنیاد رکھی اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔

عربوں نے عراق میں اپنا اثر ورسوخ اسی وقت سے بڑھانا شروع کردیا تھا ۲۱۵ء اور ۲۶۸ء کے درمیانی عرصے میں جب عراقی عربوں کی قیادت جذیمۃ الابرش یا جذیمۃ الوضاح کے ہاتھ میں آئی تو اس نے کمال ہوشیاری سے عراق کی حدود میں بسنے والے عربوں کو ساتھ ملا کر حیرہ سے انبار اور عین التمر تک کا علاقہ قبضے میں کرلیا اور فرات کے مغرب میں صحرائے شام تک خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس نے اسی پر بس نہ کی بلکہ صحرائے شام میں بسنے والے ایک عرب قبیلے مضر پر حملہ کرکے وہاں کے عرب باشندوں پر بھی تسلط بٹھا لیا۔ مضر کا ایک شخص عدی بن ربیعہ جذیمہ سے مل گیا تھا جس کی جذیمہ نے بڑی خاطر داری کی اور اسے اعزاز واکرام سے نوازا۔

عدی نے جذیمہ کی بہن رقاش سے شادی کرلی تھی۔ عربی کتب اور ... میں دونوں کے متعلق

بڑے پرلطف قصے درج ہے۔ رقاش کے بطن سے حضرت عمرو بن عدی پیدا ہوا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ جس زمانے میں جذیمۃ الوضاح نے عراق میں عربوں کے بادشاہ کی سی حیثیت حاصل کر رکھی تھی اسی زمانے اذینہ بن سمیذع شام میں مقیم عربوں کی قیادت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ایران کی شہنشاہی سابور کے ہاتھ میں تھی اور روم کی بادشاہی فلپ کے قبضے میں۔ فلپ بہت سنگدل بادشاہ تھا اور رعایا پر بے حد ظلم وستم توڑتا رہتا تھا۔ ان مظالم سے تنگ آ کر اہل شام نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ سابور نے موقع کو غنیمت جانا اور شام پر چڑھائی کر کے رومی فوج کو شکست دے دی۔ اذینہ بھی رومی سلطنت سے دوستی کا عہد توڑ کر ایرانیوں سے جا ملا۔ اصل میں اس کی خواہش یہ تھی کہ سابور کے زیر سایہ وہ بھی عراق میں وہی رتبہ حاصل کر لے جو جذیمہ کو حاصل تھا لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کیونکہ اسی زمانے میں قالریان نے فلپ کو تخت شاہی سے اتار کر اس کی جگہ بادشاہی سنبھال لی۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فوج لے کر خود شام کی طرف روانہ ہوا اور سابور کو شکست دے کر اسے ایران کی جانب بھگا دیا۔ اذینہ نے بھی حیثیت بدل لی اور دوبارہ رومیوں کا حلیف بن گیا۔ لیکن قالریان کی بادشاہی بھی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی اور بہت جلد اسے تخت و تاج سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس وقت اذینہ نے دوبارہ سابور سے مل جانا چاہا لیکن سابور نے اس کی ابن الوقتی کے پیش نظر اسے اپنا حلیف بنانے اور اس کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ اذینہ کو اپنی قیادت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ وہ شامی عربوں کو ساتھ ملا کر ایرانیوں سے اعلان جنگ کر دے۔ اس مرتبہ قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے ایرانیوں وک شکست دے کر مدائن کی طرف بھاگا دیا۔ اس کارنامے سے رومیوں کے دلوں میں بھی اس کی قدر ومنزلت بڑھ گئی۔ اور وہ سمجھنے لگے کہ ایرانیوں کے مقابلے میں انہیں ایک طاقت ور شخص کی خدمت میسر آگئی ہیں۔

اذینہ کے بعد اس کی اولاد حاکم بنی۔ انہیں میں اس کی نہایت حسین وجمیل لڑکی زباء بھی تھی۔ زباء نے جذیمہ کو جال میں پھنسا کر اسے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی دعوت دی جو اس نے بڑی خوشی سے قبول کر لی لیکن شادی کے بعد زباء نے موقع پا کر جذیمہ کو قتل کر دیا۔ جذیمہ کے لڑکے حضرت عمرو بن عدی کے دل میں آتش انتقام بھڑک اٹھی اور اس نے قیصر بن حضرت عمرو کو ساتھ لے کر زباء کا محاصرہ کر لیا۔ جب زباء نے دیکھا کہ اس کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا اور اسے لامحالہ حضرت عمرو بن عدی کے ہاتھ سے قتل ہونا پڑے تو اس ذلت سے بچنے کے لیے اس نے خودکشی کر لی۔ اس کی وفات سے شام میں بنی سمیذع کی قیادت کا دور ختم ہو گیا اور ان کی جگہ غسانیوں نے لے لی۔ کچھ عرصہ بعد بنی نصر کی ایک جماعت نے، جو عراق میں برسر اقتدار تھی، شام کے عربوں میں تسلط بٹھانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔

اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ:

ان واقعات کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ جنھیں ابتداء میں قیدی بنا کر سرزمین سے

لایا گیا تھا، انہوں نے آہستہ آہستہ اتنی طاقت حاصل کر لی کہ رومی اور ایرانی دونوں سلطنتیں ان کی مدد کی محتاج ہوگئیں اور ان کی پوری کوشش ان کی دوستی اور تائید کے حصول میں صرف ہونے لگی۔ شجاعت اور فنونِ جنگ میں مہارت کی بدولت دونوں سلطنتیں انہیں اندرونی اور ذاتی خودمختاری دینے پر مجبور ہوگئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایران اور روم کے زیرِ سایہ بسنے والے قبائل عرب، یمن اور حضرموت کے قبائل سے نہ صرف یہ کہ کسی طرح کم نہ تھے بلکہ انہیں ان قبائل سے زیادہ آزدی اور خودمختاری حاصل تھی۔ اسی لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانے میں عرب کی حدود جنوب میں خلیج فارس اور خلیج عدن سے لے کر شمال میں موصل اور آرمینیہ تک پھیلی ہوئی تھیں تو غلط نہ ہوگا۔ اسی طرح یہ دعویٰ بھی غلط نہ ہوگا کہ عراق اور شام کی حدود میں بسنے والے ان عرب قبائل نے آئندہ ہونے والی اسلامی فتوحات کے لیے مقدمۃ الجیش کا کام دیا اور ان علاقوں میں اسلامی سلطنت کے قیام کی غرض سے زمین ہموار کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں کے دماغوں میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کا دھندلا سا نقشہ بھی نہ تھا اور کسی کو سرزمین عرب میں ایک عظیم الشان نبی کی بعثت اور اس کے ذریعے سے عرب قوم کی سربلندی کا خیال بھی پیدا نہ ہوسکتا تھا لیکن دریائے فرات اور شام کی وادیوں کے درمیان ان قبائل کی سکونت، ان کی طرف سے عربی رسوم و رواج اور عادات و خصائل کی شدت سے محافظت اور ایران و شام اور عرب قبائل سے مساوی بنیادوں پر ان کے تعلقات پر تمام عوامل اس عربی سلطنت کی بنیاد بنے جس نے کامل چار صدی بعد ایرانی اور رومی سلطنت کی جگہ لی۔

اس جملہ معترضہ کو ختم کر کے ہم واقعات کو اسی جگہ سے شروع کرتے ہیں جہاں سے ہم نے انہیں چھوڑا تھا۔

جذیمہ الابرش کے قتل کے بعد سابور کی جانب سے حضرت عمرو بن عدی کو عراق کے عربوں کا سردار اور بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے حیرہ کو دارالحکومت بنا لیا اور اس کے بعد حیرہ اس وقت تک لخمیوں کا دارالحکومت رہا جب تک حکومت ان کے ہاتھ سے نہ چھن گئی۔

شاہانِ حیرہ:

عراق میں بسنے والے عرب ایرانی شہنشاہی کے برائے نام محکوم تھے۔ اقتدار حاکم حیرہ ہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ان عربوں کے فرائض صرف یہ تھے کہ اگر عرب یا شام کی طرف سے ایران پر حملہ ہو تو اسے روکیں اور ان تجارتی راستوں کی حفاظت کریں جو فارس سے شام اور عرب کو جاتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود سرزمین ایران پر عربوں کے حملے نہ رک سکے۔ خلیج فارس کا قرب ان حملوں کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا۔ وہ نہ صرف خشکی کی راہ سے حملہ کرتے بلکہ بسا اوقات سمندری راستے سے بھی دھاوا بول دیتے تھے۔ ایرانیوں نے بارہا ان کے حملوں کو روکا۔ آخر ذوالاکتاف کو اپنی حدود میں ایک خندق کھدوانی پڑی تاکہ ان حملوں کی شدت کم ہو جائے اور ایرانیوں کو آئے دن کے دردِ سر سے نجات ملے۔

بنی نصر کے بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت حیرہ پر متمکن ہوتے رہے آخر چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں شہنشاہ یزدجرد کی طرف سے نعمان اکبر تخت پر بیٹھا۔ یہ شخص تھا جس نے دو مشہور محل خورنق اور سدیر تعمیر کرائے تھے۔

مورخین بیان کرتے ہیں کہ عراق میں عیسائیت کا نفوذ نعمان ہی کے عہد میں شروع ہوا اور اس کی وجہ نعمان کی اس مذہب سے گہری دلچسپی تھی۔ پادریوں نے جب اس کا میلان عیسائیت کی طرف دیکھا تو اس کی اجازت سے ملک کے طول و عرض میں کئی گرجے تعمیر کر لیے۔ بعض مورخین تو یہاں تک ذکر کرتے ہیں کہ یہ معاملہ صرف دلچسپی تک محدود نہ تھا بلکہ نعمان عیسائیت کا پرجوش رکن بن گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ شہنشاہ یزدجرد عیسائیوں کا سخت مخالف ہے اور عیسائیت قبول کرنے والوں کو شدید سزائیں دیتا ہے تو وہ اپنے بیٹے منذر اکبر کے حق میں بادشاہی سے دست بردار ہو گیا اور خود رہبانیت اختیار کر لی۔

شہنشاہ یزدجرد نے اپنے لڑکے بہرام گور کو بچپن ہی میں حیرہ بھیج دیا تھا تا کہ وہ وہاں پرورش پائے۔ حیرہ میں پرورش پانے کی وجہ سے بہرام کو عربی اور یونانی میں بڑی دسترس حاصل ہو گئی تھی۔ اور عربوں اور رومیوں کے معاشی اور سیاسی حالات سے وہ پوری طرح واقف ہو گیا تھا۔ یزدجرد کی وفات کے بعد ایرانی سرداروں نے کسریٰ بن اردشیر بن سابور ذوالاکتاف کو تخت پر بٹھانے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کی پرورش ایران میں ہوئی تھی اور وہ اس کے عادات و خصائل سے اچھی طرح واقف تھے لیکن بہرام ان کے نزدیک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔

بہرام نے اپنا تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے منذر سے مدد حاصل کی۔ جب وہ اپنی چھینی ہوائی میراث حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو منذر نے اسے نصیحت کی کہ وہ اپنے دشمنوں سے عفو و درگزر سے کام لے۔ بہرام نے اس نصیحت پر عمل کیا اور اس طرح نہ صرف اپنے مخالف سرداروں اور امراء کو اپنا گرویدہ کر لیا بلکہ انعام و اکرام دے کر ٹیکسوں کا بوجھ کم کر کے رعایا میں بھی ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔

عیسائیت:

بہرام گور اپنے باپ کی طرح عیسائیوں کا شدید دشمن تھا۔ اسی لیے اس نے تخت پر بیٹھتے ہی عیسائیت کے استیصال کی مساعی شروع کر دیں جس کے نتیجے میں ایران اور روم کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں منذر نے بہرام کی مدد کی۔ پھر بھی یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا اور آخر فریقین میں صلح ہو گئی جو مدت دراز تک برقرار رہی۔

شام میں بنی غسان کے عرب سردار اور حاکم ایرانیوں سے جنگ کے دوران میں رومیوں کی مدد کیا کرتے تھے اور لخمی ایرانیوں کے حلیف بن کر رومیوں کے مقابلے میں نبرد آزما ہوتے تھے۔ ان جنگوں نے، جو ان عظیم سلطنتوں کے درمیان رونما ہوئیں، فریقین کے مذہبی جذبات کو ابھارنے میں بے حد مدد دی۔ چوتھی

صدی عیسوی کے اوائل میں، جب قسطنطین نے رومی سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی اس وقت مسیحیت نے ترقی کرنی شروع کی۔ رومی بادشاہوں نے اپنے مقبوضات میں اسے ترویج دینے کی کوشش کی اور عیسائی منادوں نے قریہ بہ قریہ پھر کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام دنیا کو سنانا شروع کیا۔ ان مبلغین نے اپنا دائرہ عمل صرف شام تک محدود نہ رکھا بلکہ عراق اور بلاد فارس میں بھی عیسائیت کی ترویج کے لیے مساعی شروع کر دیں۔

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں کی ان مذہبی جنگوں کے دوران میں عراق اور شام کے عربی قبائل کا طرزِ عمل کیا تھا۔ آیا انہوں نے بھی اپنے آقاؤں کے ادیان کا اثر قبول کر کے مجوسی اور مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا یا وہ بہ دستور اپنے آبائی مذہب بت پرستی پر قائم رہے؟

اگلی بحث شروع کرنے سے پہلے اس سوال کا جواب دینا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس سے عربوں کی ذہنی افتاد کا اچھی طرح پتا چل جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا اس ذہنی افتاد نے اسلامی فتوحات کے لیے کس حد تک راستہ ہموار کیا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ عربوں نے عراق میں رہنے والے بعض عربوں سے فارسی میں اچھی دسترس حاصل کر لی تھی اور ایرانی علوم وفنون، ادب اور ادیان سے خوب واقف ہو گئے تھے اور انہوں نے مانی، زردشت اور مزدک کی تعلیمات اور عقائد سے بھی گہری واقفیت حاصل کر لی تھی۔

(فجر الاسلام از احمد امین صفحہ ۲۳۔ منقول از الاعلاق النفیسہ لابن رستہ)

یہی حال شام میں مقیم عربوں کا تھا۔ انہوں نے نہ صرف رومیوں کی ثقافت، ادب اور ادیان کا مطالعہ گہری نظر سے کیا بلکہ عقلی و ذہنی طور پر وہ حیرہ کے عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے کیونکہ یونانی ثقافت اور رومی تہذیب وتمدن سے ان کا بہت قریبی تعلق تھا۔

عراقی عربوں نے ایرانیوں سے گہرے تعلقات اور میل ملاپ کے باوجود مجوسیت کو کبھی قبول نہ کیا۔ اسی طرح شامی عربوں نے رومی اور یونانی دیوتاؤں کی کبھی پرستش نہ کی۔ اس کے باوجود جب رومی سلطنت میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا تو صرف شامی عربوں ہی نے نہیں بلکہ عراقی عربوں نے بھی اسی کی آواز پر لبیک کہا اور کثرت سے اس نئے دین میں داخل ہونے لگے۔ طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان عربوں نے اپنے آقاؤں کے پہلے ادیان کو قبول نہ کیا تو وہ عیسائیت کی طرف کس طرح مائل ہو گئے؟

مورخین ذکر کرتے ہیں کہ بنوغسان میں سب سے پہلے عیسائی بادشاہ نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ شہنشاہ روم اپنی مملکت میں کسی جگہ بھی کسی غیر عیسائی کو حاکم مقرر کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان لوگوں میں عیسائیت پھیل گئی۔ پھر بھی ہمارا سوال برقرار رہتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ رومی شہنشاہ کے دباؤ کے ماتحت غسانی امراء عیسائی ہو گئے تھے تو بھی عوام کے عیسائیت قبول کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ الناس علی دین ملوکھم کی ضرب المثل کے تحت شامی قبائل اپنے سرداروں کی وجہ سے عیسائی ہو گئے تھے تو یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر عراقی قبائل میں سے بیشتر لوگوں نے عیسائیت کیوں قبول کر لی تھی حالانکہ یہی لوگ

ایرانیوں کی تائید میں رومیوں سے لڑا کرتے تھے۔ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ عراق اور شام کے قبائل میں عیسائیت پھیلنے کی کچھ نہ کچھ وجوہ ایسی تھیں جن کا تعلق عربوں کی ذہنی افتاد اور میلانات سے تھا اور جو ان وجوہ سے سراسر مختلف تھیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

عربوں کی سرشت میں سادگی کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نہ وہ پر پیچ باتیں کرتے اور نہ ایسی باتیں پسند کرتے تھے۔ مزدک اور مانی نے لوگوں کے سامنے جو عجیب و غریب نظریات پیش کیے تھے، اسی طرح یونانی فلسفے کی بنیاد جن دقیق اور پر پیچ باتوں پر تھی عربوں کی عقلیں انہیں سمجھنے سے قطعاً قاصر تھیں۔ اس کے بالمقابل عیسائیت چونکہ اپنے اندر بڑی حد تک سادگی لیے ہوئے تھی اس لیے عربوں نے اسے آسانی سے قبول کرلیا اور بہت ہی کم لوگ مجوسیت کی طرف مائل ہوسکے۔

چونکہ عیسائیت کا آغاز خدا کے نہایت پاک باز بندے کے ذریعے سے ہوا تھا، اسے قبول کرنے والے اہل کتاب میں شمار ہوتے تھے اور اسلام کے ظہور کے وقت متعدد نیک دل عیسائیوں نے محمد ﷺ کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ عراق اور شام میں بسنے والے عرب باشندوں کا قبول عیسائیت عربی فتوحات اور اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے بنیاد ثابت ہوا ہو۔

تبدیلی مذہب سے ان عربوں کی سرشت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ نہ عیسائیت کے پیچھے انہوں نے اپنی شخصی اور قومی آزادی کو چھوڑا اور نہ وہ بدویانہ طرزِ زندگی ترک کیا جو وہ صدیوں سے قائم رکھے ہوئے تھے۔

چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں ایک عورت ماویہ بنت ارقم بن حارث ثانی کو شام میں عربوں کی حکومت تفویض ہوئی۔ رومیوں نے اسے کمزور جانتے ہوئے اس سے بادشاہی چھیننی چاہی لیکن اس نے عورت ذات ہوتے ہوئے بڑی بہادری سے رومیوں کا مقابلہ کیا اور انہیں مصالحت پر مجبور کردیا۔ لیکن بعد میں جب رومیوں کے خلاف کچھ لوگوں نے بغاوت کردی تو ماویہ نے پچھلے واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے متعدد بہترین شہسوار رومیوں کی مدد کے لیے بھیجے جنھوں نے قسطنطنیہ جا کر پامردی سے باغیوں کا مقابلہ کیا۔

پھر بھی نہ تو آزادی کا وہ جذبہ، جو عراقی اور شامی عربوں میں یکساں جاری و ساری تھا، انہیں متحد کرسکا اور نہ فریقین کا عیسائیت کی طرف گہرا میلان ہی ان کی باہمی عداوتوں کو مٹانے میں کامیاب ہوسکا۔ اس کے برعکس لخمی اور غسانی ایرانیوں اور رومیوں سے مل کر ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے کا کوئی دقیقہ کبھی فروگزاشت نہ کرتے تھے۔

لخمی اور غسانی اوجِ کمال پر:

چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں عراق میں لخمی اور شام میں غسانی ترقی کی آخری منزلوں تک پہنچ گئے تھے۔ اس زمانے میں لخمیوں کی قیادت منذر ثالث کر رہا تھا اور غسانیوں کی حکومت حارث بن جبلہ کے

ہاتھ میں تھی۔ منذر ثالث بن ماء السماء شاہ حیرہ کا دور حکومت ۵۲۹ء تا ۵۶۲ء تھا۔ اسی زمانے میں ایران کے تخت پر قباذ اور کسریٰ انوشروان یکے بعد دیگرے متمکن ہوئے۔ حارث بن جبلہ (جو ماویہ بنت ارقم ذات القرطین کا خاوند تھا) شاہ غسانہ نے ۵۲۹ء سے ۵۷۲ء تک حکومت کی۔ یہ عہد جستینان اور جستین ثانی شاہان روم کا تھا۔ حارث بن جبلہ کو حارث الاعرج اور حارث الوہاب کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس میں حسب سابق ایرانیوں کی طرف سے منذر اور رومیوں کی طرف سے حارث شریک ہوئے۔ منذر نے جنگ کے دوران میں بہادری کے بے نظیر کارنامے انجام دیئے اور بالآخر رومیوں کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ رومیوں نے منذر کو تاوان کے طور پر سالانہ خراج دینا بھی منظور کر لیا مگر یہ صلح زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہی۔ رومیوں نے صلح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنگی تیاریاں تیز کر دی تھیں۔ جس سے کسریٰ کو بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے منذر کو حارث پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جس کے نتیجے میں حارث کو ایک بار پھر شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ۵۶۳ء میں رومیوں اور ایرانیوں میں وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ گئی۔

اس ساری مدت میں منذر ایرانیوں کے دوش بہ دوش جنگ میں حصہ لیتا رہا اور رومی سرحد کو پامال کرتا ہوا مصر کی حدود تک پہنچ گیا۔

منذر کے اس قدر طاقت حاصل کرنے کے باوجود رومیوں کی نظر سے حارث کی وقعت کم نہ ہوئی۔ وہ اب بھی یہی سمجھتے رہے کہ ایرانیوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور عراقی عربوں کے جارحانہ حملوں کے مقابلے میں شامی عرب ایک ڈھال ثابت ہوں گے اسی لیے شہنشاہ جسٹینین نے حارث کو ۵۲۹ء میں شام کے تمام عرب قبائل کا بادشاہ بنا دیا اور اسے فیلارک و بطریق، (Phylorqe et Patrice) کا خطاب دیا۔ یہی لقب شام میں متعین رومی حاکم کو دیا جاتا تھا۔

حارث نے منذر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ چونکہ وہ مرد میدان نہ تھا اس لیے اس نے فریب کاری سے کام لینا چاہا۔ ایک دفعہ جب فریقین کے درمیان زور شور کی جنگ جاری تھی تو حارث نے سو آدمیوں کی ایک جمعیت شاہ حیرہ کے پاس بھیجی جس نے جا کر اس سے کہا کہ حارث نے اس کی اطاعت کرنے کا اقرار کرنا ہے۔ یہ سن کر منذر بہت خوش ہوا اور اس وفد کی خوب خاطر تواضع کی۔ مگر وفد کے ایک شخص نے موقع پا کر منذر کو قتل کر ڈالا۔ اس خبر سے لشکر عراق میں افراتفری پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر حارث نے زور شور سے حملہ کیا اور عراقیوں کی جمعیت منتشر کر دی۔ اہل عرب اس دن کو یوم حلیمہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں کیونکہ ان سو آدمیوں کو حارث کی بیٹی حلیمہ نے عطر لگا کر منذر کے پاس بھیجا تھا۔ اس فتح سے شامی عربوں کے حوصلے بڑھ گئے اور ان کی عزت و توقیر میں بہت اضافہ ہو گیا۔ جاہلی ادب نے بھی اس زمانے میں خاصی ترقی کی۔

منذر ہی نے یوم نعیم اور یوم بوس کی بنیاد رکھی تھی اور عرب کے مشہور شاعر عبید الارص کو بھی یوم بوس کے موقع پر اسی نے قتل کرایا تھا۔ (یوم نعیم اور یوم بوس کو جاہلی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر

شعراء نے اشعار میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ان دونوں کی بنیاد اس طرح پڑی کہ منذر ثالث بن ماء السماء نے اپنے دو ندیموں حضرت خالد بن ولید بن مضلل اور حضرت عمرو بن مسعود کو ایک دن شراب کے نشے میں زندہ دفن کرادیا۔دوسرے روز جب اس کا نشہ اترا اور اسے اپنی حرکت کا علم ہوا تو بہت پچھتایا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔اس حادثے کی تلافی اس نے یہ نکالی کہ اس نے ان کی قبروں پر دو چھوٹے چھوٹے ستون بنا دیئے اور ان کا نام غریان رکھا۔سال میں دو دن وہ وہاں جاتا تھا۔ایک دن کا نام یوم نعیم تھا۔اس روز جو شخص سب سے پہلے اس کے سامنے آتا تھا اسے سو سیاہ اونٹ انعام میں دیتا تھا۔دوسرا یومِ بوس کہلاتا تھا اس دن جو شخص اسے سب سے پہلے نظر آتا تھا اسے قتل کر ڈالتا تھا۔کئی سال تک یہ ہولناک رسم جاری رہی اور کئی بدقسمت اشخاص اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔(مترجم) بعض عربی روایات سے پتا چلتا ہے کہ منخل نعمان کے ڈر سے روپوش ہوگیا تھا اور اس کا سراغ نہ مل سکا۔چنانچہ عربی میں ایک ضرب المثل بھی ہے لا افعله حتی یؤب المنخل (میں اس وقت تک یہ کام نہ کروں گا جب تک منخل واپس نہ آجائے)۔(مترجم)) عرب کے مشہور شعراء نابغہ ذبیانی اور علقمۃ الفل حارث وہاب کے ہم عصر تھے۔

سلطنت حیرہ کے آخری دن:

منذر ثالث بن ماء السماء کے بعد اس کا بیٹا حضرت عمرو بن ہند عراق کا بادشاہ بنا۔اس کی بادشاہی کے نویں سال محمد ﷺ کی ولادت ہوئی۔حضرت عمرو بن ہند کے بعد حیرہ کے تخت پر یکے بعد دیگرے بنو منذر متمکن رہے یہاں تک کہ ابوتابوس نعمان بن منذر رابع ۵۸۳ء تا ۶۰۵ء سریر آرائے سلطنت ہوا۔مشہور شاعر اعشیٰ میمون بن قیس اسی کے دربار سے وابستہ تھا۔نعمان کے عہد میں عراقی عربوں کی سلطنت دریائے دجلہ کے کناروں تک پھیل گئی تھی۔اس کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے کسریٰ کے دارالحکومت مدائن سے بالکل قریب شہر نعمانیہ کی بنیاد رکھی تھی......

اگرچہ نعمان انتہائی بدشکل تھا لیکن دنیوی نعمتوں اور آسائش حیات سے اسے حصہ وافر ملا تھا۔اس نے اپنی سوتیلی والدہ متجردہ سے شادی کرلی تھی جو بے حد حسین وجمیل تھی۔وہ منخل یشکری سے محبت کرتی تھی۔اس بناء پر نعمان نے منخل کو قتل کرادیا۔نعمان نے اپنے دورِ حکومت میں کئی شاندار باغات بنوائے تھے اور دنیا کے مختلف حصوں سے قسم قسم کے خوبصورت پھولوں کے پودے منگوا کر ان باغوں میں لگائے گئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ گل لالہ کا نام نعمان کی طرف منسوب ہو کر شقائق النعمان پڑ گیا۔

کسریٰ پرویز کو نعمان کی شان وشوکت اور اس کی سلطنت کی وسعت ایک آنکھ نہ بھائی اس نے اسے اپنے دربار میں طلب کر کے قتل کرادیا۔نعمان کے قتل سے لخمیوں کی بادشاہی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔کسریٰ پرویز نے نعمان کی جگہ ایاس بن قبیصۃ الطائی کو حیرہ کا بادشاہ مقرر کیا اور ایک ایرانی شخص بہرجان کو مرزبان مقرر کر کے عراق بھجوا دیا تاکہ شاہ حیرہ اپنے آپ کو خودمختار نہ سمجھے اور ایک ایرانی حاکم کا وجود

اسے ہر وقت اس امر کی یاد دہانی کراتا رہے کہ وہ ایرانی حکومت کے تابع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ایاس ہی کے عہد میں ہوئی۔ اسی کے زمانے میں ذوقار کی مشہور لڑائی ہوئی۔

ذوقار کی لڑائی کو عربوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس جنگ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ کسریٰ کی ناراضی کا حال معلوم ہونے کے بعد نعمان بن منذر نے اپنے اموال اور ہتھیار ہانئی بن قبیصہ کے پاس بطور امانت رکھوا دیے تھے۔ نعمان کے قتل کے بعد کسریٰ نے ہانئی سے نعمان کی چیزیں طلب کیں لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس اثناء میں بنو بکر بن وائل نے نعمان کے قتل سے طیش میں آ کر سوادِ عراق پر حملہ کر دیا اور بہت سا علاقہ ایرانیوں سے چھین لیا۔ کسریٰ نے اس صورت کا مداوا کرنے کے لیے عربوں کے مقابلے پر ایرانی فوج روانہ کی۔ کوفہ کے قریب ذوقار کے مقام پر ایرانیوں اور عربوں کا مقابلہ ہوا جس میں ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ روایت ہے کہ اس دن محمد ﷺ نے صحابہ سے فرمایا:

''یہ پہلا روز ہے جب عربوں کو عجمیوں پر غلبہ حاصل ہوا ہے اور انہیں یہ فتح صرف میری وجہ سے نصیب ہوئی ہے۔'' (مروج الذہب، مسعودی، جز اول، صفحہ ۲۳۲ مطبوعہ بغداد)

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ محمد ﷺ کی بعثت جنگ ذوقار والے سال ہوئی تھی۔

نعمان کے بعد تخت حیرہ پر تین بادشاہ اور متمکن ہوئے۔ آخر بادشاہ منذر مغرور تھا۔ اس کا انتقال ۶۳۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد عراق میں شاہان حیرہ کی حکومت کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور کسریٰ کی طرف سے داذویہ ایرانی کو حکومت کے مکمل اختیارات دے کر عراق بھیج دیا گیا۔

غسانی سلطنت کے آخری دن:

لخمیوں کے ذکر کے بعد اب ہم غسانیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لخمیوں کی طرح غسانی امراء بھی یکے بعد دیگرے تختِ امارت پر متمکن ہوتے رہے۔ شام کا آخری عرب حاکم جبلہ بن ایہم تھا۔ جس کی حکومت کا خاتمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی افواج کے ذریعے سے ہوا۔ ۵۸۷ء میں حضرت عمر الاصغر غسانی شامی عربوں کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ مشہور شاعر نابغہ ذبیانی نے نعمان بن منذر حاکم حیرہ کے ڈر سے حضرت عمر الاصغر ہی کے پاس پناہ لی تھی۔ حضرت عمر الاصغر کے بعد ابوکرب النعمان السادس بن حارث الاصغر برسرِ اقتدار آیا۔ نابغہ نے اس کی مدح میں جوشاندار قصائد تصنیف کیے انہیں عربی شاعری میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ نعمان سادس کے بعد غسانیوں میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور ہر علاقے میں علیحدہ علیحدہ حاکموں نے تسلط بٹھا لیا۔ آخر ایہم ثانی کے بیٹے جبلہ بن ایہم پر غسانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

غسانی امراء میں طوائف الملوکی حقیقت میں رومی حکومت کی ایک چال تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ایک متحدہ عرب حکومت رومی سلطنت کے لیے پریشانی اور دردسر کا باعث نہ ہو جائے اس لیے اس نے حکمت عملی سے کام لے کر ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ حاکم مقرر کر دیے تا کہ عرب متحد نہ ہو سکیں اور رومی سلطنت کو کوئی نقصان

وضعف نہ پہنچ سکے۔

عراق میں لخمیوں کا صرف ایک دارالحکومت تھا اور وہ تھا حیرہ لیکن اس کے بالمقابل شام میں غسانیوں کے متعدد دارالحکومت تھے۔ جابیہ بھی دارالحکومت تھا۔ تدمر بھی دارالحکومت تھا۔ جولان بھی دارالحکومت تھا۔ دمشق کے قریب جلق بھی ایک دارالحکومت تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں عراق میں لخمیوں کی خودمختاری کا دائرہ بے حد وسیع تھا وہاں غسانیوں کی یہ حالت نہ تھی۔ انہیں اندرونی خودمختاری ضرور حاصل تھی لیکن عراقی عربوں سے بہت کم۔

اندرونی خودمختاری اور خالص عربی طرز زندگی اختیار کرنے کا ایک اثر یہ ہوا کہ عراقی اور شامی عربوں کی زبان بہ دستور عربی ہی رہی۔ نہ عراق میں فارسی اس کی جگہ لے سکی اور نہ شام میں یونانی اور لاطینی زبانیں عربی کی قائم مقام بن سکیں۔ اسی طرح ایک فائدہ یہ پہنچا کہ شاہان حیرہ اور امرائے بنی غسان کے تعلقات اپنے ہم وطن عربوں سے بہت گہرے اور مخلصانہ رہے۔ ان تعلقات کی استواری میں عرب کے ان شعراء نے بے حد مدد دی جنھیں حیرہ اور غسان کے بادشاہوں کی طرف سے گراں قدر انعام ملا کرتے تھے۔ کتب ادب اور شعراء کے دیوان ان بادشاہوں کے اذکار سے بھرے پڑے ہیں نابغہ ذبیانی، اعشیٰ قیس اور علقمہ الفحل وغیرہ کثیر شعراء نے ان بادشاہوں کی مدح سرائی میں زور بیان صرف کیا تھا۔ اسی طرح دربار نبوی کے شاعر حسان بن ثابت کے اسلام لانے سے قبل جبلہ بن ایہم سے گہرے تعلقات تھے۔

ان تمام امور نے جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، اسلامی فتوحات کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب عربوں نے ان علاقوں میں پیش قدمی شروع کی تو یہاں بسنے والے عربوں نے بسا اوقات ان کی مدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر اپنے رومی اور ایرانی حلیفوں سے جنگ کی۔

رومیوں اور ایرانیوں کے حملے:

اس زمانے میں رومی سلطنت میں بھی ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی اور ساری مملکت فساد اور شورش کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ شہنشاہ روم فوکاس (لوکس) کے خلاف ہرقل کی بغاوت زور شور سے جاری تھی۔ ایرانیوں نے موقع کو غنیمت جان کر شام پر حملہ کر دیا۔ پہلے انطاکیہ پر قبضہ کیا۔ وہاں سے بیت مقدس کا رخ کیا۔ کہاں تو ہرقل شہنشاہ روم ایرانیوں کے خلاف برسرپیکار تھا کہاں اب اسے جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ایرانی بیت مقدس کی طرف بڑھنے سے رک جائیں لیکن اس کی کچھ پیش نہ گئی اور وہ انہیں روکنے اور مسیحی و یہودی آثار مقدسہ کی بے حرمتی سے باز رکھنے میں مطلق کامیاب نہ ہو سکا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہود بھی مجوسیوں سے مل گئے اور انہوں نے عیسائیوں کے خلاف ان کی مدد کی۔ جب شام پر ایرانیوں کا کامل تسلط ہو گیا تو انہوں نے مصر کا رخ کیا اور رومیوں کی جگہ وہاں بھی اپنی حکومت قائم کر لی۔

ایرانیوں کی ان پیہم کامیابیوں کے دوران میں محمد ﷺ پر آیت نازل ہوئی:

الم غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین لله الامر من قبل و من بعد و یومئذ یفرح المومنون بنصر الله۔

(اگرچہ رومی سرزمین شام میں مغلوب ہوگئے ہیں لیکن عنقریب چند ہی سال میں وہ اپنی مغلوبیت کے بعد غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اس روز اللہ کی مدد کی وجہ سے مومن خوش ہوں گے۔)

اللہ کا وعدہ حرف بحرف پورا ہوا۔ چند ہی سال میں ہرقل نے دوبارہ طاقت پکڑ لی اور ایرانیوں سے نبرد آزما ہوکر انہیں مصر اور شام سے نکال دیا، صلیب اعظم ان سے واپس چھین لی اور اسے بیت مقدس میں اس کی اصلی جگہ آویزاں کر دیا۔ ان مسلسل لڑائیوں میں جہاں ایرانیوں کے غلبہ و اقتدار میں نمایاں فرق آگیا وہاں رومیوں کی قوت و طاقت میں بھی بہت حد تک کمی آگئی۔ دیگر امور کے علاوہ یہ امر بھی عربوں کی سلطنت کے قیام اور فتوحات اسلامیہ کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف:

رومیوں اور ایرانیوں پر جو کچھ گزر رہی تھی مکہ اور مدینہ والے اس سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح عراق اور شام کی حدود میں بسنے والے عربوں کا حال بھی ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ ان حوادث و واقعات کا طبعی نتیجہ یہ نکلا کہ عربوں کے دلوں میں ایرانیوں اور رومیوں کا جو رعب و دبدبہ قائم تھا وہ جاتا رہا اور ان کی نظروں سے ان سلطنتوں کی وقعت کم ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور متحدہ طور پر سارے عرب کے اسلامی جھنڈے تلے جمع ہو جانے سے اس رجحان کو مزید تقویت پہنچی۔ پھر بھی اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عربوں کی نظروں میں ان سلطنتوں کی وقعت اس درجہ کم ہوگئی تھی کہ وہ ان پر حملہ کرنے اور ان کی حدود کو پامال کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکتے تھے۔ عربوں میں بیداری ضرور پیدا ہوئی مگر اس کا دائرہ جزیرہ عرب کو ان سلطنتوں کے اثر و نفوذ سے پاک کرنے کی کوششوں تک محدود تھا۔ چنانچہ یمن اور عرب کے تمام جنوبی علاقوں نے ایرانیوں کی اطاعت کا جوا سر سے اتار پھینکا۔ محمد ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں ایرانیوں کی طرف خاص نگاہ رکھی اور اس غرض کے لیے بعض اقدامات بھی کیے۔ لیکن آپ کی غرض بھی یہی تھی کہ عرب کی شمالی سرحدوں کو قیصر کی فوجوں کے تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا جائے۔ شام پر چڑھائی کرنا نہ آپ کا مقصد تھا اور نہ مسلمانوں نے ہرقل کے نام محمد ﷺ کے تبلیغی خط کو شام پر چڑھائی کا بہانہ بنایا۔ پھر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ مسلمانوں کے لیے ایران و شام پر چڑھائی کرنا ضروری ہوگیا۔

جس وقت یمامہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور یمن اور اس کے نواح میں مہاجر بن ابی امیہ اور عکرمہ بن ابوجہل مرتدین کی سرکوبی میں مصروف تھے اسی وقت سب لوگوں کو یقین ہوگیا تھا کہ اب جزیرہ عرب

میں صرف خلیفہ محمد ﷺ کی فرمانروائی ہوگی اور آئندہ کسی فتنہ پرداز شخص کو شوروشر کرنے اور بغاوت کی آگ بھڑکانے کی جرأت نہ ہو سکے گی مگر عام لوگوں کے برعکس حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خوش فہمی سے کام نہ لیا۔ یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ فساد کے شعلے ایک بار دب جانے کے بعد دوبارہ پھر بھڑک اٹھتے اور ایک بار پھر جزیرہ عرب میں انتشار پیدا کر دیتے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تمام حالات کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہے اور سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ عرب قبائل کی شورش انگیزی کے خطرے سے بچنے کے لیے کیا مناسب نہ ہوگا کہ ان کی توجہات کو ایران اور شام کی طرف منعطف کر دیا جائے تاکہ انہیں حکومت کے خلاف سر اٹھانے اور فساد برپا کرنے کا کوئی موقعہ ہی نہ مل سکے۔ اس غرض کے لیے اللہ پہلے ہی سامان کر چکا تھا۔ صحرائے شام میں عرب قبائل کثرت سے آباد تھے اور ان سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ دین اسلام کو اسی خندہ پیشانی سے قبول کر لیں گے جس طرح ان کے ہم قوم اور ہم اصل لوگوں نے قبول کر لیا تھا اور وہ بھی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی میں شریک ہو جائیں گے۔

یہ خیالات اٹھتے بیٹھے، چلتے پھرتے غرض ہر دم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ پھر بھی اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انہیں نعوذ باللہ وسعت سلطنت کی ہوس تھی اور ایک وسیع علاقے پر اقتدار قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کا منشاء صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو اطمینان نصیب ہو، وہ بے روک ٹوک احکامِ دین پر عمل کر سکیں اور اسلام کی تبلیغ کے راستے میں انہیں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ لوگوں کو اطمینان اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب حکومت کی بنیاد عدل و انصاف پر ہو اور اس میں ہوا و ہوس کا بالکل دخل نہ ہو۔ عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ حاکمِ اعلیٰ ہر قسم کی نفسانی خواہشات سے یکسر پاک ہو کر اس میں خودغرضی و نفس پرستی کا شائبہ تک نہ ہو۔ مزید برآں وہ رعایا پر حد درجہ شفیق اور مہربان ہو۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس معیار پر سو فیصد پورے اترتے تھے۔ وہ اپنے واسطے کسی عہدے اور مرتبے کے خواہش مند نہ تھے۔ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں انہوں نے کبھی اپنی ذات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہ کی۔ رعایا پر وہ جس درجہ شفیق اور مہربان تھے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ عدل و انصاف کو وہ ہر چیز پر مقدم رکھتے اور اس کے قیام میں اپنی جان اور اہل و عیال تک کو فراموش کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سلطنت کے تمام امور کی نگہداشت انتہائی حزم و احتیاط سے کرتے تھے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا پہلا سال زیادہ تر مرتدین کی شورش کا مقابلہ کرنے میں گزرا۔ مسلمان ہمہ تن اس فتنے کو فرو کرنے میں مصروف تھے اور جوق در جوق اسلامی لشکروں میں شامل ہو کر جہاد کے لیے اطراف ملک میں جا رہے تھے۔ لیکن اس نازک ترین موقع پر بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ انتظامی اور ملکی امور میں غافل نہ رہے۔ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا قاضی مقرر فرمایا گو انہیں اس سلسلے میں کوئی کام نہ کرنا پڑا۔ وہ سال بھر تک قضا کے عہدے پر متمکن رہے لیکن کوئی مقدمہ فیصلے کے لیے ان کے سامنے پیش نہ ہوا۔ ابو عبیدہ بن جراح کے سپرد بیت المال کا انتظام تھا۔ زکوٰۃ اور صدقات کا جو مال اکٹھا ہوتا تھا وہ اس کی تقسیم

کے لیے مامور تھے۔ حضرت عثمان بن عفان ذ اور زید بن ثابت ذ کے سپرد کتابت تھی۔ فرامین اور مراسلے یہی حضرات لکھا کرتے تھے۔ ان کے مقرر کردہ عمال اور قائدین بھی اطراف مملکت میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں مشغول تھے۔ ان تمام لوگوں کا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے گہرا رابطہ قائم تھا اور اہم ملکی امور میں کوئی شخص ان سے مشورہ لیے بغیر قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے جنگ ہائے ارتداد کے دوران میں ان کے اور ان کے عمال و قائدین کے درمیان کثرت سے خط و کتابت ہوئی جو تاریخوں میں محفوظ ہے۔ جنگہائے ارتداد کے باعث چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا پہلا سال سخت مصروفیات کا گزرا۔ اس لیے انہوں نے حج کے موقع پر اپنی جگہ عتاب بن اسید کو امیر الحج بنا کر بھیج دیا۔ جب تک مرتدین سے جنگیں جاری رہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے کسی اور جانب توجہ منعطف کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ جب مرتدین کا مکمل قلع قمع ہو چکا اور چپے چپے پر اسلامی حکومت کی عملداری قائم ہو چکی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی توجہ اس ضروری مسئلے پر مبذول ہوئی کہ اعلائے کلمۃ الحق اور دین حقہ کی اشاعت کے لیے مسلمانوں کو آئندہ کیا قدم اٹھانا اور اپنی جدوجہد کو کس شکل میں مرتکز کرنا چاہیے۔

اس غرض کی انجام دہی کے لیے ایک شکل یہ تھی کہ رومیوں پر حملہ کیا جائے اور ان جنگوں کو جن کا آغاز محمد صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے ذریعے سے فرما چکے تھے، پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ عربوں کی توجہ کلیتہً رومیوں کی طرف پھیر دینے سے نہ صرف آئندہ کے لیے عرب سے بغاوت اور فتنہ و فساد کا خطرہ دور ہو جاتا بلکہ مملکت رومہ کے طول و عرض میں اشاعتِ اسلام کے لیے بھی راستہ صاف ہو جاتا۔

لیکن اس سلسلے کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا جس پر نظر رکھنا بے حد ضروری تھا۔ وہ یہ کہ اگر مسلمان رومیوں پر فتح یاب نہ ہو سکتے تو پورے جزیرۂ عرب کو زبردست خطرہ لاحق ہو جاتا جو مرتدین کے فتنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتا۔ رومی اپنے علاقے میں مسلمانوں کو شکست دے کر انہیں اپنے علاقے سے نکال دینے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ انہیں حملے کا مزہ چکھانے کے لیے جزیرہ عرب پر بھی حملہ کر دیتے۔ عرب پر رومیوں کی چڑھائی معمولی بات نہ تھی، اس صورت میں اسلام کا کلیتہً قلع قمع ہو جاتا۔

مرتدین کے مقابلے میں مسلمانوں کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے آ کر عرب سے بت پرستی کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا اور تمام عرب عقیدہ توحید کی لڑی میں منسلک ہو چکے تھے۔ یہ ایک زبردست قوت تھی جو اسلام کو حاصل تھی۔ مدعیان نبوت نے قبائل عصبیت کی بنا پر سادہ لوح انسانوں کو چند روز کے لیے تو اپنے پیچھے لگا لیا لیکن محض بے بنیاد عقیدوں اور مضحکہ خیز تعلیمات کی بنا پر زیادہ عرصے کے لیے انہیں اپنے ساتھ لگائے رکھنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی ان لوگوں کا کذب و افتراء ان کے پیروؤں پر ظاہر ہونے لگا وہ ان کا ساتھ چھوڑنے لگے لیکن رومیوں کی بات علیحدہ تھی۔ وہ عیسائی تھے اور اس دین کے پیرو جو ایک شاندار ماضی کا حامل تھا۔ مسلمانوں کی طرح وہ اہل کتاب تھے، اس کے علاوہ زبردست قوت و طاقت کے مالک بھی۔

یہ درست ہے کہ ان کے اور ایرانیوں کے درمیان سالہا سال سے جنگ و جدل کا سلسلہ جاری تھا۔

ابتداء میں ایرانی ان پر غالب آگئے۔لیکن بعد میں رومیوں کا پلہ بھاری ہوگیا۔جدال وقتال کے اس غیر مختتم سلسلے نے دونوں سلطنتوں کی قوت وطاقت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔پھر بھی ابھی ان کا رعب و داب ہمسایہ اقوام پر بدستور قائم تھا۔آپس میں تو وہ جنگ و جدل میں مصروف اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے میں مشغول تھے لیکن کسی دوسری سلطنت کی مجال نہ تھی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتی خصوصاً عرب جیسی حقیر قوم کی جس کی قوت وطاقت ایرانیوں اور رومیوں کے پاسنگ بھی نہ تھی اور جو ان سلطنتوں سے جنگ چھیڑنا اپنی موت کو اپنے ہاتھ سے دعوت دینے کے مترادف سمجھتی تھی۔

دوسرے عربوں کی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی ایرانیوں سے جنگ کرنے کا خیال نہ آسکتا تھا۔حجاز فارس کے متصل نہ تھا۔اور عرب کے جو علاقے ایران سے ملے ہوئے تھے ان میں قبل ازیں ارتداد کا فتنہ زور شور سے بھڑک چکا تھا اور کسی جنگ کی صورت میں اس علاقے کے لوگوں پر قطعاً اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے واسطے یہی صورت مناسب تھی کہ وہ فتنہ ارتداد فرو کرنے کے بعد تمام تر توجہ سلطنت کے اندرونی استحکام اور قیام امن پر مبذول کرتے تاکہ عرب ایک وحدت میں منسلک ہو کر اقوام عالم میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیتے اور ان کی قوت وطاقت میں شاندار اضافہ ہو جاتا۔

مثنیٰ بن حارثہ اور عراق:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئندہ اقدامات کے متعلق غور و فکر ہی میں مشغول تھے کہ خبر ملی، ایک شخص مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ایک قلیل فوج کے ساتھ پیش قدمی کر کے بحرین کے شمال میں دجلہ اور فرات کے دہانے تک پہنچ چکا ہے۔وہ ایرانی حکام، جنھوں نے بغاوت کی آگ بھڑکانے میں بحرین کے مرتدین کی مدد کی تھی، اس کے آگے بے بس ہو گئے اور تاب مقاومت نہ لا کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اب تک مثنیٰ کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ان خبروں کے پہنچنے کے بعد تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بحرین کے قبیلہ بکر بن عائل سے تعلق رکھتا ہے اور علاء بن حضرمی کے ساتھ مل کر مرتدین سے جنگ کر چکا ہے، بحرین اور اس کے نواح میں جو لوگ بدستور اسلام پر قائم رہے تھے اور جنھوں نے اسلامی فوجوں کے ساتھ مل کر مرتدین کی جنگوں میں حصہ لیا تھا، مثنیٰ ان کا سردار تھا۔ارتداد کا فتنہ ختم ہونے کے بعد وہ چین سے نہ بیٹھا اور اپنے لوگوں کو ہمراہ لے کر خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ، بجانب شمال، عراق کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔آخر وہ ان عربی قبائل میں پہنچا جو دجلہ اور فرات کے ڈیلٹائی علاقے میں آباد تھے۔اس نے گفت و شنید کر کے انہیں ایرانی سلطنت کا جوا سر سے اتار دینے اور اسلامی حکومت کی حمایت کرنے پر آمادہ کر لیا۔ان امور کے علاوہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مثنیٰ معمولی شخص نہیں بلکہ اپنے قبیلے کا ایک معزز فرد اور انتہائی قابل اعتماد شخص ہے۔چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر قیس بن عاصم المنقری نے کہا: "یہ شخص گم نام، مجہول النسب اور فریب کار نہیں۔یہ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ہے جو اعلیٰ حسب ونسب اور شہرت اور عزت کا

مالک ہے۔"

اس صورت حال نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیں۔ اب ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کیا اس موقع پر مسلمانوں کو عرب کی حدود سے باہر بھیجنا مناسب ہوگا اور کیا مثنیٰ میں اتنی طاقت ہے کہ وہ عراق میں گھس کر ایرانی سلطنت کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھولنے میں کامیاب ہو سکے گا؟

عراق کی صورت حال یقیناً مسلمانوں کے لیے قابل توجہ تھی اور اس طرف سے غافل نہ ہو سکتے تھے۔ عراق میں بنو لخم، تغلب، ایاد، نمر اور بنو شیبان متعدد عربی قبائل آباد تھے۔ گو یہ قبائل ایرانیوں کے محکوم اور ان کے مطیع و منقاد تھے۔ پھر بھی جزیرہ عرب سے ان کا جو قدرتی رشتہ تھا، اسے بھی وہ کسی صورت میں فراموش نہ کر سکتے تھے۔ عرب میں جو بھی تحریک اٹھتی ان کے لیے اس کا بہ نظر غائر جائزہ لینا ضروری تھا۔ ادھر سجاح نے بھی عراق ہی سے نکل کر نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اس کی تمام امیدیں بھی ان مذکورہ بالا قبائل ہی سے وابستہ تھیں۔

اس ضمن میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے سب سے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ عراق میں ایرانی اقتدار ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔ محمد ﷺ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل ہرقل شہنشاہ روم نینوا اور دستجرد میں ایرانی افواج کو شکست فاش دے چکا تھا۔ اس کی فوجیں ایرانی دارالسلطنت مدائن کے دروازوں تک پہنچ گئی تھیں۔

ہرقل کی فوج کشی کے بعد بعض اور علاقے بھی ایرانی عمل داری سے نکلنے اور آزاد ہونے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے یمن نے ایرانی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کیا اور وہاں کے عامل باذان نے اسلام قبول کر کے اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کر لی۔ بعد ازاں بحرین اور خلیج فارس و خلیج عدن کے تمام علاقوں نے بھی ایرانیوں کی غلامی کو خیر باد کہا اور وہاں بھی اسلامی حکومت کا دور دورہ ہو گیا۔ سلطنت ایران نے ان علاقوں کی بازیابی کے لیے کوئی کوشش نہ کی اور اس کے مقرر کردہ حاکم اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور اطمینان سے مقبوضہ علاقوں پر غیر قوم کو قابض ہوتے دیکھتے رہے۔ اس موقع پر وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ خود سلطنت اندرونی انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔ تخت ایران پر قبضہ کرنے کی خاطر ایرانی امراء میں جنگ و جدل برپا تھا۔ چار سال میں نو بادشاہ تخت نشین ہو چکے تھے اور ہر بادشاہ نے بے دریغ اپنے مخالفین کا قتل عام کرایا تھا۔ کسی بادشاہ کو چین سے حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور تخت پر متمکن ہونے کے چند ہی روز بعد اپنے دشمنوں کی سازش کا نشانہ بننا پڑا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئندہ اقدام کے متعلق ابھی کوئی فیصلہ کرنے نہ پائے تھے کہ مثنیٰ خود مدینہ میں آموجود ہوئے اور تمام حالات خلیفہ کے گوش گزار کر دیئے۔ انہیں اطمینان دلایا کہ شام کے برعکس عراق کی فتح سہل الحصول ہے اور عراق کے میدانوں میں عربوں کو ان مہیب خطرات سے بالعموم دوچار ہونا پڑے گا جن خطرات سے شام پر فوج کشی کی صورت میں ہونا پڑا۔ انہوں نے یہ بتایا کہ دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ زرخیزی اور حسین قدرتی مناظر کے لحاظ سے شام سے کسی طرح کم نہیں۔ اہل حجاز کو چونکہ عراق کی نسبت شام کا سفر اختیار کرنے میں زیادہ آسانی میسر تھی اس لیے ان کی نظر اٹھتی شام ہی کی طرف تھی لیکن اگر وہ عراق

کے دل فریب مناظر دیکھیں تو یقیناً شام کی طرح یہ علاقہ بھی ان کے لیے پرکشش ثابت ہو۔

مثنیٰ نے یہ بھی بتایا کہ جو عرب قبائل دجلہ اور فرات کے ڈیلٹائی علاقے میں آباد ہیں وہ وہاں مقامی باشندوں کے ہاتھوں سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ عرب زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو ایرانی زمیندار آتے اور سارا غلہ سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ لیکن وہ غریب مزارع جنھوں نے رات دن سخت محنت و مشقت برداشت کرتے ہوئے خون پسینہ ایک کر کے فصل تیار کی تھی، بالکل محروم رہ جاتے ہیں اور ان کے حصے میں ان چند ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں آتا جو زمینوں کے مالک ازراہِ ترحم بخشش کے طور پر انہیں دے جاتے ہیں۔ اس ذلیل برتاؤ کے باعث عربوں کے دل ایرانی امراء اور زمینداروں کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے ہیں اور اگر جزیرہ عرب کو ایرانی دسیسہ کاریوں، سازشوں اور مخالفانہ کاروائیوں سے بچانے کے لیے عراق پر فوج کشی کی جائے تو ایرانیوں سے دلی نفرت کے باعث وہاں کے عرب قبائل ضرور اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور ہر طرح ان کی امداد کریں گے۔ اس لیے یہ نادر موقع ہاتھ سے نہ کھونا چاہیے اور سرزمین عراق میں اسلامی فوجیں روانہ کر دینی چاہئیں۔

عراق کا ڈیلٹائی علاقہ ہی اپنی خوب صورتی اور زرخیزی کے باعث عدیم المثال نہ تھا بلکہ دجلہ اور فرات کا علاقہ بھی، جو تقریباً تین سو میل لمبا تھا، سارے کا سارا قدرتی نظاروں سے معمور تھا۔ زمین کی زرخیزی اور شادابی کے علاوہ یہ علاقہ تاریخی لحاظ سے بھی انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے چپے چپے پر آثار قدیمہ بکھرے پڑے تھے اور زبان حال سے پر ہیبت بادشاہتوں اور پر شکوہ سلطنتوں کی داستانیں ہر آنے جانے والے کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ شہر اور جس کے آثار ہمارے زمانے میں دریافت ہوئے ہیں اور جس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شہر اس زمانے میں تعمیر ہوا تھا جب فراعنہ مصر پر حکمران تھے، اسی منطقے میں واقع تھا۔ شمالی جانب تھوڑا سا اور آگے بڑھنے پر قدیم شہر بابل کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ دریائے فرات کے کنارے بابل کا برج اب تک کھڑا اشوریوں کی عظمت و شوکت کی داستان بیان کر رہا ہے۔ اسی دریائے فرات کے ساحل پر ساسانی جاہ و جلال کا مظہر اور ایرانی سلطنت کا دارالحکومت مدائن آباد تھا جس کی ثروت اور شان و شوکت کا شہرہ اقصائے عالم تک پھیلا ہوا تھا۔

باغات کی کثرت، غلے کی فراوانی اور دلفریب قدرتی مناظر کے باعث یہ علاقہ جنت ارضی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی لیے جب مثنیٰ شیبانی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے ساری صورتِ حال واضح کی تو وہ اس علاقے میں اسلامی فوجیں بھیجنے پر پورے رضامند ہو گئے۔ مثنیٰ کا منشاء یہ تھا کہ عراق کے ڈیلٹائی علاقے میں اسلامی فوجیں بھیج کر عرب قبائل کو ظلم و ستم کے اس لامتناہی چکر سے نجات دلائی جائے جو ایرانی حکام کی طرف سے ان پر روا رکھا جا رہا تھا اور اس طرح انہیں ممنونِ احسان بنا کر اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ اگر ایرانی حکام لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کریں فبہا ورنہ حکومتِ ایران سے باقاعدہ ٹکر لے کر حریت ضمیر اور مذہبی آزادی کے لیے راستہ صاف کیا جائے اور دلائل و براہین کے ذریعے سے دین حقہ

کی اشاعت کے سامان فراہم کیے جائیں۔

کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے اہل الرائے اصحاب سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ انہیں بلایا اور عراق کے تمام حالات سنا کر مثنیٰ کی یہ درخواست ان کے سامنے پیش کی کہ انہیں ان کی قوم کا سردار بنا کر ایرانیوں سے نبرد آزما ہونے اور اس طرح ایک ایسا فرض ادا کرنے کا موقع دیا جائے جس کی بجا آوری درحقیقت اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

چونکہ اہل مدینہ عراق کے حالات سے بالکل ناواقف تھے اور انہیں ڈر تھا کہ سلطنت ایران پر چڑھائی کر کے اسلامی افواج کہیں الٹی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں اس لیے انہوں نے مشورہ دیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ سارا معاملہ ان کے سامنے پیش کیا جائے اور جو رائے وہ دیں اس پر عمل کیا جائے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس زمانے میں غزوۂ عقرباء سے فارغ ہو کر اپنی دونوں بیویوں، ام تمیم اور بنت مجاعہ، کے ہمراہ یمامہ ہی میں مقیم تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں فوراً مدینہ طلب فرمایا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عراق پر فوج کشی کے متعلق مثنیٰ کی تجاویز ان کے سامنے رکھیں تو انہوں نے بلا پس و پیش ان پر صاد کر دیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے خداداد فراست کی بنا پر بھانپ لیا تھا کہ مثنیٰ نے حدود عراق میں ایرانیوں کے خلاف جو کاروائی شروع کی ہے اگر خدانخواستہ وہ ناکام ہو گئی اور مثنیٰ کی فوج کو عرب کی جانب پسپا ہونا پڑا تو ایرانی حکام دلیر ہو جائیں گے۔ وہ صرف مثنیٰ کی فوج کو عراق کی حدود سے باہر نکالنے پر اکتفا نہ کریں گے۔ بلکہ بحرین اور اس کے ملحقہ علاقوں پر دوبارہ اثر و رسوخ قائم کرنے تسلط بٹھانے کی کوشش بھی کریں گے اور اس طرح اسلامی حکومت کو سخت خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس خطرے سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ دربارِ خلافت سے مثنیٰ کو قرار واقعی امداد مہیا کی جائے اور ایرانیوں کو عرب کی حدود میں اثر و رسوخ جمانے کے بجائے مزید پسپائی پر مجبور کیا جائے تاکہ ان کی جانب سے آئندہ کبھی عرب کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی یہ رائے سن کر دیگر اصحاب نے بھی مثنیٰ کی تجاویز قبول کر لیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عرض کر دیا کہ انہیں مثنیٰ کی امارت پر کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ کو ان کی خواہش کے پیش نظر ان لوگوں کا سردار مقرر کر دیا۔ جنھیں ہمراہ لے کر انہوں نے عراقی حدود میں پیش قدمی کی تھی اور حکم دیا کہ فی الحال وہاں کے عرب قبائل کو ساتھ ملانے اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ کریں، جلد ہی مدینہ سے ایک لشکر بھی ان کی امداد کے لیے روانہ کیا جائے گا جس کی مدد سے وہ مزید پیش قدمی جاری رکھ سکیں گے۔

یہ ہے وہ روایت جسے ہمارے خیال میں دوسری روایات پر ترجیح حاصل ہے، لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ نہ مثنیٰ امداد کی درخواست کرنے کے لیے مدینہ گئے اور نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ ڈیلٹائی علاقے میں پیش قدمی کرتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ آگے جا کر انہیں

ایرانی سپہ سالار ہرمز کی افواج کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی ہرمز اور مثنیٰ کے درمیان جنگ جاری تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی ان واقعات کی خبر ہوگئی۔ وہ اس وقت تک مثنیٰ کے نام سے بالکل بے خبر تھے۔ ان خبروں کے پہنچنے پر جب انہوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ مثنیٰ نے جنگہائے ارتداد کے دوران میں بحرین کے اندر متعدد کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ایک لشکر کے ہمراہ مثنیٰ کی مدد کے لیے عراق جائیں اور ہرمز پر فتح یاب ہو کر عجمی عربوں کے دارالحکومت حیرہ کی جانب کوچ کریں۔ ساتھ ہی عیاض بن غنم کو حکم دیا کہ وہ دومۃ الجندل جائیں اور وہاں کے متمرد باشندوں کو مطیع کر کے حیرہ پہنچیں۔ دونوں قائدوں میں سے جو پہلے حیرہ پہنچ جائے اسی کو اس علاقے میں جنگی کاروائی کرنے والی فوجوں کی قیادت حاصل ہوگی۔ پہلی روایت کے مقابلے میں دوسری روایت ہمارے نزدیک قابل ترجیح نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے سرے سے صحیح ہی نہیں سمجھتے۔ وجہ یہ ہے کہ اس عہد کے متعلق ہمارے پاس جو روایات پہنچی ہیں ان میں بے حد اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ ابتدائی مورخین طبری اور ابن اثیر وغیرہ بھی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کس روایت کو ترجیح دیں اور کسے نہ دیں۔

بعد میں آنے والے بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنی فوجوں کے ہمراہ جب عراق کے ڈیلٹائی علاقوں میں پہنچے تو ان کے سامنے کوئی معین مقصد اور پہلے سے تیار شدہ منصوبہ نہ تھا۔ وہ صرف مثنیٰ کی مدد اور انہیں ایرانیوں کے لشکر سے نجات دلانے کے لیے آئے تھے۔ لیکن جب ابتدائی جنگوں میں انہیں کامیابی نصیب ہوئی تو انہوں نے بہ طورِ خود پیش قدمی کا ایک منصوبہ بنا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اجازت حاصل کیے بغیر حیرہ اور شمالی عراق کی جانب بڑھنا شروع کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں صرف خمس بھیجنے اور انہیں جنگی صورتِ حال سے آگاہ کرنے پر اکتفا کیا۔ لیکن یہ روایت ضعیف معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے مقرر کردہ قائدین کو واضح طور پر یہ احکام بھیج رکھے تھے کہ وہ کسی جنگ سے فارغ ہونے کے بعد اگلا قدم اس وقت تک نہ اٹھائیں جب تک ان سے اجازت نہ حاصل کر لیں۔ جنگ ہائے ارتداد اور بعد میں عراق و شام کی فتوحات کے دور میں دیکھا جاتا ہے کہ تمام قائدین نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا۔ اس لیے ممکن نہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق میں پیش قدمی کرتے وقت یہ واضح و ضروری ہدایت نظر انداز کر دیتے اور بہ طور خود ایک منصوبہ بنا کر خلیفہ کی اجازت حاصل کیے بغیر اس پر عمل شروع کر دیتے۔

⑫
فتح عراق

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی روانگیٔ عراق:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی درخواست پر انہیں ایرانیوں پر حملہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی تھی چنانچہ مثنیٰ نے اپنا قبیلہ ہمراہ لے کر ایک نئے عزم و ولولہ سے عراق پر ہلہ بول دیا اور دریائے دجلہ وفرات کے ڈیلٹائی علاقے میں پے در پے فتوحات حاصل کرنی شروع کیں۔ جب یہ خبریں مدینہ پہنچیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ کو کمک بھیجنا مناسب خیال کیا تاکہ وہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ عراق چلے جائیں اور لشکر کی کمان فی الحال اپنے ہاتھ میں سنبھال لیں۔ عیاض بن غنم کو حکم دیا کہ وہ پہلے دومۃ الجندل جا کر وہاں کے سرکش لوگوں کو مطیع کریں اور وہاں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بہ جانب مشرق حیرہ پہنچیں۔ اگر وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں تو ایرانیوں سے جنگ کرنے والے لشکروں کے سپہ سالار وہ ہوں گے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان کے ماتحت افسر ہو کر کام کریں گے اور اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پہلے پہنچ جائیں تو سپہ سالاری کے فرائض حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ انجام دیں گے اور عیاض ان کے ماتحت ہوں گے۔

عرب عراق کی زمینوں میں بہ طور کاشت کار کام کرتے تھے۔ فصل تیار ہونے پر انہیں بٹائی کا بہت تھوڑا حصہ ملتا تھا۔ اکثر حصہ ان ایرانی زمینداروں کے پاس چلا جاتا تھا جو ان زمینوں کے مالک تھے۔ یہ زمیندار غریب عربوں پر بے حد ظلم توڑتے تھے اور ان کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے سپہ سالاروں کو حکم دے دیا تھا کہ جنگ کے دوران میں ان عرب کاشت کاروں سے نیک سلوک کیا جائے۔ نہ انہیں قتل کیا جائے نہ قیدی بنایا جائے۔ غرض ان سے کسی قسم کی بدسلوکی نہ کی جائے کیونکہ وہ عرب ہیں اور ایرانیوں کے ظلم و جور کی چکی میں پس رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس دلانا چاہیے کہ ان کی مظلومانہ زندگی کے دن ختم ہوئے اور اب وہ اپنے ہم قوم لوگوں کی بدولت حقیقی عدل و انصاف اور

جائز آزادی ومساوات سے بہرہ ور ہوسکیں گے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس حکمت عملی نے مسلمانوں کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ان کی فتوحات کے راستے میں آسانیاں پیدا ہوگئیں اور انہیں یہ خدشہ نہ رہا کہ پیش قدمی کرتے وقت کہیں پیچھے سے حملہ ہو کر ان کا راستہ مسدود نہ ہو جائے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ ایک تو اس کا بہت سا حصہ جنگ یمامہ میں کام آچکا تھا، دوسرے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں ہدایت کی تھی کہ اگر کوئی شخص عراق نہ جانا چاہے، تو اس پر زبردستی نہ کی جائے۔اس کے علاوہ کسی سابق مرتد کو اس وقت تک اسلامی لشکر میں شامل نہ کیا جائے جب تک خلیفہ سے خاص طور پر اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مزید کمک بھیجنے کے لیے لکھا تو انہوں نے صرف قعقاع بن حضرت عمرو تمیمی کو ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا۔لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور انہوں نے عرض کیا:"آپ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے صرف ایک شخص کو روانہ کر رہے ہیں حالانکہ لشکر کا بیشتر حصہ اب ان سے الگ ہو چکا ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:"جس لشکر میں قعقاع جیسا شخص شامل ہو وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا۔"

صرف قعقاع سے یہ بات خاص نہ تھی۔ایک بار عیاض بن غنم نے بھی ان سے مدد مانگی تھی تو انہوں نے عبد بن عوف الحمیری کو ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا تھا اور لوگوں کے استفسار پر وہی جواب دیا تھا جو قعقاع کے بھیجنے پر دیا۔

پھر بھی قعقاع کے ہاتھ آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے لشکر میں شامل ہونے کی ترغیب دیں جو محمد ﷺ کے بعد بہ دستور اسلام پر قائم رہے اور جنھوں نے مرتدین کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا۔(ازدی نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے حضرت خالد بن ولید کے لشکریوں کو نصائح فرمائی تھیں۔حمد وثناء کے بعد انہوں نے لکھا تھا:"میں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق جانے کا حکم دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ وہ اس وقت تک وہاں جنگوں میں مشغول رہیں جب تک میری طرف سے انہیں واپس آنے کا حکم نہ دیا جائے۔تم بھی ان کے ساتھ جاؤ اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کا ثبوت نہ دو۔اچھی طرح جان لو کہ تم نے اپنے لیے جو راستہ چنا ہے اگر حسن نیت سے اس میں قدم اٹھاؤ گے تو اللہ کی طرف سے ثواب عظیم کے مستحق ٹھہرو گے۔جب تم عراق جاؤ تو اس وقت تک وہیں مقیم رہو جب تک واپس آنے کے متعلق میرے احکام تمھیں نہ پہنچیں۔اللہ دنیا وآخرت میں ہمارے اور تمہارے ساتھ ہو اور سب کام اس کی رضا سے انجام پائیں۔والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔"طبری،ابن خلدون اور ابن اثیر نے اس خط کا ذکر نہیں کیا۔)) یہ خط موصول ہونے پر حضرت خالد بن ولید ذ نے اپنے لشکر کو ترتیب دینا شروع کیا۔دو ہزار سپاہ

ان کے پاس موجود تھی۔ قبائل مضر اور ربیعہ سے انہوں نے آٹھ ہزار افراد مہیا کیے اور دس ہزار کی جمعیت کے ہمراہ عراق روانہ ہو گئے۔ حضرت خالد بن ولید سے پہلے جو امراء عراق میں موجود تھے اور جن کی سرکردگی مثنیٰ کر رہے تھے ان کے پاس آٹھ ہزار فوج موجود تھی۔

اس طرح عراق میں لڑنے والی اسلامی فوجوں کی تعداد اٹھارہ ہزار ہو گئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ عراق میں جنگ کا آغاز ابلہ سے کریں جو خلیج فارس پر ایک سرحدی مقام تھا۔ ہندوستان اور سندھ کو جو تجارتی قافلے جاتے تھے۔ وہ یہاں سے سفر شروع کرتے تھے اور ان دونوں ملکوں سے جو تجارتی قافلے عراق آتے تھے سب سے پہلے ابلہ میں قیام کرتے تھے۔ ابلہ کی فتح کے متعلق دو روایتیں مذکور ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں نے ابلہ کو سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتح کیا لیکن بعد میں یہ دوبارہ ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان اس پر پوری طرح قابض ہوئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس کی فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئی، البتہ مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ عراق میں سب سے پہلی جنگ حفیر کے مقام پر لڑی گئی۔ (طبری اور ابن اثیر دونوں میں ابلہ کے متعلق مذکورہ اختلاف کا ذکر ہے۔ ازدی لکھتے ہیں کہ اہل ابلہ سے جنگ کا آغاز سوید بن قطبہ ذہلی نے کیا تھا۔ لیکن ابلہ والوں کی بہادری کے سامنے ان کی پیش نہ جا سکی۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق پہنچ کر سوید سے ملے تو دونوں میں طے پایا۔ دشمنوں پر یہ ظاہر کیا جائے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سوید کو چھوڑ کر مثنیٰ کے پاس چلے گئے ہیں لیکن رات گئے وہ فوج سے لشکر گاہ میں پہنچ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جابلہ میں مقیم ایرانی لشکر نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کو واپس جاتے دیکھا تو خیال کیا کہ یہ اچھا موقع ہاتھ آیا ہے سوید کی فوج ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے یک بارگی بھرپور حملہ کر دیا لیکن رات کے اندھیرے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج سوید سے آ کر مل چکی تھی۔ نتیجتاً ایرانیوں کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اسی قسم کی روایت فتوح البلدان بلاذری میں بھی موجود ہے۔)

ہرمز سے مقابلہ:

ہرمز کی بستی خلیج فارس اور کاظمہ کے سرحدی شہر کے قریب صحرا کے کنارے واقع ہے۔ ایرانیوں کی طرف سے ہرمز اس علاقے کا حاکم تھا۔ جو حسب و نسب اور شرف و عزت میں اکثر امرائے ایران سے بڑھا ہوا تھا۔ ایرانی معززین کی عادت تھی کہ وہ معمولی ٹوپیوں کے بجائے قیمتی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ حسب و نسب اور شرف و عزت میں جو شخص جس مرتبے کا ہوتا تھا اسی مناسبت سے قیمتی ٹوپی پہنتا تھا۔ سب سے بیش قیمت ٹوپی ایک لاکھ درہم کی ہوتی تھی جسے وہی شخص پہن سکتا تھا جس کی بزرگی مسلم الثبوت ہو اور جو شرف و عزت اور توقیع و وجاہت میں کمال درجے کو پہنچا ہوا ہو۔ ہرمز کے مرتبے کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کی ٹوپی کی قیمت بھی ایک لاکھ درہم تھی جسے کوئی کم درجے کا امیر ہرگز نہ پہن سکتا تھا۔ ایرانیوں کے نزدیک تو اس کی

وجاہت مسلم الثبوت تھی لیکن عراق کی حدود میں بسنے والے عرب اسے انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ان عربوں پر تمام سرحدی امراء سے زیادہ سختی اور ظلم کرتا تھا۔ عربوں کی اس سے نفرت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ کسی شخص کی خباثت کا ذکر کرتے ہوئے ہرمز کا نام بہ طور ضرب المثل لینے لگے تھے، چنانچہ کہتے تھے:

فلاں شخص تو ہرمز سے بھی زیادہ خبیث ہے۔

فلاں شخص ہرمز سے بھی زیادہ بدفطرت اور بدطینت ہے۔

فلاں شخص ہرمز سے بھی زیادہ احسان فراموش ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جزیرہ عرب کی حدود میں بسنے والے عرب اپنے بھائیوں پر مظالم کی داستانیں سن کر صبر نہ کرسکتے تھے اور وقتاً فوقتاً ہرمز کے علاقے پر چھاپے مار کر اس کا آرام وسکون برباد کیے رکھتے تھے۔ ہرمز ایک طرف عربوں کے پے در پے چھاپوں اور غارت گری سے عاجز رہتا تھا، دوسری طرف ہندوستان کے بحری قزاق اسے چین سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ وہ کشتیوں میں سوار ہو کر آتے اور اس کے علاقے میں غارت گری کرکے واپس چلے جاتے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یمامہ سے دس ہزار کی جمعیت لے کر عراق روانہ ہوئے تھے۔ عراق کی سرحد پر انہوں نے مثنیٰ کو دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کردیا اور ہر حصہ فوج کو ہدایت کی کہ وہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا حفیر پہنچ جائے۔ پہلا لشکر، جس کے سردار مثنیٰ بن حارثہ تھے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کوچ سے دو روز پہلے روانہ ہوگیا۔ دوسرا لشکر جس کی قیادت عدی بن حاتم کررہے تھے، اگلے روز روانہ ہوا۔ تیسرے روز حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی لشکر لے کر روانہ ہوگئے۔ ان لشکروں کی روانگی سے قبل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہرمز کو ایک خط بھی بھیجا تھا جس میں لکھا تھا:

"تم اسلام لے آؤ۔ امن میں رہو گے۔ اگر یہ بات منظور نہیں تو ذمی بن کر ہماری سلطنت میں شامل ہونا اور جزیہ دینا قبول کرو۔ اگر یہ پیش کش بھی تمھیں منظور نہیں تو بعد میں پچھتانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں تم اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرنا کیونکہ ہم اپنے ساتھ ایک ایسی قوم لارہے ہیں جو موت کی اتنی ہی عاشق ہے جتنے تم لوگ زندگی کے شائق ہو۔"

جب ہرمز کو یہ خط ملا تو اس نے شہنشاہ اردشیر کو پیش آمدہ حالات کی اطلاع دی اور خود لشکر جمع کرکے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے کواظم روانہ ہوگیا۔ راستے میں اسے معلوم ہوا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکروں کو حفیر میں جمع ہونے کی ہدایت کی ہے چنانچہ اس نے حفیر کا رخ کیا اور تیزی سے سفر کرتا ہوا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے پہلے وہاں پہنچ کر پانی پر ڈیرے ڈال دیئے۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو انہیں ایسی جگہ اترنا پڑا جہاں پانی کا نام ونشان تک نہ تھا لوگوں نے ان سے اس مشکل کا ذکر کیا تو فرمایا:

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ اسی جگہ پڑاؤ ڈالو اور دشمن کے ساتھ بے جگری سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ پانی پر آخر اسی فریق کا قبضہ ہوگا جو لڑائی میں استقلال اور صبر و استقامت کا ثبوت دے گا۔"

ہرمز نے میمنہ اور میسرہ پر شاہی خاندان کے دو آدمیوں قباذ اور انوشجان کو متعین کر رکھا تھا لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہرمز اپنی صفوں سے باہر نکلا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دعوت مبارزت دی۔ اسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بہادری، شجاعت، جوانمردی اور عظیم مرتبے کا خوب علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر قابو پا کر انہیں قتل کر دیا تو ایرانیوں کو اگر کامل فتح نہیں تو کم از کم آدھی فتح ضرور حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا اور ان پر قابو پانا آسان نہیں۔ اس لیے اس نے فریب دہی سے کام لیا اور اپنے چند سواروں کو اس کام پر مامور کر دیا کہ جونہی وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو آتا دیکھیں تو فوراً ان پر جھپٹ پڑیں اور قتل کر دیں۔

ادھر جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہرمز کی آواز سنی تو وہ گھوڑے سے اتر کر پیدل ہی اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ قریب پہنچ کر تلوار کھینچی اور ہرمز پر حملہ آور ہوئے۔ اس اثناء میں ہرمز کے مقرر کردہ سواروں نے کمین گاہوں سے نکل کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہا اور ہرمز کو ان کے ہاتھ سے چھڑانا چاہا۔ لیکن مسلمان بھی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ قعقاع بن حضرت عمرو نے جو بہت غور سے دشمن کی حرکات وسکنات جانچ رہے تھے، جونہی ایرانی سواروں کو کمین گاہوں سے نکلتے دیکھا، فوراً اپنے دستے کے ہمراہ ادھر کا رخ کیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی انہیں تلواروں کی باڑوں پر رکھ لیا۔ اس دوران میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک دو واروں کے بعد ہرمز کی گردن اڑا دی اور اپنی صفوں میں واپس چلے آئے۔

اب دونوں فوجوں میں دست بہ دست جنگ شروع ہو چکی تھی لیکن اپنے سپہ سالار کے مارے جانے کی وجہ سے ایرانیوں کی کمر ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک مسلمانوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور شکست کھا کر بھاگنے لگے۔

مسلمانوں نے رات کے اندھیرے میں ان کا تعاقب کیا اور دریائے فرات کے بڑے پل (جسر اعظم) تک جہاں آج کل بصیر آباد ہے انہیں قتل کرتے چلے گئے۔ ان مفرورین میں قباذ اور انوشجان بھی شامل تھے جنھیں ہرمز نے میمنہ اور میسرہ کا سردار مقرر کر رکھا تھا۔

دشمنوں پر پوری طرح قابو پانے کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے معقل بن مقرن المزنی کو ابلہ جا کر مال غنیمت اور قیدیوں کو اکٹھا کرنے کا حکم دیا اور مثنیٰ بن حارثہ کو شکست خوردہ مفرور لشکر کا پیچھا کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ معقل نے ابلہ کا رخ کیا (بعض مورخین معقل کے ابلہ جانے کا واقعہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ مسلمانوں نے ابلہ کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتح کیا۔ اس کے برعکس بعض مورخین کا بیان ہے کہ معقل نے ابلہ کو فتح کر لیا تھا لیکن بعد ازاں اسے ایرانیوں

نے واپس لے لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عرب دوبارہ اس پر قابض ہو گئے۔ موخر الذکر روایت اور سوید بن قطبہ کے ہاتھوں ابلہ کی تسخیر کی روایت میں (جو ہم پہلے درج کر چکے ہیں) تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ سوید بن قطبہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اعانت سے ابلہ فتح کیا اور معقل نے جنگ کاظمہ کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق مالِ غنیمت جمع کرنے اور قیدی اکٹھے کرنے پر اکتفا کیا ہو۔))

اور مثنیٰ ہزیمت خوردہ لشکر کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔

اثنائے تعاقب میں مثنیٰ کا گزر ایک قلعے کی جانب ہوا جس میں ایک ایرانی شہزادی رہتی تھی۔ اسی مناسب سے مورخین عرب اسے حصن المراۃ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس قلعے کے کچھ فاصلے پر اس کے خاوند کا بھی ایک قلعہ تھا۔ مثنیٰ نے اپنے بھائی معنیٰ بن حارثہ کو تو شہزادی کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا اور خود اس کے خاوند کے قلعے کا محاصرہ کر کے اسے شکست فاش دی۔ اس کے بعد بہ دستور ہزیمت خوردہ لشکر کا پیچھا شروع کر دیا۔ جب شہزادی کو اپنے خاوند کی شکست کا حال معلوم ہوا تو اس نے معنیٰ سے مصالحت کر کے اس سے شادی کر لی۔

عراق کی اس سب سے پہلی لڑائی کو غزوہ ذات السلاسل کا بھی نام دیا جاتا ہے کیونکہ اس جنگ میں ایرانیوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں جکڑ لیا تھا کہ کوئی بھی شخص میدان جنگ سے فرار نہ ہو سکے لیکن بعض لوگ اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے اور اسے جنگ کاظمہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ یہ جنگ کاظمہ کے قریب لڑی گئی تھی۔

جنگ کاظمہ دوررس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ اس لڑائی نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ ایرانی جن کی سطوت وصولت کا شہرہ ایک عرصے سے سننے میں آ رہا تھا، اپنی پوری طاقت کے باوجود ان کی معمولی فوج کے مقابلے میں بھی نہ ٹھہر سکے۔ ان کا سردار ہرمز حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا اور ہزاروں سپاہیوں کو میدان جنگ میں کٹوا کر آخر انہیں فرار ہوتے ہی بن پڑی۔ اس جنگ میں مالِ غنیمت کی جو مقدار ان کے ہاتھ لگی اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہتھیاروں کے علاوہ ہر سوار کے حصے میں ایک ہزار درہم آئے تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح کی ایک بڑی وجہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وہ پالیسی بھی تھی جو انہوں نے عراق کے کاشت کاروں کے بارے میں وضع کی تھی اور جسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سختی سے لباس عمل پہنایا تھا۔ اس پالیسی کے تحت انہوں نے کاشت کاروں سے مطلق تعرض نہ کیا۔ جہاں جہاں وہ آباد تھے انہیں وہیں رہنے دیا اور جزیے کی معمولی رقم کے سوا اور کسی قسم کا تاوان یا ٹیکس ان سے وصول نہ کیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ اس کے ساتھ ہرمز کی بیش قیمت ٹوپی اور ایک ہاتھی بھی جسے مسلمانوں نے لڑائی کے دوران میں پکڑا تھا بھیج دیئے۔ اہل مدینہ کو اس سے قبل ہاتھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ مدینہ والوں کا تو ذکر ہی کیا عرب کے کسی

اور باشندے نے بھی ابرہہ کے ہاتھی کے سوا آج تک ہاتھی کی صورت نہ دیکھی تھی۔ اس لیے جب عراق سے آئے ہوئے ہاتھی کے مہاوت نے اسے مدینہ کی گلیوں میں پھرایا تو اس عجیب وغریب جانور کو دیکھ کر اہل مدینہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مخلوق کس قسم کی ہے بعض عورتیں حیران ہو کر پوچھتی تھیں کہ کیا یہ جانور واقعی اللہ کی مخلوقات میں سے ہے۔ بعض عورتوں کا خیال تھا کہ ایرانیوں کا بنایا ہوا عجوبہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہاتھی کے مدینہ میں رکھنے کا کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ اس لیے انہوں نے اسے اس کے مہاوت کے ہمراہ عراق واپس بھیج دیا۔

اس فتح یابی نے مسلمانوں کی ہمتوں کو دو چند کر دیا تھا اور ان میں ایک نیا عزم اور ولولہ پیدا ہو چکا تھا۔ مثنیٰ شیبانی تیزی سے شکست خوردہ مغرور ایرانیوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان لوگوں کے مدائن پہنچنے سے پہلے پہلے ان کا مکمل طور پر صفایا کر دیا جائے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ انہیں مدائن سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کے مقابلے کے لیے ایرانیوں کے ایک عظیم الشان لشکر کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی۔ یہ لشکر شہنشاہ اردشیر نے اصل میں ہرمز کا خط ملنے پر ترتیب دیا تھا اور اپنے ایک سالار قارن بن قریانس کو اس کا سردار مقرر کیا تھا۔ قارن لشکر لے کر مدائن سے روانہ ہو چکا تھا کہ راستے میں اسے قباذ اور انوشجان ملے جو ہرمز کے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ اس نے ان کی ہمت بندھائی اور اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔ کچھ دور آگے بڑھ کر اس لشکر نے مذار میں پڑاؤ ڈالا جو ایک ندی کے کنارے واقع ہے دجلہ اور فرات کو آپس میں ملاتی ہے۔

جنگ مذار:

جب مثنیٰ کو قارن کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو انہیں خیال پیدا ہوا کہ اتنے عظیم الشان لشکر سے اکیلے مقابلہ کرنا اپنی شکست کو دعوت دینا اور سخت خطرہ مول لینے کے مترادف ہوگا۔ انہوں نے اپنے لشکر کے ہمراہ مذار کے قریب ہی ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھ کر تمام حالات سے مطلع کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس اندیشے کے تحت کہ کہیں قارن مثنیٰ کی قلیل فوج پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد نہ کر دے، اپنی فوج کو فوری تیاری کا حکم دیا اور تیزی سے سفر کرتے ہوئے مذار پہنچ گئے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا اندیشہ صحیح تھا۔ قارن اس دوران میں برابر مثنیٰ کے لشکر پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہا لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اچانک مذار پہنچ جانے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اصل میں ہرمز کے لشکر کی شکست نے ایرانیوں کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی اور ہر شخص مسلمانوں سے انتقام لینے کے درپے تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مثنیٰ کے کمزور لشکر کو شکست دے کر جذبہ انتقام کو تسکین دے سکیں گے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مذار پہنچ جانے سے ایرانیوں کو تشویش ضرور ہوئی لیکن ان کے جذبہ انتقام میں کوئی کمزوری نہ آئی۔ قباذ اور انوشجان نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذلت و

رسوائی کا وہ داغ دھونا چاہا جو معرکہ حفیر میں شکست کھانے اور میدان جنگ میں بری طرح فرار ہونے کی وجہ سے ان پر لگا تھا۔ انہوں نے اپنے لشکر کی ہمت بندھانی شروع کی اور ان کے جذبہ انتقام کو بھڑکا کر ایک بار پھر مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے تیار کر دیا۔ ان دو شخصوں اور قارن کا خیال تھا کہ اگر وہ اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے غیر منظم اور غیر مرتب لشکر پر حملہ کر دیں تو یقیناً مسلمانوں کو شکست دے کر انہیں جزیرہ عرب کی جانب پسپا کر سکتے ہیں اور اس طرح ایرانی قوم اور کسریٰ کی نظروں میں سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب ایرانی لشکر کو جنگ کی تیاری کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی لشکر کو فوری تیاری کا حکم دے دیا اور ایرانیوں کو موقع نہ دیا کہ وہ ان کے غیر مرتب و غیر منظم لشکر پر حملہ کر سکیں۔ جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس مقولے کی عملی تصویر ایرانیوں کے سامنے آگئی کہ میں ایسے لوگوں کو لے کر تمہارے پاس آرہا ہوں جو موت کے اتنے ہی عاشق ہیں جتنے تم زندگی کے۔ مسلمان اس بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ ان کے سامنے ایرانیوں کی کوئی پیش نہ جاتی تھی۔ مسلمانوں کی تلواریں بڑی بے دردی سے ایرانیوں کے سر اڑا رہی تھیں۔ قارن، قباذ اور انوشجان جن کے سپرد تمام ایرانی افواج کی کمان تھی اور جنہیں بہادری اور شجاعت پر ناز تھا ایک ایک کر کے مسلمان سرداروں کے سامنے آئے لیکن اپنے آپ کو قتل ہونے سے نہ بچا سکے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تینوں سردار تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔

اپنے بڑے بڑے سرداروں اور سرداران فوج کو ایسی بری طرح قتل ہوتے دیکھ کر ایرانی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کی گھبراہٹ اور بے چینی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انہیں گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ایرانیوں میں شکست کے آثار تو پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے، اس نئے حملے نے ان کے ہوش و حواس بالکل معطل کر دیئے اور تھوڑی دیر میں وہ لشکر کے سامنے بری طرح بھاگ رہے تھے۔ تیس ہزار ایرانی اس میدان جنگ میں قتل ہوئے۔ اگر ایرانی فوج کا بیشتر حصہ کشتیوں میں سوار ہو کر، جس کا انتظام انہوں نے پہلے ہی سے کر رکھا تھا پار نہ اتر جاتا یا بیچ میں نہر حائل نہ ہوتی تو اس دن مسلمانوں کے ہاتھوں ایک بھی ایرانی بچنا غیر ممکن تھا۔ فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کچھ عرصے کے لیے مذار ہی میں مقیم ہو گئے غنیمت کا پانچواں حصہ فتح کی خوشخبری کے ساتھ سعید بن نعمان کے ہاتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ ارسال کر دیا۔

جنگ کے بعد لڑائی میں حصہ لینے اور ایرانی فوج کی حمایت کرنے والوں کو مع اہل و عیال کے قید کر لیا گیا۔ ان قیدیوں میں ابوالحسن بصری بھی شامل تھے۔

جہاں لڑائی میں شامل ہونے والوں اور ان کے مددگاروں پر اس قدر سختی کی گئی وہاں عام رعایا سے بے حد نرمی کا سلوک کیا گیا۔ کاشت کاروں اور ان تمام لوگوں کو جنھوں نے جزیہ دینے کا اقرار کر لیا تھا کچھ نہ کہا گیا اور انہیں ان کی زمینوں اور جگہوں پر برقرار رکھا گیا۔

ابتدائی امور سے فراغت حاصل کر کے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ علاقے کے نظم و نسق کی

طرف توجہ کی۔ علاقے کے تمام لوگ ذمی قرار پائے اور ان پر جزیہ لگایا گیا۔ جزیہ وصول کرنے کے لیے جابجا عمال مقرر کیے گئے۔ مفتوحہ علاقے کی حفاظت کے لیے انہوں نے حفیر اور جسر اعظم پر فوجیں متعین کر رکھی تھیں، ان کا انتظام اور بہتر بنایا گیا اور فوجوں کے تمام دستوں کو مختلف افسروں کے زیر نگرانی دے کر انہیں دشمن کی خفیہ و اعلانیہ سرگرمیوں سے خبردار رہنے اور موقع پڑنے پر ان کا مقابلہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جنگی مہارت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ سرزمین ایران میں ان کی پیش قدمی کے آغاز ہی سے کسریٰ کی طاقت ور فوجیں مغلوب ہونی شروع ہوگئیں اور ان کے دم خم، حوصلے اور ولولے سب سرد پڑ گئے۔ جنگ مذار حیرہ سے کچھ ہی فاصلے پر ہوئی تھی۔ حیرہ خلیج فارس اور مدائن کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔

جنگ ولجہ:

ایرانیوں نے کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر ان عربی قبائل کو ساتھ ملانا چاہا جو دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے میں عراق کی سرحدوں کے قریب آباد تھے۔ ان میں سے اکثر قبائل عیسائی تھے جنھیں ایرانی سرتوڑ کوشش کے باوجود مجوسی مذہب قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکے تھے۔ جب مسلمان اس سرزمین میں وارد ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ بہ صورت دیگر جزیے کا مطالبہ کیا۔ ان کا فائدہ سراسر جزیہ قبول کرنے میں تھا کیونکہ اس طرح وہ اپنی آزادی بہ دستور برقرار رکھ کر ان مراعات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل تھیں، لیکن مدت دراز تک ایرانیوں کی عملداری میں رہنے کے باعث وہ ان کے احکام سے سرتابی کی جرأت نہ کر سکے۔ عراق میں عیسائیوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ بکر بن وائل تھا۔ کسریٰ اردشیر نے انہیں طلب کیا اور ان کی ایک فوج مرتب کر کے انہیں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے ولجہ کی جانب روانہ کر دیا۔ لیکن اس خیال سے کہ مسلمانوں پر فتح یابی کا فخر کلیتہً عیسائی عربوں کے حصے میں نہ آئے، اپنے ایک بہت بڑے سپہ سالار بہمن جاذویہ کو بھی ایک بھاری لشکر کے ہمراہ ان کے پیچھے پیچھے روانہ کر دیا۔ عیسائی لشکر نے حیرہ اور ولجہ کے درمیان بسنے والے دوسرے عرب قبائل اور کاشت کاروں کو بھی ساتھ ملا لیا اور اس طرح عربوں کا ایک عظیم الشان لشکر اپنے ہی اہل وطن سے لڑنے کے لیے روانہ ہوگیا جس کے پیچھے ایرانیوں کی ایک بھاری جمعیت بھی چلی آ رہی تھی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مذار میں یہ خبریں پہنچیں۔ انہوں نے اپنے تمام فوجی افسروں کو، جو حفیر، کاظمہ اور عراق کے دوسرے حصوں میں موجود تھے، کہلا بھیجا کہ وہ دشمن کی کارروائیوں سے خبردار رہیں اور اس دھوکے میں نہ آئیں کہ ماضی میں چونکہ بعض عظیم فتوحات حاصل ہو چکی ہیں اس لیے اب دشمن ان کے مقابلے میں سر اٹھا ہی نہیں سکتا۔ وہ خود لشکر لے کر کسریٰ کی بھیجی ہوئی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ولجہ روانہ ہوگئے اور دشمن کی فوجوں کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ چونکہ دونوں فریق طاقت و قوت اور عزم و ارادہ میں

ایک دوسرے سے کسی طرح پیچھے نہ تھے اس لیے خاصے وقت تک فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ زیادہ دیر تک یہ صورت حال برداشت نہ کر سکے اور لشکر کے دوسرے سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنا دستہ لے کر فوج سے علیحدہ ہو جائیں اور دشمن کی صفوں کے پیچھے جا کر چھپ جائیں۔ جب لڑائی شروع ہو تو وہ دشمن پر اچانک پیچھے کی طرف سے حملہ کر کے اس کا تیاپانچا کر دیں۔ لیکن ان دستوں کو کمین گاہوں کے اندر چھپنے میں دیر لگ گئی جس کے باعث وہ وقت مقررہ پر میدانِ جنگ میں پہنچ کر دشمن پر حملہ آور نہ ہو سکے۔

جنگ میں کبھی مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو جاتا اور وہ دشمن کو پیچھے دھکیل دیتے اور کبھی دشمن کا زور بڑھ جاتا اور وہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے۔ آخر عین اس وقت جب فریقین میں سے کسی کو بھی واضح فیصلے کا یقین نہ تھا اور دونوں مایوس ہو کر اپنے اپنے کیمپوں میں واپس جانے اور اگلے روز کی لڑائی کے لیے تیاری کرنے والے تھے، اسلامی فوجوں کے دستے کمین گاہوں سے نکلے اور عقب سے کسریٰ کے لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ ایرانی پہلے ہی مسلمانوں کی زبردست مقاومت سے گھبرائے ہوئے تھے۔ یہ نئی مصیبت دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے اور حوصلہ ہار بیٹھے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوجوں نے سامنے اور کمین گاہون سے نکل کر آنے والے دستوں نے پیچھے دشمن کو گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

جنگ اِلّیس:

اس شکست نے، جو قبیلہ بکر بن وائل کو اپنے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں کے ہاتھ اٹھانی پڑی تھی، عراق کے عربی النسل لوگوں کو آتش زیر پا کر دیا۔ انہوں نے طیش میں آ کر مسلمانوں سے ایک بار پھر جنگ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنا سردار بنو عجلان کے ایک شخص عبدالاسود عجلی کو بنایا اور حیرہ ابلہ کے درمیان مقام الیس پر فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ ساتھ ہی دربار ایران سے مدد کی درخواست بھی کی۔ وہاں سے بہمن جاذویہ کو حکم ملا کہ وہ بھارتی جمعیت کے ساتھ عیسائیوں کی مدد کو پہنچے۔ یہ احکام ملنے پر بہمن جاذویہ نے مناسب خیال کیا کہ وہ مسلمانوں سے فیصلہ کن مقابلہ کے لیے شہنشاہ اردشیر سے بالمشافہ گفتگو کرے۔ اس نے فوج کی کمان ایک سردار جابان کے سپرد کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ فوج لے کر الیس پہنچ جائے لیکن جہاں تک ممکن ہو دربارِ ایران سے اس کی واپسی تک جنگ کا آغاز نہ کیا جائے۔ خود وہ شہنشاہ سے مشورہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شہنشاہ اردشیر بیمار ہے۔ وہ وہیں ٹھہر گیا لیکن جابان کو کوئی ہدایت نہ بھیجی۔ ادھر جابان نے الیس پہنچ کر عیسائی فوجوں کے متصل پڑاؤ ڈال دیا اور انہیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے متعلق مشورہ دینے لگا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا کہ عیسائیوں کی مدد کے لیے ایرانیوں کا لشکر بھی جابان کے زیر سرکردگی میدان جنگ میں موجود ہے۔ انہیں صرف عربی النسل عیسائیوں کے مقام الیس میں اجتماع کی خبر ملی تھی۔ وہ اپنا لشکر لے کر حفیر پہنچے اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ان کے مقرر کردہ عمال وہاں کا نظم و نسق

کامیابی سے چلا رہے ہیں اور پشت کی جانب سے کسی حملے کا اندیشہ نہیں، دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ الیس پہنچتے ہی انہوں نے عیسائیوں کو تیاری کا موقع دیئے بغیر ان سے لڑائی چھیڑ دی۔ یہ حملہ اس قدر اچانک ہوا کہ عیسائی بالکل نہ سنبھل سکے اور پہلے ہی ہلے میں ان کا سالار مالک بن قیس مارا گیا۔ جب جابان نے محسوس کیا کہ عیسائیوں کی صفوں میں اضطراب پیدا ہونے لگا تو وہ ایرانی فوج کا ایک دستہ لے کر آگے بڑھا اور جوش انگیز جملوں سے عیسائیوں کی ہمت بندھانے اور انہیں جم کر مسلمانوں کا مقابلے کی تلقین کرنے لگا۔ اس کے مقرر کیے ہوئے آدمی عیسائیوں کی صفوں میں اعلان کرتے پھرتے تھے کہ بہمن جاذویہ ان کی مدد کے لیے عنقریب ایک لشکر جرار لے کر پہنچنے والا ہے۔ اس کے آنے تک پامردی سے مسلمانوں کا مقابلہ جاری رکھیں اور تمام خطرات کو نظر انداز کر کے بہادروں کی طرح میدانِ جنگ میں ڈٹے رہیں۔ چنانچہ عیسائی سنبھل گئے اور انہوں نے بڑی جرأت و بہادری سے مسلمانوں کے پیہم حملوں کو روکنا اور ان کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہ عزم و ثبات اور صبر و استقلال دیکھ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حیران رہ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کو جوش دلایا کہ وہ ایک بار پھر بھرپور طاقت وقوت سے دشمن پر حملہ شروع کریں۔

عیسائیوں کو لڑتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان کی امیدوں کا واحد سہارا بہمن جاذویہ تھا کیونکہ اس کے آنے تک ایرانی فوج ان سے مل کر جنگ میں حصہ نہ لے سکتی تھی۔ لیکن بہمن کا کہیں پتا نہ تھا۔ جابان بھی حیران تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ادھر مسلمانوں کا دباؤ برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا اور ان کے مقابلے میں عیسائیوں کی کوئی پیش نہ جا رہی تھی۔ آخر دشمن کی طاقتوں نے جواب دے دیا۔ ایک ایک کر کے ان کی صفیں ٹوٹنے لگیں اور وہ میدان جنگ سے فرار ہونے لگے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر فوج میں اعلان کر دیا کہ بھاگنے والوں کا تعاقب کیا جائے اور انہیں زندہ پکڑ کر ان کے سامنے حاضر کیا جائے۔ صرف اسی شخص کو قتل کیا جائے جو کسی طرح قابو میں نہ آئے اور مزاحمت پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ مسلمانوں اور ان کے مددگار عراق میں عربوں نے، جو اسلامی فوج میں شامل تھے، ایسا ہی کیا اور عیسائی گروہ در گروہ میدانِ جنگ میں لائے جانے لگے۔

جابان کی ایرانی فوجوں نے جنگ شروع ہونے سے پہلے کھانا تیار کیا تھا اور وہ اطمینان سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مسلمان بلائے ناگہانی کی طرح ان پر آ پڑے اور وہ کھانا اسی طرح چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج سے کہا:

"یہ کھانا اللہ نے تمہارے لیے تیار کرایا تھا اب تم مزے سے اسے کھاؤ۔"

مسلمان دستر خوانوں کے اردگرد بیٹھ گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ عجیب عجیب کھانے تھے جنھیں مسلمانوں نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ چکھا تھا۔ وہ کھاتے جاتے تھے اور اللہ کا شکر ادا کرتے جاتے تھے۔ جس نے انہیں بے مانگے ان نعمتوں سے نوازا تھا۔ الیس کے قریب دریائے فرات اور دریائے بادقلی کے سنگم پر ایک شہر مغیشیا یا منیشیا آباد تھا جو آبادی کی کثرت ... اس کے

باشندوں نے بھی جنگ الیس میں عیسائیوں اور ایرانیوں کی مدد کی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس قصبے کا رخ کر کے اسے فتح کیا۔ یہاں سے بھی مسلمانوں کو کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مالِ غنیمت میں سے ہر سوار کے حصے میں علاوہ اس حصے کے جو الیس میں ملا تھا پندرہ سو درہم آئے۔

اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اور ان جنگوں میں گرفتار ہونے والے قیدی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کر دیئے۔ انہیں کے ہمراہ بنی عجل کے ایک شخص جندل کو بھی بھیجا جس نے الیس کی فتح، مالِ غنیمت، قیدیوں کی کثرت اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کارناموں کا حال بالتفصیل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا۔ یہ واقعات سن کر انہوں نے فرمایا:

''عورتیں اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسا شخص پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔''

انہوں نے جنگ الیس کے قیدیوں میں سے ایک لونڈی جندل کو مرحمت فرمائی اور سلطنت کے تمام حصوں میں قاصد روانہ کیے جنھوں نے قریہ بہ قریہ پھر کر لوگوں کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور لشکر اسلام کی فتوحات اور عظیم الشان کارناموں سے آگاہ کیا۔ قدیم مورخین کے بیان کے مطابق ان جنگوں میں دشمن کے مقتولوں کی تعداد ستر ہزار تھی۔

بعض مورخین نے الیس اور امغیشیا کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ان جنگوں میں مسلمانوں نے انتہائی قساوت قلبی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کاش! یہ واقعات، جو تاریخ میں بیان کیے گئے ہیں، غلط ہوتے گو بظاہر انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا کیونکہ کئی راویوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی تہذیب ابھی تک اس بلند مقام تک نہیں پہنچی جہاں وہ اپنے آپ کو ہر قسم کی بہیمیت سے کاملاً مصئون و مامون کر سکے۔ گو زبان سے اس کا اقرار نہیں کیا جاتا لیکن درحقیقت آج بھی وحشت و بربریت کا شمار ان اسباب میں ہوتا ہے جنھیں تہذیب و تمدن کی استواری میں ممد و معاون خیال کیا جاتا ہے۔ آج بھی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے جنگ کا وجود ناگزیر قرار دیا جاتا ہے۔ وہی قومیں اقوام عالم کی نظروں میں سر بلند سمجھی جاتی ہیں جو ہلاکت خیز ہتھیاروں کی تیاری میں اپنی مدِمقابل قوموں سے کسی طرح کم تر نہ ہوں اور جو قوم جنگی تیاریوں میں کوتاہی برتتی ہے اس کا شمار پست اور غیر ترقی یافتہ اقوام میں کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کی روشنی میں اگر کوئی سپہ سالار دورانِ جنگ میں اپنے مدمقابل سے جابرانہ طور سے پیش آتا ہے اور خونریزی کے لیے غیر معمولی طریقے استعمال کرتا ہے تو انسانی سرشت کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی اہم اور قابل اعتراض بات نہیں۔

بعض اوقات سپہ سالار اس خدشے کے پیش نظر سختی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مدِمقابل کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو وہ آئندہ چل کر اس کے لیے دوبارہ خطرے کا باعث بن جائے گا، اس لیے وہ بدعہدی اور بغاوت کے ہر امکانی خطرے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی غرض سے میدان جنگ میں بے دردانہ دشمنوں کا قتل

عام کرتا ہے اور ان کے ولولوں کو سرد کر کے انہیں دوبارہ سر اٹھانے کے ناقابل بنا دیتا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔

مذار اور حفیر میں ایرانیوں کو جو عبرت ناک شکست اٹھانی پڑی تھی اس کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے عراق میں مقیم عربی النسل عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما کر دیا اور اس طرح الیس کا معرکہ پیش آیا۔ فتح یاب ہونے پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ ایرانیوں اور ان کے مددگاروں کی جنگی روح کو بالکل کچل دیا جائے کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکیں۔ اس غرض سے انہوں نے جو طریقے استعمال کیے ان کے باعث واقعی ایرانیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ کسریٰ اردشیر کو جو اس وقت بیمار تھا۔ اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کے اثر سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور نہایت حسرت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حیرہ:

اردشیر کی موت سے ایرانی دوگونہ مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف شہنشاہ کی موت کا صدمہ دوسری طرف صحرائے شام اور دریائے دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے میں مسلمانوں کی روز افزوں پیش قدمی۔ ان پر یاس و نومیدی کا غلبہ تھا اور وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے مقابلے کی طاقت نہ پاتے تھے۔ اپنے علاقوں سے مسلمانوں کو نکالنا انہیں ناممکن نظر آتا تھا۔ پھر بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایرانیوں کی اس پژمردگی سے کسی قسم کے دھوکے میں مبتلا نہ ہوئے اور ایرانیوں پر عظیم فتوحات حاصل کرنے کے باوجود اپنی قوت و طاقت پر نازاں نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ عیسائی قبائل جنھیں، ایرانیوں نے مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر الیس کے میدان میں مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما کر دیا تھا، اگرچہ اس وقت خاموش ہیں لیکن غیظ و غضب اور انتقام کی آگ ان کے دلوں میں بدستور بھڑک رہی ہے اور مناسب موقع آنے پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گی، اس لیے اگر اسی وقت بغاوت اور سرکشی کے ان جراثیم کا پوری طرح قلع قمع نہ کیا گیا اور جزیرہ عرب کو جانے والے تمام راستوں کی حفاظت نہ کی گئی تو آئندہ مسلمانوں کو عظیم خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ حیرہ پر جلد از جلد تسلط حاصل کرنا چاہیے تاکہ دریائے فرات کے مغرب سے جزیرہ نمائے عرب کی حدود تک سارا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آجائے اور انہیں پشت کی جانب سے کسی حملے کا اندیشہ نہ رہے۔

اس زمانے میں حیرہ کا حاکم ایک ایرانی مرزبان، آزاذبہ، تھا پچیس سال پیشتر عراقی عربوں کا یہ دارالحکومت اپنی اس شان و شوکت سے محروم ہو چکا تھا جو اسے عربوں کی حکومت کے زمانے میں نصیب ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ لخمیوں کا (جنھوں نے دوسری صدی عیسوی میں بہ مقام حیرہ اپنی سلطنت قائم کی تھی اور جو صدیوں تک یہاں حکمران رہے) طائیوں سے زبردست اختلاف پیدا ہو گیا اور دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ کسریٰ

نے جنگ وجدل کے اس سلسلے سے فائدہ اٹھانا چاہا اور لخمی بادشاہ نعمان بن منذر کے خلاف طائیوں کی مدد کر کے نعمان کو قتل کر ڈالا اور ایاس بن قبیصۃ الطائی کو حیرہ اور اس کے گردونواح کا حاکم بنا دیا۔ ابھی ایاس کو حاکم بنے چند ہی سال ہوئے تھے کہ ذوقار کے مقام پر بنو بکر بن وائل نے ایرانیوں کے ایک لشکر کو جسے ایاس کی پشت پناہی حاصل تھی، شکست دے دی جس کے نتیجے میں ایاس کو حکومت سے ہاتھ دھونے پڑے اور کسریٰ نے اپنی طرف سے ایک شخص کو حیرہ کا مرزبان (حاکم) بنا دیا۔ اس طرح حیرہ اپنی شان وشوکت سے محروم ہوگیا۔ پھر بھی عربوں کو اس سے دلی تعلق تھا اور وہ اس کی شان وشوکت دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے خلاف ان عیسائیوں کا غیظ وغضب دیکھا تو انہیں خدشہ پیدا ہوگیا کہ مبادا بنو بکر وائل طائیوں اور حیرہ میں مقیم دوسرے عربوں کو قومی عصبیت کی بنا پر ساتھ ملا کر ان کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور پیچھے سے ان کا راستہ کاٹنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے انہوں نے حیرہ کے مقام پر حملے کر کے اس پر قابض ہونے اور اسے اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ادھر اہل حیرہ بھی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ انہیں الیس اور امغیشیا کے معرکوں کا مفصل حال معلوم ہو چکا تھا اور یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوجوں کا رخ ان کی جانب پھرے گا۔ حاکم حیرہ نے پہلے ہی سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حیرہ پہنچنے کے لیے دریائی راستہ اختیار کریں گے اور امغیشیا سے کشتیوں میں سوار ہو کر حیرہ پہنچیں گے۔ وہ اپنی فوج لے کر حیرہ سے باہر نکلا اور اپنے بیٹے کو دریائے فرات کا پانی روکنے کا حکم دیا تاکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی کشتیاں دریا میں پھنس جائیں اور آگے نہ بڑھ سکیں۔

آزاذبہ کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ امغیشیا سے کشتیوں میں سوار ہوئے اور بہ جانب شمال حیرہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ انہوں نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی تھی کہ دریا خشک ہوگیا اور تمام کشتیاں کیچڑ میں پھنس گئیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بے حد تعجب ہوا انہوں نے ملاحوں سے اس کا سبب پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ اہل فارس نے دریا پر بند باندھ کر اس کا پانی روک لیا ہے اور سارا پانی دریا سے نکلنے والی نہروں میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ معلوم کر کے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کشتیوں کو تو وہیں چھوڑا اور خود فوج کا ایک دستہ لے کر دریائے فرات کے دہانے کی طرف بڑھے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ آزاذبہ کا لڑکا دہانے پر کھڑا دریا کا رخ پھیرنے کے کام کی نگرانی کر رہا ہے۔ انہوں نے اچانک اس پر حملہ کر کے اسے اور اس کی فوج کو قتل کر ڈالا اور بند توڑ کر دریا میں دوبارہ پانی جاری کر دیا۔ وہ خود اپنے سواروں کے ہمراہ کھڑے ہو کر اس کام کی نگرانی کرتے رہے۔ کشتیوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا اور اسلامی لشکر لے کر خورنق پہنچ گئیں جہاں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے لشکر کو اترنے کا حکم دیا اور خورنق کے مشہور محل کے سامنے خیمہ زن ہوگئے۔

آزاذبہ حاکم حیرہ کو اپنے بیٹے کے قتل اور اردشیر کی وفات کی خبر ایک ساتھ ملی۔ اس نے اپنی

خیریت اسی میں سمجھی کہ وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے آنے سے پیشتر بھاگ کر جان بچالے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ادھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مکمل تیاری کے بعد فوج لے کر حیرہ کی جانب بڑھے۔ پہلے خورنق اور نجف پر قبضہ کیا جہاں گرمیوں کے موسم میں حیرہ کے امراء آ کر ٹھہرتے تھے۔ اس کے بعد حیرہ کے سامنے پہنچ کر ڈیرے ڈال دیئے۔ اگرچہ آزاذ بہ جان بچا کر حیرہ سے بھاگ گیا تھا لیکن اہل حیرہ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ شہر کے چار قلعوں میں محصور ہو کر بیٹھ گئے اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان قلعوں کا سختی سے محاصرہ کر لیا اور انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنا شروع کیا۔ جب یہ لوگ کسی طرح صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں کہلا بھیجا کہ اگر انہوں نے ایک دن کے اندر اندر ہتھیار نہ ڈالے اور ان کی پیش کردہ تین باتوں میں سے ایک یعنی اسلام جزیہ یا جنگ قبول نہ کی تو انہیں بالکل تہس نہس کر دیا جائے اور ان کی تباہی کی ذمہ داری انہیں پر ہوگی۔

لیکن ان لوگوں نے صلح کی بات چیت کرنے کے بجائے اسلامی فوجوں پر سنگ باری شروع کر دی۔ مسلمان بھی جواب میں ایرانیوں پر تیروں کا مینہ برسانے لگے۔ جس سے ان کے بے شمار آدمی ہلاک ہو گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اہل حیرہ بہت گھبرائے۔ شہر میں پادریوں اور راہبوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ انہوں نے ایرانی سرداروں سے فریاد کی کہ اس خون ریزی کی ساری ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا کے لیے سنگ باری بند کر دو اور لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔

کوئی چارہ کار اور راہ فرار نہ دیکھ کر قلعوں کے سرداروں نے صلح پر آمادگی ظاہر کی۔ انہوں نے اسلامی فوج کے سرداروں کو کہلا بھیجا کہ ہم آپ کی پیش کردہ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے براہِ کرم تیر اندازی بند کر دیں اور اپنے سپہ سالار کو اس کی اطلاع دے دیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے تیر اندازی بند کر دی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مطلع کر دیا کہ اہل حیرہ صلح کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے پاس آنے کی اجازت دے دی۔

اپنے وعدے کے مطابق سرداران حیرہ اپنے اپنے قلعوں سے نکل کر معززین شہر کے ہمراہ اسلامی لشکر کے سرداروں کے پاس پہنچے جنھوں نے انہیں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس روانہ کر دیا۔ حضرت خالد بن ولید باری باری قلعے کے لوگوں سے ملے اور انہیں ملامت کرتے ہوئے فرمایا:

''تم پر افسوس! تم نے اپنے آپ کو کیا سمجھ کر ہم سے مقابلہ کیا۔ اگر تم عرب ہو تو کس وجہ سے تم اپنے ہی ہم قوم لوگوں کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اگر عجمی ہو تو کیا تمہارا یہ خیال تھا کہ تم ایک ایسی قوم کے مقابلے میں جیت جاؤ گے جو عدل و انصاف میں نظیر نہیں رکھتی؟''

سرداروں نے جزیہ دینے کا اقرار کر لیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امید تھی کہ یہ قوم ... اسلام قبول

کرلیں گے لیکن انہیں بے حد تعجب ہوا جب انہوں نے بہ دستور عیسائی رہنے پر اصرار کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"مجھے تم سے اس جواب کی امید نہ تھی۔ کفر کا راستہ یقیناً ہلاکت کی طرف جاتا ہے۔ احمق ترین عرب وہ ہے جو عربی شاہراہ ترک کر کے عجمی راہ اختیار کرتا ہے۔"

لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی باتوں کا ان سرداروں پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اور انہوں نے بدستور عیسائی رہنے پر اصرار کیا۔ اس کی وجہ غالباً ایک تو یہ ہوگی کہ وہ مذہبی آزادی کے حق سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں گے اور اسلامی سپہ سالار کی طرف سے اسلام قبول کرنے کی دعوت کو اپنے حقوق میں ناجائز مداخلت تصور کرتے ہوں گے۔ دوسرا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ انہیں خیال ہوگا کہ نہ معلوم مسلمانوں کو عراق میں ثبات و استقلال میسر آتا ہے یا نہیں اور ان کی حکومت برقرار رہتی ہے یا نہیں، اس لیے ان غیر یقینی حالات میں مذہب کیوں تبدیل کریں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سرداران حیرہ سے ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیے پر صلح کی تھی۔ اس سلسلے میں باقاعدہ یہ صلح نامہ لکھا گیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ عہد نامہ ہے جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سردار حیرہ عدی بن عدی حضرت عمرو بن عدی، حضرت عمرو بن عبدالمسیح، ایاس بن قبیصۃ الطائی اور حیری بن اکال سے کیا ہے۔ اہل حیرہ نے یہ عہد نامہ تسلیم کرلیا ہے اور اپنے سرداروں کو اس کی تکمیل کے لیے مجاز گردانا ہے۔ عہد نامے کے مطابق اہل حیرہ کو ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ جزیہ ان کے پادریوں اور راہبوں سے بھی لیا جائے گا البتہ محتاجوں، اپاہجوں اور تارک الدنیا راہبوں کو معاف ہوگا۔

اگر یہ جزیہ باقاعدہ ادا کیا جاتا رہا تو اہل حیرہ کی حفاظت کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ہوگی۔ اگر وہ حفاظت میں ناکام رہے تو جزیہ نہ لیا جائے گا۔ اگر قول یا فعل کے ذریعے بدعہدی کی گئی تو یہ ذمہ داری ختم سمجھی جائے گی۔ یہ معاہدہ ربیع الاول ۱۲ھ میں لکھا گیا۔"

اہل حیرہ نے جزیے کے علاوہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کچھ تحفے بھی دیئے جو انہوں نے مال غنیمت کے ہمراہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دیئے۔ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ اگر یہ تحفے جزیے میں شامل ہیں تو خیر ورنہ انہیں جزیے کی رقم میں شامل کر کے باقی رقم اہل حیرہ کو واپس کردو۔

جب حیرہ کی فتح کی تکمیل ہوچکی تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آٹھ نفل بہ طور شکرانہ پڑھے۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"جنگ موتہ کے دن میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی تھیں۔ لیکن جس قدر سخت مقابلہ مجھے اہل فارس سے پیش آیا

ہے پہلے کبھی نہیں آیا۔ اور اہل فارس میں سے الیس والوں نے جس جواں مردی سے مقابلہ کیا اس کی نظیر میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھی۔“

فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حیرہ کو مسلمانوں کا فوجی مستقر اور مفتوحہ علاقے کا دارالحکومت بنایا۔ یہ پہلا اسلامی دارالحکومت تھا جو جزیرہ عرب کے باہر قائم کیا گیا۔ پھر بھی یہاں کا نظم ونسق آپ نے مقامی سرداروں ہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ وہ اپنی اس قدر افزائی سے بہت خوش ہوئے اور دل و جان سے ان کی اطاعت و فرماں برداری کا دم بھرنے اور حیرہ اور اس کے گرد و نواح میں سکون و اطمینان کی فضا پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونے لگے۔ جب حیرہ کے قریبی باشندوں نے دیکھا کہ اہل حیرہ اسلامی عدل و انصاف سے کاملاً بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ انہیں مذہب پر قائم رہنے، مذہبی رسوم ادا کرنے اور عبادت بجالانے کی پوری آزادی حاصل ہے اور وہ اطمینان سے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں اور دوسری طرف ایرانی حکومت ان کی طرف سے بالکل غافل ہے تو انہوں نے بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مصالحت کرنے اور ان کی اطاعت قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حکومت میں غریب کاشت کار بڑے اطمینان سے کھیتی باڑی میں مشغول ہیں۔ مسلمان نہ صرف ان سے مطلق تعرض نہیں کرتے بلکہ ایرانی زمینداروں کے ہاتھوں انہیں جن مظالم اور سختیوں سے گزرنا پڑتا تھا ان کا وجود بھی باقی نہیں، مسلمان ان کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے ہیں تو ان کے دل بے اختیار مسلمانوں کی طرف مائل ہو گئے۔

سب سے پہلے جس شخص نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جانب صلح کا ہاتھ بڑھایا وہ دیر ناطف کا پادری صلوبا بن نسطونا تھا۔ اس نے بانقیا اور بسما کے ان قصبات ساری اراضی کے لگان کی ذمہ داری قبول کر لی جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھی۔ کسریٰ کے موتیوں کے علاوہ اس نے اپنی ذات، خاندان اور قوم کی طرف سے دس ہزار دینار دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ باقاعدہ یہ معاہدہ لکھا گیا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

یہ معاہدہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کے لیے لکھا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق تم سے دس ہزار درہم سالانہ جزیہ وصول کیا جائے گا۔ کسریٰ کے موتی اس کے علاوہ ہوں گے۔ یہ رقم مستطیع اور کمانے والے افراد سے ان کی آمدنی اور حیثیت کے مطابق سالانہ وصول کی جائے گی۔ اس جزیے کے بدلے مسلمانوں کی طرف سے بانقیا اور بسما کی بستیوں میں حفاظت کی جائے گی۔ تمہیں اپنی قوت کا نقیب مقرر کیا جاتا ہے جسے تمہاری قوم قبول کرتی ہے۔ اس معاہدے پر میں اور میرے ساتھ کے سب مسلمان رضامند ہیں اور اسے قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری قوم بھی اس پر رضامند ہے اور اسے قبول کرتی ہے۔“

صلوبا کے بعد عراق کے دوسرے زمینداروں نے بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کر لی۔ فلالیج سے ... کی طرح وہ سارا علاقہ

جو جنوب میں خلیج فارس سے شمال میں حیرہ تک اور مغرب میں جزیرہ عرب سے مشرق میں دریائے دجلہ تک پھیلا ہوا تھا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے زیر نگیں آ گیا۔ انہوں نے ان علاقوں میں امراء مقرر کر کے بھیجے جن کے سپرد امن و امان اور شہری نظام بحال کرنے کے علاوہ خراج کی وصول کا کام بھی تھا۔ علاوہ بریں انہوں نے مختلف شہروں میں فوجی دستے بھی متعین کیے تاکہ اگر کوئی بغاوت پھوٹ پڑے یا کسی جانب سے حملے کا خطرہ ہو تو اس کا تدارک کیا جائے۔ ان دستوں کے تقرر سے شوریدہ سر لوگوں کے حوصلے بالکل پست ہو گئے اور وہ اسلامی حکومت سے بغاوت کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔

اس زمانے میں جب مسلمان دجلہ کے اس پار فتوحات حاصل کرنے میں مصروف تھے، اہل فارس اپنے اندرونی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اردشیر کی وفات سے ایرانی شہنشاہی کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ تمام شہزادے، جنھیں سلطنت کا وارث بننا تھا، اپنے حریفوں کے ہاتھوں قتل کیے جا چکے تھے اور ایرانیوں کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کس شخص کے سر پر بادشاہی کا تاج رکھیں یکے بعد دیگرے کئی لوگ تخت شاہی پر متمکن ہوئے۔

لیکن کسی کو بھی چند دن سے زیادہ بادشاہی کرنا نصیب نہ ہوئی اور اس طرح سلطنت کی کمزوری میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ان حالات کی موجودگی میں ایرانیوں نے مناسب سمجھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مفتوحہ علاقوں پر حملہ کر کے انہیں دوبارہ فتح کرنے کی نسبت بہتر یہ ہے کہ جو علاقہ اس وقت ان کے پاس ہے اسے ایرانی فوج کے بل بوتے پر مسلمانوں کے قبضے میں آنے سے محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے دریائے دجلہ کی دوسری طرف حفاظتی انتظامات شروع کر دیئے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان فوجی انتظامات اور ایرانی افواج کو مطلق خاطر میں لانے والے نہ تھے اور نہ ایرانی اپنی پوری قوت و طاقت کے باوجود اسلامی افواج کے مقابلے میں ٹھہر ہی سکتے تھے لیکن جس چیز نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم تھا کہ جب تک عیاض بن غنم دومۃ الجندل کی فتح سے فارغ ہو کر ان کے پاس نہیں پہنچ جائیں اس وقت تک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نہ حیرہ کو چھوڑیں اور نہ مزید فتوحات کے لیے آگے بڑھیں۔ ادھر عیاض دومۃ الجندل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور جب سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں وہاں بھیجا تھا انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کامل ایک سال تک حیرہ میں مقیم رہے۔ بے کاری کا یہ زمانہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے مصروف عمل انسان کو بہت شاق گزر رہا تھا۔ انہوں نے بارہا ساتھیوں سے کہا کہ اگر خلیفہ کا حکم نہ ہوتا تو میں عیاض کا مطلق انتظار نہ کرتا اور نہ انہیں اپنی فوج میں شامل کرتا۔ اس وقت ایران فتح کرنے سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہیں۔ ایک سال گزر چکا ہے لیکن محض عیاض کی وجہ سے ہم ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو انہوں نے تنگ آ کر ایک آدمی حیرہ کا اور ایک انباط کا بلا بھیجا۔ حیری باشندے کے ہاتھ ایک خط ملوکِ فارس کے نام بھیجا اور انباطی کے ہاتھ ایک خط

ایرانی مرزبانوں (عمال و امراء) کے نام ارسال کیا۔

ملوکِ فارس کے نام جو خط بھیجا اس کا مضمون یہ تھا:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ خط حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے ملوک فارس کے نام ہے اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہارا نظام درہم برہم کر دیا، تمہارے مکرو فریب کو ناکام کر دیا اور تم میں اختلاف پیدا کر دیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس میں تمہارا ہی نقصان تھا۔ اب تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہماری اطاعت قبول کرلو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہم تمہیں اور تمہارا علاقہ چھوڑ کر دوسری طرف چلے جائیں گے ورنہ تمھیں ایک ایسی قوم کے سامنے مغلوب ہونا پڑے گا جو موت کو اس سے زیادہ پسند کرتی ہے جتنا تم لوگ زندگی کو پسند کرتے ہو۔

ایرانی مرزبانوں کے نام جو خط تھا اس میں لکھا تھا:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ خط حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایرانی مرزبانوں کے نام ہے۔ تم لوگ اسلام قبول کرلو، سلامت رہو گے۔ یا جزیہ ادا کرو، ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں نے ایسی قوم کے ساتھ تم پر چڑھائی کی ہے جو موت کی اتنی ہی فریفتہ ہے جتنے تم شراب نوشی کے۔

انبار:

ایرانی افواج حیرہ کے بالکل قریب انبار اور عین التمر میں خیمہ زن ہو چکی تھیں اور مسلمانوں کے اس فوجی مستقر کو سخت خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ دریں حالات اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ خاموشی سے حیرہ میں بیٹھے رہتے اور باہر نکل کر ایرانی فوجوں کے خلاف کاروائی نہ کرتے تو اندیشہ تھا کہ مسلمان اس علاقے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے جو انتہائی مشقت کے بعد ان کے ہاتھ آیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ قعقاع بن حضرت عمرو کو حیرہ کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑا۔ اقرع بن حابس کو مقدمۃ الجیش پر مقرر کیا اور انبار روانہ ہو گئے۔

انبار پہنچ کر انہوں نے شہر کا محاصرہ کرلیا اور لشکر کو حکم دیا کہ قلعے کی محافظ فوج پر تیر برسائیں لیکن مضبوط شہر پناہ اور گہری خندق کے باعث، جو شہر کے اردگرد کھدی ہوئی تھی، ایرانیوں کو اس تیر اندازی سے کوئی گزند نہ پہنچا اور مسلمانوں کا ابتدائی حملہ ناکام رہا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے شہر پر حملہ کرنے کی کوئی راہ معلوم کرنے کے لیے خندق کے ساتھ ساتھ شہر کے گرد چکر لگایا چنانچہ ایک جگہ دیکھا کہ وہاں خندق نسبتاً کم چوڑی تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ لشکر کے جو اونٹ بہت بیمار اور بالکل ناکارہ ہوں اور وہ ذبح کر کے اس جگہ پھینکے دیئے جائیں۔ مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اونٹ ذبح کر کے خندق کے تنگ حصے میں پھینکنے

شروع کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی لاشوں سے وہ حصہ پٹ کر ایک پل سا بن گیا جس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فوج کا ایک دستہ لے کر خندق کے پار ہو گئے۔ اس دستے نے فصیل پھاند کر شہر کا دروازہ کھول دیا اور اسلامی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔

یہ حالت دیکھ کر ایرانی فوج کے سپہ سالار شہرزاد نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کی اور یہ پیش کش کی اگر میری جان بخشی کر دی جائے تو میں سواروں کے ایک دستے کے ساتھ جس کے پاس سامان وغیرہ کچھ نہ ہو گا شہر سے نکل جاؤں گا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ پیش کش قبول کر لی اور شہرزاد شہر سے نکل گیا۔ شہر پر مسلمان قابض ہو گئے اور انبار کے نواحی علاقے کے لوگوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مصالحت کر لی۔

عین التمر:

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو انبار اور اس کے نواحی علاقے کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو زبرقان بن بدر کو اپنا نائب بنا کر انبار میں چھوڑا اور خود عین التمر کا قصد کیا جو عراق اور صحرائے شام کے درمیان صحرا کے کنارے واقع ہے۔ انبار سے عین التمر تک پہنچنے میں تین دن لگے۔ ایرانیوں کی طرف سے وہاں کا حاکم مہران بن بہرام چوبین تھا۔ اس نے شہر کی حفاظت کے لیے ایرانیوں کی ایک بھاری فوج جمع کر رکھی تھی۔ ایرانی فوجوں کے علاوہ بنی تغلب، نمر اور ایاد کے بدوی قبائل بھی عقہ بن ابی عقہ اور ہذیل کے زیر سر کردگی بھاری تعداد میں مہران کے پاس جمع تھے جب عین التمر والوں نے اسلامی لشکر کو آتے دیکھا تو عقہ نے مہران سے کہا:

''عرب عربوں سے لڑنا خوب جانتے ہیں اس لیے تم ہمیں مسلمانوں سے نبٹ لینے دو۔''

مہران نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ عربوں سے لڑنے میں تم اتنے ہی ماہر ہو جتنے ہم عجمیوں سے لڑنے میں ماہر ہیں۔ تم مسلمانوں سے لڑو۔ اگر ہماری ضرورت ہوگی تو ہم میدان جنگ میں پہنچ جائیں گے۔''

ایرانی مہران کی چال کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے اس خیال سے کہ مہران کی ان باتوں سے ان کی کمزوری اور ناطاقتی عیاں ہوتی ہے اسے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ مہران نے جواب دیا: ''تم میرے کام میں دخل نہ دو میں نے جو کچھ کیا ہے تمہاری بہتری کے لیے کیا ہے اس وقت تمہارے مقابلے کے لیے ایک ایسا شخص آرہا ہے جس نے تمہارے بادشاہوں کو قتل اور تمہاری سلطنت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نے ان عربوں کے ذریعے سے تمہارا بچاؤ کیا ہے۔ اگر یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے تو کامیابی کا فخر تمہارے ہی حصے میں آئے گا لیکن اگر شکست کھا گئے تو ہماری تازہ دم فوج تھکے ماندے مسلمانوں کو آسانی سے زیر کر سکے گی۔''

یہ سن کر ایرانی فوج مطمئن ہو گئی۔

عقہ فوج لے کر آگے بڑھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے راستے میں حائل ہو گیا۔ لڑائی شروع ہوئی تو حضرت خالد بن ولید نے بڑی پھرتی سے کمند پھینک کر عقہ کو گرفتار کر لیا۔ اپنے سردار کا یہ حشر دیکھ کر بدوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور انہوں نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور سیکڑوں لوگوں کو قید کر لیا۔ البتہ ہذیل اور بعض دوسرے سرداران لشکر بچ کر نکل گئے۔

مہران بڑے اطمینان سے قلعے میں فروکش تھا اور اسے یقین تھا کہ بدو ضرور مسلمانوں کا حملہ روک لیں گے لیکن جب اس نے یہ ماجرا دیکھا تو بہت سٹپٹایا اور فوج لے کر قلعے سے بھاگ گیا۔ قلعے میں صرف وہ فوج رہ گئی جو پہلے سے اس کی حفاظت کے لیے متعین تھی یا وہ بدو جو عقہ کے لشکر میں شامل تھے اور شکست کھا کر قلعے میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ روز قلعے والے دروازے بند کیے محاصرے کا مقابلہ کرتے رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تو انہوں نے اس شرط پر دروازے کھولنے کی پیش کش کی کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے۔ لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا۔ آخر انہیں یہ مطالبہ ماننا ہی پڑا اور قلعے کے دروازے کھول دیئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سب لوگوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد عقہ کو کھلے میدان میں لایا گیا اور اس کی گردن اڑا دی گئی۔

انبار اور عین التمر کی فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ کو خمس دے کر فتح کی خوش خبری کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے مدینہ پہنچ کر انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کے احکام نظر انداز کرتے ہوئے حیرہ اس لیے چھوڑا اور انبار و عین التمر پر اس لیے چڑھائی کی کہ انہیں حیرہ میں قیام کیے ہوئے پورا ایک سال ہو گیا تھا اور عیاض کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کب دومۃ الجندل سے فارغ ہو کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے حیرہ پہنچتے ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی عیاض کی سست روی سے تنگ آ چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کر رہے ہیں۔ اگر دشمن کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کارناموں کی اطلاع نہ ملتی رہتی جو انہوں نے عراق میں انجام دیئے تو یقیناً عیاض کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو سخت زک پہنچاتے۔

دومۃ الجندل:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ولید سے عراق کے متعلق تمام رپورٹیں حاصل کر چکے تو انہیں عیاض کی مدد کے لیے دومۃ الجندل جانے کا حکم دیا۔ جب ولید وہاں پہنچے تو دیکھا کہ عیاض بن غنم دومۃ الجندل کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور جواباً دومۃ الجندل والوں نے عیاض کا محاصرہ کر کے ان کا راستہ مسدود کر رکھا ہے۔ عیاض سے بات چیت کرنے اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ولید نے محسوس کیا کہ عیاض اپنی فوج کی مدد سے نہ

دومۃ الجندل والوں کو شکست دے سکتے اور نہ ان کے چنگل سے نکل سکتے ہیں۔ ولید نے ان سے کہا کہ بعض حالات میں عقل کی ایک بات زبردست لشکر سے مفید ثابت ہوتی ہے۔ اگر تم میری مانو تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس قاصد بھیج کر ان سے اعانت چاہو۔

عیاض کے لیے ولید کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ انہیں دومۃ الجندل پہنچے ہوئے سال بھر ہو چکا تھا اور ابھی تک فتح کی کوئی شکل نظر نہ آتی تھی۔ انہوں نے اپنے قاصد کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس روانہ کیا۔ قاصد ان کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ عین التمر کی فتح سے فارغ ہو چکے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے خط پڑھا۔ اس کے لفظ لفظ سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ انہوں نے عیاض کے نام ایک مختصر خط دے کر قاصد کو فوراً واپس کر دیا کہ عیاض کی پریشانی کچھ کم ہو جائے۔ خط میں لکھا تھا:

''حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے عیاض کے نام میں بہت جلد تمہارے پاس آتا ہوں۔ تمہارے پاس اونٹنیاں آنے والی ہیں جن پر کالے زہریلے ناگ سوار ہیں۔ فوج کے دستے جن کے پیچھے دستے ہیں۔''

عیاض کے نام حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حیرہ میں بے کار پڑے رہنے کی وجہ سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کس قدر گھبراہٹ لاحق تھی اور انبار و عین التمر اور فتوحات بھی ان کی آتش شوق کو سرد نہ کر سکی تھیں۔ اس وجہ سے عیاض کا بلاوا پہنچتے ہی وہ دومۃ الجندل جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عویم بن کاہل اسلمی کو عین التمر میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود فوج لے کر دومۃ الجندل روانہ ہوئے۔ دومۃ الجندل اور عین التمر کے درمیان تین سو میل کا فاصلہ ہے۔ یہ مسافت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دس روز سے بھی کم عرصے میں طے کی۔ شمال سے جنوب کو جاتے ہوئے درمیان میں شام اور نفوذ کے خوف ناک اور لق و دق صحرا پڑتے تھے جن میں سے گزرتے ہوئے سیکڑوں خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تمام خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ جب وہ دومۃ الجندل کے قریب پہنچے اور اہل شہر کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ حیران و ششدر رہ گئے۔ ان کے سردار سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آئندہ اقدامات کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔

دومۃ الجندل میں اس وقت جو قبائل ڈیرے ڈالے پڑے تھے ان کی تعداد اس وقت سے کئی گنا زیادہ تھی جب ایک سال قبل عیاض بن غنم ان کی سرکوبی کے لیے پہنچے تھے۔ وجہ یہی تھی کہ بنو کلب بہراء اور غسان کے قبائل اپنے ساتھ کئی اور قبائل ملا کر عراق سے دومۃ الجندل چلے آئے تھے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اپنی عبرت ناک شکست کا بدلہ عیاض سے لینا چاہتے تھے۔ ان قبائل کی روز افزوں آمد کے باعث عیاض کے لیے انتہائی صبر آزما حالات پیدا ہو گئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کے مقابلے کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں۔

دومۃ الجندل کی فوج دو بڑے حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصے کا سردار اکیدر بن عبدالمالک کندی

تھا اور دوسرے کا جودی بن ربیعہ۔ اکیدر دومۃ الجندل کا حاکم تھا اور اس نے مدینہ کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اس کی سرکوبی کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عیاض کو روانہ کیا تھا۔ ان قبائل میں جو اس جگہ جمع تھے اکیدر سے زیادہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کوئی واقف نہ تھا۔ وہ غزوہ تبوک کو نہ بھولا تھا جب محمد ﷺ اس سے وفاداری کا عہد لے کر مدینہ واپس تشریف لے آئے تھے اور اسے وہ وقت بھی خوب یاد تھا جب محمد ﷺ کے احکام کے مطابق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پانچ سو سواروں کے ہمراہ دومۃ الجندل پہنچے تھے اور اسے قید کر کے دھمکی دی تھی کہ اگر دومۃ الجندل کے دروازے مسلمانوں کے لیے نہ کھولے گئے تو اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مجبور ہو کر اسے دومۃ الجندل کے دروازے کھولنے ہی پڑے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دو ہزار اونٹ، آٹھ سو بکریاں، چار سو وسق گیہوں اور چار سو درہم دے کر صلح کرنی پڑی۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ اسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ آنا، وہاں اسلام قبول کرنا اور محمد ﷺ سے دوستی کا معاہدہ کرنا پڑا۔ یہ تمام باتیں اکیدر کے دل میں میخ کی طرح گڑی ہوئی تھیں۔ اسی لیے جب اس نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دومۃ الجندل پہنچنے کی خبر سنی تو وہ جودی بن ربیعہ سے ملا جو دومۃ الجندل کے لیے عراق سے آنے والے بدوی قبائل کا سردار تھا اور کہنے لگا: ''میں تمہاری نسبت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ واقف ہوں۔ آج دنیا میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی شخص اقبال مند اور فنونِ جنگ کا ماہر نہیں، جو قوم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کرتی ہے خواہ تعداد میں کم ہو یا زیادہ، ہر حال میں شکست کھا جاتی ہے۔ اس لیے تم میری بات مانو اور مسلمانوں سے صلح کر لو۔''

لیکن ان قبائل نے جن کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، اکیدر کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اکیدر یہ کہہ کر ان سے علیحدہ ہو گیا، تم جانو تمہارا کام۔ میں تمہارے ساتھ مل کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں۔

وہ اپنے حلیفوں سے جدا ہو کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ملنے کے ارادے سے ان کے کیمپ میں داخل ہوا۔ یہاں پہنچ کر روایات میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ اکیدر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سامنے حاضر ہوا تو انہوں نے ان کی گردن مارنے کا حکم دے دیا لیکن بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے قید کر کے مدینہ بھیج دیا گیا۔ حضرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسے رہائی ملی اور وہ مدینہ سے عراق چلا گیا۔ وہاں عین التمر کے قریب ایک مقام دومہ ہی میں اقامت پذیر ہو گیا اور آخری وقت تک وہیں رہا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر دومۃ الجندل پہنچے۔ وہاں کی فوج مختلف قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر قبیلہ اپنے سرداروں کے ماتحت تھا اور یہ تمام سردار جودی بن ربیعہ کے زیر سرکردگی تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دومۃ الجندل کو اپنی اور عیاض بن غنم کی فوج کے گھیرے میں لے لیا۔ جو عربی النسل عیسائی دومۃ الجندل کی امداد کے لیے پہنچے تھے وہ قلعے سے باہر تھے کیونکہ قلعے میں ان

کے لیے گنجائش نہ تھی۔

لڑائی شروع ہوئی تو جودی بن ربیعہ اور ودیعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بالمقابل اور ابن حدر جان اور ابن الایہم عیاض بن غنم کے مقابلہ صف آرا ہوئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جودی کو اور اقرع بن حابس نے ودیعہ کو گرفتار کرلیا۔ باقی لوگ قلعے کی طرف بھاگے۔ لیکن وہاں گنجائش نہ تھی۔ قلعہ بھر جانے پر اندر والوں نے دروازہ بند کرلیا اور اپنے ان ساتھیوں کو جو باہر رہ گئے تھے، مسلمانوں کی تلواروں کے حوالے کردیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج کے ایک سردار عاصم بن حضرت عمرو نے اپنے قبیلے بنو تمیم سے اپنے حلیف بنی کلب کی امداد کی درخواست کی۔ بنو تمیم فوراً ان کی حفاظت کے لیے پہنچ گئے اور اس طرح بنی کلب کی جانیں بچ گئیں۔

جو لوگ قلعے کی طرف بھاگے تھے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کا پیچھا کیا اور اتنے آدمی قتل کیے کہ ان کی لاشوں سے دروازہ پٹ گیا اور اندر جانے کا راستہ نہ رہا۔ انہوں نے جودی بن ربیعہ اور دوسرے قیدیوں کی بھی گردنیں اڑا دیں۔ سوا بنی کلب کے قیدیوں کے جنھیں عاصم بن حضرت عمرو نے پناہ دے دی تھی۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قلعے کا دروازہ اکھڑوا ڈالا اور جتنے بھی قلعے میں محصور تھے انہیں قتل کردیا۔ فتح کے بعد انہوں نے اقرع بن حابس کو انبار واپس جانے کا حکم دیا اور خود دومۃ الجندل میں قیام کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے، آخر کیا بات تھی کہ مسلمانوں نے دومۃ الجندل پر اتنی توجہ مبذول کی اور اسے ہر قیمت پر فتح کرلینا چاہا۔ محمد ﷺ کے عہد میں دو بار اس پر چڑھائی ہوئی اور آخر اکیدر سے دوستی کا معاہدہ کرکے اسلامی عمل داری میں شامل کرلیا گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمان سال بھر تک اس کا محاصرہ کیے پڑے رہے اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک اسے کاملاً مطیع کرکے اپنی حکومت میں دوبارہ شامل نہ کرلیا گیا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دومۃ الجندل کی جغرافیائی حالت ایسی تھی کہ اس پر قبضہ کرنا ہر حالت میں ناگزیر تھا۔ دومۃ الجندل اس راستے کے سرے پر واقع ہے جہاں سے ایک طرف حیرہ اور عراق کو راستہ جاتا ہے اور دوسری طرف شام کو۔ محمد ﷺ کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ شام اور جزیرہ عرب کی سرحدوں پر امن قائم رہے اور رومی فوجیں مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر سرزمین عرب میں نہ گھس آئیں۔ اسی لیے آپ نے دومۃ الجندل کو اپنے زیر نگیں لانے کے لیے ہر ممکن کوشش فرمائی۔ یہی حال حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا تھا۔ ان کے زمانے میں اسلامی فوجیں ایک طرف عراق میں ایرانی فوجوں سے نبرد آزما تھیں تو دوسری طرف شام کی سرحدوں پر رومیوں سے مصروف پیکار تھیں اور ضروری تھا کہ یہ اہم مقام مسلمانوں کے قبضے میں رہے۔ یہی وجہ تھی کہ عیاض بن غنم ایک سال تک اس کا محاصرہ کیے پڑے رہے اور سخت مشکلات کے باوجود وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیا۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل پہنچنے کے لیے کہا گیا تو وہ بھی بلا توقف اس جانب روانہ ہوگئے۔ اگر خدانخواستہ دومۃ الجندل مسلمانوں کے قبضے میں نہ آتا تو نہ صرف

عراق میں ان کی فتوحات کا کوئی بھروسا ہوتا بلکہ شام کی فتح بھی ناممکن ہو جاتی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی عراق میں واپسی:

انسانی سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ جب تک ایک قوی اور زبردست وجود ان کے درمیان رہتا ہے وہ بھیگی بلی بنے رہتے ہیں لیکن جونہی وہ شخص انہیں چھوڑ کر کہیں اور چلا جاتا ہے تو وہ میدان خالی پا کر من مانی کرنے پر تل جاتے ہیں۔ یہی حال حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی غیر حاضری میں اہل حیرہ اور اہل عراق کا ہوا۔ ایرانیوں اور ان کے عرب مددگاروں نے سوچا کہ مسلمانوں کی اطاعت کا جوا سر سے اتار پھینکنے کا موقع اس سے بہتر اور کوئی ہاتھ نہ آئے گا۔ بنو تغلب نے یہ خیال کیا کہ عقہ کے قتل کا بدلہ لینے کا موقع اس سے اچھا اور کوئی نہیں۔ قعقاع اس موقع پر صرف یہ کہہ سکتے تھے کہ جن جن علاقوں پر مسلمان قابض ہو چکے تھے انہیں ہاتھ سے نہ نکلنے دیں اور دشمن کو آگے بڑھنے سے روکیں۔ لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اس پالیسی کو لباس عمل پہنانے کی طاقت ان میں نہ تھی کہ دشمن کے حملوں سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آگے بڑھ کر اس کے مقبوضات پر پے در پے حملے کیے جائیں اور اسے اپنے ہی علاقوں میں الجھائے رکھ کر اسلامی مقبوضات کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکا جائے۔

ادھر جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایرانیوں اور عربی النسل عیسائی قبائل کے ارادوں سے آگاہی ہوئی تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی دومۃ الجندل میں نہ رہ سکے اور انہوں نے فوراً کوچ کی تیاری کر لی۔ مقدمے پر اقرع بن حابس کو متعین کیا اور عیاض بن غنم کو ساتھ لے کر حیرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ حیرہ پہنچ کر اسے عیاض کی سپردگی میں دیا اور قعقاع کو حصید کی طرف بھیجا۔ جہاں عربوں اور ایرانیوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ خود قسم کھائی کہ بنو تغلب پر اس طرح اچانک حملہ کریں گے کہ انہیں کسی طرح بھی سنبھلنے کا موقع نہ ملے گا۔

جب اہل عراق کو معلوم ہوا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان کی سرکوبی کے لیے ایک بار پھر عراق پہنچ چکے ہیں تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی اور اپنے علاقے کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کے جو حسین خواب وہ دیکھ رہے تھے وہ سب آن کی آن میں ختم ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسری اقوام کی طرح مسلمان بھی سرزمین عراق کو تاخت و تاراج کر کے چلے جائیں گے اور وہ بعد میں اپنے علاقوں پر قابض ہو سکیں گے۔ لیکن ان کے خیالات پادر ہوا ثابت ہوئے۔

حصید، خنافس اور مضیح:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق قعقاع حصید کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایرانی لشکر ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ اس کا سپہ سالار مارا گیا اور لشکر نے میدان جنگ سے فرار ہونے میں اپنی عافیت سمجھی۔ ہزیمت خوردہ لشکر کا خیال تھا کہ وہ شہر خنافس میں پناہ لے گا جہاں پہلے ہی سے ایک اور ایرانی لشکر موجود تھا لیکن اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی کیونکہ خنافس میں مقیم ایرانی لشکر کا سپہ سالار مسلمانوں کی آمد کی خبر سن

کر پہلے ہی وہاں سے فرار ہو کر مضیح پہنچ چکا تھا جہاں کا حاکم ہذیل بن حضرت عمران تھا۔

اس طرح مسلمان بغیر لڑے بھڑے خنافس پر قابض ہو گئے اور اب کوئی فرد ایسا نہ تھا جو ایرانی لشکر کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار کر کے میدان جنگ میں لاتا۔

اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے سرداروں کو مضیح کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا اور خود بھی ادھر کا رخ کیا۔ یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ تمام قائدین کو کس رات اور کس وقت مضیح پہنچنا ہے۔ چنانچہ مقررہ وقت پر تمام قائدین منزل مقصود پہنچ گئے اور آتے ہی تین اطراف سے ہذیل اور اس کی فوج پر، جو بے خبر پڑی سو رہی تھی، بھرپور حملہ کر دیا۔ ہذیل مع چند ساتھیوں کے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ باقی تمام فوج قتل ہو گئی۔ لاشوں سے میدان اس طرح پٹ گیا گویا بکریاں ذبح کی ہوئی پڑی ہیں۔

اس جنگ کے دوران میں دو ایسے مسلمان اسلامی فوج کے ہاتھوں مارے گئے جو مضیح میں مقیم تھے اور جن کے پاس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عطا کیا ہوا ایک صداقت نامہ بھی موجود تھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مارے جانے کی اطلاع ملی تو آپ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کے اس فعل کی سزا ملنی چاہیے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو مسلمان دشمن کی سرزمین میں دشمن کے ساتھ قیام پذیر ہوں گے ان کے ساتھ ایسی صورت کا پیش آنا بہت ممکن ہے۔

جنگ مضیح سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انہوں نے اپنے سرداروں قعقاع اور ابولیلیٰ کو بنی تغلب کی بستیوں کی جانب روانہ فرمایا اور خود بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ اس حملے کا پروگرام بھی ویسا ہی بنایا گیا تھا جیسا جنگ مضیح کے موقع پر ترتیب دیا گیا تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے مل کر رات کے وقت تین اطراف سے دشمنوں پر زور وشور سے حملہ کر دیا۔ اس حملے میں بنی تغلب کا کوئی بھی مرد بچ کر نہ نکل سکا۔ عورتیں گرفتار کر لی گئیں۔ فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نعمان بن عوف شیبانی کے ہاتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خمس روانہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں قیدیوں میں سے ایک لڑکی صابحہ بنت ربیعہ بجیر کو خریدا تھا جس سے ان کے یہاں حضرت عمر اور رقیہ پیدا ہوئے۔

فراض:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ان اچانک حملوں اور قبائل کے ان مقابلے سے عاجز رہنے کی خبریں عراق بھر میں پھیل چکی تھیں اور صحرا میں رہنے والے تمام قبائل سخت خوف زدہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈالنے اور ان کی اطاعت قبول کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجوں کے ہمراہ دریائے فرات کے ساتھ ساتھ شمالی علاقوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ وہ جہاں بھی پہنچتے وہاں کے باشندے ان سے مصالحت کر لیتے اور ان کی اطاعت کرنے کا اقرار

کرتے۔ آخر وہ فراض پہنچ گئے جہاں شام، عراق اور الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔

فراض عراق اور شام کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ اگر عیاض بن غنم کی قسمت یاوری کرتی اور وہ ابتدا ہی میں دومۃ الجندل فتح کر لیتے تو غالباً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہاں تک نہ پہنچتے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا منشاء سارے عراق اور شام کو فتح کرنے کا نہ تھا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان دونوں ملکوں کی سرحدوں، پر جو عرب سے ملتی ہیں، امن و امان قائم ہو جائے اور ان اطراف سے ایرانی اور رومی عرب پر حملہ آور نہ ہو سکیں لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ یہ دونوں مملکتیں کاملاً مسلمانوں کے قبضے میں آ جائیں۔ اس لیے اس نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراقی قبائل کو مطیع کرنے کی غرض سے انتہائی شمال تک چلے گئے اور اس طرح مسلمانوں کے لیے بالائی جانب سے شام پر حملہ کرنے کا راستہ کھل گیا۔ ایرانی سرحدات سے رومیوں پر حملہ کرنے کا راستہ کھل گیا۔ ایرانی سرحدات سے رومیوں پر حملہ کرنے کا راستہ کھل جانا ایک ایسا معجزہ تھا جس کا خیال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تک کو بھی نہ آ سکا اور یہ کارنامہ ایسے شخص کے ہاتھوں رونما ہوا جس کی نظیر پیدا کرنے سے عرب اور عجم کی عورتیں واقعی عاجز تھیں۔

فراض میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کامل ایک مہینے تک قیام کرنا پڑا۔ یہاں بھی انہوں نے ایسی جرأت اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا کہ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ مشرقی جانب ایرانی تھے جو ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مغربی جانب رومی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ اگر اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جمعیت کو تباہ و برباد نہ کر دیا گیا تو پھر یہ سیلاب روکے نہ رکے گا۔ رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دریائے فرات حائل تھا۔ ان کے علاوہ چاروں طرف بدوی قبائل آباد تھے۔ جن کے بڑے بڑے سرداروں کو قتل کر کے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کے دلوں میں انتقام کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ بھڑکا دی تھی۔ اس نازک صورتِ حال سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لاعلم نہ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو حیرہ واپس آ کر اپنی قوت و طاقت میں اضافہ کرتے ہوئے پھر رومیوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہو سکتے تھے۔ انہوں نے ایسا نہ کیا کیونکہ دشمن کو سامنے دیکھ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لیے صبر کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ ان کی نظروں میں کیا ایرانی و رومی اور کیا اہل بادیہ سب حقیر تھے۔ ان کی عظیم الشان فوجوں کو وہ نہ پہلے کبھی خاطر میں لائے اور نہ آئندہ خاطر میں لانے کو تیار تھے۔ اس لیے وہ بڑے اطمینان سے لڑائی کی تیاریوں میں مشغول تھے۔

ادھر رومیوں کو ابھی تک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے واسطہ نہ پڑا تھا اور وہ ان کے حملے کی شدت سے ناواقف تھے۔ جب اسلامی فوجیں فراض میں اکٹھی ہوئیں اور برابر ایک مہینے تک ان کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑی رہیں تو انہیں بہت جوش آیا اور انہوں نے اپنے قریب کی ایرانی چوکیوں سے مدد مانگی۔ ایرانیوں نے بڑی خوشی سے رومیوں کی مدد کی کیونکہ مسلمانوں نے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا تھا اور ان کی شان وشوکت کو تہ و بالا کر کے ان کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ ایرانیوں کے علاوہ تغلب، ایاد اور نمر کے عربی النسل

قبائل نے بھی رومیوں کی پوری پوری مدد کی کیونکہ وہ اپنے رؤسا اور سربرآوردہ اشخاص کے قتل کو بھولے نہ تھے۔ چنانچہ رومیوں، ایرانیوں اور عربی النسل قبائل کا ایک لشکر جرار مسلمانوں سے لڑنے کے لیے روانہ ہوا۔ دریائے فرات پر پہنچ کر انہوں نے مسلمانوں کو کہلا بھیجا: "تم دریا کو عبور کر کے ہماری طرف آؤ گے یا ہم دریا کو عبور کر کے تمہاری طرف آئیں؟"

حضرت خالد بن ولید نے جواب دیا: "تم ہماری طرف آجاؤ۔"

چنانچہ دشمن کا لشکر دریا عبور کر کے دوسری جانب اترنا شروع ہوا۔ اس دوران میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کی تنظیم اچھی طرح کر لی اور باقاعدہ صفیں قائم کر کے انہیں دشمن سے لڑنے کے لیے پوری طرح تیار کر دیا۔ جب لڑائی شروع ہونے کا وقت آیا تو رومی لشکر کے سپہ سالار نے فوج کو حکم دیا کہ تمام قبائل علیحدہ علیحدہ ہو جائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس گروہ نے زیادہ شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ چنانچہ ساری فوج علیحدہ علیحدہ ہو گئی۔ لڑائی شروع ہوئی تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے دستوں کو حکم دیا کہ وہ چاروں طرف سے دشمن کے لشکر کو گھیر لیں اور انہیں ایک جگہ جمع کر کے اس طرح پے در پے حملے کریں کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلامی دستوں نے رومی لشکر کو گھیر کر ایک جگہ جمع کر لیا اور ان پر پُرزور حملے شروع کر دیے۔ رومیوں اور ان کے حلیفوں کو خیال تھا کہ وہ قبائل کو علیحدہ علیحدہ مسلمانوں کے مقابلے میں بھیج کر لڑائی کو زیادہ طول دے سکیں گے اور جب مسلمان تھک کر چُور ہو جائیں گے تو ان پر بھرپور حملہ کر کے انہیں مکمل طور پر شکست دے دیں گے لیکن ان کا خیال خام ثابت ہوا اور ان کی تدبیر خود ان پر الٹ پڑی۔ جب مسلمانوں نے انہیں ایک جگہ جمع کر کے ان پر حملے کرنے شروع کیے تو وہ ان کی تاب نہ لا سکے اور بہت جلد شکست کھا کر میدان جنگ سے فرار ہونے لگے۔ لیکن مسلمان انہیں کہاں چھوڑنے والے تھے۔ انہوں نے ان کا پیچھا کیا اور دور تک انہیں قتل کرتے چلے گئے۔ تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ اس معرکے میں عین میدان جنگ اور بعد ازاں تعاقب میں دشمن کے ایک لاکھ آدمی کام آئے۔

فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فراض میں دس روز قیام فرمایا اور ۲۵ ذی القعدہ ۱۲ھ کو انہوں نے اپنی فوج کو واپس حیرہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا خفیہ حج:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یمامہ میں مرتدین کی سرکوبی کر چکے تھے۔ عراق ان کے ذریعے سے فتح ہو چکا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے کسریٰ کے اقتدار کا دیوالیہ نکل چکا تھا۔ فراض کی فتح سے سلطنت رومہ میں پیش قدمی کرنے کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اللہ کی عنایت تھی ورنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی کیا حیثیت تھی کہ وہ یہ عظیم الشان فتوحات حاصل کرتے اور ایرانی سلطنت ان کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور ہو جاتی۔ جب وہ اللہ کے ان افضال و انعامات پر غور کرتے تو ان کا دل تشکر و امتنان کے جذبات سے معمور ہو جاتا۔ تشکر و امتنان

کے یہی جذبات تھے جنھوں نے جنگ فراض سے فارغ ہونے کے بعد انہیں حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے پر آمادہ کیا۔ جنگ کے بعد فراض کے دس روزہ قیام نے جذبات کی اس آگ کو اس حد تک بھڑکا دیا کہ اب کوئی طاقت انہیں حج پر جانے سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی غیر حاضری عراق میں مسلمانوں کے لیے سخت خطرات پیدا کرنے کا موجب ہو سکتی ہے۔ ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایرانی اس علاقے میں دوبارہ فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکا سکتے تھے۔ پھر بھی حج بیت اللہ کے مقابلے میں انہوں نے ان تمام خطرات کا نظر انداز کر دیا۔

اگر دشمن کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی غیر حاضری کا علم ہو جاتا تو وہ مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کا یہ زریں موقع کسی طرح ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اس خطرے سے بچنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ وہ اس طور پر حج کرتے کہ سوا خاص سرداروں کے اسلامی فوج کے کسی بھی فرد کو یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ ان کا سپہ سالار لشکر سے غیر حاضر ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ حج کے لیے پہلے خلیفہ سے اجازت طلب کرتے لیکن اس صورت میں یہ خدشہ تھا کہ اگر خلیفہ کی طرف سے اجازت مل جاتی تو سارے لشکر میں چرچا ہو جاتا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حج کو جا رہے ہیں اور جونہی وہ روانہ ہوتے پیچھے سے ایرانی فوجیں مسلمانوں پر حملہ کر دیتیں۔ اس صورت میں اس حج کا کیا فائدہ جو مسلمانوں کی تباہی کا موجب بنتا۔ اگر خلیفہ کی طرف سے اجازت نہ ملتی تو ان کے پاس اس آتش شوق کو سرد کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا جو حج بیت اللہ کے لیے ان کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ اس لیے آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ انتہائی خفیہ طور پر حج کیا جائے کہ نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس کا پتا چلے اور نہ ان کے لشکر کے کسی فرد کو۔ انہیں یقین تھا کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس فعل پر باز پرس کی تو وہ عذر معذرت کر کے انہیں راضی کر لیں گے۔ دوسری طرف اللہ بھی انہیں اس حج کے ثواب سے محروم نہ کرے گا۔

انہوں نے لشکر کو تو حیرہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا اور اپنے متعلق یہ ظاہر کر کے کہ وہ ساقہ کے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں خفیہ طور پر حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ چند لوگ اور بھی تھے۔ وہ شہروں اور بستیوں سے دور دور سیدھے مکہ کی سمت روانہ ہوئے۔ یہ راستہ بہت عجیب و غریب اور سخت دشوار گزار تھا۔ کوئی رہبر نہ تھا لیکن جوانی کے ایام میں چونکہ انہیں تجارت کے لیے ملک در ملک پھرنا پڑا تھا اور سپہ سالار کی حیثیت سے پورا صحرا چھان مارا تھا۔ اس لیے وہ اس علاقے کی تمام وادیوں، ٹیلوں، راستوں، میدانوں غرض چپے چپے سے واقف تھے اور انہیں راستے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ حج سے پہلے ہی وہ مکہ معظمہ پہنچ گئے اور حج کے فرائض پوری طرح ادا کر کے واپس آ گئے لیکن تعجب یہ ہے کہ قیام مکہ کے دوران میں کسی بھی شخص کو ان کی وہاں موجودگی کا علم نہ ہوا حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی پتا نہ چلا جو بعض روایات کے مطابق اس سال حج پر مکہ میں موجود تھے۔

واپسی پر بھی انہوں نے وہی دہشت ناک اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا جو حج کو جاتے ہوئے

اختیار کیا تھا۔ ابھی لشکر کا آخری حصہ حیرہ پہنچا بھی نہ تھا کہ وہ ساقہ سے آملے اور اس کے ہمراہ شہر میں داخل ہوئے۔ اس طرح ان کے لشکر کے کسی بھی فرد اور عراق کے کسی بھی شخص کو یہ علم نہ ہوسکا کہ وہ اس نازک وقت میں لشکر سے غیر حاضر تھے اور حج کے لیے مکہ چلے گئے تھے۔

حیرہ میں قیام کے بقیہ دن انہوں نے بڑے اطمینان سے گزارے۔ ایک طرف یہ خوشی تھی کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں حج بیت اللہ کی توفیق مرحمت فرمادی تھی۔ دوسری طرف یہ اطمینان تھا کہ عراق میں ان کی فتوحات پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں۔ اب ان کا خیال سلطنتِ ایران کے دارالحکومت مدائن کی طرف کوچ کرنے کا تھا۔ لیکن اللہ کو یہ منظور تھا کہ جنگ فراض میں کامیابی حاصل کر کے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا اسے پایہ تکمیل کو پہنچائیں اور رومی سلطنت میں بھی اسی طرح فتوحات حاصل کریں جس طرح ایرانی سلطنت میں کر چکے تھے۔ (عراقی فتوحات کے ذیل میں حیرہ کی فتح تک مورخین میں اتفاق ہے۔ بعض تفاصیل میں کچھ اختلاف ہو تو ہو لیکن واقعات کی ترتیب اور ان کے نتائج میں کوئی اختلاف نہیں لیکن حیرہ کی فتح کے بعد پیش آنے والے واقعات میں اختلاف ہے۔ ہم نے اس بات میں انبار، عین التمر اور فراض کی جنگوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اس پر طبری، ابن اثیر اور ابن خلدون تو متفق ہیں لیکن بلاذری، ازدی اور واقدی نہیں۔ یہ مورخین جنگ فراض کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے۔ انبار اور عین التمر کی جنگوں کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت پیش آئیں جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام کی فوجوں کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔)

بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ جس سال حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حج پر روانہ ہوئے اس سال امیر الحج حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایام خلافت میں کبھی حج نہیں کیا۔ لیکن مورخین اس روایت کو ترجیح دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اس سال حج کے موقع پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خود مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ ہر حال دونوں روایتوں میں سے خواہ کوئی بھی روایت صحیح ہو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار اعظم کے حج پر جانے کا اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک وہ واپس حیرہ نہ پہنچ گئے۔

۱۳

شام پر حملے کے اسباب

رومیوں کو تشویش:

سرزمین عراق میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے اور جس طرح ہر میدان میں ایرانی افواج قاہرہ کو شکست دی اس کا ذکر ہمسایہ ملکوں کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ ان خبروں پر سب سے زیادہ تشویش مشرقی رومی سلطنت کے فرمان رواؤں کو ہو رہی تھی۔ کیونکہ ان کے حالات بھی ایرانی سلطنت سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ جس طرح عراقی سرحد پر لخم، بنو تغلب، ایاد اور نمر وغیرہ عربی النسل قبائل آباد تھے۔ اس طرح شام کی سرحد پر بنو بکر، بنو عذرہ، بنو عدوان، بنو بحیرہ اور غسانی قبائل مقیم تھے۔ رومی سلطنت کا خیال تھا کہ جس طرح مسلمانوں نے عراق پر پے در پے حملے کر کے اس اپنی عمل داری میں شامل کر لیا ہے اس طرح وہ شام پر حملے کر کے اسے بھی قبضے میں لانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس خیال کے تحت انہوں نے پوری توجہ شام کی اس سرحد کو مضبوط کرنے پر مبذول کی جو عرب سے ملتی تھی تاکہ مسلمانوں کی پیش قدمی کو ابتداء میں روک کر انہیں رومی سلطنت پر حملہ کرنے سے باز رکھا جا سکے۔

اس سلسلے میں تعجب خیز امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمانوں نے رومیوں کے ڈر سے شام کی ملحقہ سرحدات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ عرب سے جلا وطن کیے ہوئے یہود و نصاریٰ کی انگیخت سے عرب پر حملہ کر دیں۔ مگر چند ہی سال میں حالات اتنے تبدیل ہو گئے کہ جن رومیوں سے ڈر کر مسلمانوں نے اپنی سرحدات کو مضبوط کرنے کی طرف توجہ کی تھی اب انہیں رومیوں نے مسلمانوں سے ڈر کر اپنی جنوبی سرحدوں کی حفاظت اور انہیں مستحکم کرنے کے کام کو باقی تمام کاموں پر فوقیت دینی شروع کر دی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی ہرقل شام و روم کے ان جذبات و خیالات سے پوری طرح آگاہ تھے جنہوں نے اسے سخت سراسیمہ کر رکھا تھا۔ لیکن جب تک مرتدین سے جنگیں ختم نہ ہو جاتیں وہ شام پر توجہ مبذول نہ کر سکتے تھے کیونکہ اگر مرتدین کی پوری طرح سرکوبی سے پہلے ہی اسلامی فوجیں شام کی طرف روانہ

کر دیا جاتا تو خدشہ تھا کہ مبادا مرتد قبائل، جنھیں رفتہ رفتہ مطیع کیا جارہا تھا۔ اسلامی فوجوں کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ وسیع پیمانے پر بغاوت کر دیں۔ بعد میں جب مثنیٰ بن حارثہ کی ان تھک کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو عراق میں کامیابی نصیب ہونے لگی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایرانی سلطنت میں گھس کر لخمیوں کے دارالحکومت حیرہ پر اسلامی پرچم لہرا دیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی شام کا خیال آیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے عراق کی طرح شام کی سرحد پر بھی عرب قبائل آباد تھے اور جس طرح عراق کے بعض عرب قبائل نے عیسائیت پر قائم رہنے کے باوجود مسلمانوں سے مل کر کسریٰ کی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اسی طرح شام کے عرب قبائل کے بارے میں بھی یہ امید کی جارہی تھی کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے کیونکہ رومیوں کی حیثیت حاکم کی تھی اور اہل شام کی محکوموں کی، اور حاکموں اور محکوموں کے درمیان نفرت و عداوت کے جو جذبات پنہاں ہوتے ہیں وہ ہر شخص کو معلوم ہیں۔ حاکم و محکوم کے تعلق کے علاوہ ایرانیوں اور عراق کی سرحد پر بسنے والے عرب قبائل کی طرح رومی اور شامی سرحد پر بسنے والے بادیہ نشین عرب قبائل کے درمیان جنس اور زبان کا بین اختلاف بھی موجود تھا۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کو امید تھی کہ شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کر کے جب وہ رومی لشکروں پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو شامی عرب اپنے ہم وطن لوگوں سے آکر مل جائیں گے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی طاقت وقوت میں معتد بہ اضافہ ہو جائے گا اور وہ رومیوں پر مکمل فتح حاصل کر کے اس زرخیز اور آباد سرزمین پر قابض ہو سکیں گے۔

رومیوں پر حملہ کرنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو تردد تھا وہ دومۃ الجندل کی فتح عمل میں لانے اور مسلمانوں پر اس کے دروازے کھل جانے کے بعد ختم ہو گیا۔ پھر بھی چونکہ ابھی تک عراق میں جنگوں کا سلسلہ جاری تھا اس لیے رومیوں پر فوری حملہ مناسب نہ سمجھا گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شامی سرحد پر مقیم مسلمان امراء کو واضح ہدایات دے دی تھیں کہ وہ اپنی طرف سے رومی سرحدات پر حملہ کرنے میں پہل نہ کریں اور جب تک رومیوں کی طرف سے حملہ کرنے کی ابتدا نہ ہو وہ مدافعت کا پہلو اختیار کیے رکھیں اور اپنے آپ کو رومی تصادم سے ہر ممکن طریقے سے بچائیں۔ ادھر چونکہ رومیوں کو مسلمانوں کی فتوحات کا سارا حال معلوم تھا۔ اس لیے وہ بھی شام کی سرحد عبور کر کے اسلامی فوجوں پر حملہ کرنے سے ہچکچاتے تھے اور اپنی سرحد ہی کے اندر ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اس طرح فریقین کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ڈر اور خوف کے جذبات پائے جاتے تھے اور ہر فریق جنگ کی ابتدا کرنے سے پہلوتہی کر رہا تھا۔

رومیوں کے ڈر اور خوف کی بنیاد زیادہ تر اس پر تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بیعت کے بعد شمالی عرب کے مرتدین کی سرکوبی اور سرحدوں کے استحکام کے لیے جو فوجیں روانہ کی تھیں انہیں اپنے مقاصد میں پوری کامیابی ہوئی تھی اور وہ کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر مظفر و منصور واپس آگئی تھیں۔ تمام قبائل نے بغیر لڑے بھڑے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور سواد دومۃ الجندل کے باقی تمام علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ فلسطینیوں اور شامی سرحد پر بسنے والے عربوں پر مشتمل جو فوجیں شام کے سرحدی مقامات پر

موجود تھیں انہیں رومی کسی طرح بھی عربوں کے مقابلے کے لیے تیار نہ کر سکتے تھے کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ مبادا یہ لوگ مسلمانوں سے مل جائیں۔

شامی سرحد پر اسلامی فوجوں کے سردار حضرت خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہلے انہیں مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے بھیجنا چاہا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس رادے کی مخالفت کی اور اتنا اصرار کیا کہ آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں مرتدین کے مقابلے میں بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کے بجائے تیما میں امدادی دستے کا امیر مقرر کر کے شام کی سرحد پر بھیج دیا۔ انہیں ہدایت تھی کہ جب تک خلیفہ کے واضح احکام ان تک نہ پہنچیں وہ نہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور نہ اس وقت تک دشمن سے جنگ کا آغاز کریں جب تک دشمن خود پہل کر کے ان کے مقابلے میں نہ آجائے۔ البتہ وہ گردونواح میں بسنے والے قبائل کو ساتھ ملانے کی پوری کوشش کریں سوا ان قبائل کے جو ارتداد اختیار کر چکے تھے۔

فریقین کی جنگی تیاریاں:

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احکام پر پوری طرح عمل کیا جس کے نتیجے میں چند ہی دنوں کے اندر اندر ان کے جھنڈے کے نیچے ایک جرار لشکر تیار ہو گیا۔ جب ہرقل کو اپنی سرحدوں پر اس عظیم الشان لشکر کے اجتماع کی خبر ملی تو اس نے بھی پورے زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں ہرقل کی جنگی تیاریوں کا ذکر کر کے رومی سرحدوں پر چڑھائی کرنے کی اجازت طلب کی مبادا رومیوں کا لشکر اچانک مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائے اور انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے خط پر خوب غور و فکر کیا۔ جنوبی عرب سے آنے والی خبریں بہت حوصلہ افزا تھیں۔ عکرمہ اور مہاجر نے اس علاقے کے مرتدین کا قلع قمع کر دیا تھا اور عکرمہ، مہاجر کو یمن میں چھوڑ کر خود اپنی فوجوں کے ساتھ واپس آنے والے تھے۔ ان فوجوں کی واپسی پر شام میں مقیم اسلامی فوجوں کو کمک بھیجنا بہت آسان تھا لیکن سوال یہ تھا کہ آیا یہ فوجیں، جن کی تعداد بہرحال رومیوں کے جرار لشکروں سے بہت کم تھی، رومیوں کے مقابلے کے لیے کافی بھی ہوں گی بالخصوص اس حالت میں کہ رومیوں کے پاس سامانِ جنگ کی بھی کمی نہ تھی اور اس سے قبل ہرقل اپنی افواج کی کثرت اور سامان جنگ کی فراوانی کی بدولت ایرانیوں کی عظیم الشان فوجوں کو شکست دے چکا تھا۔ اس مشکل صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کا یہی طریقہ تھا کہ جنوبی عرب کے ان قبائل کو جو بدستور اسلام پر قائم تھے، ساتھ ملایا جائے اور دوسری اسلامی فوجوں کے ساتھ انہیں بھی شام روانہ کر دیا جائے۔ اس طرح امید ہو سکتی تھی کہ اسلامی فوجیں رومیوں کے سامنے ٹھہر سکیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انتہائی غور و فکر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ

،حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ،حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ،حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ،حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ،حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ،حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ،حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ،حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور دوسرے بڑے بڑے مہاجرین و انصار کو طلب فرمایا اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ اہل عرب کو شامیوں کے متوقع حملوں سے ہر طرح محفوظ رکھا جائے۔ اس غرض سے آپ نے جو تدابیر اختیار کیں انہیں پوری طرح لباس عمل پہنانے نہ پائے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ اب آپ لوگوں نے سن لیا ہے کہ ہرقل ہمارے مقابلے کی غرض سے کثیر تعداد میں فوجیں جمع کر رہا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طاقت و جرأت سے کام لینا چاہیے اور رومیوں سے نبرد آزمائی کے واسطے زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوجیں شام روانہ کرنی چاہئیں۔ جو شخص مارا گیا اسے شہادت کا رتبہ نصیب ہوگا اور جو زندہ رہا وہ مجاہدین کے زمرے میں شامل ہوگا اور اللہ کے ہاں اس کے لیے جو اجر لکھا جائے گا اس کا کوئی حساب و شمار ہی نہیں۔ اب آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہنے لگے: "واللہ! ہم نے جس نیک کام میں بھی سبقت کرنے کی کوشش کی، اس میں آپ کو سب سے آگے پایا۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں کسی کو کلام نہیں۔ اللہ کا منشاء بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم شام کو فتح کر لیں۔ آپ یقیناً زیادہ سے زیادہ آدمی شام روانہ کیجئے۔ اللہ اپنے دین کا مددگار ہے۔ وہ یقیناً اسلام کو شان و شوکت بخشے گا اور اس کی ترقی کے لیے جو وعدے اس نے اپنے رسول ﷺ سے کیے تھے انہیں ضرور پورا فرمائے گا۔"

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ میں احتیاط کا مادہ زیادہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: "اے خلیفہ رسول اللہ ﷺ! اس معاملے پر اچھی طرح غور و فکر کیجئے۔ رومی ہم سے بہت زیادہ طاقتور ہیں۔ یک دم افواج بھیج کر انہیں غیر یقینی صورت حال سے دوچار کر دینا قرین دانشمندی نہ ہوگا۔ میرے خیال میں رومیوں پر پوری قوت سے حملہ کرنے کی نسبت بہتر یہ ہوگا کہ ابتداء میں چند دستے بھیجے جائیں جو سرحد پر چھاپہ مار کر اور رومیوں کو تھوڑا بہت نقصان پہنچا کر واپس چلے آئیں۔ ان کے بعد چند دستے اور بھیجیں جو پہلے کی طرح سرحدوں پر چھاپے مار کر سرحدی قبائل کو خوف زدہ کر کے واپس آجائیں۔ اسی طرح کچھ کچھ وقفے کے بعد دستے بھیجے جائیں اور کچھ عرصہ بعد انہیں واپس بلا لیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو اہل شام ہمارے مسلسل حملوں سے خوف زدہ ہو جائیں گے، دوسری طرف جب عرب دیکھیں گے کہ ہمارے دستے ہر بار رومیوں کو زک پہنچا کر اور مالِ غنیمت لے کر واپس آتے ہیں تو ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور ان میں رومیوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ بہت آسانی سے اہل یمن اور ربیعہ و مضر کو اکٹھا کر کے انہیں رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی مرضی ہوگی کہ آپ انہیں ساتھ لے کر خود جہاد پر روانہ ہو جائیں یا اپنی جگہ دوسرے سردار مقرر کر کے بھجوا دیں۔"

مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حاضرین کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”بتائیے اب آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟“

اس پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ”آپ مسلمانوں کے دلی خیر خواہ اور حامیٔ دین ہیں۔ اگر آپ نے ان کی بھلائی کے لیے کوئی قطعی رائے قائم کر لی ہے تو نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آپ اسے نافذ کرنے کا حکم فرمائیں کوئی شخص آپ کی مخالفت نہ کرے گا۔“

اس موقع پر دیگر حاضرین مجلس نے بھی عثمان رضی اللہ عنہ سے پوری طرح اتفاق کیا اور حضرت ابو بکرؓ کو مخاطب کر کے کہنے لگے: ”آپ کی جو بھی رائے ہو اسی پر عمل کیجئے۔ ہم دل و جان سے آپ کی اطاعت کریں گے اور جو حکم آپ ہمیں دیں گے اسے بہ سرو چشم قبول کریں گے۔“

یہ سن کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں کو شام پر لشکر کشی کے لیے تیار ہونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ”میں تم پر چند امیر مقرر کرتا ہوں۔ تم اپنے رب کی اطاعت کرو اور اپنے امراء کی مخالفت نہ کرو۔ تمہاری نیتیں اور سیرتیں پاک و صاف ہونی چاہئیں کیونکہ اللہ انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ہیں۔“

لیکن لوگوں پر رومیوں کی اتنی ہیبت طاری تھی کہ خلیفہ کے احکام سن کر تھوڑی دیر کے لیے وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خاموشی کو توڑا اور گرج کر کہنے لگے: ”اے مسلمانو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خلیفہ کی باتوں کا جواب نہیں دیتے حالانکہ اس کے پیش نظر صرف تمہاری بھلائی ہے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس سرزنش نے حاضرین کے دلوں پر فوری اثر کیا اور وہ شام روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ (ازدی لکھتے ہیں کہ حضرت خالد بن سعید اس مجلس میں موجود تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے جہاد پر جانے کی حامی بھری تھی۔ لیکن طبری، ابن خلدون اور ابن اثیر نے اپنی کتابوں میں وہی روایت درج کی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ہم بھی طبری کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس زمانے میں تیما میں مقیم تھے اور اس اجتماع میں حاضر نہ تھے)۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مصروفیات اور ذمہ داریاں:

شام پر چڑھائی کے معاملے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس درجہ انہماک تھا کہ دوسرے تمام معاملات ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ جریر بن عبداللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل تھے۔ وہ ان سے اجازت لے کر شام سے مدینہ آئے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بعض مطالبات پیش کیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے فرمایا: ”تمہیں معلوم ہے کہ مسلمان اس وقت ایران اور روم، دو شیروں کے مقابلے میں نبرد آزما ہیں لیکن تمہیں اس وقت اپنے مطالبات کی پڑی ہے تم فوراً عراق پہنچ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہو جاؤ اور اپنے مطالبات کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سننے کے بعد جریر حیرہ چلے گئے جہاں اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مقیم تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ابتدائے خلافت ہی سے اہم جنگی مسائل سے واسطہ پڑ چکا تھا جن میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس لیے ان کا زیادہ تر وقت انہیں مسائل کو حل کرنے اور انہیں گتھیوں کو سلجھانے میں گزر جاتا تھا۔ کبھی عراق میں پھیلی ہوئی فوجوں کی فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ انہیں مدد کی ضرورت تو نہیں۔ کبھی جنگوں میں گئے ہوئے لوگوں کے اہل و عیال کی طرف توجہ کرنی پڑتی تھی کہ ان کی ضروریات بہت اچھی طرح پوری ہو رہی ہیں اور انہیں تکالیف کا سامنا تو نہیں کرنا پڑ رہا۔ کبھی شمال اور جنوبی عرب کے قبائل کا خیال آتا تھا کہ حکومت سے ان کی وفاداری اور دارالخلافے سے ان کے بہ ظاہر مخلصانہ تعلقات مشکوک تو نہیں۔ کبھی میدان جنگ سے فتوحات کی دل خوش کن خبریں آکر مسرت اور بہجت کی لہریں قلب کے گوشے گوشے میں پھیل جاتی تھیں اور کبھی بعض سرداروں کی پست ہمتی کی اطلاعات موصول ہو کر دل و دماغ پر تفکرات کے پردے ڈال دیتی تھیں۔ ہر خبر کے متعلق سوچنا پڑتا تھا کہ اسے لوگوں سے بیان کیا جائے یا نہ اور اگر بیان کیا جائے تو کس طریقے سے۔ غرض ان کے شب و روز انہیں تفکرات میں گزرتے تھے اور وہ ناخن تدبیر کے ذریعے سے پیچیدہ گتھیوں کے سلجھانے میں مصروف رہتے تھے اگرچہ ان کے مشیر کار بہت تجربہ کار، مخلص اور تمام معاملات پر گہری نظر رکھنے والے تھے، انہیں ان پر بے حد اعتماد بھی تھا اور اکثر اہم امور کے بارے میں وہ ان سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے پھر بھی وہ ان کے مشوروں کے پابند نہ تھے بلکہ تمام معاملات میں آخری فیصلہ خود ہی کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ عامۃ المسلمین کے سامنے جواب دہ صرف خلیفہ کی ذات ہے اس لیے ہر معاملے کی ذمہ داری بھی اسی کو اٹھانی چاہیے اور یہ بوجھ کسی اور فرد یا جماعت کے سر نہ ڈالنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ جب سے مرتدین کی جنگوں نے شدت اختیار کی تھی انہوں نے مدینہ سے باہر نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ ان کے شب و روز دارالخلافہ ہی میں گزرتے تھے اور ہر وقت وہ انہیں افکار میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے کہ پیش آمدہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں، فوجوں کو کس طرح کمک پہنچائی جائے، فلاں علاقے کی بغاوت کس شخص کے ذریعے سے فرو کی جائے، مفتوحین سے کیا سلوک کیا جائے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام و انصرام کس طرح عمل میں لایا جائے۔

مرتدین کی سرکوبی سے فراغت کے بعد جب اسلامی فوجوں نے ایران و روم کی عظیم الشان، باجبروت سلطنتوں کی طرف توجہ منعطف کی اور عراق و شام کے میدانوں میں معرکے سر ہونے لگے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں انہیں اس درجہ انہماک تھا کہ مملکت کے علاوہ دیگر تمام امور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے حتیٰ کہ انہوں نے اپنے آپ کو بھی فراموش کر کے اپنے آرام و آسائش اور صحت تک کو اس راہ میں قربان کر دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اختیار کردہ سیاست کامیابی اور ظفر مندی کی ضامن تھی۔ ان کا عہد جہاں عدل و

انصاف اور رعایا پر رحمت و شفقت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا وہاں اس اولعزمی کا بھی جواب نہیں جس کا نمونہ انہوں نے اپنے مختصر سے عہد خلافت میں پیش کیا۔ انہوں نے انتہائی شجاعت سے سارے عرب کو اسلامی حکومت کا مطیع و فرماں بردار بنا دیا لیکن قبائل کو ان کے جائز حقوق دینے سے کبھی پہلوتہی نہ کی بلکہ جو آزادی محمد ﷺ نے انہیں مرحمت فرما رکھی تھی اسی آزادی سے انہوں نے بھی انہیں بہرہ ور کیے رکھا اور سوا زکوٰۃ کے، جو وہ محمد ﷺ کے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے، ان سے اور کسی چیز کی ادائیگی کا مطالبہ نہ کیا۔ اس زکوٰۃ کا بھی بیشتر حصہ انہیں قبائل کے فقراء اور مساکین پر خرچ ہو جاتا تھا۔

سلطنت کو خراج اور مال غنیمت کے ذریعے سے جو آمدنی ہوتی تھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس میں سے ایک درہم بھی اپنی ذات پر خرچ کرنا حرام سمجھتے تھے۔ وہ سلطنت کے خزانے سے صرف اتنی رقم لیتے تھے جتنی مسلمانوں نے ان کے لیے گزارے کے طور پر مقرر کر رکھی تھی۔ آمدنی کا بیشتر حصہ جنگوں کی تیاری میں خرچ ہوتا تھا اور بقیہ فقراء اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ابتدائی عہد خلافت میں بیت المال سخ میں تھا جہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ قیام پذیر تھے لیکن بعد میں جب کام کی زیادتی کے باعث انہیں اپنا قیام مدینہ میں منتقل کرنا پڑا تو بیت المال کو بھی اپنے ساتھ مدینہ لے آئے۔ جب ایران سے بھاری مقدار میں مال غنیمت آنا شروع ہوا تو ان سے عرض کیا گیا کہ بیت المال کی نگرانی اور حفاظت کے لیے کسی شخص کو مقرر کر دیں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ جتنا مال ان کے پاس آتا تھا وہ اسے اسی وقت لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور بیت المال میں اتنا بچتا نہ تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے نگران کی ضرورت پڑتی ایک مرتبہ ان کے عہد خلافت میں مدینہ کے قریب قبیلہ بنوسلیم میں سونے کی ایک کان دریافت ہوئی۔ سونا بڑی قیمت دھات ہے لیکن انہوں نے حسب معمول کان سے حاصل ہونے والا سونا بھی مسلمانوں میں تقسیم کر دیا اور کچھ بچا کر نہ رکھا۔

تقسیم اموال میں وہ مساوات کا اصول ملحوظ رکھتے تھے اور ابتدائی دور کے مسلمانوں اور بعد میں اسلام قبول کرنے والوں، آزاد لوگوں اور غلاموں، مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا فرق روا نہ رکھتے تھے بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ وہ لوگوں کے وظائف ان کے مرتبے کے مطابق کیوں مقرر نہیں کرتے؟ لیکن انہوں نے یہ جواب دے کر انہیں خاموش کر دیا کہ جو لوگ ابتداء میں اسلام لائے وہ اپنا اجر آخرت میں اللہ سے پائیں گے، دنیا میں انہیں وہی کچھ ملے گا جو دوسرے مسلمانوں کو ملتا ہے۔

عدل و انصاف اور مساوات کے اس سلوک نے تمام لوگوں کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا گرویدہ کر دیا تھا اور ہر شخص کے دل میں ان کی تعظیم و تکریم کے جذبات پنہاں تھے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ دلی رفیق اور سب سے زیادہ قابل اعتماد مشیر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ کا بھی اپنی اپنی جگہ ان سے خصوصی تعلق تھا۔ ان لوگوں سے مشورہ لیتے تھے لیکن ذاتی طور پر باوجود ان کے مشوروں کو قبول

کرنا ان کے لیے لازم نہ تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر مشورے کے بہانے وہ کسی کام کی ذمہ داری دوسروں پر نہ ڈالتے تھے بلکہ ہر قسم کی ذمہ داری خود اٹھاتے تھے۔ اس کی متعدد مثالیں ان کے عہد میں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ جب اسامہ کے لشکر کو روانہ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا تو ان کے تمام مشیروں کی رائے تھی کہ یہ وقت اس کام کے لیے موزوں نہیں کیونکہ مدینہ کے چاروں طرف مرتدین کا زور ہے اور اسامہ کے لشکر کی روانگی کے باعث مدینہ میں لڑنے والوں کی تعداد بے حد کم رہ جائے گی لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کے مشوروں کو رد کرتے ہوئے اسامہ کو روانہ ہونے کا حکم دیا اور مرتدین سے اس طرح مقابلہ کیا کہ ان کے تمام مشیروں ان کی فراست، عقل مندی اور کمال دور اندیشی کا اعتراف کرنا پڑا۔

کام کا بوجھ ان پر جتنا پڑتا جاتا تھا ان کی طبیعت میں اتنا ہی انکسار، فروتنی اور سادگی آتی جاتی تھی۔ جب تک آپ سنح میں رہے آرام کے لیے بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ عموماً وہ صبح کے وقت گھوڑے پر سوار ہو کر سنح سے مدینہ آیا کرتے تھے اور نماز پڑھا کر امور سلطنت میں مصروف ہو جاتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی آرام بھی کرتے تھے اور ان کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھاتے تھے جمعہ کے روز دوپہر تک وہاں گھر ہی میں رہتے تھے اور سر اور ڈاڑھی کو خضاب لگاتے تھے۔ اس کے بعد مدینہ آ کر جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے۔ لیکن کام بڑھ جانے کے باعث جب انہیں سنح کا قیام ترک کر کے مدینہ میں رہنا پڑا تو انہوں نے آرام کا سارا وقت مسلمانوں کی خاطر قربان کر دیا اور لمحہ لمحہ سلطنت کے امور کی دیکھ بھال میں صرف کرنے لگے۔ لیکن کام کی انتہائی کثرت کے باوجود انہوں نے اپنے لیے کبھی کوئی خادم مقرر نہ کیا۔ دن کا بڑا حصہ وہ مسجد میں تشریف فرما رہتے اور لوگوں کی شکایات سنتے۔ جہاد کے متعلق مختلف ہدایات بھیجتے اور لوگوں کو مشورے دیتے رہتے تھے۔ جب ضروری ہوتا تھا تو ان سے مشورے لیتے بھی تھے۔ سلطنت کے تمام چھوٹے بڑے معاملات مسجد ہی میں ان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے اور وہیں بیٹھے بیٹھے وہ ان کے متعلق احکام صادر فرما دیتے تھے۔

غریبوں اور مسکینوں پر بے حد مہربان تھے۔ سردیوں میں کمبل خریدتے اور انہیں محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر فقراء اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ مدینہ میں ایک بوڑھی اندھی عورت رہتی تھی۔ میں روزانہ علی الصباح اس کی خبر گیری کے لیے جایا کرتا تھا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی جب وہاں جا کر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص ہی سے آ کر اس بڑھیا کا سارا کام کاج کر گیا ہے۔ آخر ایک روز میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس شخص [illegible] رہوں گا۔ ابھی رات باقی تھی کہ میں بڑھیا کی جھونپڑی کے قریب چھپ کر بیٹھا ر[illegible] کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چلے آ[illegible] میں کہا ''حضرت ابوبکر! یقیناً یہ کام تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا'' [illegible] کاج کیا اور واپس چلے گئے۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذات ان کے تمام عمال کے لیے نمونہ تھی۔ عرب کی آتش فشاں سرزمین میں، جہاں ہر طرف بغاوت اور ارتداد کے شعلے بھڑک رہے تھے، مایوس دلوں کے لیے ان کی ذات اس مشعل کی مانند تھی جو اندھیری رات اور تنگ و تاریک مکان میں ضیا دوز ہو اور تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر رہی ہو۔ سارا عرب ان کے عدل و انصاف، رحمت و شفقت، حکمت اور حسن سیاست سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا اور یہی خصوصیات ان کی کامیابی کا اصل باعث تھیں۔

جہاد اور غنیمت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کامل یقین تھا کہ اللہ انہیں ہر میدان میں کامیابی عطا فرمائے گا۔ اللہ نے اپنے رسول ﷺ سے دین کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ خواہ زمین و آسمان ہل جاتے لیکن خدائی باتوں کا ٹلنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اس کے وعدے پورے ہوئے مرتدین کی جنگوں میں مسلمانوں کو شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ عراق کے میدان ہائے جنگ میں فتح ونصرت ان کے قدم چوم رہی تھی اور مسلمان ہر دم تائید ایزدی سے بہرہ یاب ہو رہے تھے۔ کوئی جنگ ایسی نہ ہوتی تھی جس میں کثیر مال غنیمت ہاتھ نہ آتا ہو۔ دربار خلافت میں مال غنیمت کا صرف پانچواں حصہ جاتا تھا باقی میدان جنگ ہی میں تقسیم ہو جاتا تھا اور ہر سپاہی کے حصے میں ہزاروں درہم آتے تھے۔ جنگوں میں پیچھے رہنے والے لوگ جب یہ دیکھتے تھے تو ان کے دلوں میں بھی لڑائیوں میں شرکت کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا اور جونہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے جہاد میں شمولیت کا اعلان ہوتا فوراً ہی قبائل عرب دیوانہ وار آگے بڑھ کر ان کی دعوت پر لبیک کہتے تھے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف مالِ غنیمت کا لالچ عربوں کو کشاں کشاں میدان ہائے کارزار کی طرف لے جاتا تھا بلکہ جنگوں میں شامل ہونے کا بڑا سبب وہ جذبہ شہادت تھا جو ہر مسلمان کے دل میں موجزن رہتا تھا۔ کون شخص اس بات سے بے خبر تھا کہ مجاہدین اور ان کے دشمن کی قوت و طاقت اور تعداد میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ دشمن ہمیشہ بہترین جنگی تیاریوں اور جرار لشکروں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل میدان جنگ میں آیا اور اپنی شان وشوکت کا مظاہرہ کرنے میں کبھی کسی قسم کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان حالات میں شریک جنگ ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن نڈر اور بے خوف مجاہدین نے اللہ کے راستے میں کسی بھی خطرے کی پروانہ کی اور ہمیشہ دشمن کی صفوں میں دیوانہ وار گھستے چلے گئے۔ حصول شہادت کا یہی جذبہ دیکھ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایرانی سرداروں کو یہ پیغام بھجوایا کرتے تھے کہ ”میں تمہارے پاس ایک ایسی قوم کو لا رہا ہوں جو موت کو اتنی ہی عاشق ہے جتنے تم زندگی کے۔“

یہ قانون قدرت ہے کہ جو قوم موت سے بے خوف ہوتی ہے اقوام عالم میں اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ اپنی خواہشات اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں، قوموں کی سرداری کا تاج انہیں کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے لیے موت پسند کی جس پر انہیں ہمیشہ کے لیے زندگی عطا کی گئی۔

انہوں نے اللہ کی راہ میں ہر قسم کی تکالیف اور مصائب برداشت کیے اس لیے انہیں دونوں جہان کی عزت سے سرفراز کیا گیا۔

پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مال غنیمت کا شوق بھی کسی حد تک انہیں میدان جنگ میں لے جانے کا باعث بنا۔ عرب قبائل کی فطرت میں یہ بات داخل تھی کہ وہ غنیمت کو دیکھ کر کسی طرح صبر نہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ اسلام نے آ کر اس نفسانی جذبے کو بڑی حد تک مٹا دیا تھا اور غنیمت کے لالچ میں دشمن سے جنگ کرنے کی بجائے اللہ کے دین کی خاطر جہاد میں شرکت کرنے کی تمنا ان کے دلوں میں پیدا کر دی تھی لیکن قدرتی جذبے کو یکسر مٹانا آسان نہ تھا۔ کسی نہ کسی حد تک یہ جذبہ ان کے دلوں میں موجود تھا۔ چنانچہ خود حضرت خالد بن ولید ؓ نے الیس کی جنگ کے اختتام پر کہا تھا کہ عراق میں مال و دولت کی فراوانی اور مال غنیمت کی کثرت، جو عربوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی، آتش جنگ بھڑکا دینے کے لیے یقیناً کافی تھی۔

مرتد قبائل جنھیں ارتداد کی سزا میں عراق کی جنگوں میں شرکت سے بہ زور منع کر دیا گیا تھا، اپنے بھائیوں کے گھروں میں دولت کی ریل پیل دیکھ کر اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو لوگ اسلام پر ثابت قدم رہے تھے وہ نہ صرف کامیابی و کامرانی سے ہم کنار بلکہ مال و دولت سے بھی بہرہ ور ہو رہے تھے مگر مرتدین کے حصے میں حسرت و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔

روانگی شام:

بایں ہمہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو شام جانے کی دعوت دی تو ابتداء میں رومیوں کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی زبردست جنگی طاقت دیکھ کر مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں جانے کی جرأت نہ ہوئی لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ رومیوں کی ہیبت کا یہ اثر عارضی ہے اور جونہی انہیں حالات کی نزاکت کا احساس ہو گا وہ جوق در جوق جہاد پر جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد لوگوں نے یکے بعد دیگرے اپنے آپ کو شام جانے کے لیے پیش کرنا شروع کر دیا۔

اہل مدینہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کو بھی اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہا اور انہیں یہ خط لکھا: "اللہ نے مومنوں پر جہاد فرض کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تنگی ہو خواہ فراخی سامان جنگ کی کمی ہو یا افراط، انہیں ہر حال میں دشمنوں سے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے، چنانچہ ف[illegible]

وجاهدوا باموالكم وانفسكم في سبيل الله (اے مومنو! اپنے مالوں اور ا[illegible]

اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔) جہاد ایک لازم فریضہ ہے اور اس کا ثوا[illegible] [illegible] میں

ناممکن ہے۔ تمہارے ان بھائیوں کو، جو میرے سامنے موجود [illegible]

کیا، چنانچہ وہ میری آواز پر لبیک کہہ کر خلوص نیت سے شا[illegible] [illegible] میں پیہم یہ خبریں پہنچ رہی تھی

باری ہے۔تم بھی میری آواز پر لبیک کہو اور جو فریضہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عائد کیا گیا ہے اس کی بجا آوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو۔"

اہل یمن پر اس خط کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ جونہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قاصد نے اسے مجمع عام میں پڑھ کر سنایا ذوالکلاع حمیری اپنی قوم اور یمن کے بعض اور قبائل کو ہمراہ لے کر شام جانے کے ارادے سے مدینہ روانہ ہو گئے۔ ذوالکلاع کی پیروی میں قبیلہ مذحج سے قیس بن ہبیرہ مرادی، ازد سے جندب بن حضرت عمرو الدوسی اور طی سے حابس بن سعد طائی نے اپنے اپنے ساتھیوں اور قبیلوں کے ہمراہ مدینہ کی راہ لی۔

اس دوران میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قاصد یمن میں قبیلہ در قبیلہ جا کر ان کا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں مشغول تھا اور اہل یمن کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مہاجرین، انصار، اہل مکہ اور دوسرے نواحی قبائل کو اکٹھا کر کے شام بھیجنے کی تیاری کر رہے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لشکروں کو کس وقت بھیجنا شروع کیا؟ شام کی طرف کوچ کرنے والا سب سے پہلا لشکر کون سا تھا؟ جو لشکر مدینہ آ کر اکٹھے ہوئے تھے ان کے امیر کون تھے؟ ان امور کے متعلق مورخین میں خاصا اختلاف ہے۔

اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کی جانب سب سے پہلا لشکر ۱۲ھ کے اواخر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حج سے واپس آنے کے بعد روانہ ہوا تھا۔ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ۱۲ھ کے اوائل میں جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق روانہ فرمایا تو انہی کے ساتھ حضرت خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو شام جانے کا حکم دیا۔ لیکن ہمارے خیال میں اصل واقعات اس طرح ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں جب ابھی یمن، کندہ اور حضر موت میں مرتدین سے جنگیں جاری تھیں، عراق جا کر اسلامی افواج کی قیادت سنبھالی تھی۔ حضرت خالد بن سعید کو بھی اسی زمانے میں شام بھیجا گیا تھا لیکن ان کے بھیجنے کی اصل غرض محض سرحدوں کی حفاظت تھی نہ کہ رومیوں سے جنگ چھیڑنا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو شام پر چڑھائی کرنے کا خیال یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں میں مرتدین کے کامل استیصال، عراق میں حیرہ کی فتح اور شام کے سرحدی شہر دومۃ الجندل کی تسخیر کے بعد آیا۔

ہماری اس رائے کی تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ جب شام پر چڑھائی کرنے کا سوال پیدا ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اہل یمن کو وہاں جانے کے لیے آمادہ کیا اور یہ اس وقت تک نہ ہو سکتا تھا جب تک وہاں سے فتنہ ارتداد کا بالکل قلع قمع نہ کر دیا جاتا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عکرمہ اور ذوالکلاع یمن میں امن وامان قائم کرنے کے بعد وہیں مقیم نہیں رہے بلکہ مہاجر کو ساتھ لے کر کندہ اور حضر موت میں فتنہ ارتداد کو فرو کرنے کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ جب جنوبی عرب میں کلیتہ امن قائم ہو گیا اور مدینہ کو عکرمہ کی واپسی کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے اس لشکر کو چھوڑ کر، جس کے ذریعے سے انہوں نے مرتدین کے ساتھ جنگوں میں حصہ لیا تھا، ایک اور لشکر کی قیادت سنبھال لی جسے یمن اور جنوبی

عرب کی بغاوتوں کو دبانے، یمن سے مدینہ لوٹنے اور وہاں سے شام روانہ ہونے کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔ اکیلا مکہ سے مدینہ تک کا راستہ اونٹوں پر دس دن سے کم میں طے نہیں ہوتا اور مدینہ سے شام کا فاصلہ ایک مہینے کی مسافت سے کسی طرح کم نہیں۔

مذکورہ بالا معاملے کی طرح اس امر میں بھی مورخین میں اختلاف ہے کہ شام پر چڑھائی کا خیال پیدا ہونے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے کس شخص کو امیر بنا کر وہاں بھیجا۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ سعادت سب سے پہلے حضرت خالد بن سعید بن عاص اموی کے حصے میں آئی۔ ہم قبل ازیں یہ روایت بھی بیان کر چکے ہیں کہ مرتدین سے جنگیں شروع ہوتے ہی انہیں شام کی سرحد پر تیماء بھیج دیا گیا تھا تاکہ رومی مسلمانوں کی مصیبت (ارتداد) سے فائدہ اٹھا کر عرب پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ان دونوں روایتوں کے برعکس ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے حاکم تھے اور آپ کی وفات سے ایک ماہ بعد مدینہ پہنچے تھے مدینہ پہنچ کر وہ علی رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہنے لگے: "اے بنو عبد مناف! تم نے ہنسی خوشی خلافت کی باگ ڈور دوسروں کو کیوں سپرد کر دی حالانکہ اس پر تمہارا حق فائق تھا؟"

بعد میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف اسلامی لشکر بھیجنا چاہا اور حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے عرض کیا کہ آپ ایسے آدمی کو سالار لشکر بنا کر بھیج رہے ہیں جو قبل ازیں فساد انگیز باتیں کر چکا ہے۔

اس معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اصرار اس حد تک بڑھا کہ آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو ہٹا کر ان کی جگہ زید بن ابوسفیان کو شامی لشکروں کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بر خود غلط اور متکبر انسان ہے۔ اس لیے اسے ایسی مہم پر بھیجنا مناسب نہ ہوگا جہاں ہر قدم پر انتہائی حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی روایتیں بھی آتی ہیں کہ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو کبھی امیر بنا کر بھیجا ہی نہیں گیا، وہ ابوعبیدہ بن جراح کے لشکر میں شامل تھے۔

ان تمام روایات کے برعکس ہمارا خیال وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو شام کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تیما بھیجا گیا تھا اور وہ اپنے دستے کے ہمراہ وہیں مقیم رہے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جہاد شام کے لیے عام تحریک فرمائی تو وہ مدینہ میں موجود نہ تھے۔ یہ تحریک انہوں نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ ہی کی طرف سے یہ رپورٹ موصول ہونے پر کی تھی کہ رومی فوجوں میں نقل و حرکت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور اگر دربار خلافت سے ان کی مدد کے لیے فوجیں روانہ نہ کی گئیں تو خطرہ ہے کہ مبادا رومی ان کے دستے پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیں۔

رومی بھی جنگی تیاریوں اور فوجی نقل و حرکت میں حق بجانب تھے۔ کیونکہ انہیں پیہم یہ خبریں پہنچ رہی تھی

کہ عراق میں مسلمان فتوحات پر فتوحات حاصل کر رہے ہیں اور عرب میں مسلمانوں کے خلاف مرتدین نے جو جا بجا فتنے کھڑے کیے تھے ان سب کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ ان کے دلوں میں اب تک غزوہ تبوک کی یاد باقی تھی۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کثیر صحابہ کو ساتھ لے کر رومی سرحدوں تک پہنچ گئے تھے اور رومی سرحد پر بسنے والے قبائل سے معاہدات صلح کر کے مدینہ واپس چلے گئے تھے۔ اب آپ کے متبعین دوبارہ رومی سرحدات تک پہنچ کر اسے عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے رومی سلطنت نے غسانیوں اور شام کی سرحد پر بسنے والے دوسرے قبائل کو ہدایت کی کہ وہ سرحد پر ایک زبردست روک بن کر کھڑے ہو جائیں اور مسلمانوں کو کسی طرح بھی شامی حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دیں۔ چنانچہ ان قبائل نے کثیر فوج فراہم کر کے اسے سرحد پر جمع کر دیا۔ اب رومیوں اور مسلمانوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل کیل کانٹے سے لیس تیار کھڑی تھیں۔ مسلمانوں کی فوج سرحد کے اس طرف عرب کی حدود میں تھی اور غسانیوں کی فوج سرحد کے اس پار شام کی حدود میں۔ دونوں فوجیں منتظر تھیں کہ کب حکم ملے اور دوسرے فریق پر دھاوا بول دیں۔

اسی دوران میں حضرت خالد بن ولید کی پے در پے فتوحات کی خبریں موصول ہو کر رومیوں کے لیے مزید پریشانی اور سراسیمگی کا باعث بن گئیں۔ آج اہل انبار نے عاجز آ کر شہر کے دروازے اسلامی لشکر کے لیے کھول دیئے۔ آج عین التمر پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا۔ آج فلاں شہر کی فوج نے مسلمانوں کے مقابلے میں شکست کھائی اور آج فلاں فوج نے تاب مقاومت نہ لا کر راہ فرار اختیار کی۔

رومیوں کو یقین تھا کہ تیماء پر مقیم اسلامی فوج بھی چین سے بیٹھنے والی نہیں، وہ بھی اپنے بھائیوں کی تقلید میں شامی سرحد پر دست درازی کرنے سے کسی صورت باز نہ رہے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایک نئے جوش اور ولولے سے مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

یہ دیکھ کر حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے دوبارہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا۔ جس میں رومیوں کے جوش وخروش اور بہراء، کلب، تنوخ، لخم، جذام اور غسان کے قبائل کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دیتے ہوئے شامی سرحد کے اندر پیش قدمی کی اجازت طلب کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت شام بھیجنے کے لیے فوجوں کی فراہمی میں مصروف تھے۔ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جواباً لکھا:

''تمہاری درخواست پر تمہیں پیش قدمی کی اجازت دی جاتی ہے لیکن حملہ کرنے میں کبھی پہل نہ کرنا اور ہمیشہ اللہ سے مدد مانگتے رہنا۔''

شامی فتوحات کے سلسلے میں یہ پہلے کلمات تھے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قلم سے نکلے۔

اسلامی فوجوں کی پیش قدمی:

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اپنے مختصر سے دستے اور بدوی قبائل کے ہمراہ شام کی سرحد پر تیماء میں مقیم تھے۔ ان کے مقابلے کے لیے سرحدی قبائل پر مشتمل رومیوں کا عظیم الشان لشکر سرحد کے دوسری طرف تیار کھڑا تھا لیکن اپنے سے کئی گنا فوج کو دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے اور ان کے عزم و ارادہ میں پہلے سے زیادہ پختگی آ گئی۔ جب حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی یہ ہدایات موصول ہوئیں تو انہوں نے فوراً اپنی فوج کو تیار ہونے کا حکم دے دیا اور اسے لے کر شامی حدود میں داخل ہو گئے۔ رومیوں اور ان کے مددگاروں نے جونہی اسلامی لشکر کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ لشکر گاہ میں داخل ہوئے اور رومیوں کا چھوڑا ہوا سامان قبضے میں کر لیا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس پہلی فتح کی اطلاع بھیجی۔ وہاں سے جواب آیا: ''آگے بڑھتے چلے جاؤ لیکن جب تک تمہارے پاس مزید فوجیں نہ پہنچ جائیں۔ بہ طور خود دشمن پر حملہ کرنے سے پرہیز کرو۔''

چنانچہ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ بحر مردار کے مشرقی ساحل کے قریب مقام قسطل پر انہیں ایک اور رومی لشکر کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اسے بھی شکست دی اور پیش قدمی جاری رکھی۔ یہ دیکھ کر رومیوں اور اہل شام کو بہت طیش آیا۔ ان کی آتش حمیت بھڑک اٹھی اور انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

جب حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ جنگی تیاریاں دیکھیں تو انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جلد از جلد کمک روانہ کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ کامیابی سے سفر جاری رکھ سکیں۔ اس دوران میں مدینہ سے فوجیں روانہ ہو چکی تھیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان کی کامیابی کا پورا یقین تھا اور خدائی امداد پر کامل بھروسہ۔ وجہ یہ تھی کہ رومی ایرانیوں سے کسی طرح بھی بہتر نہ تھے۔ جب سے انہوں نے ایرانیوں پر غلبہ

حاصل کیا تھا انہیں عیش و آرام کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ سرحدوں کی حفاظت کا سارا کام انہوں نے بدوی قبائل پر چھوڑ رکھا تھا۔ یہ قبائل اگرچہ شجاعت و بہادری میں تو کسی طرح ہیٹے نہ تھے لیکن جنس اور زبان کے لحاظ سے جو تعلق انہیں اہل عرب سے تھا وہ رومیوں سے نہ تھا۔ شامی عرب اگرچہ عیسائی مذہب کے پیرو تھے پھر بھی ہرقل کی عیسائیت اور ان کی عیسائیت میں بڑا فرق تھا۔ شامی عرب "ارثوذکسی" (آرتھوڈوکس) عقیدے کے پیرو تھے اور قیصر "کاثولیکی" (کیتھولک) فرقے کا متبع۔

جب شامیوں نے دیکھا کہ قیصر کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلے میں آنے سے جی چرا رہا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ قیصر کو اپنے اہل وطن کی تباہی و بربادی کا خطرہ ہے، اس لیے وہ انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں لانے کے بجائے ہمیں قربانی کا بکرا بنانا چاہتا ہے۔ اس پر شامی عیسائیوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور اس خیال سے کہ وہ خواہ مخواہ رومیوں کی سلطنت کے بچاؤ کی خاطر اپنی جانیں کیوں قربان کریں، انہوں نے لڑائی سے دست کشی اختیار کر لی اور حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

اسلامی لشکروں کی روانگی:

مورخین میں اس کے متعلق اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کون سا لشکر حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے روانہ ہوا تھا؟ طبری ابن اثیر اور ابن خلدون نے اس سلسلے میں جو روایات بیان کی ہیں وہ ان روایات سے مختلف ہیں جو واقدی، ازدی اور بلاذری نے لکھی ہیں۔ ذیل میں سب سے پہلے ہم طبری اور اس کے مذکورہ بالا ساتھیوں کی روایات کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعد میں واقدی، ازدی اور بلاذری کی روائتیں درج کریں گے۔

عکرمہ بن ابوجہل کندہ اور حضر موت کی بغاوتوں کو فرو کر کے یمن اور مکہ کے راستے مدینہ پہنچے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے جانے کا حکم دیا۔ عکرمہ اپنا وہ لشکر چھوڑ چکے تھے جس کے ساتھ انہوں نے جنوبی علاقوں میں مرتدین سے جنگیں کی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک اور لشکر تیار کیا اور عکرمہ کو اس کی قیادت سپرد کر کے شام کی طرف روانہ کر دیا۔ اسی وجہ سے اس لشکر کا نام "جیش بدال" پڑ گیا۔ عکرمہ کے ساتھ ہی انہوں نے ذوالکلاع حمیری کو اس لشکر کا سردار بنا کر جو ان کے ساتھ یمن سے آیا تھا، شام روانہ ہونے کا حکم دیا تا کہ حضرت خالد بن سعید کو اطمینان رہے اور وہ پیش قدمی جاری رکھ سکیں۔

اسی زمانے میں حضرت عمرو بن عاص مرتدین سے فراغت پا کر قضاعہ میں مقیم تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی شام جا کر حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے ممد و معاون ثابت ہوں لیکن ان کارناموں کی وجہ سے جو انہوں نے فتنہ ارتداد فرو کرنے کے سلسلے میں انجام دیئے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اختیار دیا کہ خواہ وہ قضاعہ ہی میں مقیم رہیں، خواہ شام جا کر وہاں کے مسلمانوں کی تقویت کا باعث بنیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں لکھا: "میں تمہیں دنیا و دونوں کے

اعتبار سے تمہارے لیے بہتر ہے۔ لیکن تمہاری خوشی مجھے بہر حال منظور ہے۔"

حضرت عمرو بن عاص نے جواب دیا: "میں اسلام کے تیروں میں سے ایک تیر ہوں اور اللہ کے بعد آپ اس کے تیر انداز۔ جس طرف آپ کو کوئی خطرہ نظر آئے آپ بلا تامل اس تیر کر چلا دیئے جو بہت سخت اور جگر چھلنی کرنے والا ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ کو بھی اسی مضمون کا خط لکھا تھا۔ انہوں نے بھی جواب میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرح اخلاص و محبت اور ایثار کا اظہار کیا، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فلسطین اور ولید کو اردن کا حاکم مقرر کر کے شام روانہ ہونے کا حکم دیا۔

تعمیل حکم میں دونوں صاحب شام روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے ولید بن عقبہ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ اہل مدینہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے بے تاب ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوجیں بھیجنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ یہ سن کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور انہوں نے اس خیال سے کہ رومیوں پر فتح یابی کا فخر انہی کے حصے میں آئے، ولید بن عقبہ کو ساتھ لے کر رومیوں کی عظیم الشان فوج پر حملہ کرنا چاہا جس کی قیادت ان کا سپہ سالار اعظم باہان کر رہا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ جس طرح حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مٹھی بھر فوج کے ہمراہ ہرمز کو شکست دے کر عراق میں اپنا سکہ بٹھایا تھا اسی طرح وہ بھی باہان کو شکست دے کر رومیوں پر اپنا رعب قائم کر سکیں گے۔

باہان کو جب حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے ارادہ کا پتا چلا تو اس نے لشکر لے کر دمشق کا رخ کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ واقوصہ اور دمشق کے درمیان مقام "مرج الصفر" میں پڑاؤ ڈال کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ باہان کا پیچھے ہٹنا اصل میں ایک چال تھی اور وہ مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر پشت سے ان پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی خطرے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بار بار انہیں خبردار کیا تھا لیکن کامیابی کے نشے اور فخر و مباہات کی محبت نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے دل سے یہ بات قطعاً فراموش کر دی کہ وہ اپنی پشت کی حفاظت کا بندوبست کیے بغیر آگے نہ بڑھیں۔ جب وہ مرج الصفر کے قریب پہنچے تو باہان لشکر لے کر پلٹا اور مسلمانوں کا محاصرہ کر کے ان کی پشت کا راستہ کاٹ دیا۔ اتفاق سے اسلامی فوج کا ایک دستہ باقی لشکر سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس دستے میں حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کا لڑکا سعید بھی تھا۔

باہان نے سب سے پہلے اس دستے پر حملہ کیا اور تمام لوگوں کو جن میں سعید بن خالد بھی شامل تھا، قتل کر دیا۔ جب حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو اپنے بیٹے کے مارے جانے کی اطلاع ملی اور اپنے آپ کو خوں خوار دشمنوں سے محصور پایا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا، انہوں نے لشکر کو عکرمہ کی سرکردگی میں چھوڑ کر چند آدمیوں کے ہمراہ راہ فرار اختیار کی اور مدینہ کے قریب ذوالمروہ ہی پہنچ کر دم لیا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس واقعے کا پتا چلا تو انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بہت سخت خط لکھا اور انہیں مدینہ آنے سے منع کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنے شکست خوردہ ہمراہیوں کے ساتھ انتہائی حزن و الم کی حالت میں ذوالمروہ ہی میں مقیم

رہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مجھ سے زیادہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرشت سے واقف تھے۔ اگر میں ان دونوں کا کہا مانتا تو مسلمانوں کو اس شکست سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔“

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے فرار کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عزم و حوصلہ میں مطلق فرق نہ آیا۔ جب انہیں یہ خبر پہنچی کہ عکرمہ بن ابوجہل اور ذوالکلاع حمیری اسلامی لشکر کو رومیوں کے چنگل سے بچا کر واپس شام کی سرحد پر لے آئے ہیں اور وہاں مدد کے منتظر ہیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کمک بھیجنے کا انتظام شروع کر دیا۔

شرحبیل بن حسنہ عراق میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور اس زمانے میں قیدی اور مال غنیمت لے کر مدینہ آئے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں ولید بن عقبہ کی جگہ شام جانے کا حکم دیا۔ ولید بن عقبہ بھی ان ہزیمت خوردہ لوگوں میں شامل تھے جو حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ شام سے فرار ہو کر ذوالمروہ میں مقیم تھے۔ شرحبیل نے ابن سعید اور ابن عقبہ کے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں لے کر عکرمہ کے پاس روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک اور بھاری لشکر جمع کیا جس میں اکثریت مکہ والوں کی تھی۔ اس لشکر کا سردار انہوں نے یزید بن ابی سفیان کو بنایا اور انہیں شام روانہ ہونے کا حکم دیا۔ یزید کے پیچھے انہوں نے حضرت خالد بن سعید کے بقیہ لشکر پر ان کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان کو امیر بنا کر اسے بھی شام بھیجا۔ اس پر بس نہ کیا بلکہ ابوعبیدہ بن جراح کو بھی حمص کا والی بنا کر ایک بھاری لشکر کے ہمراہ شام کی طرف کوچ کا حکم دیا۔

یہ تمام لشکر جرف میں جا کر خیمہ زن ہوتے تھے۔ جب کبھی کسی لشکر کی روانگی کا وقت آتا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خود شہر سے باہر تشریف لے جاتے اور سالار لشکر کو یہ نصائح فرما کر دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے:

”یاد رکھو! ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ جس نے اس مقصد کو پا لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ جو شخص اللہ کے لیے کوئی کام کرتا ہے اللہ خود اس کا کفیل ہو جاتا ہے۔ تمھیں کوشش اور جدوجہد سے کام لینا چاہیے کیونکہ جدوجہد کے بغیر کوئی کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ یاد رکھو! جس شخص میں ایمان نہیں وہ مسلمان کہلانے کا بھی مستحق نہیں۔ جو کام ثواب کی خاطر نہ کیا جائے اس کا ثواب بھی نہیں ملتا۔ جس کام میں نیک نیتی شامل نہیں وہ کام ہی نہیں۔ کتاب اللہ میں اللہ کی خاطر جہاد کرنے والوں کو بہت بڑے اجر اور ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے لیکن کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس ثواب کو صرف اپنے لیے مخصوص کرنا چاہے۔ جہاد فی سبیل اللہ ایک تجارت ہے جسے اللہ نے مومنوں کے لیے جاری فرمایا ہے۔ جو شخص اسے اختیار کرتا ہے اللہ اسے رسوائی سے بچا لیتا ہے اور دونوں جہان کی عزت بخشتا ہے۔“

یزید بن ابی سفیان کو روانگی کے وقت انہوں نے جو نصائح فرمائیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انہوں نے فرمایا: ”اپنے لشکر کے ساتھ اچھی طرح سلوک کرنا، انہیں نصیحت کرتے وقت

اختصار سے کام لینا کیونکہ زیادہ باتیں کرنے سے بعض حصے بھول جاتے ہیں۔ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اس طرح لوگ بھلائی سے پیش آئیں گے۔ دشمن کے ایلچیوں کی عزت کرنا اور انہیں زیادہ دیر پاس نہ بٹھانا کہ جب وہ تمہارے لشکر سے باہر نکلیں تو انہیں جنگی رازوں کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو لشکر کے سب سے شاندار حصے میں انہیں ٹھہرانا۔ اپنا بھید چھپانا تاکہ تمہارا نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔ ہمیشہ سچی بات کہنا تاکہ صحیح مشورہ ملے۔ راتوں کو اپنے رفیقوں کے ساتھ بیٹھنا، اس طرح تمھیں ہر قسم کی خبریں مل سکیں گی۔ لشکر میں پہرے کا انتظام کرنا اور پہرے والے سپاہیوں کو سارے لشکر میں پھیلا دینا۔ اکثر ان کا اچانک معائنہ بھی کرنا۔ اگر کسی ایسے شخص کو سزا دو جو اس کا مستحق ہو تو اس میں کسی قسم کا خوف دل میں نہ لانا۔ مخلص اور وفادار رفیقوں سے میل جول رکھنا۔ جن سے ملو اخلاص سے ملنا، بزدلی نہ دکھانا کیونکہ اس طرح دوسرے لوگ بھی بزدلی کا اظہار کرنے لگیں گے۔"

ان لشکروں کو روانہ کرکے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہیں کامل امید تھی کہ اللہ ان فوجوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو رومیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ وجہ یہ تھی کہ ان میں ایک ہزار سے زیادہ مہاجر اور انصار صحابہ شامل تھے جنہوں نے ہر موقع پر انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا تھا اور ابتدائے اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ ان میں وہ اہل بدر بھی شامل تھے جن کے متعلق آپ نے اپنے رب کے حضور یہ التجا کی تھی: "اے اللہ! اگر آج تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو آئندہ پھر کبھی زمین پر تیری پرستش نہ کی جائے گی۔"

یہی وہ لوگ تھے جن کی مدد کے لیے اللہ نے آسمان سے فرشتے نازل کیے اور جن کے متعلق یہ آیات مقدسہ نازل ہوئیں:

کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين۔

(کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے اذن سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

جس لشکر کے ہمراہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق پر چڑھائی کی تھی اور جس کے ذریعے سے انہوں نے سلطنت ایران کو پارہ پارہ کر دیا تھا اس میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے جنگ یمامہ میں شرکت کی تھی۔ زیادہ تر تعداد بحرین اور عمان کے ان لوگوں کی تھی جو بدستور اسلام پر قائم تھے اور جنھوں نے مرتدین کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ کیا ان لوگوں کو بہادری شجاعت اور اخلاص ومحبت میں بدر، احد اور حنین کی جنگوں میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام کے برابر قرار دیا جاسکتا ہے جنھوں نے ہر موقع پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور حفاظت کی؟ اسی طرح کیا ان لوگوں کو مکہ، مدینہ اور طائف کے ان عظیم شہسواروں کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے جن کا کام ہی ہر وقت ستیزہ کاری میں مصروف رہنا اور اپنی تلواروں کے جوہر عالم پر آشکارا کرتے رہنا تھا؟ اس لیے اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنوبی عرب کے کمزور اور بے حقیقت باشندوں کے

ذریعے سے حکومت ایران پر غالب آسکتے تھے تو کیا عکرمہ، ابوعبیدہ، حضرت عمرو بن العاص اور یزید بن ابی سفیان مکہ اور مدینہ کے مشہور بہادروں کے ذریعے سے رومی سلطنت کا قلع قمع نہ کرسکتے تھے؟

عراق میں اسلامی فوجوں کی کامیابی کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام کی جانب تیزی سے فوجیں بھیجنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی شکست سے بددل ہو کر شام پر توجہ مبذول کرنا چھوڑ دیتے اور وہاں سے اپنی فوج واپس بلا لیتے تو اس کا نتیجہ بہت خطرناک نکلتا۔ اس طرح نہ صرف عراق کی تمام فتوحات اکارت چلی جاتیں بلکہ الٹا رومی، سرزمین عرب میں یلغار شروع کردیتے اور اسلام ایران و روم کی عظیم الشان طاقتوں کے درمیان پس کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں یہ کس طرح ہوسکتا تھا؟

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احکام کے مطابق امرائے عسا کرنے شام پہنچنا شروع کیا، البتہ حضرت عمرو بن عاص اپنے لشکر کے ہمراہ عربہ ہی میں مقیم رہے۔ ابوعبیدہ سرزمین بلقاء کو عبور کرکے جابیہ پہنچ گئے۔ راستے میں انہیں شامی عربوں کی جانب سے کچھ مزاحمت پیش آئی لیکن انہیں شکست دے دی گئی۔ شرحبیل اردن پہنچے اور یزید بن ابی سفیان نے بلقاء میں پڑاؤ ڈالا۔ ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ داثن کے مقام پر انہیں رومیوں اور بدوؤں کی ایک فوج کا سامنا کرنا پڑا لیکن لڑائی کے بعد رومیوں کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔

اس جگہ پہنچ کر روایات میں باہم اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کو فلسطین کے جنوب میں قابل ذکر مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا اور وہ بے روک ٹوک منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ لیکن بعض روایات اس کے خلاف ہیں۔ ان روایات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اسلامی لشکر عکرمہ کے پاس نہ پہنچ گئے اس وقت تک رومیوں نے ان کا باضابطہ مقابلہ نہ کیا اور نہ باقاعدہ فوجیں ان کے مقابلے کے لیے ہی لائے بلکہ یہ کام بادیہ نشین لوگوں کے سپرد رہا جنھوں نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کی مزاحمت کی لیکن معمولی لڑائیوں کے بعد پسپا ہوتے گئے۔ فلسطین کی جنوبی جانب رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو معرکے ہوئے وہ بعد میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیش آئے۔

لیکن روایات کا اختلاف اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب مسلمانوں کے مختلف لشکر عکرمہ کے لشکر کے قرب وجوار میں پہنچ جاتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے دمشق کے راستے میں پڑاؤ ڈالا۔ شرحبیل نے طبریہ اور دریائے اردن کی بالائی جانب غور کے قریب ایک سطح مرتفع میں قیام کیا۔ یزید نے بلقاء میں بصرہ کا محاصرہ کرلیا اور حضرت عمرو بن عاص ذ نے عربہ میں جبردن کو فتح کرنے کی مساعی شروع کردیں۔

یرموک: رومی فوجوں کی چڑھائی:

ابتداء میں رومیوں نے مسلمانوں کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم تبوک تک آکر واپس چلے گئے تھے۔ اسی طرح اب بھی تھوڑی بہت ترکتازیوں کے بعد عرب آکر واپس چلے

گے۔ چنانچہ جب حضرت خالد بن سعید نے رومیوں کے مقابلے میں شکست کھائی اور میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کی تو رومیوں کے اس یقین میں اور بھی پختگی پیدا ہوگئی۔ انہوں نے ان خبروں کو بھی زیادہ اہمیت نہ دی کہ عکرمہ کی مدد کے لیے مسلمانوں کی فوجیں دم بہ دم شام کی سرحد کی طرف بڑھی چلی آرہی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان فوجوں کا حشر بھی حضرت خالد بن سعید کے لشکر جیسا ہوگا۔ لیکن جب اسلامی فوجیں مجتمع ہونے لگیں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے تو رومی خواب غفلت سے جاگے اور انہیں حالات کی نزاکت کا احساس ہوا۔ ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر انہوں نے پوری قوت سے مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیا تو عراق کے حالات یہاں بھی پیش آئیں گے اور سارا شام مسلمانوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ہرقل نے ہر اسلامی لشکر کے مقابلے کے لیے زبردست فوجیں روانہ کیں تاکہ ان پر علیحدہ علیحدہ حملہ کرکے ان کی قوت و طاقت کو نابود کیا جاسکے اور انہیں ہمیشہ کے لیے سرزمین شام سے نکال دیا جائے۔

مختلف روایات سے پتا چلتا ہے کہ اس موقع پر مسلمان فوجوں کی کل تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے مقابلے میں رومی افواج دو لاکھ چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھیں۔ عکرمہ کے لشکر کی تعداد چھ ہزار تھی اور ابوعبیدہ، یزید اور حضرت عمرو بن العاص کے لشکروں میں سے ہر ایک کی تعداد سات اور آٹھ ہزار کے درمیان تھی۔

رومی افواج میں سب سے بڑا لشکر ہرقل کے بھائی تذارق (تیوڈریک) کا تھا جو نوے ہزار سپاہ پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بالمقابل صف آرا تھا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بالمقابل فیقار بن نسطوس کا لشکر تھا جس کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ یزید بن ابی سفیان سے لڑائی کے لیے جرجہ بن تدرا کو بھیجا گیا تھا۔ ہرقل خود حمص میں مقیم تھا اور تمام حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ پل پل کی خبریں اسے مل رہی تھیں اور اس کی تمام تر کوشش سلطنت کو عربوں کے قبضے میں جانے سے بچانے پر صرف ہورہی تھی۔ اس نے اپنے بھائی تذارق کو اس عظیم مہم پر مامور کیا تھا۔ تذارق نے ہی اس سے قبل ایرانیوں کے لشکر جرار کو شکست دی تھی۔ اسی تذارق کے ذریعے سے عربوں کو نیست و نابود کرنے اور انہیں ایسا سبق دینے کا تہیہ کیا جارہا تھا جسے وہ حضرت عمر بھر فراموش نہ کرسکیں۔

رومیوں کی عظیم الشان افواج کو دیکھ کر مسلمانوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس قاصد بھیج کر ان کی رائے طلب کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ میری رائے میں اس نازک ترین موقع پر دشمن سے علیحدہ علیحدہ جنگ کرنا مسلمانوں کے لیے کسی طرح بھی سودمند نہ ہوگا اس لیے تمام اسلامی فوجوں کو یکجا ہوکر مقابلہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم یکجا ہوگئے تو دشمن کثرت تعداد کے باوجود ہمارے مقابلے پر نہ ٹھہر سکے گا لیکن اگر ہم اپنی موجودہ صورت پر قائم رہے تو ہماری کوئی بھی فوج دشمن کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے گی اور بہت جلد شکست کھا جائے گی۔

دربار خلافت سے بھی وہی مشورہ موصول ہوا جو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سپہ سالاروں کو لکھا:

"اکٹھے ہو کر ایک لشکر کی شکل اختیار کرلو اور متحد ہو کر دشمن کے مقابلے کے لیے نکلو۔ تم اللہ کے مددگار ہو۔ جو شخص اللہ کا مددگار ہوگا اللہ بھی اس کی مدد کرے گا لیکن جو اس کا انکار کرے گا اور ناشکری کا ثبوت دے گا اللہ بھی اسے چھوڑ دے گا۔ گناہوں سے یکسر اجتناب کرو۔ اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔"

چاروں اسلامی لشکروں نے مشوروں کے تحت یکجا ہو کر دمشق کے راستے میں یرموک کے بائیں کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ تذارق نے یہ دیکھا تو اپنی پوری طاقت دریا کے دائیں کنارے پر لاکر جمع کر دی۔

دریائے یرموک حوران کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مختلف پہاڑیوں کے درمیان بڑی تیزی سے گزرتا ہوا غور اردن اور بحر مردار میں جا گرتا ہے۔ دریائے یرموک اور دریائے اردن کے مقام پر اتصال سے تیس چالیس میل اوپر دریائے یرموک ایک طویل و عریض میدان کے گرد چکر کاٹتا ہے جسے تین اطراف سے اونچی اونچی پہاڑیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ میدان اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ایک عظیم الشان فوج آسانی سے خیمہ زن ہو سکتی ہے۔ رومیوں نے یہ جگہ پسند کی اور وہاں پر ڈیرے ڈال دیئے۔ لیکن اس کے انتخاب میں رومیوں سے سخت غلطی ہوئی۔ یہ میدان وسیع تو بے شک تھا لیکن تین طرفوں سے پہاڑیوں میں محصور ہونے کے باعث باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا جس پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا اور رومی بالکل گھیرے میں آگئے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو وہ چلا اٹھے: "مسلمانو! تمھیں خوش خبری ہو۔ رومی گھیرے میں آچکے ہیں اور محصور فوج محاصرہ کرنے والی فوج کے چنگل سے شاذ و نادر ہی بچتی ہے۔"

اب صورت حال یہ تھی کہ نہ رومی اپنی طاقت وقوت اور تعداد کے بل بوتے پر مسلمانوں پر غالب آسکتے تھے اور نہ مسلمان اس قدرتی امداد کے باوجود رومیوں پر غلبہ حاصل کر سکتے تھے۔ مسلمان رومیوں کے باہر نکلنے کے راستے پر قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ جب رومی اس راستے سے باہر آنے کی کوشش کرتے تو مسلمان انہیں مار مار کر پیچھے ہٹا دیتے اور جب مسلمان رومیوں پر حملہ کرتے تو یہ خیال کر کے بہت جلد واپس اپنی جگہوں پر آجاتے مبادا رومی ان کی قلت تعداد کے باعث ان کا محاصرہ کر کے انہیں تباہ و برباد کر دیں۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے اور کوئی فریق دوسرے پر غلبہ حاصل نہ کرسکا۔ آخر مسلمانوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ تمام حالات لکھے اور ان سے مدد بھیجنے کی درخواست کی کہ لمبا عرصہ گزر جانے پر لشکر بد دل نہ ہو جائے اور جوش و خروش ختم ہو کر طاقت وقوت میں کمزوری کا باعث نہ بنے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شامی لشکروں کے امراء سے زیادہ بے چین تھے۔ ان کے گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ ابوعبیدہ ذ اور ان کے ساتھی یہ طریقہ اختیار کریں گے۔ ان اہل بدر کے متعلق، جنھوں نے قلت تعداد کے باوجود اہل مکہ کے کثیر التعداد لشکر کو شکست فاش دی تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ رومیوں کے مقابلے میں اس قدر عاجز آجائیں گے کہ ان سے کسی طرح بھی عہدہ برآنہ ہوسکیں گے۔ انہوں نے اس معاملے پر غور و فکر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مدینہ کے مقیم دیگر اہل الرائے

اصحاب سے مشورہ لیا۔ اسی غور و فکر کے دوران میں ان پر اصل حقیقت واضح طور پر منکشف ہوگئی۔

مسلمانوں نے کبھی کثرت تعداد کے بل بوتے پر دشمن کو نیچا نہ دکھایا تھا۔ اعلیٰ قیادت اور ایمانی قوت، یہ دو سبب تھے جنھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کیا۔ جہاں تک ایمانی قوت کا سوال تھا وہ شامی لشکروں میں کسی طرح بھی کم نہ تھی کیونکہ ان میں سابقون الاولون اور محمد ﷺ کے جلیل القدر صحابہ شامل تھے اور وہ اہل بدر تھے جن کے ہاتھوں فتح مکہ عمل میں آئی اور مرتدین کا خوفناک فتنہ انجام کو پہنچا۔ اس لیے خرابی لازماً قیادت میں تھی۔ رومیوں سے مقابلے کے لیے ایسے قائد کی ضرورت تھی جو نڈر اور بے باک ہو، نرمی سے نا آشنا ہو، لڑائی میں کسی بھی موقع پر اس کا قدم پیچھے ہٹنے والا نہ ہو، موت کا خوف اس کے پاس بھی نہ پھٹکتا ہو۔ ادھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے قائدین پر نظر ڈالتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ ابوعبیدہ باوجود کامیاب جرنیل ہونے کے نرم دل ہیں، حضرت عمرو بن العاص انتہائی عقل مند ہونے کے باوجود میدان جنگ کے شہسوار نہیں۔ عکرمہ میدان جنگ کے شہسوار تو ہیں لیکن ان میں پیش آمدہ امور کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ان تمام سالاروں کو اب تک بڑی بڑی جنگوں سے واسطہ نہ پڑا تھا مزید برآں ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی برتری تسلیم کرنے اور ماتحتی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

یہ حقیقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر منکشف ہوتے ہی معاً ان کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو ان تمام صفات سے کاملاً بہرہ ور تھا جو ایک عظیم سپہ سالار میں ہونی چاہئیں اور وہ شخص تھا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہ خیال آتے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں شام بھیجنے کا ارادہ کر لیا اور ساتھیوں سے فرمایا: ''واللہ! میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے رومیوں کے دلوں میں کوئی بھی شیطانی وسوسہ نہ رہنے دوں گا۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی روانگی شام:

کسی بھی شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کیونکہ شام کے معاملات اب اس نہج کو پہنچ چکے تھے کہ مزید التوا مسلمان افواج کے لیے سخت نقصان کا موجب ہوتا۔ سب لوگ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام بھیجنے پر رضامند ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ خفیہ حج کر کے عراق واپس پہنچ چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ خط ارسال فرمایا: ''تم یہاں سے روانہ ہو کر یرموک میں مسلمانوں کی افواج سے مل جاؤ کیونکہ وہاں وہ دشمن کے نرغے میں گھر گئے ہیں۔ یہ حرکت (خفیہ حج) جو تم نے کی ہے آئندہ کبھی سرزد نہ ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ تمھارے سامنے دشمن کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور تم مسلمانوں کو دشمن کے نرغے سے صاف بچا لاتے ہو۔ اے ابوسلیمان! میں تمھیں تمھارے خلوص اور خوش قسمتی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اس مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤ، اللہ تمھاری مدد فرمائے۔ تمھارے دل میں غرور نہ پیدا ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کا انجام نقصان اور رسوائی ہے۔ اپنے کسی فعل پر نازاں نہ ہونا۔ فضل و کرم کرنے والا صرف اللہ ہے اور وہی اعمال کا صلہ دیتا ہے۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس وقت عراق سے جانا نہ چاہتے تھے۔ وہ عراق میں اس وقت تک مقیم رہنے کے خواہاں تھے جب تک ایرانیوں کا دارالحکومت ان کے ہاتھ پر فتح اور کسریٰ شاہ ایران کا تخت وتاج پاش پاش نہ ہو جاتا۔ ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی دشوار امر نہ تھا کیونکہ ایرانی عساکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے ہر میدان سے بھاگ رہے تھے۔ ان کی قوت وطاقت ختم ہو چکی تھی اور ایک ہلے میں ان کی سلطنت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا تھا۔ فتح مدائن کا فخر معمولی فخر نہ تھا۔ یہ وہ عظیم الشان اعزاز تھا جس کے حصول کی تمنا قیصر روم جیسے بادشاہوں کے دل کو بھی بے چین کیے رکھتی تھی۔

ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس عراق کو چھوڑ کر شام جانے کا حکم پہنچا ہوگا تو ان کے دل میں ضرور انقباض پیدا ہوا ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں عراق سے ہٹانے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ طبری میں روایت آتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خط پڑھنے کے بعد انہوں نے کہا: یہ کام عیسر بن ام شملہ (حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ) کا ہے۔ انہیں اس بات پر حسد ہے کہ عراق کی فتح میرے ہاتھ سے کیوں ہوئی؟

غالباً انہیں یہ بھی خیال ہوگا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عراق میں ان کی جگہ لینا چاہتے ہیں جبھی تو انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر زور ڈال کر انہیں شام بھیجا ہے۔ بہ ایں ہمہ اگر یہ خیال ان کے دل میں ہو بھی تو بھی بدظنی کی بنا پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں فرمایا: میری خواہش تھی کہ جب میں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام بھیجا تھا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو عراق بھیج دیتا اور مرنے کے بعد جب اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا تو کہتا کہ اے میرے پروردگار! میں نے اپنے دونوں ہاتھ تیری راہ میں پھیلا دیئے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی جانتے تھے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دل میں ضرور یہ خیالات گردش کریں گے اور ان کا اثر ان کے کاموں پر پڑے گا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے خط میں یہ فقرہ لکھ دیا تھا کہ جو حرکت (خفیہ حج) تم سے صادر ہوئی ہے آئندہ کبھی سرزد نہ ہو۔ اس طرح وہ انہیں تنبیہ کرنا چاہتے تھے کہ ان کا اولین فرض خلیفہ کے حکم کی اطاعت کرنا ہے اور انہیں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو خلیفہ کی مرضی یا احکام کے خلاف ہو۔

گمان غالب ہے چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے ناراضگی کا اندیشہ تھا اس لیے انہوں نے خط میں جہاں ان کی بہادری اور ان کے کارناموں کی تعریف کی وہاں انہیں عجب وتکبر اور فخر وغرور سے بچنے کی تلقین بھی کر دی اور واشگاف الفاظ میں یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ فضل وکرم کرنے والا صرف اللہ ہے، کسی بندے کی مجال نہیں کہ وہ اپنی طاقت وقوت کے بل بوتے پر فتوحات حاصل کر سکے۔

لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دل میں پیدا شدہ شکوک وشبہات کو بھی صاف کر دینا چاہا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ نصف فوج مثنیٰ بن حارثہ کے زیر سرکردگی عراق میں چھوڑ دیں اور

بقیہ نصف فوج لے کر خود شام روانہ ہو جائیں۔ خط کے آخر میں لکھا: "جب اللہ تمھیں شام میں فتح نصیب کرے تو اس فوج کو ہمراہ لے کر عراق چلے جانا اور وہاں اپنا پہلا عہدہ دوبارہ سنبھال لینا۔"

اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر واضح کر دیا کہ انہیں عراق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا کسی اور شخص کے آنے کی پروا نہ کرنی چاہیے کیونکہ ان کے قائم مقام مثنیٰ بن حارثہ ہوں گے اور شام کی فتح کے بعد انہیں عراق میں ان کا پہلا عہدہ دوبارہ تفویض کر دیا جائے گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں کوئی شک نہ تھا کہ اللہ انہیں شام میں فتوحات جلیلہ سے نوازے گا۔ اگرچہ انہیں وہاں کی تمام خبریں مل رہی تھیں لیکن وہ مطمئن تھے۔ ان کا دل اس یقین سے بھرپور تھا کہ وہ سیف اللہ ہیں اور اللہ کی تلوار بندوں کے ہاتھوں کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق شام روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

چونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام میں پیش آنے والے حالات کا بہ خوبی اندازہ تھا اس لیے انہوں نے تمام صحابہ کو ساتھ لے جانا چاہا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں آدھی فوج مثنیٰ کے پاس چھوڑ جانے کی ہدایت کی تھی۔ اس لیے انہوں نے فوج کی تقسیم اس طرح کی کہ تمام صحابہ تو اپنی فوج میں رکھے اور مثنیٰ کے لیے صحابہ کرام کی تعداد کے برابر ایسے لوگ چھوڑ دیے جنھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد باقی فوج کا جائزہ لے کر ایسے لوگوں کو اپنی فوج میں شامل کر لیا جو وفود کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے اور ان لوگوں کی تعداد کے مساوی ایسے لوگوں کو مثنیٰ کے لیے چھوڑ دیا جو اپنے اپنے قبیلوں میں مقیم رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد جو لوگ بچ گئے انہیں نصف نصف تقسیم کر لیا۔ مثنیٰ کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا اور انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا: "واللہ! میں تو آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے سرمو انحراف نہ کرنے دوں گا۔ ان کے حکم کے مطابق آدھے صحابہ میرے پاس رہنے چاہئیں اور آدھے آپ کے پاس۔ آپ کیوں مجھے ان سے محروم کرتے ہیں حالانکہ میری فتوحات کا انحصار ہی صحابہ پر ہے؟"

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ کا اصرار دیکھا تو ان کی منت سماجت کر کے جلیل القدر اور بہادر صحابہ کو اپنے ساتھ رکھنے پر رضامند کر لیا۔

چونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ڈر تھا کہ ان کے جانے کے بعد کہیں مسلمانوں پر کوئی مصیبت نہ آپڑے اس لیے انہوں نے کمزور مردوں اور عورتوں کو مدینہ واپس بھیج دیا تا کہ اگر خدانخواستہ ایرانی مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو بھی ان کی عورتوں اور بچوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ ان تمام امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ لشکر کے ہمراہ شام کی جانب روانہ ہو گئے۔ مثنیٰ بھی ایک دستہ فوج کے ہمراہ صحرا تک انہیں رخصت کرنے گئے۔

عراق سے شام جانے کے لیے قریب ترین راستہ ایک لق و دق صحرا سے ہو کر گزرتا تھا لیکن اول تو

یہ صحرا بڑا خوفناک اور سخت دشوار گزار تھا، اس عبور کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا اور ہوشیار سے ہوشیار رہبر کو بھی اس میں رستہ بھولنے کا خوف لاحق رہتا تھا۔ دوسرے اگر بہ ہزار دقت و دشواری اسے عبور کر بھی لیا جاتا تو بھی بقیہ راستہ آسانی سے کاٹنا ناممکن تھا کیونکہ شام کی سرحد پر بسنے والے تمام عربی قبائل رومیوں کے مددگار تھے۔ قیصر کا ایک لشکر بھی وہاں مقیم تھا جو بہت آسانی سے اسلامی لشکر کا راستہ قطع کر سکتا تھا۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق سے عرب پہنچتے اور وہاں سے شام جانے والا عام راستہ اختیار کرتے جس سے قبل ازیں عکرمہ رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے اسلامی سپہ سالار گزر کر شام پہنچے تھے۔ لیکن اس طرح بے حد دیر ہو جاتی اور جس مقصد کے لیے انہیں شام جانے کا حکم دیا گیا تھا وہ فوت ہو جاتا۔ اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ شام جانے کے لیے ایسا کون سا راستہ اختیار کیا جائے جس میں نہ تو دشمن سے مڈبھیڑ کا خطرہ ہو اور نہ ساتھیوں تک پہنچنے میں دیر لگے۔ بہ ظاہر کوئی ایسی تدبیر نظر نہ آتی تھی اور یہی دکھائی دیتا تھا کہ یا تو خوفناک صحرا سے گزر کر اور صحرا کے دشمن قبائل سے دو دو ہاتھ کر کے ساتھیوں تک رسائی حاصل کرنی ہوگی یا ایک طویل راستہ اختیار کر کے شام پہنچنا ہوگا۔

آخر یہاں بھی اللہ کی نصرت آڑے آئی۔ قدرت کی جانب سے ایک عجیب و غریب راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی گئی۔ ان کے ساتھیوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ اس راستے سے گزرنا کیونکر ممکن ہوگا لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ارادہ اٹل تھا اور ساتھیوں کو مجبوراً انہیں کی بات ماننی پڑی۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے وہ صحرائی راستہ اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا جو عین التمر سے شروع ہو کر شمالی شام تک پہنچتا تھا۔ اس راستے کی مسافت اگرچہ دوسرے راستوں کی نسبت کم تھی لیکن درمیان میں چونکہ رومیوں کے حامی قبائل آباد تھے اور قیصر کی فوجیں بھی اس جگہ ڈیرے ڈالے پڑی تھیں اس لیے تصادم کے خطرے سے بچنے کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ راستہ ترک کر دیا اور وہ راستہ اختیار کیا جو اس سے قبل عیاض بن غنم کی امداد کے لیے حیرہ سے دومۃ الجندل جانے کے لیے اختیار کیا تھا۔

وہ لشکر لے کر پہلے دومۃ الجندل پہنچے اور دومہ سے یرموک پہنچنے کے لیے وادی سرحان کا راستہ اختیار کیا۔ درمیان میں قراقر کی بستی پڑتی تھی جہاں بنوکلب کے بعض قبائل آباد تھے۔ انہوں نے بستی پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اگر وہ وادی سرحان کے معروف راستے ہی پر سفر کرتے رہتے تو چند روز میں بصریٰ پہنچ جاتے اور وہاں ابوعبیدہ کا لشکر ساتھ لے کر یرموک میں اسلامی افواج سے مل جاتے لیکن ان کا خیال تھا کہ بصریٰ پہنچنے سے پہلے ہی رومی ان کا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح انہیں یرموک پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ اس اندیشے کے پیش نظر انہوں نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے جس سے ہم رومیوں کے عقب میں پہنچ جائیں اور کسی رومی لشکر سے مقابلہ بھی نہ کرنا پڑے کیونکہ اگر راستے میں رومیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی تو ہم دیر سے یرموک پہنچیں گے۔ سب نے بالاتفاق جواب دیا کہ ایسا راستہ ہے تو ضرور لیکن اس سے لشکر کسی طرح نہیں گزر سکتا، صرف اکیلا آدمی گزر سکتا ہے۔ اس لیے آپ وہ راستہ اختیار کر کے مسلمانوں کو

ہلاکت میں نہ ڈالیں۔لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ وہی راستہ اختیار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔انہوں نے فرمایا:''تم نے اپنے آپ کو اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے پیش کیا ہے،اب تمہارا قدم پیچھے ہٹنے اور یقین کم ہونے نہ پائے۔یاد رکھو! تائید الٰہی کا مدار نیت ہی پر ہوتا ہے اور اجر نیکی ہی کے مطابق ملتا ہے۔کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اللہ کی نصرت سے بہرہ ور ہوتے ہوئے مشکلات سے ڈر جائے اور ہمت ہار دے۔''

جب ساتھیوں نے یہ تقریر سنی تو ان کا خوف و ہراس جاتا رہا اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا:''اللہ نے آپ کی ذات میں ہر قسم کی خیر و برکت جمع کر دی ہے۔اس لیے آپ بے کھٹکے اپنے ارادوں کو لباس عمل پہنائیں۔ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

انہوں نے مجوزہ راستے سے سفر کرنے کے لیے رہبر طلب فرمایا۔لوگوں نے رافع بن عمیرۃ الطائی کا نام لیا۔انہوں نے اسے بلا کر کہا:''ہم اس راستے سے سفر کرنا چاہتے ہیں،تم ہماری رہبری کے فرائض انجام دو۔''

اس نے جواب دیا:''آپ گھوڑوں اور اتنے ساز و سامان کے ساتھ اس راستے سے نہیں گزر سکتے۔ وہ راستہ ایسا ہے کہ اس سے صرف ایک سوار گزر سکتا ہے اور وہ بھی بے خوف وخطر نہیں۔پوری پانچ راتوں کا سفر ہے۔راستے سے بھٹکنے کے خوف کے علاوہ پانی کا بھی کہیں نام ونشان نہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور فرمایا:''خواہ کچھ ہو جائے مجھے تو اسی راستے سے جانا ہے۔تم بتاؤ اس راستے سے چلنے کے لیے کیا کیا انتظامات کیے جائیں؟''

رافع نے کہا:''اگر آپ ضرور اسی راستے سے جانا چاہتے ہیں تو لوگوں کو حکم دیجیے کہ وہ بہت سا پانی ساتھ لے لیں اور جس جس سے ہو سکے اپنی اونٹنی کو پانی پلا کر اس کا ہونٹ باندھ دے۔کیونکہ یہ سفر بے انتہا خطرات کا حامل ہے۔اس کے علاوہ بیس اونٹنیاں بڑی موٹی تازی اور حضرت عمر رسیدہ مجھے مہیا کی جائیں۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے رافع کی اس خواہش کے مطابق اونٹنیاں مہیا کر دیں۔رافع نے پہلے انہیں خوب پیاسا رکھا۔جب پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گئیں تو انہیں خوب پانی پلایا۔جب وہ خوب سیر ہو گئیں تو ان کے ہونٹ چھید کر باندھ دیئے تاکہ جگالی وغیرہ نہ کر سکیں۔اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب فوج کو کوچ کا حکم دیجیے۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لشکر اور ساز و سامان لے کر اس کے ہمراہ روانہ ہوئے۔جہاں کہیں پڑاؤ ڈالتے ان میں سے چار اونٹنیوں کے پیٹ چاک کرتے۔جو پانی ان کے معدے سے نکلتا وہ گھوڑوں کو پلا دیتے اور جو پانی ساتھ لائے تھے وہ خود پیتے۔

جب صحراء میں سفر کا آخری دن آیا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے رافع سے جسے آشوب چشم کی شکایت تھی،کہا کہ پانی ختم ہو چکا ہے،اب کیا کرنا چاہیے؟ رافع نے جواب دیا:''گھبرایئے نہیں۔ہم انشاء اللہ جلد پانی تک پہنچ جائیں گے۔''

تھوڑی دیر آگے چل کر جب فوج دو ٹیلوں کے پاس پہنچی تو رافع نے لوگوں سے کہا:''دیکھو! عوسج کی جھاڑی آدمی کے سرین کی مانند نظر آتی ہے؟''

انہوں نے کہا ہمیں تو ایسی کوئی جھاڑی نظر نہیں آتی۔ اس پر رافع نے گھبرا کر انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہا کہ اگر خیریت چاہتے ہو تو جس طرح ہو سکے اسے ڈھونڈ نکالو۔ آخر بڑی تلاش سے وہ جھاڑی ملی مگر کسی نے اسے کاٹ دیا تھا اور صرف تنا باقی رہ گیا تھا۔ جھاڑی ملنے پر مسلمانوں نے زور سے تکبیر کہی۔ رافع نے کہا: "اب اس جھاڑی کی جڑ کے قریب مٹی کھودو۔"

مٹی کھودنے پر وہاں ایک چشمہ نکل آیا جس سے سب نے سیر ہو کر پانی پیا۔ جب مسلمانوں کو اپنی سلامتی کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو رافع نے کہا: "میں اس چشمے پر صرف ایک مرتبہ بچپن کے زمانے میں اپنے والد کے ساتھ آیا تھا۔"

اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ شام کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ آگے چل کر راستے میں انہیں کوئی دقت و پریشانی لاحق نہ ہوئی اور وہ جلد جلد سفر طے کرتے ہوئے سوی پہنچ گئے۔ وہ صبح سے ذرا پہلے وہاں پہنچے تھے اور پہنچتے ہی بستی پر حملہ کر دیا۔ وہاں کے باشندوں کو مسلمانوں کی آمد کا سان گمان بھی نہ تھا۔ وہ گھبرا گئے اور مقابلے کی تاب نہ لا کر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ آگے چل کر اہل تدمر سے مقابلہ پیش آیا۔ وہ بھی تھوڑی سی مقاومت کے بعد زیر ہو گے۔ دمشق قریب ہی تھا لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس پر حملہ نہ کرنا چاہا کیونکہ اس طرح وہ راستے ہی میں رومیوں سے الجھ جاتے اور اپنے پروگرام کے مطابق مسلمانوں کی مدد کے لیے یرموک نہ پہنچ سکتے۔ اس لیے انہوں نے عام راستہ چھوڑ کر حوارین کا راستہ اختیار کیا اور قصم پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے جو قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے صلح کر لی۔ وہاں سے اذرعات کی جانب مڑے۔ مرج راہط پر پہنچ کر غسانیوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں شکست دے کر وہاں کے لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ مرج راہط سے چل کر وہ بصریٰ پہنچے۔ یہاں ابوعبیدہ بن جراح، شرحبیل بن حسنہ اور یزید بن ابی سفیان فوجیں لیے پڑے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں ساتھ لے کر شہر پر حملہ کر دیا اور اسے فتح کر لیا۔ یہاں سے یہ تمام قائدین فوجوں کے ہمراہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے جو فلسطین کے غور کے نزدیک عربات میں مقیم تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ساتھیوں کے قریب ہی خیمہ زن ہوئے اور اس طرح تمام اسلامی فوجیں یرموک کے مقام پر جمع ہو گئیں۔

یہ ہے وہ روایت جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سفر شام سے متعلق بالعموم کتب تاریخ میں پائی جاتی ہے۔ بادی النظر میں یہ روایت ان افسانوں سے زیادہ مختلف نہیں جو عموماً بڑے بڑے لوگوں کے متعلق گھڑ کر مشہور کر دیئے جاتے ہیں۔ رافع بن عمیرہ کی رہبری میں صحرا کو عبور کرنے کا واقعہ بظاہر بہت عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تصدیق سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ساری زندگی ہی عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کیا عیاض بن غنم کی امداد کے لیے عین التمر سے دومۃ الجندل پہنچنے کا واقعہ عجیب و غریب نہیں؟ کیا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خفیہ حج کرنے کا واقعہ لوگوں کی عقلوں کو حیرت میں نہیں ڈال دیتا؟ اور کیا مسیلمہ کی سرکوبی اور عراق کی عظیم الشان فتوحات لوگوں کو ششدر

کرنے کے لیے کافی نہیں؟ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مقصد کے حصول کے لیے ہمیشہ ایسے طریقے استعمال کرتے تھے جن کی بنا پر کم سے کم وقت میں بہتر سے بہتر طور پر مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ اس موقع پر بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حسب معمول یہی کیا اور اس خوفناک و دشوار گزار صحرا سے گزر کر شام پہنچے تاکہ راستے میں دشمنوں سے مڈبھیڑ نہ ہو سکے اور وہ بہ آسانی اسلامی افواج تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور دشمن انہیں راستے میں نہ روک سکا۔

بعض مورخین نے اس روایت کو تو اپنی کتابوں میں درج کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ احتیاط بھی کی ہے کہ روایت میں کوئی حصہ ایسا نہ آنے پائے جو عقل کے خلاف ہو۔ اس لیے مورخین میں اس لشکر کی تعداد کے متعلق اختلاف موجود ہے جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ عراق آیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی تعداد نو ہزار تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ چھ ہزار تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ آٹھ سو اور پانچ سو کے درمیان تھی۔ جو لوگ لشکر کی تعداد نو ہزار بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم کے ماتحت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق سے آدھی فوج لے کر چلے تھے۔ اس وقت عراق میں مسلمانوں کی فوج اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ جو لوگ فوج کی تعداد ایک ہزار سے کم بتاتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام محض اس لیے بھیجا گیا تھا کہ عرب اور عجم میں ان کی بہادری، شجاعت اور قیادت کی دھوم مچی ہوئی تھی اور بڑے بڑے سپہ سالار اور پر ہیبت شہنشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ اس لیے ان کا وہاں بھیجا جانا محض دشمن پر رعب ڈالنے کے لیے تھا ورنہ جو فوجیں رومیوں کے بالمقابل صف آرا تھیں وہ تعداد میں ہرگز کم نہ تھیں، علاوہ بریں مدینہ سے ان کے لیے برابر کمک پہنچ رہی تھی۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق سے تو یقیناً آدھی فوج لے کر روانہ ہوئے تھے لیکن قراقر پہنچنے پر جب تنگ و تاریک جنگل سے گزرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو انہوں نے اپنے ساتھ صرف چند سو سپاہی رکھے اور باقی لشکر کو وادی سرحان کے عام راستے سے شام پہنچنے کی ہدایت کی۔ انہیں چند سو ساتھیوں کے ساتھ وہ بصریٰ پہنچے۔ ہماری رائے میں یہی روایت زیادہ قابل قبول ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ راستے میں رومیوں کے تصادم سے بچنا چاہتے تھے اس لیے آسان راہ یہی تھی کہ وہ اپنے لشکر کا بڑا حصہ چھوڑ دیتے اور بہت تھوڑے آدمی لے کر کوچ کرتے کیونکہ ایک معمولی دستے کے لیے تو یہ ممکن ہوتا ہے کہ اگر وہ دشمن کو دیکھ بھی لے تو چابک دستی کی بدولت راہ کاٹ کر پھرتی سے نکل جائے لیکن کئی ہزار پر مشتمل ایک بھاری لشکر کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دشمن کی آنکھ بچا کر ایک طرف کو ہٹ جائے۔

بہر حال اس بارے میں خواہ روایات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، یہ بات یقینی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بہ خیریت یرموک پہنچ کر اسلامی لشکروں سے مل گئے اور ان کے ساتھ رومیوں سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ ہرقل نے باہان ہی کو سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ وہ بڑے کروفر سے آیا اور رواقوصہ میں مقیم رومی فوج سے جاملا۔ باہان وہی شخص تھا جس نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو شکست دی تھی۔ رومیوں کو باہان کے پہنچنے

کی بے حد خوشی ہوئی اور مسلمانوں کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پہنچنے سے بے اندازہ مسرت۔ اب دونوں فوجیں کیل کانٹے سے لیس ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی تھیں اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور مدمقابل کو زیر کرنے کے لیے ہمہ تن تیار تھیں۔

مسلمانوں کے لیے یہ موقع بے حد نازک تھا۔ ایک تو رومیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ دوسری سازو سامان اور جنگی تیاری کے لحاظ سے بھی مسلمانوں اور رومیوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ رومی پوری سج دھج اور کامل جنگی تیاری سے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکلے تھے۔ پھر بھی اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ رومیوں کو عربوں سے زیادہ جنگی مہارت بھی حاصل تھی اور وہ لڑائی کے طور طریقوں کو عربوں سے زیادہ جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کامل دو ماہ تک فریقین کے درمیان کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ رومیوں کو ظاہری قوت و طاقت کے لحاظ سے تو بے شک عربوں پر برتری حاصل تھی لیکن باطنی قوت میں مسلمان ان سے کئی گنا بڑھے ہوئے تھے۔ رومی افواج شام میں مقیم بدوؤں اور ہرقل کے ان لشکروں پر مشتمل تھیں جنھوں نے اس سے قبل ایرانیوں سے جنگ کی تھی۔ اول تو ان دونوں گروہوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی، دوسرے ان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہ تھا جس کی خاطر وہ جنگ کے لیے نکلے تھے۔ لیکن ان کے مقابل مسلمانوں کی فوجیں تمام تر عربوں پر مشتمل تھیں، دوسرے انہیں کامل یقین تھا کہ رومیوں سے لڑائی جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں شامل ہے۔ جو شخص اس لڑائی میں مارا جائے گا اسے شہادت کا درجہ حاصل ہوگا، آخرت میں اسے جنت الفردوس ملے گی اور وہ اللہ کی رضا و خوشنودی سے کاملاً بہرہ ور ہوگا اور وہ بھی شہداء کی طرح اجر عظیم کا مستحق ہوگا۔ اس دنیا میں اسے مال غنیمت سے جو حصہ ملے گا وہ اس کے علاوہ ہوگا۔ گویا ایک طرف اپنی زبردست جمعیت کا زعم تھا اور دوسری طرف ایمانی قوت کارفرما تھی۔ ایک طرف ظاہری سازو سامان پر بھروسہ تھا اور دوسری طرف روحانیت جلوہ گر تھی۔

دن اور ہفتے گزرتے چلے گئے لیکن فریقین کی فوجیں اپنی اپنی جگہ برقرار رہیں اور ان میں حرکت کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لیے یہ صورت حال قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ آج تک مدمقابل کو دیکھ کر ان سے صبر نہ ہوسکا تھا۔ لیکن موقع ایسا تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اکیلے کچھ نہ کرسکتے تھے۔ اس وقت مسلمان افواج چار حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ہر حصہ فوج علیحدہ علیحدہ قائد کے ماتحت تھا۔ حد یہ کہ اذان بھی ہر لشکر میں علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق سے صرف ساتھیوں کی امداد کے لیے آئے تھے، انہیں ان پر امیر بنا کر نہ بھیجا گیا تھا۔ ان کے لیے ناممکن تھا کہ وہ قلیل التعداد فوج کے ساتھ اکیلے ہی دشمنوں کے لشکر جرار پر حملہ کردیتے۔ رومیوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر حملے کرنے شروع کردیئے۔ لیکن ان کے حملے بھی زیادہ کارگر ثابت نہ ہوسکے۔ مسلمان ان کے حملوں کو پسپا کرکے اپنے کیمپوں میں واپس آجاتے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لیے ... حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں شامی

افواج کی قیادت سپرد نہ کی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ خود بھی ایسی درخواست نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس طرح دوسرے امراء کے دلوں میں حسد پیدا ہو جاتا۔ لیکن یرموک کے کنارے جو واقعات پیش آرہے تھے وہ مسلمانوں کی ہمتیں پست کر دینے کے لیے کافی تھے۔ رومی برابر صفیں منظم کرنے میں مصروف تھے اور ان کے کیمپ سے آنے والی خفیہ خبروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ مسلمانوں پر بھرپور حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر تمام امراء کو رومیوں کی تیاریوں اور خوفناک ارادوں کا علم تھا۔ اس صورت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لیے یہی راستہ تھا کہ وہ ان امراء کو ایک متحدہ قیادت قبول کرنے کا مشورہ دیتے لیکن اپنی ذات کے سوا انہیں اور کسی پر بھروسہ نہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے کسی بھی شخص کو تمام اسلامی فوجوں کا سپہ سالار بنانے کی تجویز پیش کی تو دوسرے لوگ ان سے ناراض ہو جائیں گے۔ اب کریں تو کیا کریں؟

باہان کے آنے کے بعد رومیوں کی جنگی تیاریاں تیز تر ہوگئیں۔ وہ متعدد بار پادریوں کو بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ پادری اشتعال انگیز تقریروں سے رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے اور عیسائیت کی سلامتی کا واسطہ دے کر انہیں جنگ پر ابھارتے تھے۔ واشگاف الفاظ میں رومیوں کو بتاتے تھے کہ اگر اس موقع پر انہوں نے جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیا اور انہیں ختم کرنے کی تدابیر نہ کیں تو عیسائیت کا خاتمہ ہے اس لیے انہیں عیسائیت کی بقاء کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے اور کسی طور مسلمانوں کو زندہ نہ چھوڑنا چاہیے۔

ان آتشیں تقریروں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ رومی لشکر میں زبردست جوش و خروش پیدا ہوگیا اور ہر رومی عیسائیت کی بقاء کی خاطر جان دینے کو تیار ہوگیا۔ آخر ایک دن مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ رومی کیل کانٹے سے لیس اگلے روز ان پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ باہان نے اس طرح ان کی صف بندی کی ہے جس کی نظیر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ سن کر مسلمان امراء کو فکر پیدا ہوا اور وہ اکٹھے ہو کر رومیوں سے مقابلہ کرنے کی تدابیر سوچنے لگے۔

ہر امیر نے مختلف تجاویز پیش کیں لیکن لشکر کی صف بندی کے متعلق کسی نے کوئی رائے نہ دی کیونکہ ہر امیر اپنے لشکر کی صف بندی کا خود ذمہ دار تھا۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی باری آئی تو وہ کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا: ''آج کا دن اللہ کے اہم دنوں میں سے ہے۔ آج کسی کے لیے فخر و مباہات اور خود رائی و خود ستائی مناسب نہیں۔ تمہارا جہاد خالص اللہ کے لیے ہونا چاہیے اور تمھیں اپنے اعمال کو خدا کی خوشنودی کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ یاد رکھو! آج کی کامیابی ہمیشہ کی کامیابی ہے۔ ایک ایسی قوم سے جو ہر طرح منظم و مرتب ہے، تمہارا علیحدہ علیحدہ لڑنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ جو تم سے دور ہیں (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) انہیں تمہارے حال کا علم ہوتا تو وہ کبھی تمھیں اس طرح لڑنے کی اجازت نہ دیتے۔ بے شک تمھیں ان کی طرف سے تو کوئی حکم نہیں ملا لیکن تم اس معاملے کو اس طرح انجام دو گویا یہ تمہارے خلیفہ اور ان کے خیر خواہوں کا حکم ہے۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سن کر کچھ دیر تک امرائے عساکر پر مکمل خاموشی طاری ہوئی اور ہر شخص سر جھکائے اس معاملے کے متعلق سوچتا رہا۔ آخر انہیں یقین ہوگیا کہ جو کچھ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا وہ بالکل سچ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تین مہینے ہونے کو آئے وہ رومیوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے، الٹا مسلمانوں کی حالت سے فائدہ اٹھا کر رومیوں نے اپنے آپ کو مضبوط اور طاقت ور بنالیا۔

اس وقت ان تمام امراء کے دلوں میں یہ خیالات گردش کر رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ رومیوں نے غلبہ پالیا اور انہیں شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا تو ان ولایات کا کیا ہوگا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام آنے سے قبل ان کے لیے مقرر کی تھیں۔ اگر ابوعبیدہ حمص نہ پہنچ سکے تو وہاں کی ولایت کیونکر حاصل کرسکیں گے؟ اگر مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا تو یزید بلقاء کی امارت پر کس طرح قبضہ حاصل کرسکیں گے؟ اگر انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی تو شرحبیل اردن پر کیونکر تسلط بٹھا سکیں گے؟ اگر اس سرزمین میں مسلمانوں کے قدم نہ ٹھہر سکے تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عربہ میں کس طرح حکومت قائم کرسکیں گے؟ اگر رومی مسلمانوں پر غالب آ گئے تو یہ امراء کیا منہ لے کر مدینہ میں داخل ہوسکیں گے؟ اور اہل مدینہ سے کیونکر آنکھیں چار کرسکیں گے۔

آخر انہوں نے کہا: ''آپ ہی بتایئے! اس موقع پر کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمیں اس خیال سے یہاں بھیجا تھا کہ ہم یہ مہم بہ آسانی سر کرلیں گے۔ اگر انہیں موجودہ حالات کا علم ہوتا تو وہ ضرور تمھیں اکٹھا رکھتے۔ جن حالات میں سے تم گزر رہے ہو وہ پہلے واقعات کے مقابلے میں بہت سخت اور مشرکین کے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم علیحدہ علیحدہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو الگ شہر کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ لیکن اگر تم اس موقع پر کسی ایک شخص کو امیر تسلیم کرکے اس کی اطاعت اختیار کرلو تو اس سے نہ تمہارے مراتب میں کوئی فرق پڑے گا اور نہ اللہ اور امیر المومنین کے نزدیک تمہارا درجہ کم ہوگا۔ ذرا دیکھو تو سہی دشمن نے کتنی زبردست تیاری کر رکھی ہے۔ یاد رکھو کہ اگر آج ہم نے انہیں ان کی خندقوں میں دھکیل دیا تو ہم ہمیشہ انہیں دھکیلتے ہی رہیں گے، لیکن اگر انہوں نے ہمیشہ شکست دے دی تو ہم پھر کبھی کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ میری تجویز اس بارے میں یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو باری باری امارت کا موقع ملنا چاہیے۔ اگر آج ایک امیر ہے تو کل دوسرا، پرسوں تیسرا، ترسوں چوتھا یہاں تک کہ ہر شخص کو امیر بننے کا موقع مل جائے۔ آج کے لیے تم مجھے امیر بنادو۔''

جنگ کا آغاز:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی رائے نہایت معقول تھی۔ تمام امراء اس پر متفق ہوگئے اور پہلے روز کے لیے انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کردیا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ رومیوں کی یورش آج بھی عام دنوں کی طرح ہوگی اور لڑائی بہرحال طول کھینچے گی۔ اس لیے باری باری ہر ایک کو امیر بننے کا موقع مل

جائے گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس ایک مہینے کے دوران میں رومیوں کی ترتیب اور صف بندی کا بہ غور مطالعہ کر لیا تھا۔ انہوں نے ان کے مقابلے کے لیے ایک ایسا طریقہ استعمال کرنا چاہا جو نہ صرف رومیوں پر رعب ڈالنے والا ہو بلکہ اس کے ذریعے سے فتح بھی حاصل ہو سکے۔ انہوں نے اسلامی لشکر کو اڑتیس دستوں میں تقسیم کیا (ہر ایک دستہ کم و بیش ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا) اور فرمایا: ''تمہارے دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ کثرت تعداد پر نازاں ہے۔ اس کے مقابلے میں یہی تدبیر مناسب ہے کہ ہم اپنی فوج کے بہت سے دستے بنالیں تاکہ دشمن کو ہماری تعداد اصل سے بہت زیادہ نظر آئے۔

قلب میں انہوں نے اٹھارہ دستے رکھے اور ابوعبیدہ کو ان کا سردار بنایا۔ ان دستوں میں عکرمہ بن ابو جہل اور قعقاع بن حضرت عمرو بھی شامل تھے۔ میمنہ پر دس دستے متعین کیے اور ان کا سردار حضرت عمرو بن العاص کو بنایا۔

ان دستوں میں شرحبیل بن حسنہ بھی تھے۔ میسرہ پر دس دستے متعین کیے اور ان کا سردار یزید ابن ابی سفیان کو مقرر کیا۔ ہر دستے کا علیحدہ سردار بھی تھا جو میمنہ، میسرہ اور قلب کے سرداروں سے احکام حاصل کرتا تھا۔ ان دستوں کے سردار وہ لوگ تھے جو بہادری، جواں مردی اور شجاعت میں اپنی نظیر آپ تھے، مثلاً قعقاع بن حضرت عمرو، عکرمہ بن ابو جہل، صفوان بن امیہ وغیرہ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس ترتیب کے علاوہ لشکر کا ایک ہراول دستہ بھی بنایا تھا۔ جس پر غیاث بن اشیم مقرر تھے۔ قاضی کی خدمت ابوالدرداء کے سپرد ہوئی۔ لشکر کے قاری مقداد تھے جو لشکر کو سورۂ انفال پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ وہ لشکر میں گشت کرتے رہتے اور ہر دستے کے سامنے ٹھہر کر کہتے: ''اللہ اللہ! تم حامیان عرب ہو اور دین اسلام کے مددگار۔ تمہارے مدمقابل حامیان روم اور شرک کے مددگار ہیں۔ اے اللہ! آج کی جنگ صرف تیرے نام کے لیے ہے۔ اے اللہ! اپنے بندوں پر اپنی مدد نازل فرما۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو کہتے سنا: ''اوہو! رومی کتنے زیادہ ہیں اور مسلمان کتنے کم'' یہ سن کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سخت طیش آیا اور وہ چلا کر بولے: ''اوہو! رومی کتنے کم ہیں مسلمان کتنے زیادہ یاد رکھو! فوجیں اللہ کی مدد کی بدولت زیادہ ہوتی ہیں اور ناکامی و بزدلی کی وجہ سے کم ہوتی ہیں۔ فتح و شکست کا انحصار آدمی کی کثرت و قلت پر نہیں ہوتا۔''

پھر فرمایا: ''کاش! (میرے گھوڑے) کا پاؤں اچھا ہوتا پھر چاہے دشمن تعداد میں ہم سے کتنے زیادہ کیوں نہ ہوتے مجھے ان کی مطلق پروا نہ ہوتی۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ سارے لشکر میں پھیل گئے۔ ہر شخص کے سینے میں غیرت و حمیت کے جذبات بھڑکنے لگے اور ہر دل میں شہادت کی تمنا لہریں لینے لگی۔ ہر زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

''فوجیں اللہ کی مدد کی بدولت زیادہ ہوتی ہیں اور ناکامی و بزدلی کی وجہ سے کم ہوتی ہیں۔''

ہر شخص کے سامنے پچھلی جنگوں کے منظر آ گئے۔ جن میں کفار بے پناہ طاقت سے مسلمانوں کے مقابلے میں آئے لیکن ایمانی قوت کے سامنے ان کی ایک نہ چل سکی اور ہر بار انہیں انتہائی ذلت و رسوائی سے پسپا ہونا پڑا۔

مسلمانوں میں اس وقت اتنا جوش و خروش پیدا ہو چکا تھا کہ شام آنے کے بعد سے اب تک پیدا نہ ہوا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آج فتح حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کسی کام کا ارادہ کر لیں تو کوئی طاقت انہیں باز نہیں رکھ سکتی۔ ادھر انہوں نے رومیوں کو پوری طاقت و قوت سے میدان جنگ میں صفیں باندھے ہوئے دیکھا۔ وہ مسلمانوں کی طاقت کو کلیتہً ختم کر دینے کے ارادے سے میدان میں آئے تھے اس وقت انہیں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ یاد آئے: ''آج کا دن اللہ کے اہم دنوں میں سے ہے۔ اللہ نے جنت کے دروازے مومنوں کے لیے کھول دیئے ہیں۔ آج جو شخص موت قبول کرتا ہے اسے ہمیشہ کی زندگی عطا فرمائی جائے گی۔''

ان الفاظ نے ان کے عزم و حوصلہ میں بے پناہ زور پیدا کر دیا اور انتظار کرنے لگے کہ کب حملے کا حکم ملتا ہے اور وہ میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔

جس طرح مسلمانوں کو رومیوں کی تیاری کی اطلاع مل گئی تھی اس طرح رومیوں کو بھی مسلمانوں کی نقل و حرکت کا حال معلوم ہو گیا۔ غالباً اس علاقے کے رہنے والے کچھ بدو دونوں لشکروں کے درمیان جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو منجملہ دیگر اطلاعات کے یہ اطلاع بھی ملی کہ ان کے آنے کی وجہ سے رومیوں کے بعض سرداروں کے دلوں میں سخت گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ ان گھبرائے ہوئے بے چین سرداروں میں ''جرجہ'' بھی شامل تھا۔ یہ شخص یا تو عربی النسل تھا یا تھا تو رومی لیکن سالہا سال سے شام میں رہنے کے باعث عربی بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اسے مسلمانوں کی بہت سی باتوں کا بخوبی علم تھا۔ جب اس کے جاسوسوں نے اسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بے نظیر اور عظیم الشان فتوحات کی اطلاع دی تو بے اختیار اس کے دل میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ملنے اور ان سے گفتگو کی خواہش پیدا ہوئی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھی اس کی اس خواہش کا علم ہو گیا۔ جب باہان نے رومی دستوں کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکلنے کا حکم دیا تو جرجہ ہراول دستے پر متعین تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پکارا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فوج سے نکل کر آئے اور دونوں لشکروں کے درمیان اسے ملے دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ رومیوں نے یہ سمجھا کہ جرجہ کو مدد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مسلمانوں پر زور شور سے حملہ کیا اور انہیں اپنی جگہ سے پیچھے ہٹا دیا۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید کے خیمے کے ساتھ اپنا دستہ لیے کھڑے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان رومیوں کے حملے کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنے لگے تو غیرت و حمیت ان کی رگ رگ میں سرایت کر گئی اور انہوں نے چلا کر کہا: ''میں ہر جگہ تم سے لڑتا رہا ہوں،

کیا آج کی لڑائی میں تم سے ڈر کر بھاگ جاؤں گا؟ واللہ! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔"

یہ کہہ کر وہ ساتھیوں کی طرف مڑے اور کہا: "آؤ، موت کے لیے کون بیعت کرتا ہے؟"

یہ سن کر ضرار بن ازور، حارث بن ہشام، ان کے لڑکے حضرت عمرو بن عکرمہ اور چار سو دوسرے بہادر معزز مسلمانوں اور شہسواروں نے عکرمہ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی اور عکرمہ انہیں لے کر رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ رومیوں کے پاؤں اس ناگہانی حملے کی وجہ سے لڑکھڑا گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ عین اس وقت جرجہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے گفتگو کے نتیجے میں اسلام قبول کرلیا اور اپنا دستہ لے کر مسلمانوں سے مل گیا۔ یہ امر رومیوں میں مزید بدحواسی اور ابتری پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

فتح یرموک:

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے رومی لشکر کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو انہوں نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے اور رومیوں پر زبردست حملہ کرنے کا حکم دیا۔ عکرمہ کے دستے کا زور کیا کم تھا جو اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر نے قیامت ڈھانی شروع کی۔ رومیوں کے لیے اب کوئی جائے فرار نہ تھی۔ پیچھے واقوصہ کی ہولناک گھاٹی اور گہرے کھڈے ان کا راستہ روکے ہوئے تھے اور سامنے سے مسلمانوں کا لشکر انہیں بے دریغ قتل کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تلوار ہاتھ میں لیے سب سے آگے آگے تھے۔ اس موقع پر مسلمان عورتیں بھی اپنے مردوں سے کم نہ رہیں اور انہوں نے بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ ابوسفیان کی بیٹی جویریہ نے جو نمونہ اس موقع پر دکھایا اس نے اس واقعے کی یاد تازہ کردی جو غزوہ احد کے موقع پر اس کی والدہ ہند کے ذریعے سے ظہور پذیر ہوا تھا۔

رومی بھی اپنی مدافعت میں جان توڑ کر لڑے۔ جو مسلمان ان کے قابو میں آگیا زندہ نہ بچ سکا۔ رومیوں کی شجاعت اور جواں مردی کی وجہ سے خاصی دیر تک لڑائی کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ شام ہوگئی مگر لڑائی جاری رہی۔ عکرمہ اور ان کے ہاتھ پر موت کی بیعت کرنے والے لوگوں میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹا۔ یہ لوگ معرکے کے آغاز سے انجام تک انتہائی جواں مردی سے دشمن کے سامنے ڈٹے رہے اور بڑھ چڑھ کر حملے کرتے رہے۔ سورج غروب ہونے پر رومیوں میں ضعف کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ان کے سواروں کے چہروں سے شدید تھکاوٹ کے آثار ہویدا تھے اور وہ بھاگنے کے لیے کسی راستے کی تلاش میں تھے لیکن اس وقت ان کے لیے کوئی راہ فرار نہ تھی۔ واقوصہ کی گھاٹی ان کے پیچھے تھی اور مسلمان ان کے آگے۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اندازہ کرلیا کہ رومی سواروں کا فرار ان کے ساتھیوں کے لیے مزید کمزوری کا باعث ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آدمیوں کو ایک طرف ہٹ جانے کا حکم دیا۔ جب ان سواروں نے راستہ کھلا دیکھا تو بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس راستے سے نکلتے چلے گئے اور سرزمین شام میں

منتشر ہو گئے۔ جب میدان رومی سواروں سے خالی ہو گیا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے سوار اور پیدل دستے لے کر رومیوں کے پیدل دستوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا صفایا کرنا شروع کیا۔ رومی اپنی خندق میں گھس گئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ وہاں بھی پہنچ گئے تو انہوں نے واقوصہ کی گھاٹی کا رخ کیا۔ اکثر رومیوں نے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے کے لیے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ دھڑا دھڑ اس گھاٹی میں گرنے لگے۔ اگر ایک گرتا تھا تو دس کو ساتھ لے گرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی دیوار مع بنیاد زمین بوس ہو گئی ہے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ وہ لوگ کھڈ کو نہ دیکھ سکے۔ جو رومی بھاگ بھاگ کر ادھر آتے انہیں خبر نہ ہوتی کہ آگے والوں پر کیا گزری، وہ بھی اس کھڈ میں گر جاتے۔ طبری کے بیان کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار رومی واقوصہ کی کھائی کی نذر ہوئے۔ ان میں سے اسی ہزار نے اپنے آپ کو بیڑیوں سے باندھ رکھا تھا۔ یہ تعداد ان سواروں اور پیدلوں کے علاوہ ہے جو میدان جنگ میں کام آئے۔ یہ لڑائی دن اور رات کے اکثر حصے میں جاری رہی۔ صبح ہونے سے پہلے ہی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ رومی لشکر کے سپہ سالار اعظم کے خیمے تک پہنچ چکے تھے۔

ہرقل کا بھائی تذارق بھی اس معرکے میں قتل ہوا۔ فیقار اور اس کے ساتھی، جن کا شمار رومیوں کے سرکردہ اور معزز اشخاص میں ہوتا تھا، جنگ میں مارے جانے سے بچ گئے تھے لیکن وہ اس عبرت ناک شکست کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ذلت سے بچانے کے لیے ٹوپیوں سے منہ چھپا لیے اور میدان کے ایک جانب بیٹھ کر کہا کہ اگر ہم مسرت کا دن دیکھنے اور عیسائیت کی حمایت کرنے کے قابل نہیں تو ذلت و بدبختی کا یہ دن بھی آنکھوں سے دیکھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ وہ لوگ اسی حالت میں قتل کر دیئے گئے اور موت انہیں عار سے بچانے کا موجب ہوئی۔ باہان نے بھاگ کر جان بچائی اور بعد کی جنگوں میں دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے پر آیا لیکن اس کا حشر ہمیشہ یرموک سے کم نہ ہوا۔

رومیوں کو کامل شکست ہو چکی تھی۔ مسلمان ان کی لشکر گاہ میں داخل ہوئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہرقل کے بھائی تذارق کے خیمے میں رات گزاری۔ صبح کو جب انہوں نے میدان میں نگاہ دوڑائی تو حد نظر تک کسی رومی کا نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو میدان ایک روز قبل رومی افواج قاہرہ سے بھرپور تھا، جہاں بڑے قیمتی جنگی گھوڑے جولانیاں دکھاتے تھے، جہاں ہر طرف عالی شان اور بلند و بالا خیموں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ وہاں اب ہو کا عالم طاری تھا، نہ کسی رومی کا نام و نشان نظر آتا تھا نہ کسی گھوڑے کا۔ عالی شان اور بلند و بالا خیمے موجود تھے لیکن مالکوں سے خالی تھے اور ان کی جگہ مسلمان ان میں آرام کر رہے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور انہوں نے اللہ کے اس عظیم الشان احسان کا شکر ادا کرنے کے لیے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا لیے۔

جنگ یرموک میں مسلمان شہداء کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ اس لڑائی میں تین ہزار مسلمان شہید ہوئے تھے جن میں جلیل القدر صحابہ اور بڑے بڑے بہادروں اور شہسواروں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ معرکے کے

دوران میں عکرمہ بن ابوجہل اور ان کے بیٹے حضرت عمرو بن عکرمہ کے جسم تلواروں اور نیزوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ فتح کے بعد انہیں تذارق کے خیمے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عکرمہ کا سر اپنی ران پر اور حضرت عمرو بن عکرمہ کا سر اپنی پنڈلی پر رکھ لیا اور ان کے چہروں سے مٹی پونچھنے اور حلق میں پانی ٹپکانے لگے۔ اسی عالم میں انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ابوسفیان کی آنکھ میں ایک تیر لگ گیا جسے ابوحشمہ نے نکالا۔

اس جنگ کا انجام رومیوں کے لیے بہت حسرت ناک تھا۔ ان کی تمام امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ تمام منصوبے ملیا میٹ ہو گئے تھے۔ ہرقل ان دنوں حمص میں مقیم تھا جونہی اس نے اپنے لشکر کی عبرت ناک شکست کی خبر سنی وہ ایک شخص کو اپنا قائم مقام بنا کر خود وہاں سے بھاگ گیا۔ ادھر مسلمانوں نے جنگ یرموک سے فراغت حاصل کرتے ہی اردن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں اسے رومیوں سے پاک کرا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے دمشق کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔

دمشق کا محاصرہ، اس کی فتح اور بعد کے واقعات طبری اور ان کے خوشہ چینوں کے بیان کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام میں پیش آئے۔ جنگ یرموک کے دوران میں بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کا ذکر ہم نے درمیان میں کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ تمام مورخین نے ان کا ذکر کیا ہے پھر بھی ترتیب میں اختلاف پایا جاتا ہے اور ہم نے اس سے پہلے صرف انہی واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو طبری اور اس کے خوشہ چین مورخین نے بالاتفاق اپنی کتابوں میں بیان کیے ہیں۔ ان واقعات میں سب سے مشہور واقعہ یہ ہے کہ عین اس وقت، جب گھمسان کی جنگ جاری تھی، مدینہ سے ایک قاصد محمیہ بن زنیم میدان جنگ میں پہنچا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا اور مدینہ کے حالات پوچھنے شروع کیے۔ اس نے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر کہا کہ مدینہ میں ہر طرح خیریت ہے اور تمہاری امداد کے لیے فوجیں آ رہی ہیں۔ لوگ اسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے۔ اس نے انہیں علیحدگی میں لے جا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر سنائی اور ایک خط بھی دیا۔ یہ خط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے تھا اور اس میں انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ان کی جگہ ابوعبیدہ ذکو قیادت سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھا اور اسے ترکش میں ڈال دیا مبادا یہ خبر لشکر میں پھیل کر لوگوں کی پست ہمتی کا سبب بن جائے۔ جب جنگ ختم ہو چکی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے رومیوں پر فتح حاصل کر لی تو لشکر کی قیادت سے علیحدہ ہو گئے اور خلیفہ ثانی کے احکام کے مطابق امارت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دی۔

جہاں تک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی کا تعلق ہے کسی بھی مورخ کو اس سے اختلاف نہیں۔ البتہ اختلاف ہے تو اس بات میں کہ آیا یہ خط حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے نام تھا یا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی کا حکم خود ان کے پاس نہیں بلکہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تھا لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسے مخفی رکھا اور دمشق کے محاصرے تک اس کی اطلاع حضرت خالد بن

ولید رضی اللہ عنہ کو نہ دی۔ مگر بعض دوسرے مورخین کا کہنا ہے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ حکم اس وقت تک مخفی رکھا جب تک دمشق مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نہ ہوگیا۔ شہر پر کامل تسلط کے بعد ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ خط حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دکھا کر امارت سنبھالی۔

طبری نے شامی افواج کی سپہ سالاری سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی کے جو اقعات بیان کیے ہیں انہیں پڑھ کر قارئین کو عجیب پریشانی لاحق ہوتی ہے کیونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ صرف اس فوج کے امیر تھے جو عراق سے ان کے ساتھ آئی تھی، شام میں مقیم دوسری اسلامی افواج میں سے کسی کی امارت سے انہیں واسطہ نہ تھا۔ اسی طرح ابوعبیدہ بھی حضرت عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان اور شرحبیل بن حسنہ کی طرح صرف اپنی فوج کے سردار تھے۔ جنگ یرموک کے دن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کل فوجوں کا سپہ سالار تمام سرداروں کی رضامندی سے بنایا گیا تھا اور اگر پہلے ہی روز مسلمانوں کو فتح حاصل نہ ہوجاتی تو دوسرے روز کوئی دوسرا سردار سپہ سالار بنتا۔ یہ واقعات ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں طبری کے علاوہ دوسرے مورخین کی کتابیں بھی دیکھنی چاہئیں کہ آخر وہ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

فتح شام کے متعلق دوسری روایات:

اصل میں شام کی فتوحات کے بارے میں ازدی، واقدی اور بلاذری کا طبری سے بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ان اصحاب کی بیان کردہ روایات کے مطابق جنگ یرموک شام کی پہلی جنگ نہ تھی۔ بلکہ اجنادین اور دمشق کی جنگیں اس سے پہلے ہو چکی تھیں۔ ان روایات کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جنگ ہائے مرتدین ختم ہوتے ہی شام کی فتح کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس وقت سرحد پر کوئی مسلمان فوج نہ تھی۔ ایک روز انہوں نے مدینہ کے اہل الرائے حضرات کو طلب فرمایا اور ان کے سامنے شام کی چڑھائی کے متعلق اپنی تجاویز رکھیں جن کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ جب انہوں نے تمام لوگوں کو اپنا ہم نوا پایا تو یمن اور جنوبی عرب کے دوسرے علاقوں کو پیغام بھیجے کہ وہ شام پہنچ کر اپنے آپ کو جہاد کے لیے پیش کریں۔ اس اثنا میں وہ مدینہ، مکہ، طائف اور حجاز کے مسلمانوں کو بھی اسی غرض کے لیے تیار کرتے رہے۔ فوجوں کے اکٹھا ہوجانے پر انہوں نے چار آدمیوں کو علم عنایت فرمائے اور انہیں فوجوں کا سردار بنا کر شام کی جانب روانہ کر دیا۔ یہ چار اشخاص یزید بن ابی سفیان، ابوعبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل اور شرحبیل بن حسنہ تھے۔ ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ انہوں نے ان چاروں اشخاص کے لیے وہ علاقے بھی مخصوص فرما دیئے تھے جہاں کا انہیں والی بننا تھا۔ تصادم سے بچنے کے لیے انہیں یہ ہدایت بھی دی تھی کہ اگر کسی امیر کے مقرر کردہ علاقے میں کفار سے جنگ چھڑ جائے اور کوئی دوسرا امیر بھی اس وقت اس علاقے میں موجود ہو یا اسے مدد کے لیے طلب کیا گیا ہو تو لشکر کی قیادت عامہ اس امیر کے سپرد ہوگی جس کے علاقے میں جنگ ہو رہی ہو۔ اس کے بالمقابل ایک اور روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے ابوعبیدہ بن جراح کو ان تمام افواج کا سپہ سالار اور یزید بن ابی سفیان کو امارت میں ان

کا نائب بنایا تھا۔ (بلاذری کی روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ کو علم دے کر شام بھیجنا چاہا تو انہوں نے معذرت چاہی۔ بعد میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے زمانہ خلافت میں سارے شام کا والی بنا کر بھیجا) ان لشکروں کی روانگی کے انتظامات کی تکمیل اس وقت ہوئی جب ذوالکلاع حمیری اور یمن کے دوسرے تمام افراد اپنے اپنے قبائل مذحج، طیٔ اور اسد وغیرہ کو لے کر مدینہ میں حاضر ہو گئے۔ تیاری مکمل ہونے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے یزید بن ابی سفیان کو ان کے لشکر کے ہمراہ شام روانہ فرمایا اور ان کے پیچھے پیچھے زمعہ بن اسود کو ایک فوج دے کر بھیجا۔

باقی لشکر ابھی مدینہ ہی میں تھے۔ جب گلیاں باہر سے آنے والے مجاہدین سے بھر گئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں لے کر مدینہ سے باہر نکلے اور ثنیۃ الوداع پہنچ کر انہیں رخصت کیا۔ حضرت خالد بن سعید بن عاص بھی ان لشکروں کے ساتھ شام روانہ ہوئے لیکن انہوں نے اپنے چچیرے بھائی یزید بن ابی سفیان کے بجائے ابوعبیدہ بن جراح کے لشکر میں شامل ہونا پسند کیا کیونکہ وہ سابقون الاولون میں سے تھے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ''امین الامت'' کا لقب مل چکا تھا۔ ان لشکروں کی روانگی کے بعد مدینہ میں یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں سے مزید لشکر پہنچنے شروع ہوئے۔ انہیں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام کی جانب روانہ فرمایا اور اجازت دے دی کہ وہ اگلے لشکروں میں سے جس لشکر کے ساتھ چاہیں مل جائیں۔

ہرقل ان دنوں فلسطین میں تھا۔ جب اسے مسلمانوں کی تیاریوں کی خبریں ملیں تو اس نے علاقوں کے سرداروں کو جمع کیا اور ان کے سامنے جوشیلی تقریریں کر کے انہیں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس نے کہا ''یہ بھوکے ننگے غیر مہذب لوگ صحرائے عرب سے نکل کر تم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ تم انہیں ایسا منہ توڑ جواب دو کہ پھر یہ کبھی تمہاری طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ سامان حرب اور فوجوں کے ذریعے سے تمہاری پوری مدد کی جائے گی۔ جو امراء تم پر مقرر کیے گئے ہیں تم دل و جان سے ان کی اطاعت کرو، فتح تمہاری ہی ہوگی۔''

فلسطین کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف آمادہ پیکار کر کے ہرقل دمشق آیا۔ وہاں سے حمص اور انطاکیہ پہنچا اور فلسطین کی طرح ان علاقوں میں بھی اس نے جوشیلی تقریریں کر کے وہاں کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ خود انطاکیہ کو ہیڈ کوارٹر بنا کر مسلمانوں سے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔

اسی اثناء میں ابوعبیدہ وادی قریٰ اور حجر سے گزر کر سرزمین شام میں داخل ہو چکے تھے۔ مآب میں ایک رومی لشکر سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ رومی لشکر مسلمانوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور اسے جلد ہی شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ جابیہ پہنچنے پر ابوعبیدہ کو معلوم ہوا کہ ہرقل نے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ایسا عظیم الشان لشکر تیار کیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس پر انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو تمام حالات لکھ کر مشورہ طلب کیا اور امداد کی درخواست بھی کی۔ ادھر یزید بن ابی سفیان نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا لیکن اس میں رومیوں کی زبردست جنگی تیاریوں سے خوف کھانے کے بجائے اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہرقل کا فلسطین سے

انطاکیہ پہنچ جانا خود اس خوف و ہراس پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یزید کے خط سے بہت خوشی ہوئی اور انہیں جواب میں لکھا کہ تم اسی طرح ہمت بلند رکھو، اللہ یقیناً تمہاری مدد فرمائے گا۔ لیکن ابو عبیدہ کو جو جواب بھیجا اس میں اس امر پر تاسف کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ رومیوں کی قوت و شوکت سے مرعوب ہو گئے۔ پھر بھی دونوں خطوں میں انہوں نے مزید کمک بھیجنے کا وعدہ کیا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ کو خطوط لکھ کر ان سے بھی موجودہ حالات کے متعلق مشورہ طلب فرمایا تھا۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ناگوار گزری کیونکہ وہ نہ چاہتے تھے کہ اہم امور کے متعلق مشوروں میں سابقون الاولون اور بعد میں اسلام قبول کرنے والوں کو ایک سطح پر رکھا جائے پھر بھی وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ایسا کرنے سے روک نہ سکے۔

اس اثناء میں عرب قبائل جہاد کے شوق میں چاروں طرف سے آکر مدینہ میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ اہل مکہ کی بھی ایک کثیر تعداد مدینہ پہنچ چکی تھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان تمام لوگوں کا سردار حضرت عمرو بن العاص کو بنایا اور انہیں شام روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ حضرت عمرو بن العاص نے پوچھا: ''کیا شام میں لڑنے والی فوجوں کی قیادت بھی میرے پاس رہے گی؟''

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''تم صرف ان لوگوں کے سردار ہو جو یہاں سے تمہارے ساتھ بھیجے جا رہے ہیں لیکن شام پہنچ کر اگر اسلامی لشکروں کو مل کر دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا تو تمہارے امیر ابو عبیدہ بن جراح ہوں گے۔''

روانگی کا وقت آیا تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے سفارش کر کے انہیں شام میں لڑنے والی اسلامی افواج کا سپہ سالار مقرر کرا دیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صاف جواب دے دیا اور کہا: ''میں تمہیں دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میں ہرگز حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ سفارش نہ کروں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک درجے کے لحاظ سے ابو عبیدہ تم سے افضل ہیں۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے امیر بن جانے سے ابو عبیدہ کے درجے اور فضیلت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔''

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حضرت عمرو بن العاص کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا اور انہوں نے جواب دیا: ''حضرت عمرو! تمہیں کیا ہو گیا؟ تم اپنے لیے امارت کے خواہش مند ہو اور اس سے تمہاری غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہیں ایک دنیوی رتبہ اور قدر و منزلت حاصل ہو جائے۔ تمہیں اللہ سے ڈرنا اور اس کی خوشنودی کے سوا اور کسی چیز کا طالب نہ ہونا چاہیے۔ تم لشکر لے کر شام روانہ ہو جاؤ۔ اگر اس مرتبہ تم امیر نہیں بن سکے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ امارت کے موقعے آگے چل کر بہت آئیں گے۔''

اس قسم کی باتیں کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص کو راضی کر لیا اور وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے قیمتی نصائح حاصل کرنے کے بعد لشکر لے کر شام روانہ ہو گئے۔ اگرچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف

سے ابوعبیدہ کو پیش قدمی کی ہدایات مل رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود پیش قدمی کی رفتار بہت سست تھی۔ مدینہ سے بھیجی ہوئی امداد اور حضرت عمرو بن عاص کے شام پہنچنے پر بھی اس سست روی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ ابوعبیدہ برابر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لکھتے رہے: ''رومی اور ان کے حاشیہ نشین قبائل مسلمانوں سے لڑنے کے لیے بھاری تعداد میں اکٹھے ہو رہے ہیں اس لیے مجھے رائے دیجئے کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیے؟''

ابوعبیدہ کے پے درپے خطوط سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تنگ آگئے اور انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس وقت عراق میں تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں لکھا: ''جونہی میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے عراق سے شام روانہ ہو جاؤ، مثنیٰ کی فوج کو عراق ہی میں چھوڑ دو اور اپنے ساتھیوں میں سے بہترین آدمی چن کر ساتھ لے لو۔ شام پہنچ کر ابوعبیدہ بن جراح سے ملو۔ اس وقت شام کی افواج ابوعبیدہ کے زیر سرکردگی ہیں لیکن آئندہ ان فوجوں کے سپہ سالار تم ہو گے۔ والسلام علیک۔''

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی کہ انہیں عراق سے ہٹا کر شام بھیجا جا رہا ہے تو انہیں بہت غصہ آیا۔ ابھی تک انہوں نے خلیفہ کا خط نہ پڑھا تھا۔

انہیں خیال ہوا کہ یہ سارا کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ وہ انہیں عراق سے ہٹا کر خود ان کی جگہ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس خیال کا اظہار انہوں نے زبان سے بھی کر دیا۔ انہوں نے کہا: یہ سب کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا دھرا ہے۔ انہیں اس بات کا حسد ہے کہ اللہ نے عراق میرے ذریعے سے کیوں فتح کرایا۔

لیکن جب انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خط کھول کر پڑھا جس میں انہیں شام میں مقیم اسلامی افواج کی قیادت سپرد کی گئی تھی تو اطمینان کا سانس لیا۔

جن مورخین نے واقعات اس ترتیب سے بیان کیے ہیں وہ یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خط حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ملا تو وہ حیرہ میں تھے اور انبار عین التمر کی فتوحات ابھی تک وقوع میں نہ آئی تھیں۔ خط ملنے پر انہوں نے تیاری کی اور شام روانہ ہو گئے۔ یہ دونوں مقام راستے میں پڑتے تھے، انہیں فتح کیا اور قراقر پہنچے۔ قراقر سے وہ صحرا کو قطع کر کے سویٰ پہنچے جہاں سے سرزمین شام شروع ہو جاتی تھی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بھی ایک خط ارسال کیا تھا جس میں لکھا تھا: ''میں نے حضرت خالد بن ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کو رومیوں سے جنگ کرنے کا کام سپرد کیا ہے تم ان کی مخالفت نہ کرنا اور بہ دل و جان ان کے تمام احکام کی اطاعت کرنا۔ میں نے انہیں تمہارا امیر مقرر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دینی لحاظ سے تمہارا مرتبہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے بلند تر ہے لیکن جو جنگی مہارت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے وہ تمھیں حاصل نہیں۔ اللہ ہمیں اور تمھیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

ادھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بن ولید نے بھی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو یہ خط لکھا: ''میری دعا ہے کہ اللہ ہمیں اور تمھیں خوف کے دن امن عطا فرمائے اور اس دنیا میں دشمنوں کے ہاتھوں شکست کھانے سے محفوظ رکھے۔

میرے پاس خلیفہ رسول اللہ ﷺ کا خط آیا ہے جس میں مجھے شام جانے اور وہاں اسلامی لشکروں کی کمان سنبھالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ! نہ میں نے شامی افواج کی سپہ سالاری کی خواہش کی، نہ میرے خیال میں یہ بات آسکتی تھی کہ مجھے شامی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا جائے گا، نہ میں نے کبھی خلیفہ رسول اللہ ﷺ یا کسی اور شخص کو اشارۃ وکنایۃ کوئی خط ہی لکھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو مرتبہ اس وقت آپ کا ہے آئندہ بھی اسی طرح برقرار رہے گا۔ نہ آپ کے کسی حکم سے روگردانی کی جائے گی، نہ آپ کی کسی رائے کی مخالفت کی جائے گی اور نہ کوئی کام آپ کے مشورے کے بغیر کیا جائے گا کیونکہ آپ مسلمانوں کے سردار ہیں۔ آپ کی فضیلت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا اور نہ آپ کی رائے سے پہلوتہی کی جاسکتی ہے۔ اللہ ہمیں اپنے احسان کی دولت سے مالا مال کر دے اور آگ کے عذاب سے بچالے۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ۔"

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سویٰ سے لویٰ پہنچے، وہاں سے قصم آئے جہاں انہوں نے بنو مشجعہ سے صلح کی۔ یہاں سے وہ غویر اور ذات الصمین کی طرف مڑے اور راستے میں مقیم قبائل کو مرعوب کرتے ہوئے غوطہ دمشق پہنچ گئے۔ راستے میں تدمر کی تسخیر بھی عمل میں آئی۔ (بلاذری میں مذکور ہے کہ آپ تدمر سے حوارین اور مرج الراہط ہوتے ہوئے غوطہ دمشق پہنچے تھے)۔

غوطہ سے ثنیۃ العقاب کے راستے انہوں نے دمشق کا قصد کیا۔ اس ثنیہ (گھاٹی) کو ثنیۃ العقاب کا نام حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حملے کے بعد دیا گیا کیونکہ یہاں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا "عقاب" لہرایا تھا۔ دمشق کے مشرقی دروازے سے ایک میل کے فاصلے پر وہ ایک گرجے میں اترے جسے بعد میں "دیر حضرت خالد بن ولید" کا نام دے دیا گیا۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ ابوعبیدہ ان سے یہیں ملے تھے اور دمشق کا محاصرہ اصل میں اس روز شروع ہوا تھا۔

بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دمشق کے سامنے زیادہ دن تک قیام نہ کیا بلکہ آگے بڑھ کر قناۃ بصریٰ پہنچے جہاں مسلمانوں کی افواج مجتمع تھیں۔ اس اثناء میں مسلمانوں کو خبریں پہنچنی شروع ہوئیں کہ ہرقل نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اجنادین میں ایک عظیم الشان لشکر جمع کیا ہے۔ یہ خبریں سن کر پہلی روایت کے مطابق مسلمان دمشق کا محاصرہ چھوڑ کر (ازدی کی روایت اس بارے میں یہ ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دمشق سے گزرے تو ضرور تھے لیکن انہوں نے اور ابوعبیدہ نے غوطہ اور اس کے نواحی علاقوں میں اچانک دھاوے بولنے کے سوا کوئی باضابطہ حملہ نہ کیا۔ اس دوران میں انہیں خبر ملی کہ حمص کا حاکم رومیوں کی ایک عظیم الشان جمعیت کے ہمراہ اس ارادے سے باہر نکلا ہے کہ بصریٰ کے مقام پر شرجبیل بن حسنہ کا راستہ کاٹ دے تاکہ وہ ساتھیوں سے نہ مل سکیں۔ پھر خبر ملی کہ رومیوں کی عظیم الشان افواج اجنادین میں جمع ہوئی ہیں اور تمام اہل شہر اور شام میں مقیم عرب قبائل رومیوں سے مل کر مسلمانوں کے مقابلے کی زبردست تیاری کر رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ ذ دمشق سے نکلے اور اجنادین کا قصد کیا۔ ابوعبیدہ فوج کے پچھلے حصے میں تھے۔ اہل دمشق نے موقع پا کر ان کا راستہ کاٹ دیا اور ان

سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو وہ فوج لے کر پلٹے اور ابوعبیدہ کو اہل دمشق کے چنگل سے چھڑایا۔ اہل دمشق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حملے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گئے اور قلعے میں پہنچ کر پناہ لی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ابوعبیدہ کو ساتھ لے کر اجنادین روانہ ہو گئے)) اور دوسری روایت کے مطابق بصریٰ کا محاصرہ ختم کر کے رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اجنادین کی جانب روانہ ہوئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات سے چوبیس روز پہلے اجنادین میں مسلمانوں اور رومیوں کی پہلی مڈبھیڑ ہوئی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تینوں امراء یعنی یزید بن ابی سفیان، شرحبیل بن حسنہ اور حضرت عمرو بن عاص کو لکھا تھا کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر اجنادین پہنچ جائیں چنانچہ یہ تینوں قائدین حکم کی تعمیل میں اپنی فوجوں کے ہمراہ اجنادین پہنچ گئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تمام افواج کی کمان سنبھالی اور لشکر کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔ پیدل فوج پر ابوعبیدہ کو مقرر کیا، میمنہ پر معاذ بن جبل کو، میسرہ پر سعید بن عامر بن حزیم جمحی کو اور سواروں پر سعید بن زید بن حضرت عمرو کو مقرر کیا اور خود مسلمانوں کو جوش دلانے کے لیے صفوں کے درمیان گشت کرنے لگے۔

رومیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ مسلمانوں پر حملہ شروع کر دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے آدمیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ نماز ظہر تک جنگ شروع نہ کی جائے لیکن جب سعید بن زید نے دیکھا کہ رومیوں کے حملے کے نتیجے میں مسلمانوں کو جانی نقصان ہو رہا ہے تو انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے رومیوں پر جوابی حملہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے گھڑ سوار دستے کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد باقی فوج کو بھی لے کر دشمن پر پل پڑے۔ رومیوں کو شکست فاش ہوئی، مسلمانوں نے ان کے بے شمار آدمی قتل کر ڈالے اور بے حساب مال غنیمت حاصل کیا۔

معرکہ اجنادین میں فتح یاب ہو کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ واپس دمشق آ گئے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس گرجے میں اترے جو باب شرقی سے متصل تھا۔ ابوعبیدہ نے باب جابیہ کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ حضرت عمرو بن العاص باب توما کے سامنے فروکش ہوئے۔ شرحبیل باب فراویس اور یزید باب صغیر کے سامنے خیمہ زن ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں نے پوری طرح شہر کا محاصرہ کر لیا۔

اہل دمشق نے ہرقل کو لکھا کہ وہ اس وقت سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ مسلمانوں نے سختی سے ان کا محاصرہ کر رکھا ہے اس لیے جلد از جلد ان کی مدد کے لیے فوج روانہ کی جائے۔ چنانچہ ہرقل نے ایک فوج روانہ کی۔ مرج الصفر میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج سے اس فوج کا مقابلہ ہوا جس میں رومی فوج کو شکست فاش اٹھانی اور فرار ہوتے ہی بن پڑی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دوبارہ دمشق آ گئے اور محاصرہ شروع کر دیا۔

اہل دمشق سے جب تک بن پڑا انہوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ شہر کی دیواروں کو مضبوط بنایا اور ان کے اوپر سے مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کیے۔ شہر کے دروازوں پر مضبوط دستے متعین کیے کہ مسلمانوں کو شہر میں داخل ہونے سے روکیں۔ لیکن کوئی بھی چیز مسلمانوں کو محاصرے کی سختی سے باز نہ رکھ سکی۔ ناچار امرائے دمشق نے ایک بار پھر ہرقل کو لکھا کہ اگر اس نے اس نازک موقع پر ان کی مدد نہ کی تو دشمن سے مصالحت کے

سوا ان کے لیے کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا۔ ہرقل نے جواب میں لکھا کہ جرأت و ہمت سے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو اور کسی بھی قیمت پر اس شہر پر قبضہ نہ کرنے دو، تمہاری مدد کے لیے میں قاصد کے پیچھے پیچھے فوجیں روانہ کر رہا ہوں۔ اہل دمشق نے بے صبری سے ان فوجوں کا انتظار شروع کیا لیکن آخر ان کی امیدیں حسرتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہرقل کی طرف سے کوئی مدد نہ پہنچی۔ اہل دمشق کی ہمتوں نے جواب دے دیا اور انہیں مسلمانوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور ان سے صلح کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اس صلح کے متعلق مختلف روایات تاریخوں میں بیان ہوئی ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اہل دمشق سے صلح ابوعبیدہ نے باب جابیہ کے قریب کی تھی۔ صلح نامہ پر کرنے کے بعد جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ باب شرقی سے بہ زور اندر گھس آئے ہیں اور اپنے سپاہیوں کی مدد سے شہر پر قبضہ کر رہے ہیں، جب دونوں سردار آپس میں ملے تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ شہر والوں نے صلح کر لی ہے اور مسلمانوں کو شہر والوں کے مال و جان پر کسی قسم کا اختیار نہیں لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہوں نے اپنے زور بازو سے شہر کو فتح کیا ہے اس لیے شہر والوں سے مفتوحین جیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ آخر تھوڑی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد دونوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ صلح برقرار رکھی جائے اور شہر والوں سے مفتوحین کا سلوک نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اہل دمشق سے باب شرقی کے قریب صلح کا معاہدہ کیا تھا اور ابوعبیدہ باب جابیہ سے بہ زور شہر میں داخل ہوئے تھے۔ پھر بھی تمام روایتوں میں اس امر پر اتفاق ہے کہ آخر صلح کی شرائط ہی برقرار رکھی گئیں اور شہر والوں سے مفتوحین کا سا سلوک نہ کیا گیا۔

روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابھی دمشق کا محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی اور ان کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ انہوں نے خلافت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کے عہدے سے معزول کر کے ان کی جگہ ابوعبیدہ کو سالار لشکر مقرر کر دیا اور اس کی اطلاع ابوعبیدہ ذکو بھی بھیج دی۔ لیکن ابوعبیدہ ذنے یہ حکم اس وقت تک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے چھپائے رکھا جب تک دمشق مسلمانوں کے ہاتھ نہ آ گیا۔ البتہ ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ فتح دمشق سے پہلے ہی ابوعبیدہ ذنے یہ اطلاع حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دے دی تھی لیکن ان کی تیوری پر ذرا بھی بل نہ پڑے اور انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے خلیفہ ثانی کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

یہ ہیں وہ روایات جو ازدی، بلاذری اور واقدی نے شامی فتوحات کے متعلق بیان کیں اور جو ہم نے بالاختصار نقل کر دی ہیں۔ انہیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے یہ روایات جہاں طبری سے مختلف ہیں وہاں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی امارت اور ان کی معزولی کے سوال پر بھی دونوں میں بین اختلاف موجود ہے۔

پھر بھی دو باتیں ایسی ہیں جن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں اول یہ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی نے عراق کی

طرح شام کی فتح کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس غرض کے لیے فوجیں اور ہر قسم کی امداد روانہ کی تھی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ عراق اور شام کی ان ابتدائی فتوحات ہی سے، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئیں، اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ دوم یہ کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شام میں بھی وہی کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا مظاہرہ وہ عراق میں کر چکے تھے۔ وہ ہر مقام پر مظفر و منصور ہوئے اور قیادت سے معزولی کے باعث ان کے رتبے میں کوئی کمی واقع ہو سکی اور نہ ان کی جنگی صلاحیتوں میں۔ یہ ان کی جنگی صلاحیتیں ہی تو تھیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھ کر انہیں سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا اور جن کا اعتراف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ سے فرمایا تھا: ”میں اس تلوار کو کسی طرح میان میں نہیں ڈال سکتا جسے اللہ نے کافروں پر مسلط کیا ہو۔“

ان مختلف روایات کی موجودگی میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ یرموک کی جنگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں واقع ہوئی یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں۔ اگر اس امر کو دیکھا جائے کہ واقوصہ کی گھاٹی، جس کے قریب یہ جنگ لڑی گئی، صحرائے شام، عرب کی سرحد اور وادی سرحان کے راستے کے قریب واقع ہے تو طبری کی رائے کی تائید کرنی پڑتی ہے کہ یہ جنگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی کیونکہ ابتدائی جنگیں سرحد کے قریب ہی لڑی جاتی ہیں۔ لیکن ایک اور نقطہ نگاہ سے بلاذری کی اس روایت کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جنگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں واقع ہوئی۔ اس نے بیان کیا ہے کہ جب ابتدائی جنگیں شروع ہوئیں تو رومیوں نے دمشق کی جانب ہٹنا شروع کیا۔ دمشق کا شہر نہ صرف خود بہت مستحکم تھا بلکہ اس کے اردگرد بھی ایسی بستیاں آباد تھیں جہاں سے مسلمانوں کے حملے کا دفاع بہت اچھی طرح کیا جا سکتا تھا۔ رومیوں کا ارادہ تھا کہ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے مسلمانوں کو ایسی جگہ لے آئیں گے جہاں سے ان کے لیے واپس ہونا بے حد مشکل ہوگا، اس وقت وہ یکبارگی ان پر حملہ کر کے انہیں شکست دے دیں گے، پھر کبھی مسلمانوں کو شامی علاقے پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسلمان دمشق تک پہنچ گئے لیکن رومیوں کی توقعات کے برعکس شہر کا محاصرہ ہوتا چلا گیا اور آخر ہار کر رومیوں کو صلح کرنی پڑی اور شہر پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا۔

واقعات کی اصل ترتیب کا فیصلہ تو واقعی مشکل ہے لیکن جہاں تک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سپہ سالاری سے معزول کیے جانے کا تعلق ہے اس کا فیصلہ آسان ہے۔ طبری، بلاذری اور دوسرے تمام مورخین کا اس امر پر تو کلی اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام اس غرض کے لیے بھیجا تھا کہ وہ رومیوں کے دلوں سے تمام شیطانی وسوسے دور کر دیں اور اس جمود کو، جو ایک لمبے عرصے سے شام میں مقیم اسلامی فوجوں پر چھا چکا تھا، توڑ دیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ آیا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ وہاں تمام اسلامی فوجوں کے سپہ سالار بن کر گئے تھے یا صرف اس فوج کے امیر بن کر جو آپ کے ساتھ عراق سے شام پہنچی تھی۔ اگر یہ اختلاف دور ہو جائے تو معزولی کا سارا واقعہ سمجھ میں آجاتا ہے۔

طبری بیان کرتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ صرف اس فوج کے امیر بن کر شام گئے تھے جو

عراق سے ان کے ساتھ آئی تھی۔ تمام اسلامی فوجوں کی قیادت صرف جنگ یرموک کے دن ان کے ہاتھ میں آئی تھی اور وہ بھی دیگر امراء کے مشورے اور رضامندی کے بعد۔ لیکن بلاذری اور ان کے خوشہ چین ذکر کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام میں مقیم تمام اسلامی فوجوں کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا اور ثبوت میں وہ خط پیش کرتے ہیں جو اس معاملے کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بھیجے تھے۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد ہم نے بلاذری کی روایت کو زیادہ قرین قیاس اور درست خیال کیا ہے کیونکہ یہ امر بعید از عقل ہے کہ ایک ہی سلطنت کی مختلف فوجیں ایک جگہ ڈیرے ڈالے پڑی رہیں اور ایک قیادت کے تحت منظم ہونے کے بجائے علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور امارت میں بٹی رہیں۔

طبری خود یہ بات تسلیم کرتے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمام اسلامی لشکروں کو حکم بھیجا تھا کہ وہ آپس میں ضم ہو کر ایک لشکر کی صورت اختیار کر لیں اور متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ اس حکم کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک تمام اسلامی لشکر ایک قیادت کے ماتحت منظم نہ ہو جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام بھیجنے سے پہلے دیا تھا اس لیے لازم تھا کہ اسلامی لشکروں کی قیادت ابوعبیدہ، یزید بن ابی سفیان یا اور کسی قائد کے سپرد ہوتی۔ اکثر مورخین کا خیال یہ ہے کہ ان لشکروں کے سپہ سالار ابوعبیدہ تھے گو بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خط لکھ کر یہ ذمہ داری اٹھانے سے معذرت چاہی تھی۔ جب ان باتوں کے تسلیم کرنے سے ہم انکار نہیں کر سکتے تو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید کو کل شامی افواج کا سپہ سالار مقرر کر کے شام بھیجا تھا اور یہی بات بلاذری نے بیان کی ہے۔

اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تمام افواج کے سپہ سالار نہ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنتے ہی سب سے پہلے انہیں اپنے عہدے سے معزول کرنے کا حکم نہ بھیجتے کیونکہ طبری اور دوسرے مورخین کی بیان کردہ روایات سے ثابت ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے معزول ہونے کے بعد بھی، ان فوجوں کی قیادت کرتے رہے جو ان کے ساتھ تھیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں قنسرین کی امارت اور فوج کی سپہ سالاری سے معزول نہ کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پانچویں سال پیش آیا۔ اس صورت میں پہلی معزولی قیادت عامہ سے قرار پاتی ہے اور دوسری معزولی، جو پہلی معزولی سے چار سال بعد وقوع میں آئی، صرف اس امارت سے تھی جو انفرادی طور پر انہیں ایک حصہ فوج پر حاصل تھی۔

یہ ہے ہماری رائے جس پر ہم مضبوطی سے قائم ہیں۔ اس رائے کو تسلیم کرنے سے ان مختلف شبہات کا ازالہ ہو سکتا ہے جو اس ذیل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ صرف اس فوج کے امیر ہوتے جو عراق سے ان کے ساتھ آئی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی معزولی کا حکم بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی اور طبری کی روایت کے مطابق جنگ یرموک کے بعد اور بلاذری کی روایت کے مطابق دمشق کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دوبارہ تمام اسلامی فوجوں کی قیادت سنبھال لیتے

۱۵

مثنیٰ عراق میں

عراق میں مثنیٰ کے لیے مشکلات:

مثنیٰ بن حارثہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو صحرائے شام کی سرحد پر چھوڑ کر حیرہ واپس آ گئے تھے۔ واپس آ کر انہوں نے اپنی فوج کے ذریعے سے مفتوحہ شہروں کے دفاع کا بندوبست کرنا شروع کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جونہی ایرانیوں کو حضرت خالد بن ولید ذ کے شام جانے کا حال معلوم ہوگا وہ اپنے چھینے ہوئے شہروں کو واپس لینے اور سرزمین عراق سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے پوری جدوجہد شروع کر دیں گے۔

اس وقت حالات واقعی نازک صورت اختیار کر گئے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق میں رہنے والے بدوؤں سے جس سختی کا سلوک کیا تھا اس کے باعث وہ مسلمانوں کے دشمن بن چکے تھے اور ان سے بدلہ لینے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ ادھر ایرانیوں کو یقین تھا کہ عراق میں اسلامی سلطنت کا قیام ان کے لیے پیغام موت سے کم نہیں اس لیے وہ بھی اس فکر میں تھے کہ کب موقع ہاتھ آئے اور وہ مسلمانوں کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یک بارگی حملہ کر کے انہیں حدود عراق سے پیچھے دھکیل دیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے عراق سے چلے جانے کے بعد ایرانی ضرور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اسی لیے شام جانے سے پیشتر انہوں نے تمام مسلمان عورتوں، بچوں اور کمزور مردوں کو مدینہ بھجوا دیا تھا۔ مثنیٰ کے سامنے یہ تمام باتیں روز روشن کی طرح عیاں تھیں اور وہ عجیب مخمصے میں گرفتار تھے۔ مثنیٰ ہی تھے جنھیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عراق پر چڑھائی کا کام سپرد کیا تھا اور انہیں کی مدد کے لیے حضرت خالد بن ولید ذ اور دوسرے اسلامی لشکر عراق بھیجے گئے۔ اس صورت میں مثنیٰ کے لیے یہ بات قطعاً ناقابل برداشت تھی کہ انہیں اسی سرزمین میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے جہاں سب سے پہلے انہی کے فاتحانہ قدم پڑے تھے۔

ان تمام امور کے علاوہ ایک اور بات بھی مسلمانوں کے لیے حد درجہ پریشان کن تھی اور وہ یہ کہ سالہا سال کی نااتفاقی اور لڑائی جھگڑوں کے بعد اہل ایران نے بالاتفاق شہریران (روایات میں اس کا نام شہر

بازان، شہر باز اور شہر براز بھی آیا ہے) بن اردشیر بن سابور کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرلیا تھا اور ساری رعایا نے بہ دل و جان اس کی اطاعت کرنے کا عہد کیا تھا۔ نئے بادشاہ کو کچھ دن تو سلطنت کا اندرونی نظم ونسق درست کرنے میں لگے۔ جب اس طرف سے فراغت نصیب ہوگئی تو سب سے پہلے اس نے عراق کی طرف توجہ کی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق کی آدھی فوج لے کر شام جا چکے تھے۔ شہر یران کو اس سے بہتر موقع مسلمانوں کو عراق سے نکالنے کا نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً ہرمز کو دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ مثنیٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کردیا۔ ہرمز ایک مہیب ہاتھی پر سوار ہو کر اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کو عراق کے چپے چپے سے نکال کر انہیں عرب کی حدود میں پہنچا کر ہی دم لے گا۔

جب مثنیٰ کو ان تیاریوں اور ہرمز اور اس کے لشکر کی نقل وحرکت کی اطلاعات ملیں تو انہوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ ہرمز مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں سے گزرتا ہوا حیرہ پہنچے جہاں وہ اس وقت مقیم تھے بلکہ اپنا لشکر لے کر خود اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ اپنے دونوں بھائیوں، معنیٰ اور مسعود کو بالترتیب میمنہ اور میسرہ پر مقرر کیا اور حیرہ سے روانہ ہو کر بابل کے کھنڈروں تک آپہنچے۔ ابھی ان کا سفر جاری تھا کہ انہیں شہر یران شہنشاہ ایران کا خط ملا جس میں لکھا تھا:

"میں نے تمہارے مقابلے کے لیے ایرانیوں کا ایک لشکر بھیجا ہے۔ یہ تو وہ مرغیوں اور سوروں کے چرانے والے لیکن تمہارا بھرکس اچھی طرح نکال دیں گے۔"

مثنیٰ نے شہنشاہ ایران کے قاصد کے ہاتھ سے خط لیا، پڑھا اور اسی وقت یہ جواب لکھ کر اس کے حوالے کردیا: "مثنیٰ کی جانب سے شہر یران کے نام۔ تمہارا حال دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو تم سرکش ہو۔ یہ چیز تمہارے لیے بری ہے۔ ہمارے لیے اچھی۔ یا تم جھوٹے ہو اور یہ تمہیں پتا ہی ہے کہ اللہ کے نزدیک اور اس کے بندوں کی نظروں میں عقوبت اور فضیحت کے لحاظ سے سب سے زیادہ جھوٹے بادشاہ ہوتے ہیں۔ تمہارے خط سے ہمیں علم ہوگیا ہے کہ اب تم اس حد تک مجبور ہو گئے ہو کہ مرغیاں اور سور چرانے والوں کے سوا تمہیں اور لوگ ہمارے مقابلے میں بھیجنے کے لیے ملتے ہی نہیں۔ پس اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہارا مکر وفریب خود تم پر ہی لوٹا دیا اور تم سور چرانے والوں سے مدد لینے پر مجبور ہو گئے۔"

جب اہل ایران کو مثنیٰ کے اس خط کا علم ہوا اور یہ بھی پتا چلا کہ وہ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے خود سرحد ایران کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ انہیں ہرگز توقع نہ تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمانوں میں اس قدر قوت باقی رہی ہوگی کہ وہ اس بے باکی سے ان کے بادشاہ کو جواب دیں گے۔ بعض لوگوں کو اپنے بادشاہ کا انداز تحریر بھی بہت ناگوار گزرا اور انہوں نے اس سے کہا: "آپ نے خط لکھ کر مسلمانوں کو اور دلیر بنا دیا ہے۔ براہ مہربانی آئندہ جب آپ کسی کو خط لکھیں تو پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ کرلیا کریں۔"

مثنیٰ مدائن کے قریب بابل کے کھنڈروں میں ایک جگہ خیمہ زن ہو کر ہرمز کی آمد کا

انتظار کرنے لگے۔ آخر ہرمز بھی آپہنچا۔ اسے کامل اطمینان تھا کہ مسلمان اس کے چنگل سے کسی طرح بھی نہ نکل سکیں گے اور وہ انہیں تباہ کر کے ہی دم لے گا۔ اس کا مہیب ہاتھی دائیں بائیں زور زور سے سونڈ ہلا رہا تھا۔ مسلمانوں کو آج تک کبھی ہاتھی سے پالا نہ پڑا تھا۔ یہ خوف ناک جانور دیکھ کر ان کے دلوں پر ہیبت طاری ہوگئی۔ مثنیٰ کو بھی یقین ہوگیا کہ جب تک ہاتھی میدان جنگ میں موجود رہے گا مسلمان اطمینان سے ایرانیوں کا مقابلہ نہ کرسکیں گے۔ چنانچہ وہ خود چند لوگوں کو ساتھ لے کر نکلے، تلواریں سونت کر ہاتھی پر پل پڑے اور اسے مار کر ہی دم لیا۔ مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کی بے چینی دور ہوگئی اور انہوں نے نئے جوش اور نئے ولولے سے ایرانیوں پر حملہ کر دیا اور اس وقت تک بس نہ کیا جب تک انہیں شکست فاش نہ دے لی۔ ایرانی لشکر نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور انہیں مدائن کے دروازوں تک پہنچا کر ہی دم لیا۔

ایران میں دوبارہ خلفشار:

ہرمز کی شکست کی خبر شہر یران پر بجلی بن کر گری۔ اسے اسی وقت بخار چڑھ آیا اور اسی حالت میں اس نے جان دے دی۔ سرداران ایران نے اس کی جگہ کسریٰ کی بیٹی کو تخت پر بٹھانا چاہا تا کہ ایک بار پھر وہ اپنی طاقت وقوت کو مجتمع کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کرسکیں۔ لیکن ابھی اسے سریر آرائے سلطنت ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ اسے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ سابور بن شہر یران تخت پر بیٹھا۔ اس نے فرخ زاد کو اپنا وزیر بنایا اور اس سے کسریٰ کی بیٹی آزرمیدخت کی شادی کرنی چاہی لیکن آزرمیدخت شاہی خاندان کے باہر شادی کرنے پر رضامند نہ تھی۔ اس نے سابور سے کہا ''اے ابن عم! کیا تم میرے غلام سے میری شادی کرو گے؟ میں یہ بات کسی طرح منظور نہیں کرسکتی۔'' لیکن سابور نے اس کی ایک نہ سنی اور بڑی تلخ کلامی سے پیش آیا۔ اس پر آزرمیدخت نے اک مشہور عجمی بہادر سیاؤخش رازی کو ساتھ ملایا۔ شادی کی رات کو جب فرخ زاد حجلہ عروسی میں داخل ہوا سیاؤخش نے اس پر اچانک حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد وہ آزرمیدخت اور اس کے اعوان و انصار کو ساتھ لے کر سابور کے محل پر آیا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ پہرے داروں نے مزاحمت کی لیکن یہ لوگ انہیں قتل کر کے محل میں گھس گئے اور سابور کو مار ڈالا۔ آزرمیدخت تخت شاہی پر متمکن ہوگئی۔

ان واقعات کی اطلاع مثنیٰ کو ملی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایرانیوں کا اتحاد ان کے لیے سخت خطرے کا باعث تھا لیکن اب اللہ نے ان کے درمیان پھوٹ ڈال دی تھی اور وہ تخت پر قبضہ کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ موجودہ حالات مثنیٰ کے لیے انتہائی سازگار تھے۔ انہوں نے ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہا اور یہ سوچ کر کہ نہ معلوم آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں، مدائن کی جانب کوچ کر دیا اور ایرانیوں سے لڑتے بھڑتے شہر کے دروازے تک جا پہنچے۔ ان کی عین خواہش مدائن کو فتح کرنے کی تھی۔ لیکن اس کے لیے زبردست جمعیت کی ضرورت تھی جو ان کے پاس موجود نہ تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ان کی

مدد کے لیے کوئی لشکر روانہ نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس وقت تمام فوجیں شام میں رومیوں سے برسر پیکار تھیں۔

بہت کچھ سوچ بچار کے بعد انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں فتوحات کی خوش خبری دینے کے بعد ان مرتد قبائل سے مدد لینے کی اجازت طلب کی جو توبہ کر کے دوبارہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور جن کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا تھا کہ انہیں کسی اسلامی فوج میں شامل نہ کیا جائے۔ مثنیٰ جانتے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی درخواست آسانی سے قبول نہ کریں گے لیکن دوسری طرف انہیں یہ بھی علم تھا کہ سابق مرتد قبائل اپنے کیے پر پچھتا رہے ہیں اور اسلامی افواج میں شامل ہونے کے لیے بے چین ہیں۔

خط لکھے ہوئے عرصہ ہو گیا لیکن مثنیٰ کو جواب موصول نہ ہوا۔ اس پر انہوں نے خود مدینہ جا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ لشکر کو زیریں عراق میں سرحد کے قریب لے آئے اور بشیر بن خصاصیہ کو عراق میں اپنا قائم مقام بنا کر خود مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مرض الموت میں مبتلا پایا۔ پھر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ بڑی توجہ سے ان کی باتیں سنیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا جنھیں وہ اپنے بعد خلیفہ مقرر کر چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو انہوں نے فرمایا: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں جو کہتا ہوں اسے سنو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ مجھے امید نہیں کہ میں آج شام تک زندہ رہ سکوں گا۔ میرے مرنے کے بعد تم کل کا دن ختم ہونے سے پہلے پہلے مثنیٰ کے ساتھ لوگوں کو لڑائی پر روانہ کر دینا۔ تمھیں کوئی مصیبت دینی کام اور حکم الٰہی سے غافل نہ کر پائے۔ تم نے دیکھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا کیا تھا حالانکہ اس وقت مسلمان ایک بڑے ابتلاء میں تھے۔ اگر میں اس وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی بجا آوری میں دیر کرتا اور کمزوری دکھاتا تو نہ صرف مدینہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو جاتا بلکہ اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ جب اہل شام پر فتح حاصل ہو جائے تو اہل عراق کو عراق واپس بھیج دینا کیونکہ وہ عراق ہی کے کاموں کو خوب انجام دے سکتے ہیں اور عراق ہی میں ان کا دل کھلا ہوا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلا کام یہ کیا کہ مثنیٰ کے ساتھ ایک فوج عراق بھیجی انہیں سابق مرتدین کو اسلامی فوج میں شامل ہونے کی اجازت بھی مل گئی تھی کیونکہ اب اسلام طاقت پکڑ چکا تھا اور ان کی طرف سے کسی قسم کے فتنہ و فساد کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا۔

۱۶

جمع قرآن

غزوہ یمامہ کے اثرات:

جمع قرآن کریم کی تاریخ بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم غزوہ یمامہ کا ذکر دوبارہ کریں کیونکہ اسی جنگ کے نتیجے میں اس عظیم الشان کام کو لباس عمل پہنانے کا خیال بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ ابتداءً ہم نے اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ جنگوں اور فتوحات کے واقعات کے تسلسل میں فرق نہ آئے۔

جنگ ہائے مرتدین میں غزوہ یمامہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ جنگ نہ صرف بڑی ہولناک تھی بلکہ اثرات کے لحاظ سے بھی دوررس نتائج کی حامل تھی۔ مسیلمہ بن حبیب کے قتل سے سارے عرب کے مدعیان نبوت پر ضرب کاری لگی، بحرین میں مرتدین کے استیصال سے بنوحنیفہ کو دوبارہ اسلام لانے کی توفیق ملی اور اسی امر نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کو عراق کی طرف پیش قدمی کرنے کی جرات دلائی۔ جنگ یمامہ میں مسیلمہ کے لشکر کو شکست دینے کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوری قوت صرف کر دی تھی۔ ادھر مسیلمہ نے بھی مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو مسیلمہ کو شکست فاش ہو چکی تھی۔ اس کے ہزاروں آدمی میدان جنگ میں مارے جا چکے تھے اور وہ خود بھی وحشی غلام کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا بھی کچھ کم نقصان نہ ہوا تھا۔ ان کے بارہ سو آدمیوں نے جام شہادت نوش کیا تھا جن میں کبار صحابہ اور حفاظ قرآن کی ایک کثیر تعداد شامل تھی۔

جہاں یہ فتح مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے دل خوش کن تھی کہ اس کے ذریعے سے عرب میں ایک بہت بڑے فتنے کا خاتمہ ہو گیا وہاں یہ امر سخت غم واندوہ کا موجب تھا کہ اس جنگ میں کبار صحابہ اور حافظ قرآن کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تھی اور اس طرح انہیں ایسے عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کی تلافی کی کوئی صورت انہیں نظر نہ آ رہی تھی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو تو خصوصیت سے سخت رنج پہنچا تھا کیونکہ ان کے بھائی زید اس معرکے میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کے رنج والم کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے بیٹے عبداللہ اس جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے کر واپس مدینہ آئے تو ان سے کہا:

''جب تمہارے چچا زید شہید ہو گئے تو تم کیوں چلے آئے۔تم نے اپنا منہ مجھ سے کیوں نہ چھپا لیا؟''

عبداللہ نے صرف یہ جواب دیا:

''انہوں نے حصول شہادت کی تمنا کی، انہیں مل گئی۔میں نے بھی اس غرض کے لیے پوری جدو جہد کی لیکن افسوس میں اسے حاصل نہ کر سکا۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

لیکن اپنے بھائی اور دیرینہ رفقاء کی شہادت کا الم ناک حادثہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کام کے متعلق غوروفکر کرنے سے نہ روک سکا جو بلاشبہ اسلامی تاریخ کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے۔غزوہ یمامہ میں حفاظ کی ایک کثیر تعداد شہید ہو چکی تھی اور ابھی جنگوں کا سلسلہ جاری تھا جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور آئندہ جنگوں میں حفاظ کثرت سے شہید ہونے لگے تو قرآن بالکل مٹ جائے گا اس لیے اسے ایک جگہ جمع کر لیا جائے تا کہ اس کے مٹ جانے کا خطرہ جاتا رہے۔اس معاملے پر انہوں نے کئی دن تک خوب غوروفکر کیا اور اس کے بعد ایک دن مسجد میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے اسے پیش کرتے ہوئے کہا:''یمامہ کی جنگ میں حفاظ کی بھاری تعداد نے جام شہادت نوش کیا ہے۔مجھے ڈر ہے کہ دوسری جنگوں میں بھی حفاظ کی اکثریت شہید ہو جائے گی اور اس طرح قرآن کریم کا بیشتر حصہ ضائع ہو جائے گا۔میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں تا کہ وہ مٹنے سے محفوظ رہے۔''

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اب تک اس معاملے کے متعلق کچھ نہ سوچا تھا۔اس لیے جونہی انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ باتیں سنیں، فرمایا:''میں وہ کام کیونکر کر سکتا ہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔''

اس پر دونوں بزرگوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی جس کی تفصیل مورخین نے بیان نہیں کی مگر آخر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہو گئے اور انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا۔

اس کے متعلق صحیح بخاری میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ایک روایت درج ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:''جنگ یمامہ کے بعد ایک دن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے طلب فرمایا۔جب میں ان کے پاس پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جنگ یمامہ میں متعدد حفاظ شہید ہو گئے ہیں۔اگر جنگوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور کسی وقت خدانخواستہ تمام حفاظ شہید ہو گئے تو قرآن کا اکثر حصہ ضائع ہو جائے گا اس لیے میری رائے میں آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں کہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہے۔زید بن ثابت کہتے ہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا''میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اس کام میں امت کی بھلائی ہے اس لیے اسے ضرور کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی بات پر اتنا اصرار کیا کہ آخر اللہ نے میرا بھی سینہ کھول دیا اور میں نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کرلیا۔''

زید بن ثابت کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا 'تم جوان اور عقل مند انسان ہو۔ ہم تمہاری صداقت اور راست گفتاری میں کسی قسم کا شک نہیں کرسکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وحی لکھنے کا شرف بھی تمھیں حاصل ہوتا رہا ہے اس لیے قرآن کریم کو تلاش کرکے اسے ایک جگہ جمع کردو۔ واللہ! اگر مجھے پہاڑ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانے کا حکم دیا جاتا تو یہ کام میرے قرآن جمع کرنے سے زیادہ سہل ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ دونوں وہ کام کس طرح کرسکتے ہیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا کہ اس میں امت کی بھلائی ہے۔ وہ برابر میری باتوں کا جواب دیتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح میرا بھی سینہ کھول دیا چنانچہ میں نے یہ کام کرنے کی حامی بھرلی اور قرآن کریم کو تلاش کرنے اور چمڑے، لکڑی، پتھر کے ٹکڑوں اور آدمیوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کیا۔ سورۃ توبہ کی دو آیتیں مجھے خزیمہ انصاری سے ملیں۔ ان کے سوا اور کسی کے پاس وہ آیتیں نہ مل سکیں۔

آیتیں یہ تھیں:

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ماعنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم فان تولوا فقل حسبی الله لا اله الا هو علیه توکلت وهو رب العرش العظیم۔

جب ہم نے قرآن کریم کے اوراق لکھ لیے تو معلوم ہوا کہ ان میں سورۂ احزاب کی ایک آیت نہیں ہے جسے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا کرتا تھا۔ آخر وہ آیت بھی خزیمہ انصاری سے ملی جن کی اکیلی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا۔ وہ آیت یہ تھی:

من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فمنهم من قضی نحبه و منهم من ینتظر۔

یہ آیت مل جانے پر میں نے اسے سورہ مذکورہ بالا میں شامل کرلیا۔ جن اوراق میں قرآن کریم جمع کیا گیا تھا وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ رہے۔ ان کی وفات کے بعد ام المومنین حفصہ کے پاس آگئے۔

یہ ہے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں درج کی ہے۔ تمام روایات اس کی صحت پر متفق ہیں۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ زید نے جو قرآن جمع کیا تھا اس میں سورتوں کی کوئی خاص ترتیب مقرر نہ تھی اور یہ بالترتیب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل ہوتا رہا۔

دیگر روایات:

ایک روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ قرآن کریم کو سب سے پہلے جمع کرنے کا شرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو

حاصل ہوا۔ (کتاب المصاحف، ابن ابی داؤد صفحہ ۲۰ و کتاب الاتقان فی علوم القرآن، سیوطی، صفحہ ۵۹)

انہوں نے ایک آیت کے متعلق دریافت فرمایا تو لوگوں نے جواب دیا کہ یہ آیت فلاں صحابی کو یاد تھی لیکن وہ جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے۔ یہ سن کر انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فوراً قرآن کریم کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ مگر یہ روایت اس سلسلے میں بیان کی ہوئی دیگر تمام روایات کے متناقض ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کو جمع کرنے کا مشورہ تو بے شک سب سے پہلے دیا لیکن اسے جمع کرنے کا فخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کے حصے میں نہیں آسکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل روایت بھی ہماری رائے کی تائید کرتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: "اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحمت نازل فرمائے۔ قرآن کریم جمع کرنے کے کام میں وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں کیونکہ انہیں نے سب سے پہلے اسے جمع کیا۔"

جن لوگوں کی رائے میں قرآن کریم جمع کرنے کا کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے انجام پذیر ہوا تھا ان کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے یہ کام شروع کرنا چاہا تو پہلے ایک خطبہ دیا جس میں صحابہ کو ہدایت کی کہ جس شخص نے قرآن کریم کا کوئی حصہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست حاصل کیا ہو وہ اسے ہمارے پاس لائے۔ صحابہ کی عادت تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتے اسے چمڑوں، تختیوں اور ہڈیوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے۔ وہ کسی شخص سے اس وقت تک قبول نہ کرتے تھے جب تک وہ اپنے ثبوت میں دو گواہ نہ پیش کر دیتا تھا جو آکر یہ گواہی دیتے تھے کہ واقعی یہ آیات رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کام کو ابھی ختم نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی شہادت ہوگئی۔ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلا کر قرآن کریم جمع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا اور ہدایت کی کہ اگر طرز تحریر میں کہیں اختلاف واقع ہو تو اسے مضر کی زبان میں لکھ لیا کرو۔ کیونکہ قرآن کریم مضر ہی کے ایک شخص (محمد ﷺ) پر نازل ہوا تھا۔

قرآن جمع ہونے کا زمانہ:

قبل اس کے کہ میں تاریخ جمع قرآن پر روشنی ڈالوں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ کام کیونکر کر سکتا ہوں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔" رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول، نبوت تفویض ہونے کے وقت سے مدینہ میں وفات کے وقت تک، مسلسل تیئس سال تک ہوتا رہا۔ بعض اوقات چند آیات نازل ہوتی تھیں بعض اوقات پوری سورت نازل ہو جاتی تھی۔ سب سے پہلے وحی جو آپ پر نازل ہوئی وہ سورہ قلم کی یہ آیات تھیں:

اقرأ باسم ربك الذي خلق ... الذي علم

بالقلم علم الانسان مالم یعلم۔
اس سورت کی بقیہ آیات، جنہیں ہم آج کل قرآن کریم میں مندرجہ بالا آیات کے ساتھ شامل پاتے ہیں نہ صرف بعد میں نازل ہوئیں بلکہ ان کا نزول وحی کے بیشتر حصے کے نزول کے بعد ہوا۔ کیا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مندرجہ بالا قول کا مطلب یہ سمجھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک قرآن کریم پراگندہ حالت میں تھا۔ نہ اس کی آیات میں کوئی ترتیب تھی نہ سورتوں میں۔ سب متفرق حالت میں تھیں اور جو ترتیب آج کل نظر آتی ہے وہ اس زمانے میں مفقود تھی؟

بعض مورخین کا خیال یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت قرآن کریم واقعی منتشر اور پراگندہ حالت میں تھا۔ اپنی تائید میں انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی پیش کی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے اور قرآن کسی ایک جگہ جمع نہ تھا۔'' مستشرقین کا ایک مخصوص گروہ بھی اسی امر کو قابل ترجیح قرار دیتا ہے مشہور انگریز مورخ سر ولیم میور تو اپنی کتاب کے مقدمے میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ قول بڑے زور سے اپنی تائید میں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''قرآن کریم کے اجزاء نہایت سادہ طور پر ایک دوسرے سے ملا دیئے گئے ہیں، اس میں کسی قسم کا تکلف نہیں برتا گیا اور فنی مہارت اور چابک دستی کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ اس امر سے جمع کرنے والے شخص کے ایمان و اخلاص اور اس سچی عقیدت کا پتا چلتا ہے جو اسے اس کتاب سے تھی۔ ان آیات مقدسہ سے مرتب کی گئی عقیدت اور احترام ہی کا نتیجہ تھا کہ اس نے انہیں باقاعدہ ترتیب دینے کی کوشش نہ کی بلکہ جو آیات اسے ملتی گئیں انہیں وہ ایک جگہ جمع کرتا گیا۔'' جو مستشرقین اس رائے کے موید ہیں وہ کہتے ہیں کہ زید بن ثابت ذ اور ان کے معاونین نے قرآن جمع کرتے وقت اس کی نزولی ترتیب ملحوظ خاطر نہیں رکھی اور مکہ میں اترنے والی آیات کو مدینہ میں نازل ہونے والی آیات سے پہلے درج کرنے کا کوئی التزام نہیں کیا بلکہ بلالحاظ اس بات کے کہ موقع اور محل متقاضی ہے یا نہیں، مکی سورتوں کے درمیان مدنی آیات کو داخل کر دیا۔ مستشرقین کی رائے میں اگر زید بن ثابت ذ تاریخی ترتیب مد نظر رکھتے تو یہ چیز علمی تحقیق کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوتی اور رسول عربی کے حالات کی چھان بین کرنے اور آپ کی سیرت کو پرکھنے میں اس سے بے حد مدد ملتی۔''

مستشرقین یہ بھی لکھتے ہیں کہ قرآن جمع کرنے والوں نے آیات کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے بھی ترتیب نہیں دیا۔ اس کے نتیجے میں ایک ہی سورت میں قصص اور تاریخ کے متعلق بھی باتیں ملتی ہیں اور ایمان و عبادات کے متعلق بھی تشریعی احکام بھی ملتے ہیں اور انسانی فطرت سے تعلق رکھنے والے قوانین بھی۔ مزید برآں مختلف موضوعات کے متعلق ایک قسم کی روایات کو بجائے ایک جگہ اکٹھا کرنے کے مختلف سورتوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اس طرح ایک چیز کو تلاش کرنے کے لیے سارے قرآن کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے تو کہیں جا کر گوہر مراد حاصل ہوتا ہے۔ مستشرقین کی رائے میں جامعین قرآن نے موضوعات کا خیال نہ رکھ کر اور بالخصوص ترتیب نزولی سے غفلت برت کر زبردست کوتاہی کا ثبوت دیا ہے اور اس طرح دنیا کو ایک علمی انکشاف

سے محروم کر دیا ہے۔

مستشرقین کی ان تمام آراء کی بنیاد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس قول پر ہے کہ میں وہ کام کیونکر کر سکتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ قول سمجھنے میں سخت غلطی کھائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آیات قرآنیہ ابتدائے نزول ہی سے پراگندگی کی حالت میں تھیں حالانکہ خلیفہ اول اور خلیفہ سوم کے زمانوں میں انہیں یکجا کر دیا گیا۔ لیکن یہ خیال قطعاً درست نہیں۔ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ تمام آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے حکم سے سورتوں میں مرتب ہو چکی تھیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں چند احادیث درج کی جاتی ہیں۔

مالک کہتے ہیں کہ "قرآن مجید اسی طرح تالیف کیا گیا جس طرح صحابہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھتے ہوئے سنتے تھے۔"

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ستر سے زیادہ سورتیں سن کر یاد کیں اور ایک دفعہ میں نے آپ کے سامنے ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین کی آیت تک سورۂ بقرہ تلاوت کی۔"

زید بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے سارا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا۔

مسلم اور بخاری میں انس بن مالک سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جملہ اشخاص نے قرآن کریم جمع (حفظ) کیا تھا اور چاروں انصار میں سے تھے یعنی ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید رضی اللہ عنہم۔"

انس کا مطلب یہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ان چاروں صحابہ کے سوا اور کسی صحابی نے قرآن کریم حفظ نہ کیا تھا۔ اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے قرطبی لکھتے ہیں: "یہ امر متعدد شہادتوں سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، تمیم الداری، عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن حضرت عمرو بن عاص نے بھی قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ ان روایات کی موجودگی میں انس بن مالک کی روایت قرآن کریم انصار کے چار آدمیوں کے سوا اور کسی نے حفظ نہیں کیا" کا مطلب یہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان چاروں آدمیوں کی جماعت کے سوا کسی بھی شخص نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر قرآن حفظ نہ کیا۔ صحابہ مختلف اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر حفظ کر لیا تھے اور دوسروں کو سکھاتے تھے۔ پھر بھی تمام صحابہ کے لیے ناممکن تھا کہ انہوں نے قرآن کریم کی تمام آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی ہوں۔ اس طرح اکثر صحابہ نے قرآن کریم کا کچھ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کچھ حصہ اپنے دوسرے ساتھوں سے حاصل کیا تھا۔ متعدد روایات سے پتا چلتا ہے کہ چاروں اصحاب کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر قرآن کریم حفظ کرنے کا شرف اس لیے حاصل ہوا کہ یہ بہت مخلص اور سابقون الاولون مسلمانوں میں سے تھے اور آپ ان سے بہت لطف و محبت سے پیش آتے تھے

یہ روایت بھی کثرت سے کتب احادیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر سال جبریل کے سامنے قرآن کریم کا ایک دور کیا کرتے تھے لیکن وفات والے سال آپ نے ایک کی بجائے دو دور کیے۔

سیرت نبوی میں بھی جو واقعات درج ہیں وہ ان متذکرہ بالا روایات کی پوری تائید کرتے ہیں۔ منجملہ دیگر واقعات کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے دس سال بعد وقوع پذیر ہوا۔ جب دین اسلام نے مکہ میں فروغ حاصل کرنا شروع کیا اور اہل مکہ میں باہم تفریق پیدا ہونے لگی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو اس وقت حالت کفر میں تھے، سخت طیش آیا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ قتل کے ارادے سے آپ کی جانب جا ہی رہے تھے کہ راستے میں نعیم بن عبداللہ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ انہوں نے حضرت عمر کو ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا کہ اس ہیئت میں کہاں جا رہے ہو؟ جب انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقصد کا علم ہوا تو انہوں نے کہا ''محمد کو تو بعد میں قتل کرنا، پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔'' یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جانے کی بجائے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ باہر سے انہوں نے سنا کہ خباب ان دونوں کو قرآن سنا رہے ہیں۔ انہوں نے گھر میں داخل ہو کر بہن اور بہنوئی دونوں کو زدوکوب کرنا شروع کیا لیکن آخر انہیں اپنے فعل پر ندامت ہوئی اور انہوں نے بہن سے کہا کہ جو کتاب تم پڑھ رہی تھیں مجھے بھی دکھاؤ۔ چنانچہ بہن چند اوراق اٹھا لائیں۔ ان پر سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ صحیفہ پڑھا تو قرآنی اعجاز اور اس کے جلال کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے اسی وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

وہ اوراق جن پر سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، منجملہ ان کثیر صحیفوں کے تھے جو مسلمانوں کے درمیان متداول تھے اور جن پر سورۂ طٰہٰ کے علاوہ قرآن کریم کی اور بھی کئی سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ تیرہ برس زندہ رہے۔ آپ نے صحابہ کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ''مجھ سے سوا قرآن کے اور کچھ نہ لکھا جائے اور اگر کسی نے قرآن کے سوا کوئی حدیث لکھ لی تو وہ اسے مٹا دے۔'' یہ امر لازم تھا کہ صحابہ نماز میں تلاوت کرنے اور احکام دین سیکھنے کے لیے قرآن کریم کا جس قدر حصہ لکھ سکتے تھے لکھتے تھے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی قرآن کریم لکھتے ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ مختلف قبائل کی طرف قرآن سیکھنے اور دینی تعلیم دینے کے لیے روانہ فرماتے تھے۔ یہ لوگ علیحدہ علیحدہ آیات نہ لکھتے تھے بلکہ پوری کی پوری سورتیں لکھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ یہ سورتیں انہیں لکھواتے تھے۔

قرآن کریم سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے یاایھا المزمل قم اللیل الا قلیلاً نصفه اوانقص منه قلیلاً اوزد علیه ورتل القرآن ترتیلا (اے اوڑھنے والے! رات کو قیام کر، تھوڑے حصے کے لیے یعنی اس کا آدھا یا اس سے کچھ کم کر لے یا اس پر بڑھا لے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر باترتیب پڑھ) (ترتیل کے معنی صرف ٹھہر ٹھہر کر اتارنے اور

بیان کرنے ہی کے نہیں بلکہ اس کے معنی میں تالیف اور ترتیب بھی شامل ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے رتل القرآن احسن تالیفه وابانه و تمهل فیه یعنی ترتیب کو نہایت عمدہ کیا اور اسے کھول کر اور ٹھہر ٹھہر کر بیان کیا۔ مترجم) سورۂ مزمل کی آیات رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی ابتداء میں نازل ہوئی تھیں۔ اللہ کا اپنے نبی سے یہ مطالبہ کہ وہ رات کو اٹھ کر قرآن باترتیب پڑھے ظاہر کرتا ہے کہ آیات قرآنیہ کسی بھی وقت بے ترتیب اور پراگندگی کی حالت میں نہ رہیں بلکہ جونہی رسول اللہ ﷺ پر کوئی وحی نازل ہوتی تھی آپ اسے اس کی جگہ رکھنے کا حکم دے دیتے تھے۔ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ جب یہ آیت واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله ثم توفی کل نفس ما کسبت وهم لایظلمون، نازل ہوئی تو جبریل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: "اے محمد ﷺ! اسے سورۂ بقرہ کی دو سو اسی ویں آیت کے شروع میں رکھیں۔"

قرآن کریم بار بار اپنی تعریف "کتاب" کے الفاظ سے کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ، فاتحہ کے بعد، قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ اس کا آغاز ہی اللہ اس آیت سے کرتا ہے، الم ذالك الكتاب لاريب فيه هدى المتقين (یہ قرآن ایک کتاب ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ یہ متقیوں کے لیے ہدایت کا موجب ہے) اسی طرح اور بھی کئی جگہ قرآن کے لیے کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب اس چیز کو کہتے ہیں جو لکھی ہوئی ہو اور اس سے پہلے ہم متعدد احادیث کی رو سے ثابت کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں قرآن لکھا جاتا تھا۔ زید بن ثابت کا یہ قول ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے اور قرآن کریم کسی ایک جگہ جمع نہ تھا لیکن ایک اور موقع پر انہوں نے فرمایا "ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے تھے اور قرآن کو کپڑے کے ٹکڑوں پر تالیف کرتے تھے۔" مطلب یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات اور اشارات کے مطابق متفرق آیات اپنے اپنے موقع پر لکھ لیا کرتے تھے چنانچہ تالیف کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ علاوہ بریں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں اور نماز کے علاوہ بھی پوری پوری سورتیں مثلاً بقرہ، آل حضرت عمران، نسائی، اعراف، جن، نجم، رحمن اور قمر وغیرہ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام باتوں سے پتا چلتا ہے کہ جہاں تک آیات کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کے عہد میں آپ کی ہدایت کے مطابق مکمل ہو گئی تھی اور قاریوں، حافظوں اور دوسرے مسلمانوں نے اسے اپنے اپنے سینوں میں مکمل طور پر محفوظ کر لیا تھا۔

صحابہ نے نہ صرف قرآن کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا تھا بلکہ چار اصحاب نے تو اسے باقاعدہ لکھ بھی لیا تھا۔ اس امر پر مورخین کا اتفاق ہے کہ جہاں تک آیات کی ترتیب کا سوال ہے، رسول اللہ ﷺ کی وفات سے قبل لکھے ہوئے مصحفوں اور آپ کی وفات کے بعد مرتب کیے ہوئے مصحفوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ آیات کی ترتیب رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں خود فرما دی تھی، البتہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کام رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

جب یہ امر ثابت شدہ ہے کہ قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں جمع تھا تو پھر سوال پیدا ہوتا

ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا کیا مطلب لیا جائے گا جو انہوں نے جمع قرآن کی تجویز پیش کیے جانے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا یعنی "میں وہ کام کیونکر کرسکتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔" اور وہ کیا دلیلیں تھیں جنہوں نے آخر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت کے دلوں کو کھول دیا اور وہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجویز کے مطابق قرآن کریم جمع کرنے پر متفق ہو گئے۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو چکی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ لوگوں نے یہ بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا کر کہی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا "کیا آپ میری بیعت کرنا پسند نہیں کرتے کہ اپنے گھر جا کر بیٹھ گئے ہیں؟" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہلا بھیجا۔ "واللہ! یہ بات نہیں بلکہ مجھے ڈر ہے کہ مبادا لوگ کتاب اللہ میں زیادتی کر دیں اس لیے میں نے قسم کھالی ہے کہ اس وقت تک گھر سے باہر نہ نکلوں گا جب تک قرآن جمع نہ کرلوں گا۔" (حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول "مجھے ڈر ہے کہ مبادا لوگ کتاب اللہ میں زیادتی کر دیں۔" صرف سیوطی نے کتاب الاتقان میں درج کیا ہے۔ دیگر مؤلفین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول لکھا ہے "میں نے قسم کھالی ہے کہ اس وقت تک گھر سے باہر نہ نکلوں گا جب تک قرآن جمع نہ کرلوں۔" ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں یہ روایت درج کی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بیعت کے چند روز بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا "اے ابوالحسن! کیا آپ میری امارت سے ناراض ہیں؟" انہوں نے جواباً کہلا بھیجا "واللہ! نہیں، میں نے قسم کھالی ہے کہ سوا جمعہ کے گھر سے باہر نہ نکلوں گا۔" پھر خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کر کے واپس چلے آئے۔ ابن ابی داؤد روایت کے آخر میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ دوسرے مورخین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب یہ قول منسوب کیا ہے "میں اس وقت تک باہر نہ نکلوں گا جب تک قرآن جمع نہ کرلوں۔" یہاں جمع کرنے سے مراد حفظ کرنا ہے کیونکہ اس وقت جو شخص قرآن کریم حفظ کرلیتا تھا اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس نے قرآن جمع کرلیا ہے) رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد قرآن کریم جمع کرنے میں علی ذا کیلے نہ تھے بلکہ کئی اور صحابہ بھی اس کام میں ان کے شریک تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کے کام کو سراہا اور اس عظیم کام سے کسی ایک شخص کو روکنے کا خیال بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ وہ مطمئن تھے کہ اللہ ہی نے قرآن کریم نازل کیا ہے اور وہی اس کا محافظ ہے۔ کسی مسلمان کے دل میں اس بات کا خیال بھی نہیں آسکتا کہ وہ اپنی طرف سے قرآن کریم میں کمی بیشی کرے اور اگر کوئی ایسا کام کرے گا بھی، جس کا خدشہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ظاہر کیا ہے تو اللہ خود ہی اپنی کتاب کی حفاظت فرمائے گا اور اسے اپنے ارادے میں قطعاً ناکام و نامراد رکھے گا۔ اسی لیے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم جمع کرنے کا کام شروع کرائیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تردد ہوا کیونکہ وہ ایسا کام نہ کرتے تھے جو رسول اللہ ﷺ نے نہ کیا اور کسی ایسے کام سے پہلو تہی اختیار نہ کرتے تھے جو آپ نے انجام دیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم لکھنے کا کام عامۃ المسلمین کے سپرد کر رکھا تھا۔ بعض لوگوں کو خود رسول اللہ ﷺ قرآن کریم لکھوا دیتے تھے۔ دوسرے لوگ ان کاتبین سے نقل

یا سن کر سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ان کے زمانے میں بھی وہی طریقہ جاری رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جاری تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ کر قرآن کریم لکھ لیں یا حفظ کر لیں۔ دربار خلافت سے بالخصوص اس کے لیے کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔

یہ تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت کی دلیل۔ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں اصرار کرنا شروع کیا اور اُس کے حق میں دلائل بھی دیئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم جمع کرنے کا حکم دے دیا۔ افسوس ہے کہ تاریخ سے اس گفتگو کی تفصیلات کا علم نہ ہوسکا جو اس باب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوئی۔ اگر تفصیلات بھی کتب تاریخ میں محفوظ ہوتیں تو اس سے معاملے کے کئی اور بھی پہلو نظروں کے سامنے آجاتے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمع قرآن کریم کے سلسلے میں وہ کون سا کام تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اسے کرتے ہوئے تردد ہوا کیونکہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ اسے فوراً لکھوا کو ہدایت کر دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھ لی جائے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ تو درست ہے آپ اتری ہوئی آیات کے بارے میں کاتبان وحی کو ان کا محل اور موقع بتا دیا کرتے تھے لیکن یہ تمام آیات متفرق جگہ لکھی ہوئی تھیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول تواتر سے ہوتا تھا اس لیے آپ اپنی زندگی میں اسے ایک جگہ جمع نہ کرا سکے۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد جب وحی کا نزول ہوگیا اور کتاب اللہ کامل ہوگئی تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں انجام نہ دے سکے اسے ضائع ہونے اور تحریف و تبدیل کے خدشے کے پیش نظر آپ کے بعد فی الفور مکمل کر لیا جائے۔

یہ تھیں وہ وجوہ جن کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جمع قرآن پر اصرار کیا۔ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دلائل بہت ٹھوس اور وزنی تھے اور اس میں سراسر اسلام اور مسلمانوں کے لیے بھلائی مضمر تھی اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات مان لی اور زید بن ثابت کو قرآن کریم جمع کرنے کا حکم دے دیا۔

چنانچہ ابوعبداللہ زنجانی اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھتے ہیں: ''شواہد سے پتا چلتا ہے حضرت عمرؓ کا موقف صرف یہ تھا کہ قرآن کریم کو، جو اب تک ہڈیوں، لکڑیوں اور کھالوں پر لکھا ہوا بکھرا پڑا تھا، باقاعدہ اوراق پر لکھ کر ایک جگہ پر جمع کر لیا جائے لیکن صحابہ میں چونکہ حد درجہ احتیاط تھی اور وہ ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہتے تھے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو اس لیے وہ ڈرتے تھے کہ کہیں یہ کام بدعت میں شمار نہ ہو۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن:

یہ بیان کرنے سے پہلے کہ جمع قرآن کے سلسلے میں کیا کام ہوا، یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو واقعات پیش آئے انہوں نے ثابت کر دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کے سلسلے میں جو رائے دی تھی وہ انتہائی صائب تھی اور انہوں نے اپنی دوررس نگاہوں سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ اگر قرآن کریم ایک جگہ جمع نہ کیا گیا تو آئندہ مسلمانوں کو کس قدر عظیم خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ بے حد وسیع ہو گیا تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں نو مسلموں کو قرآن پڑھانے اور سکھانے کا کام صحابہ کرام کے سپرد تھا لیکن اسلامی سلطنت کی حدود چونکہ بے حد وسیع ہو چکی تھیں اس لیے لوگوں کی قراتوں میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا پھر یہ اختلاف آہستہ آہستہ وسعت اختیار کرنے لگا اور لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہماری قرات تمہاری قرات سے بہتر ہے۔ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ لوگوں نے قرات کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر شروع کر دی اور اس طرح ایک زبردست فتنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حذیفہ بن یمان نے، جو اس زمانے میں آرمینیا اور آذر بائیجان میں مصروف پیکار تھے، تکفیر و تفسیق کا بڑھتا ہوا طوفان دیکھ کر سخت خطرہ محسوس کیا۔ وہ فوراً مدینہ پہنچ گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ ''امیر المومنین! امت کی خبر لیجیے، وہ ہلاک ہونے کو ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا ''کیا ہوا؟'' حذیفہ نے سارا ماجرا عرض کر کے بتایا ''ہماری فوج میں عراق، شام اور حجاز کے لوگ شامل ہیں، ان کے درمیان قراتوں میں سخت اختلاف واقع ہو گیا ہے اور نوبت ایک دوسرے کی تکفیر تک پہنچ گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ بھی کتاب اللہ میں اسی طرح اختلاف نہ کرنے لگیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں کیا تھا۔'' حذیفہ کی باتیں سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی خطرے کی اہمیت محسوس کی اور لوگوں کو جمع کر کے یہ سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ لوگوں نے کہا ''آپ ہی بتایئے اس خطرے سے نبٹنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟'' انہوں نے فرمایا۔ ''میری رائے تو یہ ہے کہ لوگوں کو ایک قرات پر اکٹھا کر دیا جائے کیونکہ اگر آج مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تو آئندہ پیدا ہونے والا اختلاف موجودہ رونما ہونے والے اختلاف سے بہت زیادہ سخت ہو گا۔''

تمام صائب الرائے حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تجویز کی تائید کی۔ اس پر انہوں نے ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کو کہلا بھیجا کہ مصحف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کچھ روز کے لیے ہمیں دے دیجئے ہم اس سے نقلیں کرا کے مختلف علاقوں میں بھجوا دیں گے اور آپ کا مصحف آپ کو واپس کر دیں گے۔ چنانچہ ام المومنین نے وہ مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھجوا دیا اور انہوں نے اس کی نقلیں کرا کے اطراف مملکت میں پھیلا دیں۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کے باقی نسخوں اور تحریرات کو تلف کرنے کا حکم دے دیا۔

عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کا یہ اختلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دوربینی اور بالغ نظری کا زبردست ثبوت ہے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نقلیں اطراف مملکت میں پھیلا کر اور باقی تمام مضمون کو تلف کرنے کا حکم دے کر مسلمانوں کے درمیان قرات کا اختلاف مٹا دیا۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قرآن جمع کرنے کا حکم نہ دیتے تو یہ اختلاف وسیع تر ہو جاتا اور مسلمانوں کو ایسے فتنے کا سامنا کرنا پڑتا جو سیاسی فتنوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر

ہوتا۔ اسی امر کو دیکھتے ہوئے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا اور بالکل سچ فرمایا تھا:

"قرآن کریم جمع کرنے کے کام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں کیونکہ آپ وہ شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے قرآن جمع کیا۔"

ابن مسعود کی ناراضگی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرنے کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انشراح صدر ہوگیا تو انہوں نے زید بن ثابت کو قرآن کریم جمع کرنے کا مہتمم بالشان کام سپرد کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ناگوار گزرا اور انہوں نے کہا:

"مسلمانو! مجھے تو قرآن کریم لکھنے سے ہٹا دیا گیا ہے اور ایسے شخص کے سپرد کام کر دیا گیا ہے جو میرے اسلام لانے کے وقت ایک کافر کے صلب میں تھا۔"

ان کی مراد زید بن ثابت سے تھی جو عبداللہ بن مسعود کے اسلام لانے کے وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ابن مسعود نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں زید بن ثابت کو قرآن کریم لکھنے کا کام سپرد کیا تھا اور چند صحابہ کو بھی اس کام میں ان کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ ہوسکتا ہے عبداللہ بن مسعود نے دونوں مرتبہ ناراضگی کا اظہار کیا ہو چنانچہ قرطبی لکھتے ہیں۔

"حضرت ابوبکر انباری کہتے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے زید کو جمع قرآن کا کام سپرد کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان دونوں حضرات کو ابن مسعود سے کوئی پرخاش تھی۔ عبداللہ یقیناً زید سے زیادہ فاضل سابقون الاولون میں شامل اور دیگر خدمات دینیہ میں ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے تھے لیکن ان تمام خوبیوں اور فضیلتوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ جہاں تک حفظ قرآن مجید کا تعلق ہے ابن مسعود زید بن ثابت کے ہم پلہ نہ تھے۔"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ناراضگی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دونوں کے عہد میں ظاہر ہوئی۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ناراضگی یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا نہ کرتے تھے "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ستر سے زیادہ سورتیں سن کر یاد کیں لیکن زید بن ثابت اس وقت بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے پھرتے تھے۔" بلکہ عثمان ذ کے عہد میں انہوں نے اہل عراق کو ابھارنا شروع کیا تھا کہ وہ جمع قرآن کریم کے کام میں زید بن ثابت کی اعانت نہ کریں۔ وہ کہتے تھے۔ "میں نے اپنا مصحف چھپا لیا ہے اور جو بھی شخص اپنا مصحف چھپا سکتا ہے وہ ضرور چھپا لے۔"

ایک دن انہوں نے خطبہ دیا اور کہا: "اے لوگو! اپنا اپنا مصحف چھپا لو تم مجھ سے یہ امید کس طرح کر سکتے ہو کہ میں زید بن ثابت کی قرأت اختیار کروں گا حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ستر سے

زائد سورتیں سنی اور یاد کی ہیں لیکن زید بن ثابت اس وقت بچے تھے اور اپنے ہمجولیوں کے ساتھ مدینے کی گلیوں میں کھیلتے کودتے پھرتے تھے۔ واللہ! مجھ سے زیادہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ فلاں آیت کہاں اور کس موقع پر نازل ہوئی۔ مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا جاننے والا اور کوئی نہیں۔ لیکن میں تم پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کو جاننے والا موجود ہے تو میں سفر کی سخت صعوبتیں اٹھاؤں گا اور اس کے پاس ضرور پہنچوں گا۔"

پھر بھی بڑے بڑے صحابہ نے ابن مسعود کی ان باتوں کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہ دیکھا۔ کیونکہ ان سے فتنہ پھیلنے کا اندیشہ تھا جس سے اسلام نے بڑی سختی سے روکا ہے چنانچہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

ہم تو عبداللہ بن مسعود کو بہت نرم دل، نرم خو اور مشفق انسان سمجھتے تھے، نہ معلوم انہیں کیا ہو گیا اور وہ کیوں امراء پر طعن و تشنیع کرنے لگے ہیں؟

یہ صحیح ہے کہ عبداللہ بن مسعود بدری تھے اور زید بن ثابت بدری نہ تھے۔ ابن مسعود کو اسلام لانے میں یقیناً زید اور ان کے والد سے سبقت حاصل تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ ابن مسعود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سے زیادہ سورتیں سیکھی تھیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب تھے اور انہوں نے آپ کی وفات تک سارا قرآن آپ سے حاصل کر لیا تھا یہ خصوصیت ایسی تھی جو عبداللہ بن مسعود کو حاصل نہ تھی۔ قرطبی لکھتے ہیں: "یہ بات بالعموم مشہور ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے سارا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ سیکھا تھا بلکہ بعض حصے ایسے رہ گئے تھے جو انہوں نے آپ کی وفات کے بعد سیکھے۔ بعض ائمہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ عبداللہ بن مسعود پورا قرآن سیکھنے سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔"

یہ امر بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ابن مسعود کا مصحف قرآن کریم کی آخری دو سورتوں یعنی معوذتین سے خالی تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت کو جمع قرآن کریم کی ذمہ داری اس لیے سپرد کی تھی کہ وہ انہیں اس کام کا پوری طرح اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار سے یہ کام شروع کرنے کا ارادہ کیا تو زید بن ثابت کو بلا کر کہا تھا: "تم عقل مند نوجوان ہو۔ ہم تمہارے متعلق یہ خیال نہیں کر سکتے کہ تم کتاب اللہ میں تحریف و تبدل کر دو گے۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وحی لکھتے رہے ہو اس لیے اب ہم تمہیں قرآن کریم جمع کرنے کا کام سپرد کرتے ہیں۔"

قرطبی نے عبداللہ بن مسعود پر زید بن ثابت کی فضیلت کے بارے میں حضرت ابوبکر انباری کا جو قول اپنی کتاب میں درج کیا ہے اس کا کچھ حصہ ہم پہلے درج کر چکے ہیں بقیہ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

"حضرت ابوبکر انباری کہتے ہیں کہ زید، عبداللہ بن مسعود سے بڑھ کر قرآن کے حافظ تھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں انہیں سارا قرآن سکھا دیا تھا لیکن عبداللہ بن مسعود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی

میں آپ سے ستر کے قریب سورتیں سیکھ کر حفظ کی تھیں، باقی سورتیں انہوں نے آپ کی وفات کے بعد سیکھیں۔ اس لیے جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں قرآن کریم ختم کر کے اسے حفظ کر لیا ہو اسی شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن کریم جمع کرے اور اس کام کے لیے اسی کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہیے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید کو دیگر اصحاب رسول اللہ پر غالباً اس لیے بھی ترجیح دی کہ وہ نوجوان تھے اور زیادہ محنت سے کام کر سکتے تھے۔ نوجوانی کی وجہ سے ان میں اپنی رائے پر اڑ جانے اور اپنے علم و فضل کے جا و بیجا اظہار کا مادہ بھی نہ تھا۔ وہ صحابہ کرام کی باتوں کو غور سے سنتے تھے اور قرآن جمع کرتے ہوئے انتہائی تحقیق و تدقیق اور تفتیش سے کام لیتے تھے حالانکہ انہیں سارا قرآن کریم حفظ تھا۔ مزید برآں متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے سال جب آپ نے جبریل کے سامنے قرآن کریم کا دو بار دور کیا تھا تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ دوسرے دور کے وقت موجود تھے جو آپ کا آخری دور تھا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بھی اس عظیم الشان ذمہ داری کا پوری طرح احساس تھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جانب سے ان پر ڈالی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے قرآن مجید جمع کرنے کو کہا تو انہوں نے جواب دیا: "واللہ! اگر مجھے پہاڑ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے کا حکم دیا جاتا تو بھی یہ کام میرے لیے قرآن کریم جمع کرنے سے زیادہ سہل ہوتا۔"

وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور دیگر بڑے بڑے صحابہ کو قرآن کریم حفظ تھا۔ چار انصاری صحابہ نے (جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے) براہ راست رسول اللہ ﷺ سے قرآن کریم سیکھا تھا اور اسے باقاعدہ ترتیب دے کر لکھ رکھا تھا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مصحف ترتیب دے رکھا تھا۔ بعض لوگوں کے مصحف مکمل تھے اور بعض کے نامکمل۔ اس صورت میں کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ زید بن ثابت کی نگرانی اور ان کا شدید محاسبہ کرنے کے لیے موجود تھے، ان کا یہ عظیم الشان بوجھ سر پر اٹھا لینا یقیناً پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔

ان جلیل القدر صحابہ کے علاوہ سب سے بڑا محاسبہ کرنے والی ذات اس خدائے بزرگ و برتر کی تھی جس نے اپنے رسول ﷺ پر قرآن نازل فرمایا تھا اور جس کی نظر سے خفیف سے خفیف غلطی اور کوتاہی بھی مخفی نہ رہ سکتی تھی۔ اللہ کے محاسبے ہی کا ڈر تھا جس کے باعث زید بن ثابت نے انتہائی جاں کاہی سے کام لیا۔ ہڈیوں، چمڑوں، درختوں کی چھالوں، پتھروں وغیرہ پر لکھی ہوئی ایک ایک آیت جمع کرنے، ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنے اور انہیں ترتیباً ایک جگہ لکھنے میں انہوں نے حزم و احتیاط کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس طرح وہ مصحف تیار ہو گیا جس نے آئندہ قرآن کریم کا کوئی حصہ ضائع ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ کو قراتوں کا اختلاف مٹا کر تمام مسلمانوں کو ایک قرات پر جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے اسی مصحف کو سامنے رکھ کر اس کی نقلیں کرانے اور انہیں اطراف مملکت میں بھیج دینے کے احکام صادر کیے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ زید بن ثابت نے اپنے مصحف میں قرآنی آیات ان کی تاریخ نزول کے

لحاظ سے مرتب نہ کی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے میں آیات کی ترتیب خود مقرر فرما چکے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آپ مدینہ میں اتری ہوئی آیات مکی سورتوں میں شامل کر دیتے تھے۔ زید بن ثابت کے لیے اپنی طرف سے کوئی ترتیب قائم کرنا ناممکن تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مقرر فرمائی ہوئی ترتیب قائم رکھی اور اسی ترتیب کے مطابق قرآن مجید چمڑے کی کھالوں پر لکھ کر جمع کر دیا۔

زید کا طریق کار:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ زید بن ثابت نے جمع قرآن کریم کے سلسلے میں کیا طریق کار اختیار کیا اس کا جواب بلا تردد یہی دیا جا سکتا ہے کہ وہی علمی اور تحقیقی طریق کار جو آج کل کے محققین اختیار کرتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ زید نے جس قدر محنت اور جاں فشانی سے کام کیا موجودہ محققین میں سے کسی کو اس کا عشر عشیر بھی کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا تھا کہ جس جس شخص نے قرآن کریم حفظ کیا ہو یا اس کا کوئی حصہ لکھا ہو زید کو اس کی اطلاع دے اور لکھا ہوا حصہ ان کے سامنے پیش کرے۔ چنانچہ زید رضی اللہ عنہ کے پاس ہڈیوں، پتوں اور کھجور کے درخت کی چھالوں، چمڑوں اور پتھروں پر لکھی ہوئی آیات اور سورتیں کثیر تعداد میں جمع ہونے لگیں۔

جب آیات اور سورتوں کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام مکمل ہو گیا تو زید بن ثابت نے ان کی جانچ پڑتال کی اور ترتیب کا کام شروع کیا۔ کوئی آیت اس وقت تک قبول نہ کرتے تھے جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لیتے تھے کہ واقعی یہ آیت اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ ذیل کی مثال سے زید کی غایت درجہ احتیاط کا بہ خوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت السابقون الاولون من المهاجرين و الانصار الذين اتبعوهم باحسان، پڑھا یعنی انصار اور الذین کے درمیان سے واؤ حذف کر دی۔ زید بن ثابت نے سن کر کہا کہ اصل آیت "والذين اتبعوهم باحسان" ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطمئن نہ ہوئے۔ آخر انہوں نے ابی بن کعب کو بلایا اور ان سے آیت کے متعلق دریافت کیا۔ ابی نے زید کی قرات کی تصدیق کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل سے ہر قسم کا شک و شبہ دور کرنے کے لیے یہ بھی کہا "واللہ! یہ آیت رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس وقت پڑھائی تھی جب آپ بازار میں گندم کی خرید و فروخت میں مشغول تھے۔" اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور کہا کہ واقعی زید ہی کی قرات صحیح ہے۔

صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف نہیں بلکہ جب بھی کسی صحابی سے زید بن ثابت کو قرات میں اختلاف ہوتا وہ تحقیق کی خاطر یہی طریقہ استعمال کرتے تھے اور صحیح قرات کا تعین کرنے کے لیے دیگر صحابہ شہادتیں طلب کرتے تھے۔ اگر پتوں اور ہڈیوں وغیرہ پر لکھی ہوئی آیات میں اختلاف ہوتا تھا تو بھی جب تک ان کی صحت کے بارے میں اچھی طرح اطمینان نہ کر لیتے تھے آگے نہ بڑھتے تھے اور اس بارے میں اپنے حافظے پر

بھی اعتماد نہ کرتے تھے حالانکہ انہوں نے قرآن کریم حفظ کر رکھا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ قبل جبریل کے سامنے قرآن مجید کا جو آخری دور کیا تھا اس وقت وہ بھی موجود تھے السابقون الاولون والی آیت میں محض ایک واؤ پر اختلاف کرنے کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کی تحقیق و تدقیق میں زید کا پایہ کس قدر بلند تھا اور جو کام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے سپرد کیا تھا وہ انہوں نے کس قدر محنت و جانفشانی سے انجام دیا۔

قرآن کریم جمع کرنے میں زید بن ثابت نے جس شدید محنت سے کام لیا اس نے آئندہ کے لیے کلام اللہ کو ہر قسم کی تحریفات سے پاک کر دیا، چنانچہ تمام منصف مزاج مستشرقین کو اس امر کا اعتراف ہے کہ موجودہ قرآن بعینہ وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا اور جو زید بن ثابت نے انتہائی محنت و مشقت سے جمع کیا تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں:

''ہمیں علم ہے دنیا بھر میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں جو قرآن کی طرح کامل بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔'' (یہ درست نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سورتوں کی ترتیب مقرر نہ فرمائی تھی اور موجودہ ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کی قائم کردہ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی رسول اللہ ﷺ نے خود ہی مقرر فرمادی تھی۔ دیگر شواہد کے علاوہ ابوداؤد اور مسند احمد بن حنبل کی مندرجہ ذیل حدیث بھی اس کا بین ثبوت ہے: ''اوس بن ابی اوس حذیفہ ثقفی کہتے ہیں کہ ثقیف کے اس وفد میں، جو اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ آیا تھا، میں بھی موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کہا کہ مجھے قرآن شریف کی منزل پوری کرنی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ جب تک وہ ختم نہ کرلوں باہر نہ نکلوں۔ اس پر ہم نے صحابہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے قرآن کریم کو کس طرح حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: تین سورتوں، پانچ سورتوں، سات سورتوں، نو سورتوں، گیارہ سورتوں، تیرہ سورتوں اور ق سے شروع ہو کر آخر قرآن تک جسے مفصل کہتے ہیں۔'' مذکورہ بالا حدیث سے سورتوں کی ترتیب کا وجود صریحاً ثابت ہے کیونکہ وہ منزلیں جن میں اس حدیث کی رو سے قرآن کریم کے حصے کیے ہوئے ہیں، آج تک مسلمانوں میں مروج ہیں۔ ان سات حصوں کو اصطلاح میں سات منزلیں کہتے ہیں اور ہر ایک منزل میں اتنی ہی سورتیں ہیں جتنی اس حدیث میں مذکور ہیں۔ اسی طرح حدیث مذکور کے مطابق ساتویں منزل سورۃ ق سے شروع ہوتی ہے پہلی چھ منزلوں میں کل اڑتالیس سورتیں ہیں اور یہی وہ تعداد ہے جو مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہے۔ (مترجم))

سورتوں کی ترتیب:

زید بن ثابت نے آیات کی صحت اور ان کی ترتیب میں تو کمال جان فشانی سے کام لیا لیکن سورتوں کی ترتیب و تنسیق پر کوئی خاص توجہ نہ کی۔ سورتوں کی موجودہ صورت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کی قائم کردہ ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن، قرطبی، جلد اول صفحہ ۵۲)

اس بارے میں مختلف روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب کا کام رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض سورتوں کی ترتیب تو متعین فرما دی تھی لیکن باقی سورتوں کو غیر مترتب حالت میں چھوڑ دیا تھا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے تمام سورتوں کا نظام اور ان کی ترتیب اپنی زندگی ہی میں متعین فرما دی تھی۔ ابن وہب اپنی جامع میں لکھتے ہیں: ''ربیعہ سے کسی شخص نے پوچھا کہ سورۂ بقرہ اور آل حضرت عمران کو دوسری سورتوں پر مقدم کیوں رکھا گیا حالانکہ ان سے پہلے ۸۰ سے زیادہ سورتیں نازل ہو چکی تھیں اور یہ دونوں سورتیں بھی مکہ میں نہیں بلکہ مدینہ میں نازل ہوئیں؟ ربیعہ نے جواب دیا بے شک ان دونوں سورتوں کو مقدم رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم اسی ترتیب سے ان لوگوں کے سامنے پڑھا جاتا تھا جنہوں نے اسے جمع کیا، لیکن وہ خاموش رہے اور اس بارے میں کچھ نہیں کہا اور اسی ترتیب پر ان کا اجماع ہوا۔ اس لیے ہمیں اس بارے میں سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔''

بعض اہل علم کہتے ہیں: ''قرآن کریم کی سورتوں کی جو ترتیب آج کل کے مصحفوں میں پائی جاتی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی مقرر کردہ ہے۔ باقی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحفوں میں جو اختلاف پایا جاتا تھا وہ اس لیے تھا کہ آخری بار جبریل کے سامنے قرآن کریم پڑھنے سے پیشتر رسول اللہ ﷺ نے سورتوں کی ترتیب مقرر نہ فرمائی تھی۔ لیکن اس واقعے کے بعد آپ نے صریحاً صحابہ کو اس کے متعلق ہدایات دے دی تھیں۔'' (تاریخ القرآن از ابو عبداللہ زنجانی، صفحہ ۴۸ تا ۵۹)

بعض صحابہ اس رائے کی مخالفت کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی مقرر کردہ نہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس نے اپنے مصحفوں کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جمع کیا تھا۔ اگر آپ نے اپنی زندگی میں سورتوں کی ترتیب فرمائی ہوتی تو یقیناً حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابن عباس اسے ملحوظ خاطر رکھتے اور اپنے مصحفوں کو رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق ترتیب دیتے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن جمع کرتے ہوئے سورتوں کو کو بالترتیب نہیں لکھا تھا۔ یہ ترتیب کلیتہً صحابہ کے اجتہاد سے عمل میں آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق خود کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ (جن میں اس حدیث کی رو سے قرآن کریم کے حصے کئے ہوئے ہیں، آج تک مسلمانوں میں مروج ہیں۔ ان سات حصوں کو اصطلاح میں سات منزلیں کہتے ہیں اور ہر ایک منزل میں اتنی ہی سورتیں ہیں جتنی اس حدیث میں مذکور کے مطابق ساتویں منزل سورۃ ق سے شروع ہوتی ہے پہلی چھ منزلوں میں کل اڑتالیس سورتیں ہیں اور یہی وہ تعداد ہے جو مذکورہ بالا حدیث ہے۔ (مترجم))

میری رائے بھی یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بہ طور خود سورتوں کی ترتیب مقرر نہیں فرمائی بلکہ یہ کام امت کے لیے چھوڑ دیا۔ چنانچہ ابن عباس سے اسی سلسلے میں ایک روایت مروی ہے جس میں وہ کہتے ہیں: ''میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نے انفال اور براۃ کی سورتوں کو، جو بالترتیب ۸۰ اور دو سو آیات پر مشتمل ہیں، اس طرح کیوں ملایا ہے کہ ان کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی اور اس طرح ان

دونوں سورتوں کو سات لمبی سورتوں (سبع طوال) میں شامل کر دیا ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض دفعہ ایک ہی وقت میں کئی سورتوں کی آیات نازل ہوتی تھیں۔ جب آپ پر کوئی وحی نازل ہوتی تو آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا لیتے اور اسے حکم دیتے کہ یہ آیت فلاں سورت کے فلاں موقع پر لکھ دو۔ سورت انفال مدنی زندگی کے اوائل میں آپ پر نازل ہوئی تھی اور سورت براَت کا نزول آخری زمانے میں ہوا۔ چونکہ ان دونوں سورتوں کا مضمون آپس میں ملتا جلتا تھا اس لیے میں نے یہ خیال کیا کہ سورت براَت سورت انفال ہی کا حصہ ہے۔ چونکہ آپ نے ہمیں صریحاً نہ فرمایا تھا کہ یہ سورت کس سورت کا حصہ ہے اس لیے میں نے دونوں سورتیں اکٹھی کر دیں اور ان دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ لکھا۔ اس طرح انہیں سات طویل سورتوں میں شامل کر دیا۔" ((اس حدیث سے قطعاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترتیب قرآنی میں کوئی دخل تھا بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ عثمان رضی اللہ عنہ کی غایت درجہ احتیاط کا بھی پتا چلتا ہے۔ حالانکہ تمام سورتوں کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کا عام قاعدہ تھا مگر اس سورت کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پا کر اپنی رائے کو اتنا دخل بھی نہ دیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی اس پر لکھ دیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ابن عباس نے عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کی وجہ دریافت کی تھی کہ انفال اور براَت کو ملا کر کیوں رکھا گیا؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ آیتوں اور سورتوں کے نزول کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود انہیں خاص خاص مقامات پر رکھواتے تھے جس کا مطلب صاف ہے کہ آپ ہی کی ہدایت سے یہ دونوں بھی اس طرح رکھی گئیں۔ اس کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ میرا خیال یہ تھا کہ، انفال اور براَت ایک دوسری ہی کا حصہ ہیں مگر آپ نے چونکہ ایسا نہ فرمایا اس لیے میں انہیں ایک دوسری کا حصہ نہیں کہتا۔ یہ روایت ایک مضبوط اور زبردست شہادت ہے اس بات پر کہ آیتوں اور سورتوں کی تمام ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی اور کچھ آپ نے کیا یا فرمایا اس سے صحابہ نے سرمو انحراف نہ کیا۔ مترجم))

اصل میں سورتوں کی ترتیب کا تعلق ہمارے اس باب سے نہ تھا۔ اس کا ذکر ضمناً قرطبی کے اس قول کی وضاحت کے سلسلے میں آ گیا کہ "زید بن ثابت نے قرآن کریم کو سخت محنت و مشقت کے بعد جمع کیا تھا لیکن اس کی سورتیں آپ کی مرتب کی ہوئی نہیں۔"

جمع قرآن کی تکمیل:

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا زید نے سارا قرآن ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع کر لیا تھا یا اس کام کی تکمیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئی۔ اس کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ بخاری کی ایک روایت پہلے گزر چکی ہے جس میں ذکر ہے کہ وہ اوراق جن میں زید نے قرآن جمع کیا تھا، حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے۔ان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد وہ ان کی بیٹی ام المومنین حفصہ کی تحویل میں آگئے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کا کام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مکمل ہو چکا تھا لیکن بعض روایتیں اس قسم کی بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تکمیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی۔

یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہے کہ کون سی روایت صحیح ہے۔البتہ دونوں قسم کی روایتوں میں اس طرح تطبیق دی جاسکتی ہے کہ زید بن ثابت نے قرآن کریم کا اکثر حصہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں جمع کرلیا تھا۔جن اوراق پر وہ قرآن کریم لکھتے تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیتے جاتے تھے۔ان کی وفات کے بعد وہ اوراق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس منگوا لیے۔زید نے جب ان کے عہد میں قرآن کریم کی تکمیل کی تو بقیہ اوراق بھی انہیں کے سپرد کردیئے۔اس طرح قرآن کریم کے مکمل اوراق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہو گئے اور یہی اوراق سامنے رکھ کر عثمان رضی اللہ عنہ نے دیگر مصاحف تیار کرائے۔آج ہم جس قرآن کی تلاوت کرتے ہیں وہ بعینہ وہی ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت کے ذریعے سے جمع کرایا تھا اور یہی قرآن انہیں الفاظ اور اسی ترتیب سے قیامت تک پڑھا جائے گا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا کارنامہ:

''اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحمت نازل فرمائے۔قرآن کریم جمع کرنے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں۔''

یہ تھے وہ الفاظ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان فرمائے اور انہیں الفاظ پر ہر مسلمان کا یقین و ایمان ہے۔اس کتاب کی تصنیف کے وقت دل میں کئی مرتبہ یہ سوال پیدا ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کون سا کارنامہ سب سے زیادہ عظیم الشان ہے۔مرتدین کی سرکوبی اور سرزمین عرب سے ارتداد کا مکمل خاتمہ؟ عراق اور شام کی فتوحات جو اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ثابت ہوئیں جس کی بدولت انسان کو تہذیب و تمدن سے آگاہی حاصل ہوئی؟ یا کلام اللہ کو جمع کرنے کا کام جو ایک امی نبی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور جس نے اپنی روشنی سے دنیا بھر کو منور کردیا۔جب بھی یہ سوال ذہن میں آیا یہ جواب دینے میں قطعاً تردد محسوس نہ ہوا کہ بلاشبہ جمع قرآن کریم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ ہے اور اسی سے اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ برکت نصیب ہوئی۔جزیرہ عرب کی حالت میں آہستہ آہستہ اضمحلال پیدا ہوتا گیا اور جو قوت و شوکت اسے خلافت راشدہ اور عہد بنی امیہ میں نصیب ہوئی تھی بنی عباس کے زمانے میں وہ مفقود ہوگئی۔اسلامی سلطنت پر بھی آہستہ آہستہ زوال آتا گیا اور مسلمان پستی کی حالت میں گرتے چلے گئے حتیٰ کہ اسلامی سلطنت کا نام بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہونا شروع ہوگیا۔لوگ عرب کو بھی بھولنے لگے اور اگر اللہ نے مسلمانوں کے لیے حج کرنا فرض قرار نہ دیا ہوتا تو یقیناً ایک دن ایسا بھی آتا کہ عرب کا شمار دنیا کے گمنام گوشوں

میں ہونے لگتا۔ لیکن کتاب اللہ ابتدائے نزول سے آج تک زندہ موجود ہے اور جب تک دنیا میں ایک بھی انسان کا وجود باقی ہے کتاب اللہ زندہ اور برقرار رہے گی۔

اس بیان کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں جنگہائے مرتدین اور اسلامی سلطنت کے قیام کی اہمیت سے انکار ہے۔ بلاشبہ یہ دونوں کام انتہائی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مرتدین کی سرکوبی کے سوا اور کوئی کام نہ کرتے تو بھی یہ ایک کارنامہ ان کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔ اسی طرح اگر وہ اسلامی سلطنت کے قواعد وضوابط مرتب کرنے کے سوا اور کوئی کام ہاتھ میں نہ لیتے تو بھی یہ کارنامہ ان کا نام تاریخ کے صفحات پر تاابد زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔ لیکن جب ان عظیم الشان کارناموں کے ساتھ جمع قرآن کا مہتم بالشان کارنامہ بھی ملا لیا جائے جو اپنی شان اور افادیت میں ان دونوں کارناموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مادر گیتی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا فرزند پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے جن کی مخلصانہ مساعی اور پیہم جدوجہد کے نتیجے میں آج بھی ہمیں قرآن کی نعمت عظمیٰ اسی طرح میسر ہے جس طرح چودہ سو برس پیشتر صحابہ کرام کو میسر تھی۔

۱۷

خلافت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

خلافت کا تصور:

بیعت خلافت کے بعد ایک شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یا خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا۔ انہوں نے فوراً اسے ٹوکا اور فرمایا: ''میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفہ رسول اللہ ﷺ ہوں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلا ہوا یہ فقرہ مورخین نے ان کے کمال انکسار اور فروتنی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ فقرہ گہرے غور وخوض کا مستحق ہے کیونکہ اس سے نہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انکسار ظاہر ہوتا ہے بلکہ حکومت کا وہ تصور بھی عیاں ہو جاتا ہے جو صدر اول کے مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد سے پہلے لاتعداد صدیاں گزر گئیں اور آپ کے بعد بھی سینکڑوں سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل اور صدہا صدیوں پر محیط زمانے میں ہزاروں بادشاہ اور حکام گزرے ہیں جن کے متعلق خود ان کا اور ان کی محکوم رعایا کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس سرزمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس لیے جو تقدیس انہیں حاصل ہے وہ روئے زمین پر اور کسی شخص کو حاصل نہیں۔ فراعنہ مصر کا حال کسے معلوم نہیں۔ انہیں فراعنہ میں سے ایک فرعون تو یہاں تک بڑھ گیا کہ اس نے ''انا ربکم الاعلی'' (میں تمہارا بزرگ و برتر پروردگار ہوں) کا نعرہ لگا کر الوہیت تک کا دعویٰ کر دیا۔ اس زمانے میں فی الحقیقت مصریوں کے سواد اعظم کا یہی خیال تھا کہ ان کے بادشاہوں کو ربوبیت کی صفات حاصل ہیں۔ رہی سہی کسر ان کے مذہبی پیشواؤں نے پوری کر دی اور انہوں نے اپنے متبعین کو بادشاہوں کی تقدیس کا یقین دلانا شروع کر دیا۔ اشور، ایران، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کا بھی یہی حال تھا اور وہاں کے اکثر بادشاہ اپنے آپ کو زمین پر خدا کا نائب اور ظل اللہ خیال کرتے تھے اور یہی حال ان کی رعایا کا تھا۔

ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کے اندر بھی پادریوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے بادشاہوں کے اشارے پر انہیں تقدیس و احترام کا بلند ترین [illegible] پادریوں کے دعوے

کے مطابق بادشاہوں کو یہ مرتبہ خدا کی طرف سے تفویض ہوا تھا۔ اس بناء پر ان کے اقتدار میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ وہ زمین پر خدا کے نائب سمجھے جانے لگے۔ ان کی زبانوں سے نکلا ہوا ہر حرف بمنزلہ وحی خیال کیا جانے لگا۔ ان کا حکم خدا کی مانند سمجھا جانے لگا جس سے انحراف ممکن نہ تھا۔ پندرھویں صدی اور بعض اقوام میں سترھویں صدی تک یہی حال رہا۔ اگرچہ اس وقت یورپ نے علم و ہنر اور تہذیب و ثقافت میں خاصی ترقی کرلی تھی لیکن اندھی عقیدت کا جو پردہ لوگوں کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا وہ اس وقت تک نہ ہٹ سکا جب تک آزادی ضمیر اور مساوات کے علم برداروں نے ان ناروا پابندیوں اور انسانی ضمیر کو کچل دینے والے عقائد کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کردیا اور ہزاروں لاکھوں جانیں خانہ جنگیوں میں ضائع نہ ہوگئیں۔

بادشاہوں کے لیے تقدیس و احترام کا یہ جذبہ اقوام عالم میں صدیوں تک کارفرما رہا اور یورپ نے تو قریب کے زمانے میں اس سے نجات حاصل کی ہے لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بے نفسی اور انکساری کا عالم دیکھئے کہ جب ایک شخص انہیں خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارتا ہے تو وہ فوراً یہ کہہ کر اسے ٹوک دیتے ہیں کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔

خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے بھی کسی شان و شوکت اور بڑائی کا اظہار مطلوب نہ تھا بلکہ ان کی مراد صرف یہ تھی کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی قیادت اور امور سلطنت کی انجام دہی کے معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان امور کی جانشینی کا خیال بھی نہ آسکتا تھا جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تھے۔ اسی امر کو واضح کرتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں فرمایا تھا: "مجھے یہ ذمہ داری (امر خلافت) تفویض تو کردی گئی ہے لیکن میں اپنے آپ کو اس بار گراں اٹھانے کے قابل نہیں پاتا۔ واللہ! میری خواہش تھی کہ تم میں سے کوئی شخص اسے اٹھائے، دیکھو! اگر تم میں سے کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ میں بھی وہیں کام کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے تو یہ خیال خام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اللہ کے بندے تھے لیکن اللہ نے انہیں نبوت کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا اور ہر قسم کے گناہوں سے منزہ قرار دیا تھا۔ میں بھی اللہ کا بندہ ہوں مگر تم میں کسی بھی شخص سے بہتر نہیں۔ تم میرے کاموں کی نگہداشت کرو، اگر دیکھو کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بنائے ہوئے راستے پر جارہا ہوں تو میری اطاعت کرو لیکن اگر مجھے صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا پاؤ تو ٹوک کر سیدھی راہ پر لگادو۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی قیادت اور سلطنت کی نگہداشت کا کام مسلمانوں کے انتخاب اور ان کی رضامندی سے اپنے ذمے لیا تھا۔ اللہ نے انہیں اس طرح خلیفہ بنا کر نہ بھیجا تھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا تھا۔ اگر انہیں دوسرے مسلمانوں پر فضیلت تھی اور یقیناً تھی تو صرف تقویٰ کے سبب، خلافت کی وجہ سے نہیں۔ اسی لیے وہ لوگوں کو صرف وہی حکم دینے کے مجاز تھے جو اللہ کی نازل کردہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیمات کے مطابق ہوں۔ احکام الٰہی اور ارشادات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف نہ وہ کوئی حکم دے سکتے تھے نہ اسے منوا سکتے تھے۔ چنانچہ خطبہ اولیٰ میں انہوں نے یہ

فقرہ کہہ کر اس معاملے کو بالکل صاف کر دیا تھا: ”میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں لیکن اگر میں اس کے احکام کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لقب:

”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے لیکن انہوں نے اپنا لقب خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ رکھا بلکہ اس بارے میں دوسرے لوگوں سے استفسار کیا۔ بعض لوگوں نے امیر المومنین کا لقب تجویز کیا جو انہوں نے پسند فرما کر اختیار کر لیا اور آئندہ تمام خلفاء کو امیر المومنین ہی کہا جانے لگا۔ خلیفہ کا لقب ترک کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکرار سے بچنا چاہتے تھے۔ بعد میں تو یہ تکرار عجیب وغریب صورت اختیار کر لیتی کیونکہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لقب، خلیفہ خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا تو عثمان کا لقب ”خلیفہ، خلیفہ، خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا چاہیے تھا اور علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ، خلیفہ، خلیفہ، خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے یاد کرنا پڑتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب چھوڑ کر امیر المومنین کا لقب اختیار کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔“ کے فقرے میں خلیفہ کا لفظ اس کے لغوی معنی میں لیا تھا اور مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ ان کی حیثیت امور سلطنت کی انجام دہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کی ہے۔ اگر خلیفہ کے لقب سے اس کے لغوی معنی کے سوا کوئی اور معنی مراد لیے جاتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ لفظ چھوڑ کر ”امیر المومنین“ کا لفظ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

امیر المومنین کا لقب اختیار کرنے کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشاہدے میں یہ بات آ چکی تھی کہ اسلامی نظام حکومت نے جزیرہ عرب اور دوسرے مفتوحہ علاقے میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا اور یہ انقلاب اس سرعت سے برپا ہوا تھا کہ لوگوں کی نظریں حیرت زدہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن کتاب اللہ اور سنت نبوی میں نظام حکومت کے لیے تفصیلی احکام موجود نہ تھے۔ البتہ قرآن کریم میں شوریٰ کو نظام حکومت کے لیے بہ طور بنیاد ضرور بیان کیا گیا تھا۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا ”وشاورھم فی الامر (اے نبی! دنیوی معاملات میں لوگوں سے مشورہ کر لیا کرو۔“ اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا: ”وامرھم شوریٰ بینھم“ (مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں) سیاسی اور ملکی امور کی انجام دہی کے لیے چونکہ اللہ کی طرف سے تفصیلی احکام موجود نہ تھے اور یہ سارا کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورے اور اپنی صواب دید سے کرنا تھا اس لیے ان کی حیثیت ایک سپہ سالار اور امیر لشکر کی تھی جسے جنگ کے سلسلے میں بادشاہ کی طرف سے اصولی ہدایات تو مل جاتی ہیں لیکن لشکر کی صف بندی اور جنگ کے جملہ امور کی نگہداشت خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امور سلطنت کا سارا انتظام وقتی صورت حال کے مطابق شرعی حدود میں رہتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو سامنے رکھتے ہوئے خود ہی کرنا تھا۔ وہ پابند نہ تھے کہ اگر کسی معاملے کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کوئی خاص راہ عمل اختیار کی تھی تو وہ بھی لازماً وہی اختیار کریں۔ اس لیے انہوں نے خلیفہ،

خلیفہ رسول اللہ ﷺ کے بجائے امیر المومنین کا لقب اختیار کرنا پسند فرمایا۔

اس انقلاب پر نظر ڈالنے سے، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انتہائی قلیل عرصے میں پیدا کر دیا تھا، یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ سختی اور نرمی کے مواقع علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور اس وقت تک کوئی کام صحیح طور پر نہیں ہو سکتا جب تک سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی سے کام نہ لیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظیم الشان کامیابی اور ان کی بے پناہ قوت کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ ان دونوں خصلتوں کو برتنے کے صحیح مواقع جانتے تھے۔

عرب کا سیاسی نظام:

رسول اللہ ﷺ کے عہد تک عرب بے شمار مذاہب کا گہوارہ تھا اس کے شمالی اور جنوبی حصے ایک دوسرے سے بالکل کٹے ہوئے تھے اور ایک حصے کے لوگ دوسرے حصے کے باشندوں سے بالکل مختلف تھے۔ یمن ایرانیوں کی عمل داری میں شامل تھا اور وہاں مسیحیت اور بت پرستی پہلو بہ پہلو قائم تھیں۔ وہاں کے لوگ حمیری زبان بولتے تھے جو تلفظ کے اعتبار سے قریش کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ مزید برآں یمن صدیوں سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں حجاز کے لوگوں پر بدویت غالب تھی۔ اس میں صرف تین شہر تھے: مکہ، یثرب اور طائف۔ ان تینوں شہروں کا بھی آپس میں اس کے سوا اور کوئی علاقہ نہ تھا کہ یہ حجاز میں واقع تھے اور ان کے باشندوں کی باہم رشتہ داریاں تھیں۔ ویسے ان شہروں کا نظام قبائل کی طرح ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھا۔ جہاں تک مذاہب کا تعلق تھا، مکہ میں بت پرستی زوروں پر تھی لیکن عیسائیت کو بھی وہاں نفوذ حاصل تھا۔ مدینہ میں یہودی قبائل گو بہت طاقتور تھے لیکن اکثریت بت پرستوں کی تھی۔ جب جزیرہ نما عرب میں توحید کی صدا گونجی اور خدا نے چاہا کہ دین اسلام عرب کے اطراف و جوانب میں پھیل جائے تو اس نے اس کے لیے سامان بھی ویسے ہی مہیا کر دیے۔ یمن کو ایرانیوں کی غلامی سے چھٹکارا مل گیا اور وہ غیر ملکی اثرات سے بالکل آزاد ہو گیا۔ فتح مکہ کے بعد حجاز میں تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ حجاز کے بعد دوسرے عرب علاقوں کی باری آئی اور تھوڑے ہی عرصے میں سارا جزیرہ نمائے عرب حلقہ بہ گوش اسلام ہو کر ایک ہی مسلک میں منسلک ہو گیا۔ گو رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آپ کی تعلیمات پر ایمان لانے میں کل عرب متحد تھا مگر تمام قبائل اپنی اپنی جگہ آزاد و خود مختار تھے۔ البتہ ارکان اسلام میں ایک اہم رکن کی بجا آوری کے سلسلے میں انہیں زکوٰۃ ضرور مدینہ بھیجنی پڑتی تھی۔

یہ دینی وحدت عرب کے سیاسی نظام میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مدینہ کے نواحی قبائل نے رسول اللہ ﷺ سے دوستی کے معاہدے کر رکھے تھے۔ جب آپ مکہ پر چڑھائی کرنے کے لیے روانہ ہوئے تو ان معاہدات کے مطابق قبائل سلیم، مزینہ اور غطفان بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو کر مکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ فتح مکہ کے بعد جب وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے بھی اسلامی

غزوات میں شرکت کی خواہش ظاہر کی چنانچہ حنین اور طائف کے غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے لشکر میں اہل مکہ بھی شامل تھے۔ بعد ازاں جب اسلام کثرت سے قبائل عرب میں پھیل گیا تو آپ نے نو مسلموں کو قرآن سکھانے اور دینی تعلیم دینے کے لیے اپنے عمال کو اطراف و جوانب میں بھیجنا شروع کیا۔ ان عمال کے سپرد جہاں لوگوں کو قرآن سکھانے اور دینی تعلیم دینے کا کام تھا وہاں یہ ذمہ داری بھی تھی کہ صاحب نصاب لوگوں سے زکوٰۃ اکٹھی کر کے مدینہ بھیجا کریں یا اسی علاقے کے فقراء اور غرباء میں تقسیم کر دیا کریں۔ طبعی امر تھا کہ اس دینی انقلاب کے نتیجے میں، جو ایک قلیل مدت میں عرب کے اطراف و جوانب میں برپا ہو چکا تھا ایک سیاسی انقلاب بھی برپا ہوتا اور جہاں دینی اور مذہبی لحاظ سے عرب ایک وحدت میں تبدیل ہو چکا تھا، سیاسی اور انتظامی لحاظ سے بھی ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتا۔ لیکن اہل عرب اس سیاسی انقلاب سے بالکل نا آشنا تھے۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد انہیں آپ کے جانشین کی اطاعت بھی قبول کرنی ہوگی۔ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ تعلیمات، جو خود رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے انہیں ملی ہیں وہ تو یقیناً ان کے دلوں میں راسخ رہیں گی اور وہ بدستور احکام اسلام پر عمل کرتے رہیں گے لیکن سیاسی اعتبار سے وہ بالکل خود مختار ہوں گے اور ہر قبیلہ پہلے کی طرح آزاد اور بیرونی حکومت کے اثرات سے بالکل پاک ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں جو فتنہ برپا ہوا اور جس کے نتیجے میں جنگہائے مرتدین وقوع میں آئیں اس کا سبب خود مختاری کا یہی جذبہ تھا جو بیشتر عرب قبائل کے دلوں میں راہ پا رہا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ عرب سیاسی لحاظ سے اسی حالت پر برقرار رہے جس حالت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تھا لیکن قبائل عرب چاہتے تھے کہ انہیں ان کی گم گشتہ خود مختاری اور آزادی واپس مل جانی چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس ایمان کی بدولت، جو انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر تھا، مصر تھے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والا ہر شخص وہ تمام ذمہ داریاں ادا کرے جو بحیثیت ایک مسلمان کے اس پر عائد ہوتی ہیں اور تمام وہ اموال جو وہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مدینہ بھیجا کرتے تھے، بدستور بھیجیں۔ لیکن آزادی کے دلدادہ قبائل رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کسی اور شخص کو اپنا حاکم مطلق ماننے، حکومت میں مہاجرین و انصار کا حق فائق سمجھنے اور اموال زکوٰۃ مدینہ بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ صاف کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات اور تھی۔ وہ اللہ کے نبی تھے، ان پر وحی اترتی تھی اور بندوں پر ان کی اطاعت فرض تھی لیکن ان کے بعد کسی قبیلے یا کسی فرد کا یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے قبائل کو آزادی سے محروم کر کے ان پر حکومت کرے۔

مہاجرین و انصار اور خلافت:

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے باعث عرب میں جو حالات رونما ہو رہے تھے ان کا ہمیں ایک اور جہت سے بھی جائزہ لینا ہے یعنی مہاجرین اور انصار مسئلہ خلافت کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے نظریات کی وجہ سے اس وقت کے سیاسی نظام میں کیا انقلاب رونما ہوا؟ یہ حقیقت مسلم ہے کہ اپنے تقدم اسلام اور رسول

اللہ ﷺ کے دفاع میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے مہاجرین اور انصار صرف اپنے آپ کو سلطنت اور حکومت کا مستحق سمجھتے تھے حتیٰ کہ اپنے ان رشتہ داروں کو بھی، جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو چکے تھے، یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مرتدین کے فتنے کے بعد، جسے فرو کرنے میں اہل مکہ نے نمایاں حصہ لیا تھا، جب شام کی جانب پیش قدمی کرنے کا سوال درپیش ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ سے بھی اس نئی مہم کے متعلق مشورہ کرنا چاہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سہیل بن حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے درمیان تو اچھا خاصا مباحثہ بھی ہوا۔ سہیل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روش پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

''ہم تمہارے مسلمان بھائی ہیں۔ ہمارا اور تمہارا حسب نسب بھی ایک ہی ہے۔ اس کے باوجود تمھیں رشتہ داری کا مطلق پاس نہیں اور تم ہمارے حقوق غصب کرنے پر مصر ہو۔ یہ درست ہے کہ اسلام قبول کرنے میں تمھیں ہم پر سبقت حاصل ہے لیکن محض اس وجہ سے حکومت اور سلطنت کے معاملات میں تمھیں دوسرے لوگوں پر فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی۔''

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بات پر مصر رہے اور واشگاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کہ اولین مسلمانوں اور اسلام کی راہ میں قربانیاں دینے والوں ہی کو مجلس شوریٰ میں نمائندگی دی جا سکتی ہے اور وہی نظام حکومت چلانے اور سلطنت کی دیکھ بھال کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اپنے ان رشتہ داروں اور ہم وطنوں کے بارے میں جو، فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے حامیوں کے یہ خیالات تھے تو دیگر عرب قبائل کے بارے میں ان کی طرف سے جتنے بھی تند و تیز احساسات کا اظہار ہوتا کم تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اہل مکہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس سے نبٹنے اور نظام سلطنت چلانے کے لیے اگر مہاجرین اور انصار نے باہمی مشورے سے ایک راہ اختیار کر لی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر لیا تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن انہیں ہمیشہ کے لیے یہ حق نہیں دیا جا سکتا۔ اہل مکہ اور اہل طائف قبول اسلام اور مرتدین سے جنگ کرنے میں ان کے برابر کے شریک ہیں اس لیے امور سلطنت اور مشورے میں انہیں مناسب نمائندگی ضرور ملنی چاہیے اور محض اس وجہ سے کہ وہ نافہمی کی بنا پر ابتداء میں اسلام نہ لا سکے، انہیں ان کے بنیادی حقوق سے محروم نہ کرنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی خیال تھا کہ جب دیگر اسلامی قبائل نے اہل مدینہ سے مل کر جنگ ہائے مرتدین اور فتوحات عراق میں حصہ لیا ہے تو انہیں امور سلطنت میں شریک ہونے سے کیونکر روکا جا سکتا ہے؟ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی مشورہ اور امور سلطنت میں اسی طرح شریک کیا جائے جس طرح اہل مدینہ اور سابقون الاولون مسلمانوں کو کیا جاتا ہے۔ اسی لیے جب شام پر چڑھائی کا مرحلہ درپیش ہوا تو انہوں نے اس بارے میں اہل مکہ سے بھی صلاح مشورہ کیا اور ان سے امداد کے طلب گار ہوئے۔ مال غنیمت اور وظائف کی تقسیم کے وقت بھی انہوں نے یہی اصول پیش نظر رکھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ مدینہ کے قریب ایک مفتوحہ زمین میں سونے کی کان برآمد ہوئی اور اس کا سونا مدینہ آنا شروع ہوا تو انہوں نے یہ سونا تمام مسلمانوں میں بہ حصہ

رسدی تقسیم کر دیا اور یہ خیال نہ کیا کہ کون سا شخص سابقون الاولون میں شامل ہے اور کس شخص نے بعد میں اسلام قبول کیا ہے۔ جب بعض لوگوں نے کہا کہ اس سونے میں سابقون الاولون کو زیادہ حصہ ملنا چاہیے تو انہوں نے فرمایا:

”وہ لوگ محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر اسلام لائے تھے۔ اس لیے انہیں اجر دینا بھی اللہ ہی کا کام ہے اور یہ اجر انہیں آخرت میں ملے گا۔ اس دنیا میں تو ان کا اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا۔“

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو انہوں نے اپنی پہلی رائے پر اصرار کرتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مختلف پالیسی اختیار کی اور ہر شخص کے درجے اور مرتبے کے مطابق اس کا وظیفہ مقرر کیا گو آخر حضرت عمر میں ان کی بھی یہی رائے ہوگئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی سیاست اور پالیسی درست تھی۔ انہوں نے وظائف کی تقسیم کا طریق کار بدلنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن اتنی مہلت ہی نہ ملی اور وہ اس طریق کار میں تبدیلی کیے بغیر ہی فوت ہوگئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکیمانہ طرز عمل اور دانش مندانہ پالیسی نے عرب کو ایک سیاسی وحدت میں تبدیل کر دیا اور ہر شخص یہ سمجھ کر کہ اسے ملک میں مساوی حقوق حاصل ہیں، بہ دل و جان حکومت کی اطاعت میں مشغول ہوگیا۔ اس کی وفاداری کا مرکز و مرجع خلیفہ کی ذات تھی اور اس کے احکام پر عمل کرنا اس کے نزدیک فرض عین تھا۔

اسلام میں حکومت کا نظام:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت کس قسم کی تھی، آیا اسے پاپائیت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، مطلق العنان شخصی حکومت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یا جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والے شخص سے بھی یہ امر پوشیدہ نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت پر پاپائیت کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فراعنہ مصر اور شاہان یورپ جس طرز سے حکومت کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں اس کا گمان بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ براہ راست خدا سے احکام لینے کے دعوے دار نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وحی کا نزول بند ہو چکا تھا۔ اب صرف کتاب اللہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ کتاب اللہ کے احکام ہی مسلمانوں کے لیے حجت تھے اور ان کا دستور العمل سوا قرآن مجید کے اور کوئی نہ تھا۔ ہر حاکم مجبور تھا کہ کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریق پر چلے اور اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر کام کرے۔ مسلمان کے لیے اسی وقت تک حاکم کی اطاعت فرض تھی جب تک وہ کتاب اللہ کے احکام پر عمل پیرا رہے اور اس کی مقررہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی حاکم کتاب اللہ کے احکام کو پس پشت ڈالتے ہوئے خود ساختہ خلاف شریعت احکام پر عملدرآمد کرانا چاہتا تو اس کی اطاعت مسلمانوں پر فرض نہ تھی۔

اسلام کا مقرر کیا ہوا یہ ضابطہ عمل اور طرز حکومت پاپائیت کے بالکل الٹ ہے۔ خلیفۃ المسلمین کو اللہ کے

نازل کردہ احکام کا پابند رہنا اور اس کی مقررہ حدود کے اندر مقید رہنا پڑتا تھا۔ مطلق العنانی کی مطلق گنجائش نہ تھی لیکن پاپائی طرز حکومت میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں حاکم مختارکل ہوتا تھا، جو چاہتا کرتا تھا، کسی کو اس کے آگے دم مارنے یا اعتراض کرنے کی گنجائش نہ تھی، اس کے نافذ کیے ہوئے احکام خدائی سمجھے جاتے تھے۔ اسے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، ہر قسم کا اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور رعایا کو غلاموں کی طرح اس کی فرماں برداری کرنی پڑتی تھی۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کو احکام سلطنت کا سرچشمہ ماننے اور حدود شریعت قائم رکھنے کے باعث اسلامی حکومت بھی پاپائیت کا روپ دھار لیتی ہے اور اس میں اور دوسری مستبد حکومتوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ لیکن یہ اعتراض محض ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ قرآنی شریعت میں صرف اصول بیان کردیئے گئے ہیں لیکن تفصیلات سے بالعموم احتراز کیا گیا ہے۔ اگر تفصیلات آئی بھی ہیں تو صرف ایسی جگہ جہاں ان کا ذکر کرنا ناگزیر تھا۔ اسلامی حکومت میں سارے نظام کی بنیاد ان اصولوں پر رکھی جاتی ہے اور ان اصولوں کی روشنی میں فروعات و تفصیلات کا طے کرنا جمہور مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

جو اصول قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں، صالح معاشرے کے قیام اور قومی زندگی کی بقا کے لیے ان کا بروئے کار لانا ازبس ضروری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان ان اصولوں پر عمل پیرا رہے اور انہوں نے اپنی قومی وانفرادی زندگیوں کو ان اصولوں کے مطابق ڈھالا وہ ترقی کے زینوں پر چڑھتے رہے لیکن جب انہوں نے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونا چھوڑ دیا اور اپنے لیے ایسا نظام تجویز کیا جو ان اصولوں کے مخالف اور ذاتی خواہشات کا مظہر تھا تو اسی وقت ان کا تنزل شروع ہوگیا۔

اگر کتاب اللہ کے بیان کیے ہوئے اصولوں کی تشریح و توضیح کا کام کلیتہً ایک خاص گروہ پر چھوڑ دیا جاتا اور دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی کاہنوں جیسا ایک طبقہ وجود میں آجاتا تو یقیناً اس اعتراض کی گنجائش تھی کہ اسلام بھی پاپائیت کا وجود موجود ہے لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسلام مذہبی امور میں کسی خاص طبقے کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ہر انسان کو بلا استثناء مساوی طور پر یہ حق دیتا ہے کہ وہ قرآن کریم پر غور کرکے اس سے اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق نتائج اخذ کرلے۔ اس صورت میں اسلام پر پاپائیت کی تہمت لگانا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

اسلامی نظام حکومت کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک طرف تو خدائی احکام کی اطاعت اور شریعت کی مقرر کردہ حدود کی پابندی حاکم ومحکوم، ادنیٰ واعلیٰ، غریب وامیر ہر شخص پر یکساں فرض ہے۔ دوسری طرف عوام کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ جب چاہیں اپنے حاکم سے اس کی غلط روی پر باز پرس کرسکتے ہیں۔ اس نظام حکومت میں برسراقتدار طبقے کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے لیے کچھ اور قانون وضع کرلے اور غریب رعایا کے لیے کچھ اور، اور اپنے آپ کو دوسروں سے فائق، برتر اور افضل سمجھ کر اپنے لیے ایسی مراعات حاصل کرلے جو عوام کو حاصل نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ

کتاب اللہ اور سنت نبوی پر سختی سے عمل کرنے کے باعث دنیوی آلائشوں سے بالکل پاک تھے اور ان کے دل میں یہ بات میخ فولاد کی طرح جاگزیں ہو چکی تھی کہ جس شخص کے سپرد قوم کی امانت کی جائے اور وہ اس میں خیانت کر کے اس کا کچھ حصہ ذاتی تصرف میں لے آئے وہ کسی اور پر نہیں بلکہ خود اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور قیامت کے دن اسے اس خیانت کی نہایت دردناک سزا ملے گی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس امانت کا حق، جو قوم کی طرف سے ان کے سپرد کی گئی تھی، جس طرح ادا کیا اور ایام خلافت میں جس بے نفسی و پرہیزگاری کا ثبوت دیا اسے موجودہ زمانے کے لوگ غیر ممکن العمل سمجھتے ہیں۔ خلافت و امارت نے ان کی زندگی میں ذرا بھی تو تغیر و تبدل پیدا نہ کیا۔ مسلمانوں کے اموال سے فائدہ اٹھانے کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ خلافت کی ذمہ داریاں تفویض ہوتے ہی وہ اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو بالکل بھول گئے اور اللہ کے دین کی خدمت میں اور اس اسلامی سلطنت کے انتظام و انصرام کے لیے اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیا۔ عدل و انصاف کا قیام ان کا اولین مقصد تھا اور کمزوروں اور حاجت مندوں کی امداد و اعانت سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ ان کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔

جو حکومت اس طرز کی ہو، جہاں مطلق العنانی کا مطلق دور دورہ نہ ہو، جس کا حاکم اپنے آپ کو فوق البشر ہستی نہ سمجھتا ہو اسے کسی طرح بھی پاپائی اور مطلق العنان شخصی حکومت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ خلیفہ کا انتخاب یقیناً مہاجرین اور انصار ہی نے مل کر کیا تھا اور عرب کے دوسرے قبیلوں سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی لیکن اس پر بھی کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کیونکہ مہاجر اور انصار ایک ہی قبیلے کے افراد نہ تھے جنھوں نے ملی بھگت کر کے اپنے میں سے ایک آدمی کو خلیفہ منتخب کر لیا ہو بلکہ وہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کام بھی انہوں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پر کیا جا سکے اور کسی رہنما کی غیر موجودگی کے باعث امت کی بقا کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس کا فوری طور پر سدباب ہو سکے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت کی بنیاد کلیتہً صلاح مشورے پر تھی۔ ان کی بیعت عام انتخاب کے ذریعے سے کی گئی اور محض اس لیے کی گئی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سب سے محبوب ساتھی اور رفیع الشان شخصیت کے مالک تھے۔ خاندانی وجاہت اور قبائلی عصبیت کا اس انتخاب میں مطلق دخل نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خود اپنے لیے خلافت کا مطالبہ نہ کیا بلکہ انہوں نے تو لوگوں کو اپنے بجائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ بن جراح میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے خلافت سازشوں کے ذریعے سے حاصل نہ کی بلکہ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع عام میں خاصی بحث و تمحیص کے بعد جس میں انصار اور مہاجرین کے سربرآوردہ اشخاص نے حصہ لیا...... ان کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع ہوا۔ پھر جب انہی کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ ہو گیا تو بیعت کرنے میں انصار بھی کسی طرح مہاجرین سے پیچھے نہ رہے۔ انہوں نے نہ صرف صدق دل سے ان کی خلافت قبول کر لی بلکہ بعد میں جب کبھی ان کی طرف سے مالی اور جانی قربانیوں کا مطالبہ ہوا، انصار نے بڑھ چڑھ کر اور دلی ذوق و شوق سے ان میں حصہ لیا۔

خلافت کے بعد انہوں نے جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اس کے لفظ لفظ سے یہ بات عیاں ہو رہی تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جمہوریت کا کتنا پاس تھا اور وہ شوریٰ کو سلطنت کی بہبود کے لیے کس قدر ضروری خیال کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا:

"میں تم پر حاکم تو بنا دیا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں۔ اگر میں نیکی کی راہ پر چلوں تو میری فرماں برداری کرو۔ لیکن اگر میرا قدم نیکی کی راہ سے ڈگمگا کر بدی کی راہ پر چلا جائے تو مجھے درست کر دو۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا رہوں تم میری اطاعت کرتے رہو لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔"

ان الفاظ سے صریحاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عوام الناس کو خلیفہ کے کاموں کی نگہداشت کرنے اور اسے نیک مشورے دینے کا حق حاصل ہے اور اگر کبھی بہ فرض محال خلیفہ سے اللہ کے احکام کی نافرمانی صادر ہونے لگے تو رعایا پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ شوریٰ کی اہمیت کے متعلق ان الفاظ سے زیادہ اور کون سے پرزور الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

جنگوں کا سلسلہ طویل تر ہونے کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں شوریٰ کا نظام اعلیٰ قائم رہا اور وہ کوئی بھی اہم کام بغیر مشورہ لیے انجام نہ دیتے تھے۔ تمام مسلمان ان کی نظروں میں مساوی حقوق کے حامل تھے اور کسی شخص کو اس کی دنیوی وجاہت اور مرتبے کی بنا پر دوسرے لوگوں سے برتری حاصل نہ تھی۔ سابق مرتدین کے متعلق انہوں نے ابتداء میں یہ حکم صادر فرمایا تھا کہ انہیں جنگی مہمات میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ ابھی ان کی طرف سے پورا اطمینان نہ تھا۔ لیکن جب یہ خدشہ دور ہو گیا تو انہیں اسلامی فوجوں میں شرکت کی اجازت دے دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ عراق کی جنگوں میں مذکورہ بالا لوگوں سے بھی کام لیا جائے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عرب کی سیاسی وحدت:

اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی نظام حکومت کی بنیادیں استوار کر کے اپنے بعد آنے والے خلفاء کے لیے ان بنیادوں پر ایک رفیع الشان عمارت تعمیر کرنے اور عرب کو ایک سیاسی وحدت میں ڈھالنے کا موقع فراہم کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عفو و درگزر کی پالیسی نے عرب کی سیاسی وحدت کے حصول میں بے حد آسانی پیدا کر دی۔ جو بھی باغی سرداران کے سامنے حاضر کیا گیا انہوں نے اس کے پچھلے اعمال سے درگزر کرتے ہوئے ان کی جان بخشی کر دی۔ قرہ بن ہبیرہ، حضرت عمرو بن معدی کرب، اشعث بن قیس وغیرہ سرداران عرب کی مثالیں سب کے سامنے ہیں۔ بغاوت اور سرکشی کو سختی سے فرو کرنے اور بعد میں بغاوت کے سرغنوں کو معافی دے دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے سچے دل سے اطاعت اور فرمانبرداری قبول کر لی اور وحدت کی لڑی میں منسلک ہو گئے۔ شوریٰ کے طریق کار نے وحدت کے نظام کو مزید استواری بخشی جس کے نتیجے میں عراق اور شام کی فتح آسان تر ہو گئی۔

اس زمانے میں عوام کی فکری نہج بھی اس امر کی متقاضی تھی کہ نظام حکومت کی بنیادیں شوریٰ اور جمہوریت پر استوار کی جائیں۔ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا تھا۔ اسلامی شریعت عربی زبان میں تھی اور رسول اللہ ﷺ بھی سرزمین عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ عرب قبائل بدوی ہوں یا شہری، آزادی اور خودمختاری کے دلدادہ تھے اور آزادی سے بڑھ کر انہیں کوئی شے عزیز نہ تھی۔ بدوی لوگوں میں مساوات کی روح سرایت کر چکی تھی۔ اسلامی تعلیمات نے اس فکر ونظر کو مزید جلا دی کیونکہ اسلام کامل مساوات کا علم بردار تھا۔ اللہ نے اپنی کتاب میں بہ وضاحت اعلان کر دیا کہ اس کے نزدیک خاندانی وجاہت کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اصل حیثیت بندوں کے اعمال کو حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کر دیا تھا کہ اسلام گورے، کالے، عربی، عجمی، آقا اور غلام میں کسی قسم کی تمیز رکھنے کا روادار نہیں۔ اس کے نزدیک برتری اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ آج جمہوریت کا دور دورہ ہے اور ہر جا جمہوریت ہی کے گن گائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو حقیقی جمہوریت کا نظارہ چشم بینا نے صرف اسلام کے دور اولین میں دیکھا ہے۔ اس زمانے میں جمہوریت کی بنیاد اخوت ومحبت اور حریت ومساوات پر تھی اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم کے نتیجے میں ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ ہر شخص اپنے مومن بھائی کا خیر خواہ تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ”تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا یہ ارشاد کوئی معمولی ارشاد نہیں بلکہ جمہوریت کی جان ہے اور کوئی جمہوری حکومت اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اس حکیمانہ فقرے کو مشعل راہ بنا کر رعایا کے افراد کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور مونس وغم خوار نہ بنا دے۔

انہیں تعلیمات کے باعث، جنھیں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں تک پہنچایا، اس عربی وحدت کا قیام عمل میں آسکا جس کے سہارے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک رفیع الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور ایک نرالا نظام دنیا کے سامنے پیش کر کے ایک عالم کو انگشت بدندان کر دیا۔

اسلام کی طاقت کا سبب:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حکومت جزیرہ نمائے عرب تک محدود نہ تھی بلکہ عرب سے بھی باہر نکل کر دور دور تک پھیل گئی تھی اور اسلامی سلطنت کا قیام عرب کے علاوہ عراق اور شام میں بھی عمل پذیر ہو چکا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر عربی علاقوں میں اسلامی سلطنت کا قیام محض چند حملوں کا نتیجہ تھا جن میں اتفاق سے مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوگئی یا اس انقلاب نے، جس کی نشان دہی ہم پہلے کر آئے ہیں، ان فتوحات کے لیے راستہ صاف کیا اور اس طرح مسلمانوں کو دنیا کے ایک وسیع خطے میں اسلامی سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا موقع مل گیا؟

اسلام کی ابتدائی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے کسی شخص سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اسلامی افواج کی کامیابی کو وقتی اور اتفاقی قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ فتوحات وحوادث کے ایک لمبے سلسلے کی کڑی ہیں۔ اسلام نے دنیا میں آ کر جو انقلاب پیدا کیا اس کا برپا ہونا لابدی تھا۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات ایک انقلاب پذیر قوت اپنے اندر رکھتی تھیں اور ناممکن تھا کہ یہ قوت اپنا اثر دکھائے بغیر رہتی۔

اسلام کو طاقت وقوت بخشنے والے عوامل میں عقیدے کی حریت کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اسلام آزادی ضمیر کا سب سے بڑا علم بردار ہے اور دین کے معاملے میں کسی شخص پر جبر کا روادار نہیں۔ گو اس کی دعوت ساری دنیا کے لیے عام ہے لیکن وہ کسی شخص کو اپنا عقیدہ بدلنے پر مجبور نہیں کرتا۔ ہاں! یہ امید ضرور رکھتا ہے کہ اس کی پیش کردہ تعلیمات پر لوگ غور کریں۔ اسے اطمینان ہے کہ جو لوگ سچے دل سے ان تعلیمات کا مطالعہ کریں گے ان کے لیے انہیں قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں عقل سلیم انہیں قبول کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرسکتی۔

جہاں اسلام آزادی ضمیر کا سب سے بڑا علم بردار ہے وہاں اسلام کے مخالف آزادی ضمیر کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر لوگوں کو عقائد واعمال میں آزادی دے دی گئی اور انہیں اختیار دے دیا گیا کہ وہ جو مذہب اور طریقہ چاہیں اختیار کرلیں تو اسلام کی پاک تعلیم انہیں اپنی طرف کھینچ لے گی اور ان کے حق میں نامرادی اور ناکامی کے سوا کچھ نہ آئے گا۔

اسلام نے آزادئ ضمیر کا جو اصول دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس پر مسلمانوں نے پوری طرح عمل کرکے دکھا دیا۔ انہوں نے لاتعداد ممالک فتح کیے لیکن کسی شخص کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے جس شہر کو فتح کیا وہاں کے باشندوں کو کامل مذہبی آزادی دے دی۔ جو شخص بہ رضا و رغبت اسلام قبول کرلیتا اسے وہی حقوق مل جاتے تھے جو دوسرے مسلمانوں کو ملے ہوئے تھے لیکن جو شخص اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہتا اسے جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ جزیہ کوئی تاوان نہ تھا جو غیر مسلموں سے نفرت و حقارت کے باعث ان پر عائد کیا گیا ہو بلکہ اس کی حیثیت زکوٰۃ کی طرح ایک ٹیکس کی تھی جو سلطنت کی طرف سے ان کی حفاظت کے بدلے ان پر عائد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اہل عراق اور اہل شام سے صلح کے جو معاہدات کیے گئے ان میں یہ صراحت کردی گئی تھی کہ غیر مسلموں سے جزیہ صرف ان کے مال وجان کی حفاظت کے بدلے وصول کیا جائے گا۔ اور اسلامی حکومت ذمہ دار ہوگی کہ غیر مسلم اپنے اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرسکیں اور دینی عبادات بے خوفی سے بجالاسکیں۔ آج بھی کتب تاریخ میں جو معاہدات محفوظ ہیں ان میں اسلامی حکومت کی طرف سے غیر مسلموں کے گرجوں، کلیساؤں، معبدوں، مذہبی پیشواؤں اور راہبوں کی حفاظت کی شقیں موجود ہیں۔ اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آجاتی کہ مسلمان اپنے مواعید کی بجا آوری سے قاصر ہوجاتے تو نہ صرف آئندہ کے لیے جزیہ لینا بند کردیا جاتا بلکہ پچھلی وصول کی ہوئی رقم بھی انہیں واپس کردی جاتی۔

رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں قائم شدہ حکومت، جس کی بنیاد حریت ومساوات اور اخوت و

محبت کے اصولوں پر قائم کی گئی تھی، رومی شہنشاہیت سے یکسر مختلف تھی اور آج کل کی جمہوریتیں بھی افادیت کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اسلامی سلطنت کا یہ مقصد قطعاً نہ تھا کہ لوگوں کو عربوں کا مطیع و منقاد بنایا جائے اور انہیں رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی غلامی میں دے دیا جائے۔ اس کے برعکس اس کا اولین مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا جائے اور ان کے درمیان اخوت و مروت اور رحمت و شفقت کے ناقابل شکست رشتے پیدا کر دیئے جائیں۔ اسلامی سلطنت میں مفتوح اقوام کا درجہ فاتحین سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مفتوح اقوام عربوں کی طرح تمام بنیادی حقوق سے بہرہ ور تھیں۔ جو شخص اسلام لے آتا تھا اس سے مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا اور جو شخص اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہتا تھا اسے وہ تمام حقوق حاصل ہوتے تھے جو عرب کے دوسرے غیر مسلموں کو حاصل تھے۔ عرب کے فاتحین نے اپنے کسی بھی فعل سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے حامی ہیں۔ اہل عراق اور اہل شام میں جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے ان سے وہی سلوک کیا گیا جو نجران اور عرب کے دوسرے علاقوں کے عیسائیوں سے کیا جاتا تھا۔ بے شک مسلمان ان لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور ان پر اتمام حجت کرنے میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہ کرتے تھے لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص ان کی دعوت پر کان نہ دھرتا اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا تو یہ خدائی فرمان ذہن میں رکھ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے:

من اهتدی فانما یهتدی لنفسه ومن ضل فانما یضل علیها وما انا علیکم بوکیل۔

(جو شخص ہدایت قبول کرتا ہے اس کا فائدہ خود اسی کو پہنچے گا اور جو شخص گمراہی کے راستے پر گامزن رہنا چاہتا ہے اس کے نقصان کا ذمہ دار بھی وہ خود ہے۔ اے! رسول ان لوگوں سے کہہ دو "میرا کام صرف یہ ہے کہ تم لوگوں تک آواز پہنچا دوں، ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ تمہاری ہدایت اور گمراہی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔")

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نظام حکومت:

اسلام نے حکومت کا جو نظام تجویز کیا تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مفتوحہ ممالک میں اسے پوری طرح رائج کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ عراق میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بلدیاتی نظم و نسق کا کام خود وہاں کے باشندوں کے سپرد کر رکھا تھا۔ مسلمان صرف عام نگرانی اور سیاسی امور کی نگہداشت کرتے تھے۔ اس طرح کوئی باقاعدہ منظم حکومت معرض وجود میں نہ آسکی۔ جنگی صورت حال کے پیش نظر ایک عبوری طرز حکومت اختیار کر لیا گیا اور پیشتر توجہ جنگی امور کی تکمیل پر دی گئی۔

شام کا حال بھی عراق سے مختلف نہ تھا۔ شورائی نظام حکومت یہاں کے باشندوں کے لیے اسلام کی طرح بالکل نئی چیز تھا۔ فتوحات اسلامیہ کے وقت یہاں مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ شہنشاہ ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور من مانی کرتا تھا۔ پادری اور راہب شہنشاہ کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے اور مطلق العنانی کو سہارا دینے کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔ ایک طرف حکومت کے دباؤ دوسری طرف

مذہبی پیشواؤں کے وعظ کے نتیجے میں عوام الناس اپنے فرماں رواؤں کو انتہائی تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اور انہیں ان کے آگے سجدہ کرنے میں بھی باک نہ تھا۔ اسلامی فتوحات کے موقع پر جب انہوں نے ایسے نظام حکومت کا مشاہدہ کیا جس کی بنیاد عدل و انصاف اور شوریٰ پر تھی اور جہاں اس شاہی کروفر اور رعب و دبدبہ کا نام ونشان تک نہ تھا۔ جسے دیکھنے کے وہ صدیوں سے عادی تھے تو ان کے دل بے اختیار اسلام کی طرف مائل ہونے شروع ہوئے اور انہوں نے بڑی گرم جوشی سے مسلمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اسلام کی طرف لوگوں کے اس میلان کے باعث مسلمانوں کی سلطنت بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کے ڈانڈے ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف افریقہ سے جا ملے۔ مسلمان جہاں بھی گئے حق و صداقت، عدل و انصاف اور ایمان و صداقت کا علم لہراتے ہوئے گئے اور حریت و مساوات اور محبت و شفقت کے بیج ہر زمین میں بو دیئے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ عرب اور دوسرے مفتوحہ علاقے میں اسلامی نظام حکومت کاملاً رائج کر سکتے۔ ان دنوں اس سلسلے میں جو کام ہوا وہ ابتدائی نوعیت کا تھا۔ بعد میں آنے والے خلفاء کے عہد میں سلطنت نے جس طرح منظم صورت اختیار کر لی تھی اور جس طرح باقاعدہ محکموں کا قیام عمل میں آچکا تھا اس طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نہ تھا۔ ان کے عہد میں نہ حکومت نے باقاعدہ تنظیمی شکل اختیار کی تھی اور نہ مختلف محکمے قائم ہوئے تھے۔

اس کے دو طبعی سبب تھے: اول یہ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا عہد پچھلے تمام زمانوں سے مختلف تھا اور انہیں بالکل نئے سرے سے ایسے واقعات میں ایک حکومت کی تشکیل کرنی پڑی تھی۔ جب پچھلی تہذیبیں دم توڑ چکی تھیں اور ان کی جگہ ایک نئی تہذیب نے لے لی تھی۔ عقائد کے لحاظ سے ایک انقلاب آچکا تھا اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ فکر ونظر کے انداز بدل چکے تھے اور معاشرے میں زبردست تبدیلی آچکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں قلیل وقفے کے اندر ایک بالکل نیا نظام حکومت رائج کرنا کس قدر دشوار امر تھا۔

منظم حکومت عمل میں نہ آنے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ زمانہ حرب و پیکار کا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حکومت عسکری حکومت کہلانے کی زیادہ مستحق تھی۔ جنگ و جدل کے مواقع پر مقررہ نظم ونسق کا قیام تک ناممکن ہوتا ہے چہ جائیکہ ایسے علاقے میں ایک منظم حکومت کا قیام عمل میں لایا جا سکے جہاں اسلام سے قبل نظم ونسق کا وجود ہی نہ تھا۔

خلافت کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے مرتدین کا سامنا کرنا پڑا اور پہلا سال ان کی بغاوتیں فرو کرنے میں گزر گیا۔ ابھی مرتدین سے جنگوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ایرانیوں سے جھڑپیں شروع ہو گئیں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی توجہ عراق کی طرف منعطف ہو گئی۔ عراق میں کامل امن و امان نہ ہوا تھا کہ شام پر چڑھائی کا مسئلہ درپیش ہو گیا۔ اس صورت میں نظام حکومت وسیع بنیادوں پر قائم کرنا اور اس کی تفاصیل طے کرنا ناممکن تھا۔ اس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے دو بڑے مقصد تھے اور انہیں کی تکمیل میں وہ ہمہ تن

مشغول رہتے تھے۔ اول مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر کے انہیں دشمن کے مقابلے کے لیے تیار کرنا، دوم دشمن پر فتح حاصل کر کے وسیع اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھنا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عسکری حکومت کا نظام اس بدوی طریق کے زیادہ قریب تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بھی پہلے قبائل عرب میں رائج تھا۔ اس وقت حکومت کے پاس کوئی منظم لشکر موجود نہ تھا بلکہ ہر شخص اپنے طور پر جنگی خدمات کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا تھا۔ جب طبل جنگ پر چوٹ پڑتی اور لڑائی کا اعلان کر دیا جاتا تو قبائل ہتھیار لے کر نکل پڑتے اور دشمن کی جانب کوچ کر دیتے۔ ہر قبیلے کا سردار ہی اپنے قبیلے کی قیادت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ان کی عورتیں بھی انہیں ہمت دلانے اور جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے ساتھ ہوتی تھیں۔ سامان رسد اور اسلحہ کے لیے وہ مرکزی حکومت کی طرف نہ دیکھتے تھے بلکہ خود ہی ان چیزوں کا انتظام کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے انہیں تنخواہ بھی ادا نہ کی جاتی تھی بلکہ وہ مال غنیمت ہی کو اپنا حق الخدمت سمجھتے تھے۔

میدان جنگ میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا اس کا ۴/۵ حصہ جنگ میں حصہ لینے والوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا اور پانچواں حصہ خلیفہ کی خدمت میں دارالحکومت ارسال کر دیا جاتا تھا جسے وہ بیت المال میں جمع کر دیتا تھا۔ خمس کے ذریعے سے سلطنت کے معمولی مصارف پورے کیے جاتے تھے اور مدینہ کے مفلس و قلاش اور محتاج لوگوں کی امداد کی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ جونہی خمس مدینہ پہنچے اسے تقسیم کر دیا جائے اور ایک درہم بھی آئندہ کے لیے اٹھا نہ رکھا جائے۔ بعض لوگوں نے ان کے سامنے تجویز پیش کی کہ بیت المال پر پہرے دار مقرر کیے جائیں لیکن انہوں نے یہ تجویز نامنظور کر دی کیونکہ بیت المال میں کچھ بچتا ہی نہ تھا جس کی حفاظت کے لیے پہرے دار مقرر کیے جاتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت کا نظام نہایت سادہ اور بدویانہ طرز کا تھا۔ اپنے عہد کی منظم اور متمدن سلطنتوں کا رنگ انہوں نے بالکل قبول نہ کیا۔ عہد رسالت سے اتصال کے باعث ان کا عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بڑی حد تک مشابہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھولے سے بھی وہ کام نہ کرتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند کرتے تھے اور وہ کام کرنا سعادت سمجھتے تھے جو آپ نے کیا تھا لیکن وہ جامد مقلدین کی طرح نہ تھے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل نمونہ اختیار کرنے کی وجہ سے ان کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھل چکا تھا۔ یہی اجتہاد تھا جس کے باعث اللہ نے ان کے ذریعے سے عراق اور شام فتح کرائے اور ان کے ہاتھ سے ایسی متحدہ سلطنت کی بنیاد رکھوائی جس کا دستور العمل احکام الٰہی اور شوریٰ پر مبنی تھا۔ وہ افراط و تفریط سے ہمیشہ پاک اور اللہ کے نور سے حصہ لے کر ہمیشہ صراط مستقیم پر گامزن رہے۔ یہ خیال ہر وقت ان کے دلوں میں جاگزیں رہتا تھا کہ جہاں وہ بندوں کے سامنے جواب دہ ہیں وہاں اللہ کے سامنے بھی جواب دہ ہیں اور وہ قیامت کے دن ان سے ان کے تمام اعمال کا حساب لے گا۔ اللہ اور بندوں کے سامنے جواب دہی کا یہی تصور تھا جس نے ہمیشہ آپ کو صراط مستقیم پر گامزن کیے رکھا اور انہیں ایک قدم ایک لمحہ کے لیے بھی جادۂ استقامت سے ہٹنے نہ دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد اسلامی حکومت مختلف ادوار میں سے گزرتی رہی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایرانی اور رومی سلطنتوں کا نظام حکومت سامنے رکھ کر مختلف شعبوں کی تشکیل کی لیکن کتاب اللہ اور اس کی مقرر کردہ حدود سے مطلق تجاوز نہ کیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقررہ طرز حکومت ہی جاری رہا۔ خلافت راشدہ کے بعد جب سلطنت امویوں کے ہاتھ میں آئی تو شورائی طرز حکومت کی جگہ موروثی بادشاہی نے لے لی۔ عباسیوں کے زمانے میں بھی موروثی بادشاہی کا سلسلہ قائم رہا۔ عباسیوں کے عہد میں سلطنت پر اہل روم اور اہل ایران کا اثر اس قدر بڑھ گیا کہ خلفاء ان کے ہاتھوں میں بے بس ہو کر رہ گئے۔ ایران اور روم کی مکمل فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت سلطنت پر عجمی باشندوں کا اثر بہت کم تھا۔ امویوں کے عہد میں ان کا اثر قدرے بڑھا مگر سلطنت کاملاً عربی رنگ میں رنگی رہی۔ عباسیوں نے چونکہ خلافت اہل ایران کی مدد سے حاصل کی تھی اس لیے ان کے عہد میں ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خلفاء ان کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے۔

اس اثناء میں علمائے اسلام، جن میں اکثریت غیر عربوں کی تھی، حکومت کے لیے قواعد اور تفصیل مرتب کرنے میں مصروف رہے۔ ان علماء میں اکثر اختلاف ہو جاتا تھا جو بعض اوقات بڑھتے بڑھتے فساد اور شورش کی صورت اختیار کر لیتا تھا اور حاکم وقت کو سختی سے اسے فرو کرنا پڑتا تھا۔ کتنا بڑا فرق تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اور امویوں اور عباسیوں کی حکومت میں۔ اول الذکر حکومت بالکل سادہ تھی لیکن اس کی وجہ سے ایک دن کے لیے بھی ملک کے امن و امان میں خلل نہ پڑا۔ مؤخر الذکر حکومتیں شان و شوکت کے لحاظ سے جواب نہ رکھتی تھیں، بڑے بڑے علماء و فضلاء حکومت کا آئین تیار کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن اندرونی بغاوتوں نے ان سلطنتوں کو ایک دن کے لیے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور یہ ہمیشہ داخلی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں میں مصروف رہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان تھا کہ جس طرح ہمیں ایک دن اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا پڑے گا اسی طرح امور سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں وہ بندوں کے سامنے بھی جواب دہ ہیں۔ اللہ اور بندوں کی اس جواب دہی کے ڈر سے وہ جب بھی کسی اہم کام میں ہاتھ ڈالتے اللہ کے احکام کو پیش نظر رکھتے اور لوگوں کے سامنے وہ معاملہ رکھ کر ان سے بھی مشورہ لیتے۔ اسی طرح جب کوئی معاملہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا تو جب تک اس کے بارے میں خوب غور و فکر نہ کر لیتے اور اس کے نتائج و عواقب کو اچھی طرح جانچ نہ لیتے فیصلہ نہ کرتے۔ مرض الموت میں بھی ان کا طرز عمل یہی رہا اور وہ برابر مسلمانوں کی آئندہ فلاح و بہبود کے طریقوں پر غور فرماتے رہے۔ اسی دوران میں مثنیٰ شیبانی عراق سے مدینہ آئے اور باریابی کی اجازت چاہی تو انہوں نے باوجود حد درجہ ضعف و نقاہت کے انہیں اپنے پاس بلوا لیا اور بڑے غور سے ان کی معروضات سنیں۔ اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ شام ہونے سے پیشتر مثنیٰ کی مدد کے لیے مسلمانوں کا لشکر عراق روانہ کر دیا جائے۔ غرض اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زندگی کے آخری سانس تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف رہے۔

۱۸

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارتداد کا وہ فتنہ، جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے گوشے گوشے میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، کمال مستعدی سے فرو کر دیا تھا۔ عراق میں اسلامی فوجیں دور دور تک گھس گئی تھیں اور ایرانی دارالحکومت مدائن کی فتح چند دن کی بات رہ گئی تھی۔ شام میں رومی افواج قاہرہ کو ذلت آمیز شکستوں سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا اور فتوحات اسلامی کے اثرات پایہ تخت شام، دمشق تک محسوس کیے جا رہے تھے۔ ایک طرف ان حیرت انگیز فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، دوسری طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ میں ایک ایسی متحدہ عربی حکومت کی تشکیل میں مصروف تھے جس کی اساس باہمی مشورے پر تھی۔ قرآن کریم کی تدوین ہو چکی تھی۔ اسلامی سلطنت کی تشکیل کے لیے راستہ صاف ہو چکا تھا اور حقیقی عدل و انصاف پر مبنی حکومت کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ یہ تمام عظیم الشان اور اہم امور دو سال تین مہینے کی قلیل ترین مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچے تھے۔

کیا یہ تاریخ کا ایک معجزہ نہیں؟ ستائیس مہینے کی قلیل مدت میں ایک طویل و عریض علاقے کی خطرناک بغاوت بالکل فرو ہو جاتی ہے اور آن واحد میں سارا عرب وحدت کی سلک میں اس طرح منسلک ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہاں کبھی بغاوت اور شورش کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر یہی اہل عرب، جو پہلے فتنہ و فساد اور شورش و اضطراب کے شکار تھے، ان دو عظیم الشان سلطنتوں پر ہلہ بول دیتے ہیں جنھیں اپنی عسکری قوت اور تہذیب و تمدن کی بنا پر دنیا کی تمام اقوام پر برتری حاصل تھی اور یہ سلطنتیں اپنے عساکر جرار اور وافر اسلحہ کے باوجود، حقیر و ذلیل، عربوں کے سامنے عاجز رہ جاتی ہیں اور ایرانی و رومی تہذیب کی جگہ اسلامی تمدن کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ عربوں کا اپنی ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر جلد غلبہ ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جس کی نظر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ کسی شخص کی مجال نہیں کہ وہ بغیر تائید ایزدی اور توفیق خداوندی کے ایسے کارنامے انجام دے سکے جن پر ایک عالم حیران و ششدر رہ جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ کی قدرت پر مکمل ایمان رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی انگوٹھی کا نقش بھی "نعم القادر اللہ" تھا۔ اسی ایمان کے نتیجے میں اللہ نے ان کے لیے اپنی قدرتوں کا ... دے سکتے تھے وہ

ایک نحیف ونزار شخص نے مہینوں میں انجام دے دیئے۔

موت کے بارے میں روایات:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مرض الموت کی تعیین کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ یہود نے انہیں کھانے میں زہر دیا تھا۔کھانے میں ان کے ساتھ عتاب بن اسید اور حارث بن کلدہ بھی شریک تھے۔حارث بن کلدہ نے تو چند لقموں ہی پر اکتفا کیا اس وجہ سے وہ زہر کے اثر سے محفوظ رہے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عتاب پر زہر نے پورا پورا اثر کیا۔زہر سریع التاثیر نہ تھا بلکہ کہیں سال بھر میں جا کر اس کا اثر ظاہر ہوتا تھا۔چنانچہ جس روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں وفات پائی اسی روز عتاب نے مکہ میں انتقال کیا۔

لیکن یہ روایت قابل اعتماد نہیں۔اول تو اس کے راویوں میں کوئی ثقہ آدمی نہیں، دوسرے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور یہود کے درمیان کوئی ایسا نزاع نہ تھا جس کی بنا پر خیال کیا جاسکے کہ یہود نے مطلب براری کے لیے انہیں زہر دے دیا تھا۔تمام یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں مدینہ سے جلا وطن کیے جا چکے تھے۔

اس سلسلے میں وہ روایت قابل اعتبار ہے جو ان کی بیٹی ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور بیٹے عبدالرحمن سے مروی ہے یعنی مرض الموت کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ سخت سردیوں کے دنوں میں وہ ٹھنڈے پانی سے نہا لیے جس سے انہیں بخار چڑھ آیا اور پندرہ روز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گئے۔اس دوران میں ان کے حکم سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔

مرض کی شدت انہیں امور سلطنت کے بارے میں غور وفکر کرنے سے نہ روک سکی۔مرض کی ابتدا ہی میں انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی وفات قریب آ چکی ہے اور وہ بہت جلد اپنے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والے ہیں۔وہ اس اطمینان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے کہ اللہ نے ان کے سپرد جو کام کیا تھا اس کی انجام دہی میں انہوں نے حتی المقدور کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہ کیا۔ایک روز لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ طبیب کو بلا کر مشورہ کر لیتے تو بہتر ہوتا۔انہوں نے فرمایا "میں نے مشورہ کیا تھا۔" لوگوں نے پوچھا "پھر اس نے کیا بتایا؟" جواب دیا "اس نے کہا میں جو چاہوں گا کروں گا۔" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مطلب اصل میں یہ تھا کہ وہ راضی بہ قضا ہیں اور ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اب اللہ انہیں اپنے پاس بلا لے۔

جانشینی کا مسئلہ:

مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سب سے بڑا فکر مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق تھا۔ان کی نظروں کے سامنے سے پچھلے واقعات ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان خلافت پر جھگڑا برپا ہو گیا تھا اور اگر اللہ مسلمانوں کو ان کے

سارے عرب کو لپیٹ میں لے لیتا۔ پہلے اس کے شعلے مکہ اور طائف میں بھڑکتے پھر یمن کی باری آتی۔

اس اختلاف کی نوعیت دینی نہ ہوتی بلکہ خالص دنیوی ہوتی اور محض شخصی اقتدار کے قیام کے لیے قبائلی عصبیت کا یہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ اول تو کسی بھی طبقے کی طرف سے اقتدار کی ہوس قومی اتحاد میں رخنہ ڈال دیتی ہے، دوسرے ایسے وقت میں، جب ایرانی اور رومی سلطنتیں شیر کی طرح منہ پھاڑے عرب کی طرف دیکھ رہی تھیں، مسلمانوں کا باہم دست و گریباں ہو جانا ان سلطنتوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتا اور وہ بہ آسانی مسلمانوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر عرب پر تسلط بٹھا لیتیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے باعث ان کی زندگی میں تو اس فتنے کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ آئندہ کے لیے بھی اس کا سد باب ہو چکا ہے۔

مرض الموت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دل برابر انہیں افکار کی جولان گاہ رہا۔ انہوں نے تمام حالات کا بہ غور جائزہ لیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کو آئندہ اختلاف سے بچانے کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ زندگی ہی میں آئندہ آنے والے خلیفہ کا تعین کر جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ کیا تھا۔ آپ کسی شخص کو خلیفہ مقرر کیے بغیر وفات پا گئے تھے لیکن اس میں بھی اللہ کی ایک حکمت تھی یعنی لوگ یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ اس شخص کو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہے اس لیے یہ براہ راست اللہ سے احکام حاصل کرتا ہے اور اس طرح اس کی حیثیت اصل میں خلیفۃ اللہ کی ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کرنا تو ضرور چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی ان کی خواہش یہ تھی کہ اہل الرائے اصحاب سے اس کے متعلق مشورہ لے لیا جائے اور ان کی رضا مندی سے ہونے والے خلیفہ کا تقرر عمل میں آئے۔

ان کے خیال میں صرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ذات ایسی تھی جو صحیح معنی میں ان کی جانشینی کے فرائض انجام دے سکتی تھی۔ لیکن انہیں خطرہ تھا کہ مشورہ لیے بغیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی لوگوں پر گراں گزرے گی اور مسلمان اس انتخاب کو اچھی نظروں سے نہ دیکھیں گے۔ چنانچہ انہوں نے عبدالرحمن بن عوف کو بلایا اور ان سے پوچھا: ”حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں تمہارے کیا رائے ہے؟“

عبدالرحمن نے جواب دیا: ”جس امر کے متعلق آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں خود اسے بہتر جانتے ہیں۔“

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”پھر بھی؟“

عبدالرحمن نے جواب دیا: ”اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہترین ہیں لیکن ان کے مزاج میں سختی ہے۔“

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں سختی صرف اس لیے ہے کہ میں نرمی سے پیش آتا ہوں۔ اگر خلافت کا کام ان کے سپرد کر دیا جائے تو ان کی سختی بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔ میں خود بھی دیکھتا ہوں کہ اگر

میں کسی شخص پر ناراض ہوتا ہوں اور سختی سے پیش آتا ہوں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے نرمی کا سلوک کرنے پر مائل ہوتے ہیں اور اگر میں کسی سے نرمی کا سلوک کرتا ہوں تو وہ میرے سامنے اس شخص کے بارے میں درشتی کا اظہار کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموش رہے پھر فرمایا: "اے ابومحمد! جو کچھ میں نے تم سے کہا اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

عبدالرحمن بن عوف کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: "اے ابوعبداللہ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "ان کے متعلق آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اس کے باوجود میں تم سے ان کے متعلق رائے دریافت کرتا ہوں۔"

عثمان نے جواب دیا: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور وہ علم و فضل کے لحاظ سے ہم میں یکتا ہیں۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اے ابوعبداللہ! اللہ تم پر رحم فرمائے۔ واللہ! اگر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تمہارا امیر مقرر کر جاؤں تو وہ تم پر کسی قسم کی زیادتی نہ کریں گے۔"

عبدالرحمن کی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی یہ ہدایت کر دی کہ وہ کسی سے ان باتوں کا ذکر نہ کریں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صرف عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورہ لینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ سعید بن زید، اسید بن حضیر اور دیگر مہاجرین و انصار سے بھی اس کے متعلق گفتگو کی۔ بعض صحابہ نے جب یہ سنا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئندہ ہونے والے خلیفہ کے بارے میں لوگوں سے مشورہ لے رہے ہیں اور اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں تو انہیں بے حد فکر پیدا ہوا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سختی ضرب المثل تھی اور انہیں خطرہ تھا کہ مبادا ان کے خلیفہ بن جانے سے مسلمانوں میں افتراق پیدا ہو جائے۔ ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کا ایک وفد اجازت لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفد کے قائد طلحہ بن عبداللہ نے عرض کیا کہ "ہم نے سنا ہے کہ آپ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کر رہے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو جب اللہ آپ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے متعلق باز پرس کرے گا تو آپ اسے کیا جواب دیں گے؟ آپ کی موجودگی میں تو وہ لوگوں سے جس طرح پیش آتے ہیں اس کا حال آپ پر عیاں ہے مگر آپ کے بعد تو ان کے ظلم و ستم کی کوئی حد نہ ہوگی۔"

یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو طیش آیا اور بخار کی حالت میں چلا کر بولے:

"مجھے بٹھا دو

چنانچہ آپ کو بٹھا دیا گیا۔ آپ نے ان لوگوں کی طرف منہ کر کے فرمایا: ”کیا تم مجھے اللہ کے غضب سے ڈراتے ہو؟ واللہ! جب میں اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گا تو عرض کروں گا کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں پر تیرے سب سے بہتر بندے کو خلیفہ بنایا ہے۔“

اس کے بعد طلحہ سے مخاطب ہو کر بولے: ”جو کچھ میں نے اس وقت کہا ہے اسے دوسرے لوگوں تک بھی پہنچا دینا۔“

اس تند و تیز گفتگو کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے اور یہ لوگ شرمندہ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اگلے روز صبح سویرے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ان کے پاس پہنچے اور انہیں دیکھ کر کہنے لگے: ”اللہ کا شکر ہے آج آپ کی صحت بحال معلوم ہوتی ہے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”کیا واقعی؟“

انہوں نے جواب دیا: ”جی ہاں۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کچھ دیر خاموش رہے پھر درد انگیز لہجے میں بولے: ”میں نے تمہارا امیر اس شخص کو مقرر کیا ہے جو میرے نزدیک تم سب میں بہتر ہے لیکن یہ سنتے ہی تم میں سے ہر شخص کا منہ سوج جاتا ہے اور وہ میرا انتخاب ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔“

عبدالرحمن بن عوف نے بھانپ لیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کل کی باتوں سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ انہوں نے عرض کی: ”آپ لوگوں کی باتوں کی پروا نہ کریں۔ اس وقت بعض لوگ تو ایسے ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں آپ سے بالکل متفق ہیں، ان کے بارے میں تو کسی فکر کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ بعض لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر راضی نہیں لیکن اگر انہوں نے آپ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے تو صرف بطور مشورہ۔ انہیں آپ کی مخالفت مقصود نہیں۔ بہرحال جو فیصلہ آپ صادر فرمائیں گے وہ انہیں منظور ہوگا کیونکہ انہیں یقین ہے کہ آپ جو کچھ کریں گے وہ مسلمانوں کی بہتری ہی کے لیے کریں گے۔“

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں کلیتہً مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اپنے کاتب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور کہا:

”جو کچھ میں تمھیں بتاؤں اسے لکھ لو۔“

اس کے بعد یہ عبارت لکھوائی:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ وہ وصیت ہے جو حضرت ابوبکر بن ابوقحافہ ذ نے اس دنیا سے رخصت اور آخرت کی زندگی میں داخل ہوتے وقت لکھوائی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب بڑے سے بڑا کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور جھوٹے سے جھوٹا شخص بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں اپنے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو تمہارا خلیفہ نامزد کرتا ہوں۔ تم اس کے احکام کی کامل اطاعت کرو۔ میں نے حتی الامکان تم سے بھلائی کرنے میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہیں کیا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عدل و انصاف سے کام لیا تو مجھے اس سے بھی

یہی امید ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے سامنے اپنے برے اعمال کا جواب دہ ہوگا۔ بہر حال میں نے اپنی دانست میں تمہاری بھلائی ہی کی تدبیر کی ہے۔ ورنہ غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔"

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو وصیت لکھوانی شروع کی۔ جب ان الفاظ پر پہنچے کہ "میں تم پر خلیفہ بناتا ہوں" تو ان پر غشی طاری ہوگئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا منشاء معلوم ہی تھا۔ انہوں نے حالت غشی ہی میں یہ الفاظ لکھ دیئے:

"میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو تم پر خلیفہ مقرر کرتا ہوں اور میں نے تمہاری بھلائی میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہیں کیا۔"

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی غشی دور ہوئی تو انہوں نے فرمایا: "جو میں نے لکھوایا تھا اسے دوبارہ پڑھو۔"

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوری عبارت پڑھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہا اور فرمایا:

"معلوم ہوتا ہے تمہیں ڈر تھا کہ اگر غشی کی حالت میں میری جان نکل گئی اور میں پوری وصیت نہ لکھوا سکا تو لوگوں میں خلیفہ کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا:

"آپ درست فرماتے ہیں۔ واقعی میرا یہی خیال تھا۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی لکھی ہوئی عبارت برقرار رکھی اور فرمایا:

"اللہ تمہیں اس کی بہترین جزا دے۔"

لیکن اس پر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطمینان نہ ہوا اور انہوں نے اس وصیت کا اظہار عام لوگوں میں بھی کرنا چاہا تاکہ آئندہ کے لیے کسی اختلاف کا خدشہ باقی نہ رہے۔ انہوں نے مسجد کی طرف کا دروازہ کھلوایا اور اس میں کھڑے ہو گئے۔ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس دونوں ہاتھوں سے انہیں تھامے ہوئے تھیں۔ انہوں نے لوگوں کو جو مسجد میں موجود تھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں جس شخص کو تم پر خلیفہ مقرر کروں تم اس پر راضی ہو؟ کیونکہ واللہ! میں نے تمہاری بھلائی کے لیے کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہیں کیا اور نہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار ہی کو خلیفہ بنایا ہے۔ میں نے اپنے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کیا ہے۔ تم اس کے احکام کی کامل اطاعت کرو۔"

لوگوں نے یہ سن کر کہا:

"ہم آپ کے انتخاب پر راضی ہیں اور آپ سے عہد کرتے ہیں کہ ہر حال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اطاعت اور فرماں برداری کریں گے۔"

ابن سعد کی بعض روایات میں یہ ذکر بھی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت تحریر کرنے اور اس پر مہر

لگانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ باہر آئے۔ مہر شدہ وصیت ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے لوگوں سے کہا:
"جس شخص کی خلافت کا اس وصیت میں ذکر ہے تم اس کی بیعت کرلو گے؟"
لوگوں نے جواب دیا:
"یقیناً"
چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کہنے کے مطابق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔
بیعت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلا کر انہیں امور سلطنت کے متعلق بعض اہم ہدایات دیں۔

روایات میں ان ہدایات کی تفصیل اس طرح آئی ہے:
"میں اپنے بعد تمھیں اپنا جانشین مقرر کر کے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اللہ نے بعض عمل رات کو کرنے کے لیے مقرر فرمائے ہیں، وہ انہیں دن میں قبول نہیں کرتا اور بعض عمل دن کو کرنے کے لیے مقرر فرمائے ہیں، انہیں وہ رات کو قبول نہیں کرتا۔ جب تک فرضی عبادات کی بجا آوری نہ کی جائے نفلی عبادتیں قبول نہیں ہوتیں۔ جس شخص کے پلڑے قیامت کے دن بھاری ہوں گے وہ دنیا میں نیک اعمال بجالانے والا ہوگا کیونکہ حق کی بجا آوری کے بغیر پلڑوں کا بھاری ہونا غیر ممکن ہے اور جس شخص کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ دنیا میں برے اعمال بجالانے والا ہوگا کیونکہ باطل کی پیروی کیے بغیر پلڑوں کا ہلکا ہونا غیر ممکن ہے۔ اللہ نے قرآن کریم میں جہاں اہل جنت کا ذکر کیا ہے وہاں نیک اعمال بجالانے کی وجہ سے ان کی تعریف اور ان کی برائیوں سے درگزر کیا ہے۔ جب تم ان آیات کی تلاوت کرو تو کہو "اے اللہ! مجھے ڈر ہے کہ مبادا میرا شمار ان لوگوں میں نہ کیا جائے۔" اسی طرح جہاں اہل دوزخ کا ذکر کیا ہے وہاں ان کے برے اعمال کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی اچھی باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ جب تم ان آیات پر پہنچو تو کہو "اے اللہ! مجھے امید ہے کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہ ہوگا۔" اللہ نے اکثر جگہ رحمت اور عذاب کی آیات یکجا کر دی ہیں تاکہ بندے کو جہاں ذوق وشوق سے نیکی کی طرف قدم اٹھانے کی رغبت پیدا ہو۔ وہاں اسے خدائی عذاب کا ڈر بھی پیدا ہو۔ وہ صرف حق کی پیروی کرے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔ اے حضرت عمر! اگر تم میری ان نصائح پر کان دھرو گے اور ان پر عمل کرو گے تو موت سے زیادہ کوئی چیز تمھیں محبوب نہ ہوگی اور تم بڑی بے قراری سے اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اس کے انعامات سے بہرہ ور ہونے کی خواہش ظاہر کرو گے لیکن اگر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دو گے تو موت سے زیادہ اور کوئی چیز تمہارے لیے ڈر کا باعث نہ ہوگی اور یاد رکھو کہ اس طرح تم ہرگز اللہ کو عاجز نہ کر سکو گے۔

روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب یہ نصائح سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کمرے سے باہر آئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی:
"اے اللہ! میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنا کر اپنی دانست میں مسلمانوں کے لیے بھلائی کا

سامان کیا ہے۔ مجھے اپنے بعد فتنے کا ڈر تھا۔ میں نے یہ کام محض فتنے کی روک تھام کے لیے کیا ہے۔ میں نے خوب غور و فکر کر کے ایسے شخص کو ان کا امیر مقرر کیا ہے جو ان میں سب سے بہتر، سب سے زیادہ مستعد اور مسلمانوں کی بھلائی کا سب سے زیادہ خواہش مند ہے۔ میری موت نزدیک آ چکی ہے۔ میرے بعد تو ہی مسلمانوں کی نگہداشت فرما کیونکہ وہ تیرے بندے ہیں اور تیرے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اے اللہ! ان کے امیر کو نیک اعمال بجالا نے کی صلاحیت عطا فرما۔ اسے خلفائے راشدین میں سے بنا اور اس کی رعایا کو بھی اس کا مطیع و فرماں بردار بنا۔"

مذکورہ بالا ہدایات اور دعا کی توثیق کرنا ہمارے لیے بے حد مشکل ہے خصوصاً اس فقرے سے کہ "اے اللہ! اسے خلفائے راشدین میں سے بنا!" یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ عبارات فرضی طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب تو نہیں کر دی گئیں کیونکہ جب ایک شخص نے انہیں "خلیفۃ اللہ" کے لقب سے پکارا تو انہوں نے فوراً کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ چنانچہ اپنے انکسار کے باوصف وہ اپنے لیے "راشد" کا لفظ شاید ہی استعمال کرتے۔ ساتھ ہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کے متعلق متضاد روایات کتب تاریخ میں درج ہیں تو ہمارے لیے ان روایات کی چھان بین کرنا اور انہیں قبول کرنے میں بے حد احتیاط سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

محاسبہ نفس:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تقرر سے فارغ ہو چکے اور انہیں اطمینان ہو گیا کہ انہوں نے اپنے بعد مسلمانوں کی نگہداشت کا کامل انتظام کر دیا ہے تو اپنے نفس کا محاسبہ کرنا شروع کیا۔ عبدالرحمن بن عوف سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق جو پریشانی تھی میں اسے دور کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ان سے تشفی آمیز گفتگو کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے کہا: "آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے آپ کی تمام خواہشات پوری کر دیں اور آپ کے دل میں دنیا کی کسی بات کے متعلق کوئی حسرت باقی نہیں رہی۔"

یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کوئی حسرت لیے ہوئے اس دنیا سے نہیں جا رہا۔ البتہ تین باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق مجھے افسوس ہے کہ میں نے انہیں کیوں کیا، کاش میں انہیں نہ کرتا۔ تین کام میں نے نہیں کیے، کاش میں انہیں کر لیتا اور تین باتیں ایسی ہیں جنھیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کر سکا، کاش انہیں دریافت کر لیتا۔

تین باتیں جو مجھے نہ کرنی چاہیے تھیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کاش میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہوتا خواہ ان لوگوں نے لڑائی ہی کی خاطر اسے

بند کیا ہوتا۔ (جو لوگ علی رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کا واقعہ تسلیم نہیں کرتے وہ اس صورت کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اس طرح بعض لوگ یہ روایت بھی تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش وہ انصار کے حق خلافت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے)۔

۲۔ کاش میں فجاۃ السلمی کو آگ میں نہ جلاتا یا تو اسے تلوار سے قتل کر دیتا، یا اس کی جان بخشی کر کے چھوڑ دیتا۔

۳۔ کاش میں سقیفہ بنی ساعدہ والے دن خلافت کا بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ میں سے کسی پر ڈال دیتا۔ ان میں سے کوئی امیر ہوتا اور میں اس کا وزیر۔

جو امور مجھے بجالانے چاہئیں تھے وہ یہ ہیں:

ا۔ جب اشعث بن قیس حالت اسیری میں میرے پاس لایا گیا تھا تو مجھے اس کی گردن اڑا دینی چاہیے تھی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ فتنہ پرداز آدمی ہے اور کوئی فتنہ پیدا ہونے پر اسے ضرور بھڑکانے میں حصہ لے گا۔ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فراست کا کمال دیکھئے کہ ان کا یہ خدشہ ہوبہو پورا ہوا۔ جنگ صفین میں علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہونے کے باوجود اشعث درپردہ امیر معاویہ سے مل گیا اور جب تحکیم کا فتنہ برپا ہوا تو یہ اسے بھڑکانے میں پیش پیش تھا۔ مترجم)

۲۔ اسی طرح جب میں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا تو مجھے مدینہ سے نکل کر "ذو القصہ" میں مقیم ہو جانا چاہیے تھا۔ اگر مسلمان کامیاب ہو جاتے فبہا ورنہ میں ذوالقصہ میں پڑاؤ ڈالنے کی وجہ سے فوراً ان کی مدد کے لیے پہنچ سکتا۔

۳۔ جب میں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام بھیجا تو اسکے ساتھ ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو عراق بھیج دیتا اور یوں دونوں ہاتھ خدا کی راہ میں پھیلا دیتا۔

وہ تین باتیں، جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لینا چاہیے تھا، یہ ہیں:

ا۔ خلافت کے متعلق آپ سے دریافت کر لیتا تاکہ بعد میں کسی کے لیے جھگڑا کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

۲۔ آپ سے یہ بھی دریافت کر لیتا کہ خلافت میں انصار کا بھی حصہ ہے یا نہیں۔

۳۔ بھتیجی اور پھپھی کی میراث کے متعلق استفسار کر لیتا کیونکہ ان دونوں رشتہ داروں کی میراث کے متعلق میرے دل میں خلش باقی ہے۔"

وظیفے کی واپسی:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مرض الموت میں صرف انہیں باتوں کے متعلق غور و فکر میں مشغول نہ تھے بلکہ

بعض اور خیالات بھی ان کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ خلافت سے پہلے وہ تجارت کیا کرتے تھے لیکن جب امور سلطنت کا بار ان کے کندھوں پر پڑا تو انہوں نے مجبوراً اس پیشے کو خیر باد کہا اور بیت المال سے اپنے لیے وظیفہ مقرر کرا لیا جو ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لیے کافی ہوتا۔ مرض الموت میں انہیں اس وظیفے کا بھی خیال آیا۔ انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو بلا کر ہدایت کی کہ میں نے دوران خلافت میں بیت المال سے جو رقم لی تھی اسے واپس کر دیا جائے اور اس غرض سے میری فلاں زمین بیچ کر اس سے حاصل شدہ رقم بیت المال میں جمع کرادی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق وہ رقم بیت المال میں جمع کی تو فرمایا: ''اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد کسی بھی شخص کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آئے۔''

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مطابق ان کے متعلقین نے بیت المال سے لی ہوئی رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لوٹائی تو انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی اور فرمایا:

''ان کے بعد میں امیر مقرر ہوا ہوں اور میں یہ رقم تم ہی کو لوٹاتا ہوں۔''

اس سلسلے میں تیسری روایت یہ ہے کہ وفات کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بھی دینار یا درہم نہ تھا۔ انہوں نے ترکے میں ایک غلام، ایک اونٹ اور ایک مخملی چادر چھوڑی۔ جس کی قیمت پانچ درہم تھی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ وفات کے بعد ان چیزوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا جائے۔ وصیت کے مطابق جب یہ چیزیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچیں تو وہ رو پڑے اور کہا:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشین پر بہت سخت بوجھ ڈال دیا ہے۔''

ہمیں اس روایت کی صحت میں تامل ہے کیونکہ اس کے بالمقابل اکثر روایات ایسی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑا تھا گو وہ بہت ہی قلیل تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رشتہ داروں کے لیے اپنے ترکے کے پانچویں حصے کی وصیت کی تھی اور کہا تھا کہ جس طرح مال غنیمت میں سے حکومت کو پانچواں حصہ ملتا ہے اسی طرح میرے رشتہ داروں کو بھی میرے مال کا پانچواں حصہ ہی ملنا چاہیے۔ جب بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بجائے پانچویں حصے کے چوتھے حصے کی وصیت کر دیں تو انہوں نے کہا کون شخص نہیں چاہتا کہ اپنے متعلقین کے لیے وافر مال و اسباب چھوڑ کر جائے لیکن اللہ کا حق مقدم ہوتا ہے۔ اگر بجائے پانچویں حصے کے چوتھے حصے کی وصیت کر جاؤں تو تم کہو گے کہ تیسرے حصے کی وصیت کرو اور جو شخص اپنے رشتہ داروں کے لیے تیسرے حصے کی وصیت کرتا ہے وہ اللہ کے لیے کچھ باقی نہیں چھوڑتا۔''

اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ ترکہ نہ چھوڑا تھا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کی ہوئی یہ روایت صحیح مان لی جائے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک بھی دینار اور درہم باقی نہیں چھوڑا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پانچویں حصے کی وصیت کیونکر کی؟ وصیت تو وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پاس مال

ہو خواہ تھوڑا ہو خواہ بہت۔

رسول اللہ ﷺ نے وفات سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک قطعہ زمین مرحمت فرمایا تھا جسے انہوں نے درست کر کے اس میں درخت لگوائے تھے۔ بعد میں انہوں نے یہ قطعہ اپنی بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا۔

''اے میری بیٹی! میں یہ بالکل نہیں چاہتا کہ میرے بعد تمھیں مالی اعتبار سے کسی قسم کی تنگی برداشت کرنی پڑے۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم بافراغت زندگی بسر کرو پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ جو قطعہ زمین میں نے تمھیں دیا تھا وہ تم مجھے واپس کر دو تاکہ میں احکام وراثت کے مطابق اسے تمہارے بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم کر دوں۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کی صرف ایک بہن تھی۔ وہ بہت حیران ہوئیں کہ بہنوں کا کیا مطلب۔ انہوں نے والد سے اس کی وضاحت چاہی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تمہاری سوتیلی والدہ حبیبہ بنت خارجہ کو حمل ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوگی۔

اس روایت سے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ترکے کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔

تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق بھی ورثاء کو وصیت کر دی تھی۔ ان کی ہدایت تھی کہ انہیں دو کپڑوں میں کفن دیا جائے جو وہ بالعموم پہنا کرتے تھے کیونکہ نئے کپڑے پہننے کا زیادہ حق دار زندہ شخص ہے۔ (تجہیز و تکفین کے متعلق متعدد روایات مروی ہیں اور وہ تمام عائشہ رضی اللہ عنہا سے منسوب ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے وہ ایک کپڑا پہنے رہا کرتے تھے۔ وفات کے وقت انہوں نے کہا جب میں وفات پا جاؤں تو میرا یہ کپڑا دھو کر اور دو نئے کپڑے اس سے ملا کر مجھے کفن دیا جائے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں ''میں نے کہا ہم تین کپڑے نئے کیوں نہ لے لیں؟'' انہوں نے فرمایا: ''نہیں بیٹی! کفن تو اس لیے ہوتا ہے کہ خون اور پیپ وغیرہ جسم سے نکلے تو اس میں جذب ہو جائے۔ نئے کپڑے پہننے کا زیادہ حق دار زندہ شخص ہے۔'' ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کتنے کپڑوں میں دفن کیا گیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا ''تین میں۔'' آپ نے فرمایا ''میرے یہ دونوں کپڑے دھو لینا اور ایک کپڑا ساتھ ملا کر ان میں مجھے کفن دے دینا۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ''ابا جان! ہم میں اتنی استطاعت ہے کہ ہم نئے کپڑوں میں آپ کو کفن دے سکیں۔'' انہوں نے فرمایا ''اے میری بیٹی! زندہ شخص نئے کپڑے کا زیادہ حق دار ہے۔ کفن تو اس لیے ہوتا ہے کہ پیپ وغیرہ اس میں جذب ہو جائے۔'' ان کے علاوہ اور بھی روایات ہیں جو طبقات ابن سعد میں درج ہیں۔))

غسل اسماء بنت عمیس دیں اور اگر وہ اکیلی یہ کام نہ کر سکیں تو اپنے بیٹے عبدالرحمن کو بھی ساتھ

ملالیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق ہدایات دینے میں مشغول تھے کہ مثنیٰ عراق سے مدینہ پہنچے اور باریابی کی اجازت چاہی۔ انہوں نے باوجود حد درجہ نقاہت کے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ مثنیٰ نے درخواست کی کہ عراق کی صورت حال کے پیش نظر ان لوگوں کو اسلامی فوج میں داخل ہونے کی اجازت دے دیجئے جو مرتد ہو گئے تھے اور اپنے کیے پر پشیمان ہیں۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے مثنیٰ کی مدد کے لیے فوج روانہ کر دو، میری وفات تمھیں ایسا کرنے سے مطلق نہ روکے۔

وفات:

نزع کے وقت ان کی بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا ان کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے باپ کی یہ حالت دیکھ کر حاتم کا یہ شعر پڑھا:

لعمرك مايغني الثراء عن الفتى
اذ حشرجت يوماً وضاق بها صدر

جب (نزع کی حالت طاری ہوتی ہے اور سینہ سانس نہ آنے کی وجہ سے گھٹنے لگتا ہے تو دولت انسان کے کام نہیں آتی۔)

یہ شعر سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غصے سے عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھا اور کہا:

''بیٹی! اس کے بجائے یہ لفظ پڑھ:

وجاءت سكرة الموت بالحق ذالك ما كنت منه تحيد

(نزع کی حالت طاری ہوگئی، یہ وہ وقت ہے جس سے تو خوف کھایا کرتا تھا)

ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے سرہانے بیٹھ کر یہ شعر پڑھا:

وكل ذي غيبة يووب
وغائب الموت لايووب

(ہر جانے والے کی واپسی کے لیے امید کی جا سکتی ہے مگر اس شخص کی واپسی ناممکن ہے جسے موت ساتھ لے جائے۔)

ایک روایت میں مذکور ہے کہ یہ شعر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پڑھا تھا۔ آخری بات جو ان کے منہ سے نکلی وہ یہ دعا تھی:

رب توفني مسلما والحقني بالصالحين

(اے میرے پروردگار! مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دینا اور مرنے کے بعد مجھے صالحین کے پاس پہنچا دینا۔)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ (مطابق ۲۲ اگست ۶۳۴ء) پیر کو سورج غروب ہونے کے بعد ہوئی اور اسی رات انہیں دفن کر دیا گیا۔ وفات کے وقت ان کی حضرت عمر تریسٹھ برس کی تھی۔ وصیت کے مطابق ان کی بیوی اسماء بنت عمیس نے انہیں غسل دیا اور ان کے بیٹے عبدالرحمن نے جسم پر پانی ڈالا۔ اس کے بعد ان کی نعش اسی چار پائی پر رکھ کر مسجد نبوی میں لے گئے جس پر رسول اللہ ﷺ کا جسد اطہر اٹھا کر قبر میں اتارا گیا تھا۔

مسجد نبوی میں ان کا جنازہ رسول اللہ ﷺ کے مزار اور منبر کے درمیان رکھا گیا۔ نماز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ اس کے بعد جنازہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں لے گئے جہاں رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں ان کے لیے قبر تیار کی گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ ساتھ گئے۔ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے حجرے میں داخل ہونا چاہا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ”جگہ نہیں۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں اس طرح دفن کیا گیا کہ ان کا سر رسول اللہ ﷺ کے کندھوں کے متوازی تھا۔ قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد سب لوگ باچشم گریاں حجرے سے باہر نکل آئے اور خلیفہ رسول اللہ ﷺ کو رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں چھوڑ آئے۔ زندگی بھر دونوں ساتھ رہے۔ یہ رفاقت مرنے کے بعد بھی ختم نہ ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کا سب سے محبوب خادم اپنے آقا کے برابر ہی آرام کر رہا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات سے مدینہ تھرا اٹھا اور لوگوں پر کرب و اضطراب کی وہی کیفیت طاری ہوگئی جس کا نظارہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت دیکھنے میں آیا تھا۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے آئے اور دروازے پر کھڑے ہو کر کہنے لگے:

”اے حضرت ابوبکر! اللہ تم پر رحم کرے۔ واللہ! تم پہلے آدمی تھے جس نے رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا تھا۔ ایمان و اخلاص میں تمہارا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ خلوص و محبت میں تم سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اخلاق، قربانی اور ایثار اور بزرگی میں تمہارا ثانی کوئی نہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت تم نے کی اور رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں جس طرح ثابت قدم رہے اس کا بدلہ اللہ ہی تمھیں دے گا۔ جب ساری قوم رسول اللہ ﷺ کی تکذیب میں مشغول تھی تو تم نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ جب ساری قوم آپ کو اذیتیں پہنچانے کے درپے تھی تو تم نے آپ کی حفاظت کی۔ جب رسول اللہ ﷺ کی باتوں پر لوگ مطلق کان نہ دھرتے تھے تو تم نے آپ سے مل کر اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ تمھیں اللہ نے اپنی کتاب میں ”صدیق“ کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ فرماتا ہے ”والذی جاء بالصدق و صدق بہ“ (اے کافرو! اس شخص کے حالات پر غور کرو جو تمہارے پاس صدق و یقین سے بھرپور باتیں کرنے آیا ہے (رسول اللہ ﷺ) اور اسے بھی دیکھو جو ان باتوں کی تصدیق کرتا ہے (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ)۔ واللہ! تم اسلام کے حصن حصین تھے۔ کافروں کے لیے تمہارا وجود ... تھی اور تمہاری

بصیرت اور فہم و فراست کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمہاری سرشت میں کمزوری کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔ تم ایک پہاڑ کی مانند تھے جسے تند و تیز آندھیاں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔ اگرچہ تم جسمانی لحاظ سے کمزور تھے لیکن دینی لحاظ سے جو قوت تمہیں حاصل تھی اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ تم اپنے آپ کو بندہ پر تقصیر سمجھتے تھے لیکن اللہ کے نزدیک تمہارا مرتبہ بے حد بلند تھا۔ تم دنیا والوں کی نظروں میں واقعی ایک جلیل القدر انسان تھے اور مومنوں کی نگاہوں میں انتہائی رفیع الشان شخصیت کے مالک۔ لالچ اور نفسانی خواہشات تمہارے پاس بھی نہ پھٹکتی تھیں۔ ہر کمزور انسان تمہارے نزدیک اس وقت تک قوی تھا اور ہر قوی انسان اس وقت تک کمزور، جب تک تم قوی سے کمزور کا حق لے کر اسے نہ دلوا دیتے تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں تمہارے اجر سے محروم نہ رکھے اور ہمیں تمہارے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑ دے بلکہ ہمارے سہارے کے لیے کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے۔" ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا "اے ابا جان! اللہ آپ کے چہرے کو ترو تازہ رکھے اور دین اسلام کو آفات و مصائب سے بچانے کے لیے جو مساعی آپ نے کی ہیں ان کا بہتر بدلہ آپ کو دے۔ آپ نے اس فانی دنیا کو چھوڑ کر اسے ذلیل کر دیا ہے اور آخرت کو اپنے دم سے عزت بخشی ہے۔ آپ کی وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارے لیے سب سے زیادہ دردناک حادثہ ہے۔ اللہ نے اپنے کلام میں بندوں کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کے بدلے بہترین انعامات کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے ہم بھی آپ کی وفات پر صبر و استقامت کا اظہار کرتے ہیں اور اللہ سے ان انعامات کے طالب ہیں جو اس نے صبر کرنے کے بدلے میں ہم سے کر رکھے ہیں۔ اللہ آپ پر اپنی رحمت اور سلامتی نازل فرمائے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو اس صدمے کے باعث گفتگو کا یارا ہی نہ رہا تھا۔ وفات کے بعد جب وہ حجرے میں داخل ہوئے تو صرف یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل سکے: "اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تمہاری وفات نے قوم کو سخت مصیبت اور مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہم تو تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، تمہارے مرتبے کو کس طرح پا سکتے ہیں؟"

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر مدینہ سے باہر قبائل عرب میں پھیلی تو کوئی دردمند آنکھ ایسی نہ تھی جو اس سانحہ عظیمہ کے باعث پرنم نہ ہوئی ہو۔ جب مکہ میں یہ خبر پہنچی تو وہاں بھی ہر طرف سے آہ و شیون کی آوازیں آنے لگیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ اس وقت تک زندہ تھے۔ جب انہوں نے گریہ و زاری کی آوازیں سنیں تو لوگوں سے واقعہ پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کا لڑکا فوت ہو گیا۔ یہ سن کر ان کے دل پر اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ وہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر خاموش ہو گئے اور اس کے بعد اور کوئی بات نہ کی۔ جب لوگوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ترکے میں سے ان کا حصہ ان کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا:

"حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لڑکے اس کے زیادہ حق دار ہیں۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے والد کو بھی زیادہ عرصہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا اور وہ اس

عظیم حادثے کی تاب نہ لاتے ہوئے چھ مہینے بعد وفات پا گئے۔

صحابہ کی بے چینی اور بے قراری یقیناً حق بجانب تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی سر بلندی کی خاطر جو مشکلات اور تکالیف برداشت کیں اور جس طرح اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لیے وقف کیا اس کی نظیر اور کوئی نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنے پاک نمونے سے دوسرے مسلمانوں کے دلوں میں بھی دین کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے ہر قسم کی سختیاں جھیل کر اور ایمان و استقامت اور عزم و استقلال سے کام لے کر اسلام کو ہر امکانی خطرے سے بچایا اور اس راہ میں اپنی جانوں کی بھی پروا نہ کی۔ اللہ نے خلیفہ اول کے عہد میں مومنوں کا امتحان لیا تھا۔ وہ اس امتحان میں پورے اترے اور خلیفہ کے ایمان و ایقان اور مسلمانوں کی جرأت و ہمت ہی کی بدولت اسلام عرب کی حدود سے نکل کر رومی اور ایرانی مقبوضات میں دور دور تک پھیل گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے اللہ جو کام کرانا چاہتا تھا جب وہ پورا ہو چکا تو اس نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جانشین مقرر نہ کرتے تو نہ معلوم اس کا کیا نتیجہ نکلتا۔ یہ آخری کارنامہ جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انجام دیا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کی بدولت اسلام عروج کی آخری منزل تک پہنچ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلام کو جو ترقی نصیب ہوئی اسے دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب خدائی انتخاب تھا جو اسی کی دی ہوئی توفیق سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا۔ اس انتخاب میں زبان حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی لیکن مشیت خدا کی کام کر رہی تھی۔

لاریب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ مقدس وجود تھے جنھوں نے اپنے آپ کو دنیوی آلائشوں سے کلیتہً پاک کر کے خالصتہً اللہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ دونوں کی طبیعتیں مختلف تھیں لیکن مقاصد ایک ہی تھے۔ یعنی عدل و انصاف کا قیام اور اعلائے کلمۃ الحق۔ دونوں بزرگوں نے ان مقاصد کے حصول کے لیے اپنی زندگیاں یکسر وقف کر دی تھیں اور دونوں نہایت درجہ کامیاب و کامران ہو کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے۔

اللہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر فضل فرمائے اور انہیں اس دنیا کی طرح بہشت میں بھی اپنی نوازش ہائے بے پایاں سے نواز کر اپنے محبوب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب میں جگہ دے آمین!

حرفِ آخر

میں نے کتاب کے آغاز میں ہی بیان کیا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور ان کے کارنامے ذہن انسانی پر رعب و ہیبت طاری کر دیتے ہیں۔ میری اس رائی کی تائید وہ اصحاب بھی کریں گے جنھوں نے اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھا ہے اور ان عظیم الشان کارناموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے انتہائی مختصر عہد خلافت میں انجام دیئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کی یہ تاریخ درس و موعظت کا بے پایاں دفتر بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور اس کے پڑھنے سے قوموں کے عروج و زوال کا واضح نقشہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

اس قوت دنیا کے پردے پر دو ہی عظیم الشان سلطنتیں تھیں۔ جن میں سے ایک مغربی تہذیب و تمدن، عقائد اور علوم وفنون کی علم بردار تھی اور دوسری مشرقی تہذیب و تمدن، عقائد اور علوم وفنون کا مظہر۔ سلطنت رومہ لاطینی، فینیقی اور فرعونی تہذیب و آثار کا مجموعہ تھی اور سلطنت ایران، ایرانی اور ہندوستانی تمدن اور مشرق بعید کے مذاہب کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ مقدم الذکر سلطنت وسطی یورپ بلکہ اس سے بھی پرے بحیرہ روم کے مشرق تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور مؤخر الذکر مملکت وسطی ایشیا سے لے کر دجلہ اور فرات کے طویل و عریض میدانوں پر محیط تھی۔ ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے درمیان ایک ہولناک اور لق و دق صحرا حائل تھا جہاں دور دور تک روئیدگی کا نام ونشان تک نہ ملتا تھا۔ یہ ریگستان جسے صحرائے شام کہا جاتا ہے، ان خانہ بدوش قبائل کا مسکن تھا جو جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر رومی اور ایرانی سرحدوں پر آباد ہو گئے تھے۔ یہ دونوں عظیم قوتیں کبھی چین سے نہ بیٹھتی تھیں بلکہ ہمیشہ جنگ و جدل میں مصروف اور آئے دن ایک دوسری کے خلاف طاقت وقوت کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں۔ صدیوں سے ان کا یہی مشغلہ چلا آرہا تھا اور دنیا پر اپنی عظمت و ہیبت کا سکہ بٹھانے کے لیے حرب و پیکار کے سوا اور کوئی وسیلہ ان کے پاس نہ تھا۔

باہم جنگ و جدل کا سبب یہ نہ تھا کہ ان سلطنتوں میں افلاس و ناداری نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور تنگ دستی دور کرنے کی غرض سے انہوں نے ایک دوسرے کے علاقے پر دست درازی و غارت گری کو وطیرہ بنا رکھا تھا بلکہ اس کے برعکس یہ سلطنتیں بے حد خوش حال تھیں۔ ان کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ سرسبز و شاداب علاقے اور سونا اگلنے والی زمینیں ان کے قبضے میں تھیں۔ ہر قسم کی صنعتیں ان ملکوں میں فروغ پا رہی تھیں۔ علم و ادب کے چشمے ہر طرف جاری تھے۔ غرض دونوں سلطنتوں کو کسی چیز کی قلت نہ تھی۔ وہاں کے

باشندے ہر قسم کی نعمتوں سے مالا مال تھے۔ اور بافراغت زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ہر سلطنت یہ خیال کرتی تھی کہ ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ اسی ذہنیت کے زیر اثر وہ دوسروں کا مال غصب اور لوٹ مار کا بازار گرم کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہ سمجھتی تھیں بلکہ اسے فرض اولین خیال کرتی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ دونوں سلطنتیں متواتر سات سو سال تک ایک دوسرے سے برسر پیکار رہیں۔ کبھی ایک سلطنت کو فتح حاصل ہو جاتی تھی اور کبھی دوسری حکومت خوشی کے شادیانے بجاتی دوسرے کے علاقے پر قابض ہو جاتی تھی۔ لیکن فتح و شکست کے اس پیہم سلسلے کے باوجود دوسری اقوام کے دلوں سے ان کی ہیبت کم نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ جو فریق آج کسی کمزوری کی وجہ سے شکست کھا گیا ہے وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک اس شکست کا انتقام لے کر فاتح قوم پر اپنی برتری ثابت نہ کر دے گا۔ جو آج غالب ہے، وہ کل مغلوب ہوگا اور جو آج مغلوب ہے وہ کل غالب آجائے گا اور فتح و شکست کا سلسلہ باری باری چلتا جائے گا۔

اس زمانے میں، جب ہر جگہ ان دونوں سلطنتوں کا غلغلہ بلند تھا ہر طرف انہیں کی ثقافت کا ڈنکا بج رہا تھا، عرب کی سرزمین سے ایک بظاہر غیر مہذب قوم اٹھی اور آن کی آن میں ربع مسکون پر چھا گئی۔ یہ ایسا حیرت آفرین واقعہ تھا جس کی تہ کو کوئی نہ پہنچ سکا۔ کسی کے سان گمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ عرب کی سنگلاخ سرزمین سے ایک ایسی امت و ملت جنم لے سکتی ہے جو ایران اور رومیہ کے اقتدار اور ان کی صدیوں پرانی تہذیب کو آن کی آن میں پیوند خاک کر دے۔ کون خیال کر سکتا تھا کہ اس سرزمین سے تہذیب و تمدن کے سوتے پھوٹ سکتے ہیں۔ سوتے پھوٹنا تو بڑی بات ہے وہاں سے علم و عمل کی کوئی ہلکی سی کرن بھی ضوفشاں ہو سکتی ہے۔ جس کے باشندوں کی حیثیت کسریٰ شاہ فارس کے نزدیک اونٹوں اور بکریوں کے چرواہوں سے زیادہ نہ تھی اور قیصر روم بھوکے اور ننگے کا لقب دے کر جن کی تذلیل کرتا تھا کیا یہ بھوکی، ننگی، مویشی چرانے والی قوم، جس کی طرف اہل ایران اور اہل رومہ حقارت کی وجہ سے آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے، ایسے فرزند پیدا کر سکتی تھی جو کسریٰ اور قیصر کی سلطنتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتے؟

لیکن یہ سب منصہ شہود پر آیا۔ اس قوم نے انتہائی کسمپرسی کی حالت سے ترقی کی، بہت ہی قلیل عرصے میں عرب کی سرزمین سے نکل کر قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مقابل صف آرا ہو گئی اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک دونوں مملکتوں کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل نہ کر دیا۔ آپ نے اس کتاب میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ عرب ان سلطنتوں پر جنگی ساز و سامان کی برتری یا تعداد کی زیادتی کے باعث غالب نہ آئے بلکہ یقین محکم اور عزم راسخ کی بدولت کامیاب و کامران ہوئے اور اسی ایمان و یقین نے اس اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس نے متواتر دس صدیوں تک اقصائے عالم میں علم و عرفان کا چراغ روشن کیے رکھا۔ یہی چراغ تھا جس نے اہل یورپ کو روشنی بخشی اور انہیں جہالت کے اتھاہ اندھیروں سے نجات دلا کر علم و عمل کی وہ راہ دکھائی جس پر آج وہ

گامزن ہیں۔ اسلام نے اپنا دائرہ عرب، ایران اور شام ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ اس نے ایشیا میں ہند، چین اور ترکستان، افریقہ میں مصر، تیونس، الجزائر اور مراکش اور یورپ میں روس، اطالیہ اور ہسپانیہ تک ضوفشانی کی اور ان علاقوں کی پیاسی سرزمین کو باران رحمت سے سیراب کیا۔

اس معجزے کا ظہور کس طرح ہوا اور تہذیب و تمدن سے کورے، علوم وفنون سے نا آشنا، حقیر و ذلیل عرب کم مائیگی اور قلت تعداد کے باوجود ایران اور روم کی مہذب و شائستہ اقوام پر کس طرح غالب آگئے؟ کیا یہ سب کچھ اتفاقاً واقع ہو گیا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اسلام کا یہ غلبہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا جس کی نظیر اقوام عالم کی تاریخ میں ملنا غیر ممکن ہو۔ اگر بہ فرض محال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بعض اتفاقی حوادث کی وجہ سے مسلمانوں کو عدیم النظیر کامیابی نصیب ہو بھی گئی تھی تو لازماً اس کا اثر صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد تک محدود رہنا چاہیے تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی فتوحات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ مسلمانوں کو سلطنت ایران اور سلطنت روم کے مقابلے میں روز افزوں کامیابیاں نصیب ہوتی چلی گئیں اور کوئی طاقت انہیں آگے بڑھنے سے روک نہ سکی۔ اس لیے ان کامیابیوں کو اتفاقی حوادث کا نام دے کر ان کے اصل اسباب نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

واقعات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو کچھ پیش آیا وہ طبع دوراں کے اقتضاء کے عین مطابق تھا۔ زمانے کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ افراد کی طرح قوموں پر بھی لازماً انحطاط کا زمانہ آتا ہے اور جس قوم پر انحطاط کا دور آجائے فتنہ و فساد اور شورش و اضطراب اس میں راہ پا کر اس کی زندگی کا خاتمہ نزدیک لے آتے ہیں۔ اس وقت اس زوال پذیر طاقت کی جگہ لینے کے لیے ایک اور قوم کھڑی ہو جاتی ہے اور جو پرانی ثقافت کے آثار کو مٹا کر ایک نئی ثقافت کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔

اس کتاب میں پہلے بھی کئی بار شورش و اضطراب کے ان عوامل کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے جو بارہا فارس اور روم میں برپا ہوتے رہتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان عوامل نے اثر دکھانا شروع کیا اور فارس میں فتنہ و فساد نقطہ عروج تک پہنچ گیا۔ اس زمانے میں وہاں ہر جانب بدنظمی اور ابتری کا دور دورہ تھا۔ تخت شاہی کے متعدد دعوے پیدا ہو گئے تھے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے اختیار کیے جا رہے تھے اور خود غرضی لوگوں کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی۔ اس فساد کا اثر دوسرے شعبہ ہائے حیات پر بھی پڑا۔ ملک کے باشندے اتحاد و اتفاق کی دولت کھو بیٹھے۔ گروہ بندیاں قائم ہو گئیں۔ مختلف جھگڑے جنم لینے لگے اور لوگوں کے عقائد میں انتشار پیدا ہو گیا۔ یگانگی اور اخوت کی جگہ عصبیت اور مذہبی و سیاسی گروہ بندیوں نے لے لی۔ اس لیے جو بھی گروہ برسر اقتدار آجاتا وہ مخالفین کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے سے نہ چوکتا اور دوسروں کو مال و دولت اور جاہ و جلال سے محروم کر کے ہر قسم کا آسائش و آرام اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا۔ یہ انتشار اس امر کا متقاضی تھا کہ سلطنت ایران کی صف لپیٹ دی جائے، خدائی نعمت اس سے چھین لی جائے اور اس قوم کے حوالے کر دی جائے جو خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کرنا جانتی ہو۔

سلطنت رومہ کا حال بھی ایرانی سلطنت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مذہبی مناقشات اور حصول اقتدار کا سلسلہ وہاں بھی جاری تھا۔ مختلف عیسائی فرقوں کے درمیان لامتناہی اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور ہر فرقہ اپنے عقائد دوسرے فرقے کے لوگوں پر زبردستی ٹھونسنا چاہتا تھا۔ حصول اقتدار کی خواہش بھی وہاں کے سرداروں کو بے چین کیے ہوئے تھی اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے سر پھٹول اور جنگ و جدل کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں بھی ضعف و انحطاط کے آثار ہویدا ہونے لگے۔ گو جسٹینین نے بالغ نظری، اثر و رسوخ، عدل و انصاف اور زور و قوت کے بل بوتے پر سلطنت رومہ کے نیم مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونکنے کی کوشش کی لیکن بیماری اس قدر بڑھ چکی تھی اور ضعف اس حد تک سرایت کر چکا تھا کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور جانشینوں کے عہد میں سلطنت کی حالت برابر ابتر ہوتی چلی گئی۔ اس کے جانشینوں میں نہ وہ حکمت عملی تھی اور نہ وہ بالغ نظری، نہ وہ اثر و رسوخ تھا نہ وہ زور قوت جس کے بل بوتے پر سلطنت کی بگڑی ہوئی حالت بنا سکتے۔

ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں فوکاس سریر آرائے سلطنت ہوا اور اس نے ڈنڈے کے زور سے ملک پر حکومت کرنی شروع کی لیکن یہ حکومت اسے راس نہ آئی۔ کچھ عرصے کے بعد سلطنت رومہ کے افریقی مقبوضات کے حاکم ہرقل نے فوکاس کے خلاف بغاوت کر دی اور اسے قتل کر کے خود سلطنت پر قابض ہو گیا۔ فوکاس کے آخری اور ہرقل کے ابتدائی عہد حکومت میں رومیوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ایرانیوں نے سلطنت رومہ کے بہت سے حصے پر قبضہ جما لیا تھا۔ جب ہرقل کی حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی تو اس نے چھنے ہوئے مقبوضات کو رومی عمل داری میں واپس لانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ چنانچہ ایک بار پھر رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ چھڑ گئی جس میں انجام کار رومیوں کو فتح نصیب ہوئی اور ہرقل نے اپنے تمام مقبوضات ایرانیوں سے واپس لے لیے۔ اس طرح ہرقل کی قوت و طاقت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا اور لوگ خیال کرنے لگے کہ جسٹینین کا عہد لوٹ کر آ گیا ہے۔

بیرونی دشمن پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل نے سلطنت کی اندرونی حالت کو مستحکم کرنا چاہا ملک کے استحکام میں سب سے بڑی رکاوٹ ناانصافی اور سلطنت کے باشندوں کی باہمی عداوت نے ڈال رکھی تھی۔ عیسائی بے شمار فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کا جانی دشمن تھا ہرقل نے اس رکاوٹ کو دور کرنے اور مذہبی اختلاف مٹا کر سلطنت کے تمام باشندوں کو ایک ہی مذہب پر جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس غرض کے لیے اس نے جو طریق کار اختیار کیا اس نے تمام فرقوں کے لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکا دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہرقل ہمارے فرقے اور مذہب کی بیخ کنی پر تلا ہوا ہے اور تمام لوگوں کو بہ جبر اپنے فرقے میں داخل کرنے کا خواہاں ہے تو وہ اس کے مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوئے اور سارا ملک مہیب خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ اس طرح ہرقل نے جس طریق کار کو اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے مفید خیال کیا تھا وہی اس کی سلطنت کے ضعف کا باعث بن گیا۔

یہ تھے وہ عوامل جن کی بنا پر دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتوں کو عروج کی آخری منزل تک پہنچنے کے بعد آخر ضعف و اضمحلال سے ہمکنار ہونا پڑا۔ گردش ایام کا تقاضا یہ تھا کہ ان نحیف و نزار اقوام کی جگہ نئی امنگوں سے بھرپور ایک اور قوم کھڑی ہوتی جو حیرت انگیز کارناموں کی بدولت دنیا کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی۔ عروج و زوال کے طبعی قوانین کے ماتحت اس نئی قوم کے مقدر میں اس وقت تک کامیابی کے مراحل طے کرنے لکھے تھے جب تک وہ حقیقتاً پیغام الٰہی کی حامل رہتی اور دنیا کو اس کی پیروی میں اپنی نجات کے سامان نظر آتے۔

انسان کی آزادی اور خود مختاری کا چھن جانا اس کے لیے مادی تکالیف سے بدرجہا زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ آزادی پر قدغن عائد ہونے اور ضمیر کی حیرت کا گلا گھونٹ دینے والے قوانین و عقائد سے انسانی ذہن پر جمود کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور انسان غور و فکر کی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں شگفتگی مطلق باقی نہیں رہتی۔ اطمینان اور سکون کی کیفیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ جب قوم کے افراد دیکھتے ہیں کہ ان کی آزادی چھینی جا رہی ہے، ان کے افکار و خیالات اور عقائد و اعمال پر قیود عائد کی جا رہی ہیں تو ان کے دل و دماغ میں باغیانہ خیالات پیہم گردش کرنے لگتے ہیں، باغیانہ روح ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مقصد براری کے لیے ہر قسم کے جائز و ناجائز وسائل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لاریب جب کسی قوم کے فکر و نظر پر پابندیاں عائد کر دی جائیں اور انسانی ذہن کو منجمد کر کے اسے اپنے کمالات ظاہر کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو اسی وقت سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور ترقی کی رفتار آہستہ آہستہ بالکل رک جاتی ہے۔

ترقی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ فکر و نظر کے دروازے کھلے ہوں اور ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہو، تاریخ ارتقائے عالم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے بنی نوع انسان کی ترقی کا راز آزادی فکر و عمل میں مضمر رہا ہے۔ ہمارے اولین اسلاف کا جو جنگلوں اور پہاڑوں کی کھوہوں میں زندگی بسر کرتے تھے، شب و روز جنگلی جانوروں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا ان خون خوار درندوں کے مقابلے میں وہ اس لیے کامیاب ہو جاتے تھے کہ وہ ذہنی آزادی کے سبب ایسے ہتھیار ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ان جانوروں کے مقابلے میں کارآمد ثابت ہو سکیں۔ اس کے بعد جب بنی نوع انسان کی پہلی جماعت جنگلوں اور پہاڑوں کی کھوہوں سے نکل کر دریائے نیل کے کنارے آباد ہوئی اور پہلی بار دنیا میں تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی گئی تو فطرت انسان نے لوگوں کو ایسے نظام کی ضرورت کا احساس دلایا جس کے ذریعے سے امن و امان اور حریت عمل کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے بعض اصول و ضوابط مرتب کیے اور ہر شخص کے لیے ان پر عمل پیرا ہونا اور ان کا احترام کرنا لازم قرار دیا۔ جب ذہن انسانی نے ترقی کی مزید راہیں طے کیں اور قدرت کے بعض اور راز اس پر منکشف ہوئے تو انسانی ضمیر نے انگڑائی لی، انسان کے لیے غور و فکر کے راستے کھل گئے اور ان راستوں کی بدولت اس نے علم و ادب اور فنون تک رسائی حاصل کر لی۔ انسانی ذہن اسی طرح کبھی ترقی کی منازل طے کرتا اور کبھی تنزل کی راہوں پر قدم مارتا رہا۔ جب

کبھی انسان نے عقل وخرد کا آزادانہ استعمال کیا ترقی نے آگے بڑھ کر اس کے قدم چومے لیکن جب عقل پر جمود کی کیفیت طاری ہوگئی تو ترقی بھی رک گئی۔ آزادی فکر ونظر کی بدولت عجیب وغریب ایجادیں عمل میں آئیں۔ انسان نے کائنات کو مسخر کرنے کے لیے پروگرام تیار کیے۔ علم وعمل کی راہیں کھلیں۔ غرض ترقی کی منازل تیزی سے طے ہوتی رہیں اور انسان کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ لیکن جب انسانی ذہن پر قیود عائد کر دی گئیں یا اس نے خود اپنے آپ پر عقل وفکر کے دروازے بند کر لیے تو کاروان انسانیت کے بڑھتے ہوئے قدم بھی رک گئے اور ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں۔

یہی حال ایرانیوں اور رومیوں کا بھی ہوا۔ جب تک ان میں فکر وعمل کی آزادی برقرار رہی وہ ترقی کے زینے طے کرتے چلے گئے لیکن جب حریت فکر اٹھ گئی اور لوگوں کے ذہنوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے تو ترقی کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا اور ان کی عظیم الشان تہذیب آہستہ آہستہ نابود ہونے لگی۔ خدائی قانون کے تحت ضروری تھا کہ ایک اور تہذیب ان مٹتی ہوئی تہذیبوں کی جگہ لے۔ یہ شرف ازل سے عربوں کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اللہ نے محمد مصطفی ﷺ کو اس غرض کے لیے چنا اور آپ کے ہاتھ سے اس تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی گئی جس نے ایرانی اور رومی تہذیب وتمدن کی جگہ لے کر دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں آ کر بت پرستی اور آتش پرستی میں جکڑے ہوئے انسانوں کو ان بھاری زنجیروں سے نجات دلائی اور تلقین کی کہ اگر وہ اپنے لیے ترقی کی راہیں کھولنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ غور وفکر کو کام میں لائیں اور آسمان وزمین کی لاتعداد طاقتوں اور قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اپنے فائدے کی خاطر استعمال کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے دنیا کے سامنے جو تعلیم پیش کی تھی وہ ان لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھی جنھوں نے سادہ لوح عوام کو پھانس کر انہیں بے بنیاد توہمات، عقائد اور رسوم کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ بھلا کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے پیرو انہیں چھوڑ کر ایک نیا راستہ اختیار کریں۔ اس لیے انہوں نے آپ کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا اور سالہا سال تک آپ سے جنگوں میں مصروف رہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی طرف سے عزم راسخ عطا ہوا تھا۔ آپ نے نہایت پامردی سے ان کا مقابلہ کیا اور اس وقت تک میدان مبارزت میں موجود رہے جب تک اللہ نے اپنے دین کو کامل فتح عطا نہ فرما دی۔ مشیت ایزدی یہی تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ کی پیش کردہ تعلیم کو فروغ حاصل ہو اور وہ اپنی سادگی و پاکیزگی کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے ہی اسلام اقصائے عرب میں پھیل گیا اور سارے ملک سے بت پرستی کا مکمل خاتمہ ہوگیا۔

رسول اللہ ﷺ ہی کے زمانے سے مخصوص نہیں بلکہ ہر دور میں جب بھی حق وصداقت کی آواز بلند ہوئی، اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا اور علم برداران حق کو ان لوگوں کے ہاتھوں سخت تکالیف برداشت کرنی پڑیں جنھیں اپنی لیڈری ان آسمانی تحریکوں سے ختم ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ حق و باطل

کے درمیان یہ آویزش ابتدائے آفرینش سے اب تک جاری ہے۔

پھر بھی اس سلسلے میں ایک فریق کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ انسانی ضمیر ابھی تک دور طفولیت سے گزر رہا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس کی جو حالت تھی کم وبیش وہی اب بھی ہے۔ اس دوران میں جنگہائے مرتدین اور عراق و شام کے سوا باقی جتنی جنگیں ہوئیں ان کا مقصد تو کچھ اور تھا لیکن دنیا پر یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ جنگیں حریت، عدل و مساوات اور اخوت کے قیام کے لیے لڑی جارہی ہیں۔ سادہ لوح عوام ہمیشہ عدل و انصاف اور مساوات کا بلند بانگ دعویٰ کرنے والے لیڈروں کے دام تزویر میں پھنستے رہے۔ انہوں نے ایک خوش آئند مستقبل کے حصول کی خاطر لیڈروں کے ساتھ جنگوں میں شریک ہو کر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور جانیں تک قربان کرنے سے نہ ہچکچائے۔

جنگوں کے اختتام پر لوگوں کو بجا طور پر یہ امید ہوتی تھی کہ ان سے کیے ہوئے وعدے پورے کیے جائیں گے اور جن اصولوں کے قیام اور بقا کی خاطر انہوں نے جنگ میں شرکت کی تھی انہیں لباس عمل پہنایا جائے گا لیکن ہمیشہ ہی لوگوں کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا اور آخر ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان کے لیڈروں اور حاکموں کے سامنے صرف ذاتی مفاد تھا اور اس ذاتی مفاد اور مادی اغراض کے حصول کے لیے انہوں نے سینکڑوں ہزاروں جانیں میدان جنگ میں تلف کرا دیں۔ ان کے عدل و انصاف اور حریت و مساوات کے قیام کے وعدے جھوٹے تھے اور ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہ تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ بیشتر جنگیں جو عدل و انصاف اور حریت و مساوات کے نام پر لڑی گئیں ان کا فائدہ صرف خود غرض، لالچی اور حریص لیڈروں کو پہنچا۔ انہوں نے ذاتی مطلب براری کے لیے عوام الناس کو جنگ کے شعلوں میں جھونکا اور ان کی لاشوں پر اپنے لیے عالی شان محل تعمیر کر لیے۔

عوام الناس کے بار بار دھوکا کھانے کی وجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ انسانی ضمیر ہنوز عالم طفلی میں ہے۔ بچہ جب چلنے کی کوشش کرتا ہے تو لڑکھڑاتا ہے اور بار بار زمین پر گرتا ہے لیکن باز نہیں آتا۔ ایک مرتبہ زمین پر گرنے کے بعد اٹھتا ہے پھر لڑکھڑاتا ہوا چلنے لگتا ہے۔ دوبارہ گرتا ہے پھر اٹھتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن یہ لغزشیں بچے کو توازن قائم کرنا سکھاتی ہیں اور آخر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ باقی نہیں رہتی اور وہ بالکل سیدھا ہو کر چلنے لگتا ہے۔ عالم طفلی سے نکل کر وہ جوانی کی عمر تک پہنچتا ہے اور جوانی کا زمانہ گزار کر بڑھاپے کی عمر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس طرح بچہ لڑکھڑانے اور بار بار منہ کے بل زمین پر گرنے کے باوجود اٹھنے اور دوبارہ چلنے سے باز نہیں آتا اور یہی لغزشیں آخر اس کی چال میں توازن پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہیں اسی طرح اقوام عالم کا حال ہے۔ فارس اور روم کی سلطنتوں کے اوندھے منہ زمین پر آگرنے سے انسانیت کو ایک زبردست دھکا لگا۔ لیکن یہی دھکا اس کے لیے باعث رحمت ثابت ہوا۔ ان عظیم الشان سلطنتوں کی جگہ اسلامی سلطنت کی صورت میں دنیا کے لیے امن و راحت کا سامان پیدا ہو گیا اور انسانی ضمیر کو پختگی حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ اسلام نے آ کر انسانیت کی لاج

رکھ لی اور حریت و مساوات کا وہ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے جزیرہ نمائے عرب کو نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے لیے کیوں چنا اور اس خطہ زمین کو اپنے غیر مختتم انوار کے نزول کے لیے کیوں منتخب فرمایا؟

اس سوال کا قطعی اور یقینی جواب دینا تو ہمارے بس کی بات نہیں لیکن اقوام عالم کے سلسلہ عروج و زوال پر نظر ڈالنے سے ہمیں اس امر کا تھوڑا سا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ کیوں اللہ نے اپنی مشیت سے جزیرہ نمائے عرب کو اس غرض کے لیے چنا۔

مصر، یونان، اشور اور روما کی سرزمین صدیوں سے انسانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ دنیا کے دوسرے خطوں میں علم و فضل اور تہذیب و تمدن کی جو روشنی نظر آ رہی تھی وہ سب انہیں علاقوں سے فیضان حاصل کرنے کا نتیجہ تھا۔ ان علاقوں میں عقل انسانی پختگی کی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ دوسرے ممالک کے لوگ اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اسی لیے فارس اور روم کی سلطنتیں اپنے زمانے میں دنیا بھر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں۔ مگر عروج و زوال کے طبعی قوانین کے تحت آخر ان سلطنتوں پر بھی زوال آ گیا اور تہذیب و تمدن اور علم و شائستگی کے چراغ کی روشنی، جو صدیوں سے ایک عالم کو منور کر رہی تھی، آہستہ آہستہ مدہم پڑنی شروع ہو گئی۔ جزیرہ نمائے عرب ایران اور روم کے متصل واقع تھا۔ چونکہ یہ علاقے صدیوں سے تہذیب و تمدن اور علم و شائستگی کے مرکز تھے اس لیے ان میں کتنا ہی ضعف و اضمحلال راہ پا جاتا پھر بھی یہ امید کی جا سکتی تھی کہ اگر اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر مشتمل کوئی تعلیم ان کے سامنے پیش کی جائے گی تو وہ نہ صرف اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہ کریں گے بلکہ پہلے کی طرح اسے دوسرے علاقوں تک پہنچانے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ خدائی نوشتوں میں جہاں ایران و روما کے زوال کی تفصیل مندرج تھی وہاں یہ بھی مذکور تھا کہ ان علاقوں کے بالکل متصل عرب کی آزاد خود مختار سرزمین میں ایک جلیل المنزلت شخصیت معبوث کی جائے گی جسے قبول کرنے میں دنیا کی نجات مضمر ہو گی، عرب سے یہ تعلیم ایران اور روم کے علاقوں میں جائے گی اور وہاں سے دنیا بھر میں پھیلے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے اپنے نوشتوں کے مطابق عرب کی سرزمین میں اپنے پیغامبر کو معبوث کیا اور کیا بھی اس شہر میں جو اپنے تقدس اور احترام کے لحاظ سے عرب کے تمام شہروں میں منفرد حیثیت رکھتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دے کر اس کے سامنے انسانیت کی اعلیٰ قدریں متعین کر دی تھیں۔ عربوں کے قلوب فتح کرنے کے بعد آپ نے توجہ ایران اور روم کی طرف منعطف کی اور ان لوگوں کو اس شریعت غراء اور آسمانی تعلیم پر ایمان لانے کی دعوت دی جو ہر خطے کے لوگوں کے لیے یکساں مفید اور ہر زمانے کے تقاضوں کو یکسر پورا کرنے والی تھی۔ جب تک آپ زندہ رہے اعلائے کلمۃ الحق کے کام میں تندہی سے مصروف رہے اور اپنے بعد وفادار صحابہ کا ایک ایسا مقدس گروہ چھوڑ گئے جنھوں نے آپ

کا مشن پورا کرنے اور اللہ کا پیغام اقصائے عالم تک پہنچانے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس مقدس گروہ کی قیادت کا شرف حاصل تھا انہوں نے اپنے فرائض جس حق دہی سے انجام دیئے، حق و صداقت کا بول بولا کرنے کے لیے جس جان فشانی سے کام کیا اور تائید دین کی خاطر جن مہیب خطرات کا سامنا کیا انہیں ہم مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے عشق الٰہی، حب رسول، بے نفسی اور اخلاص و استقامت کے جو نمونے دکھائے ان کی نظیر پیش کرنے سے زمانہ قاصر ہے۔ یہ دلیل ہے اس امر کی کہ ان کی ذہنی پختگی کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اگر تمام انسانوں میں اسی طرح ذہنی پختگی پیدا ہو جائے تو لڑائیوں کا نام و نشان مٹ جائے اور دنیا بھر میں امن و امان اور سلامتی کا دور دورہ ہو جائے۔

لیکن ابھی یہ وقت دور ہے۔ لوگوں کی سرشت میں اب بھی یہ بات داخل ہے کہ جب ان سے ان کے آبائی عقائد اور رسم و رواج کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو خواہ وہ کتنی ہی مفید اور دل نشین کیوں نہ ہو، وہ ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے اسے ماننے سے انکار کر دیں گے اور اپنے باپ دادا کے عقائد اور پرانے رسم و رواج پر قائم رہیں گے خواہ وہ کتنے ہی مضحکہ خیز اور بعید از عقل کیوں نہ ہوں۔ وجہ یہی ہے کہ ابھی تک ان کی ذہنی افتاد اس حد تک نہیں پہنچی جسے پختگی سے تعبیر کیا جا سکے۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ شور و غوغا کر کے اور خاندانی عزت و وجاہت کی دہائی دے کر حق و صداقت پر غالب آ سکتے ہیں۔ ان کی حالت بالکل اس بچے کی سی ہوتی ہے جو شور و غل مچا کر اور چیخ و پکار کر کے والدین سے اپنا کہا منوا لیتا ہے لیکن جب ماں باپ دیکھتے ہیں کہ ان کا بچہ بے جا ضد کر رہا ہے اور اس کی بدتمیزیاں حد سے بڑھ رہی ہیں تو وہ اسے سرزنش کرتے ہیں اور بچہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی مرتدین نے اسلامی حکومت کے خلاف شورش برپا کر کے من مانی کرنی چاہی تھی لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بروقت کارروائی سے یہ فتنہ بڑھنے نہ پایا اور جس طرح نافرمان بچے ماں باپ کی گوشمالی کے بعد ان کا کہا ماننے اور اطاعت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اسی طرح مرتد قبائل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جنگی کارروائی کی تاب نہ لا کر ان کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مرتدین کے استیصال سے عرب میں اسلام کا بول بالا تو ہو ہی چکا تھا، اللہ نے چاہا کہ ایران اور روم میں بھی اسلام کے درخت کی آبیاری کرے۔ اس غرض کے لیے اس نے صدہا برس پیشتر سے انتظام شروع کر دیا تھا اور اپنی خاص تقدیر کے تحت جزیرہ عرب کے ہزاروں باشندوں کو ایران اور روم کے درمیان صحرائے شام میں آباد کر کے انہیں بطور بیج کے استعمال کیا تھا۔

ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معجزہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں رونما ہوا اور دو متحارب طاقتوں کی باہمی آویزش کا ثمرہ نہ تھا بلکہ اس خدائی تقدیر کے تحت ظہور پذیر ہوا تھا جسے بہرحال پورا ہو کر رہنا تھا اور جس کے پورے ہونے کے اسباب اللہ نے پہلے ہی سے مہیا کر دیئے تھے۔ اگر جزیرہ نما عرب شام اور عراق کے متصل واقع نہ ہوتا، اگر عربی زبان ان قبائل کی زبان نہ ہوتی جو صدیوں سے صحرائے شام میں مقیم

تھے۔ اگر اللہ عین اس وقت اپنے رسول ﷺ کو مبعوث نہ فرماتا جب زمین علم و عرفان کی پیاس اور عالم نور حق کے لیے بے تاب تھا تو اس دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ نہ رومی اور ایرانی تہذیب کے بجائے اسلامی تہذیب جلوہ گر ہو سکتی اور نہ آفتاب ہدایت اقصائے عالم پر ضوفشاں ہو سکتا۔

جب خدائی مشیت کے پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو اس کے لیے اسباب بھی مہیا ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کے ذریعے سے خدا کی تقدیر کا ظہور مقدر ہوتا ہے ان کی مخفی صلاحیتیں آپ سے آپ ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور دیگر امراء عساکر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اسلامی سلطنت کی تشکیل انہیں لوگوں کے ذریعے سے ہوئی۔ لیکن کیا کوئی شخص خیال کر سکتا ہے کہ اگر اللہ کا ارادہ سرزمین عرب میں ایک حیرت انگیز معجزہ بروئے کار لانے کا نہ ہوتا تو بھی یہ لوگ ایسے ہی عظیم الشان کارنامے انجام دے سکتے جیسے اسلامی فتوحات کے وقت انجام دیئے؟ اگر اللہ کی مشیت کارفرما نہ ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حیثیت عام لوگوں میں ایک معمولی تاجر سے زیادہ نہ ہوتی جسے ہر وقت مال و دولت کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور قوم میں ان کا مرتبہ زیادہ سے زیادہ قبیلہ تیم بن مرہ کی سرداری سے بڑھ کر نہ ہوتا۔ اگر اسلام کا ظہور نہ ہوتا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حیثیت بنی مخزوم اور قریش کے ایک معمولی بہادر آدمی سے زیادہ نہ ہوتی اور تاریخ میں ان کا نام کبھی سکندر اعظم، جولیس سیزر، ہنی بال، چنگیز خان اور نپولین بوناپارٹ جیسے عظیم سپہ سالاروں کے ساتھ نہ لیا جاتا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت نہ ہوتی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا شمار کسی گنتی میں نہ ہوتا اور امیر المومنین کی حیثیت سے جو عظیم الشان کام انہوں نے انجام دیئے اور جس طرح ایران و روم کی سلطنتوں کو تہ و بالا کر دیا ان کا کہیں نام و نشان بھی نظر نہ آتا۔ آج اگر ان لوگوں کا نام تاریخ کے صفحات پر ابدی حیثیت حاصل کر چکا ہے اور ان کے کارنامے درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں تو محض اس لیے کہ یہ لوگ اس مشیت کی عملی تصویر تھے جس کا ظہور ازل سے مقدر ہو چکا تھا۔

مخالفین اسلام اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ میں نے حیات محمد ﷺ میں یہ ثابت کیا تھا کہ قرآن کریم جارحانہ جنگ کی مذمت کرتا ہے اور اسے کسی صورت میں بھی جائز نہیں ٹھہراتا۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔

(اے مومنو! اللہ کے راستے میں جہاد کرو لیکن یاد رکھو! تمہیں صرف ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو تم سے لڑتے ہیں۔ تمہیں بطور خود جارحانہ جنگ چھیڑ دینے کی اجازت نہیں)۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے:

فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین

(جو قوم تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس سے اتنی ہی سختی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم سے کی تھی۔ اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے)۔

اسلام لوگوں کو صلح کی دعوت دیتا ہے۔ ایک دوسرے کی غلطیوں پر عفو اور درگزر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ دشمن سے بھی نرمی کا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ آزادی رائے کا وہ سب سے بڑا علم بردار ہے اور مذہب وعبادات میں کسی قسم کی مداخلت وہ قطعاً برداشت نہیں کرتا۔

اسلام کی اس تعلیم کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اعلیٰ، بلند اور پاکیزہ اصولوں کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو مرتدین سے جنگ کرنے کا حکم کیوں دیا اور عراق وشام کی فتوحات کس غرض سے کی گئیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کی دل وجان سے اطاعت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ خدائی احکام کی خلاف ورزی کا ان پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام اگرچہ رحمت وشفقت، عفو ودرگزر اور صلح وآشتی کا داعی ہے پھر بھی وہ مسلمانوں پر یہ پابندی عائد نہیں کرتا کہ وہ اسلام کی اشاعت کے لیے جبر وتعدی کو کام میں نہ لائیں بلکہ انہیں اجازت دیتا ہے کہ جہاں موقع ہو وہ اس غرض کے لیے سختی اور جبر سے بھی کام لیں اور اس لیے مسلمانوں نے ملکوں اور شہروں پر چڑھائی کی اور وہاں کے باشندوں کو تلوار کے زور سے اسلام میں داخل کیا؟

ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک مرتدین کا تعلق ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے خدائی احکام کے مطابق جنگ کی تھی جو اللہ نے سورۂ برأت میں نازل فرمائے ہیں:

فان تابو اواقاموا الصلوۃ وآتوالزکوۃ فاخوانکم فی الدین و نفصل الایات لقوم یعلمون وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفرانھم لاایمان لھم لعلھم ینتھون۔

(اگر کافر توبہ کر لیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ تم ان سے مسلمانوں کا سا سلوک کرو۔ ہم اپنی آیات گوش وہوش رکھنے والی قوم کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد شکنی کریں اور دین اسلام میں طعنہ زنی کریں تو ان ائمہ کفر سے لڑو کیونکہ ان کی قسمیں ذرا بھی اعتبار کے لائق نہیں۔ شاید اس طرح یہ شرارتوں سے باز آجائیں)۔

اس لیے جب مرتدین عہد شکنی کر کے کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلے میں آگئے اور دین اسلام پر طعنہ زنی شروع کر دی تو خدائی حکم کے مطابق ان سے لڑنا ضروری ہو گیا۔

اسی طرح جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایران اور روم کی طرف اسلامی فوجیں روانہ کیں تو بھی انہوں نے خدائی احکام سے سرمو تجاوز نہ کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کی بقا کے لیے جنگ وجدل بہرحال ضروری ہے اور جب تک تلوار کے ذریعے سے قوموں کو زیر نہ کیا جائے اسلام کے اعلیٰ اور بلند مقاصد پورے ہو ہی نہیں سکتے۔ بات یہ ہے کہ انسانی ضمیر چونکہ ان دنوں عالم طفلی میں سے گزر رہا تھا اس لیے اسے راہ راست پر

لانے اور تربیت دینے کے لیے مناسب حال طریقے استعمال کیے گئے۔کہیں ملامت اور نرمی سے سمجھایا گیا اور کہیں سختی و درشتی سے۔

مسلمانوں نے جب اسلام کے تابندہ اصول دنیا کے سامنے پیش کیے تو وہ اس امر سے غافل نہ تھے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے اس وقت تک کاملاً پورے نہیں ہو سکتے جب تک انسانی ضمیر پختگی کی حد کو نہ پہنچ جائے۔اس بات کی تکمیل کے لیے ابھی ہزاروں سال چاہئیں۔اسلام چونکہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اس لیے اس نے ان کی فلاح و بہبود کے لیے جو راستہ تجویز کیا ہے وہ ان کے حالات کے عین مطابق ہے۔اس راستے پر چلنے سے انسان آہستہ آہستہ منزل مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔اسلام کی مثال اس باپ کی سی ہے جو بچے کی تربیت کے وقت اس کی جسمانی نشوونما اور ساخت کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔وہ کبھی اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور اس سے کبھی یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ بچپن کی حالت میں جوانوں کی طرح کام کرے گا۔تربیت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ باپ کبھی تو اپنے بچے کی معصوم خواہشات کا احترام کرتے ہوئے انہیں قبول کر لیتا ہے لیکن بعض اوقات وہ دیکھتا ہے کہ اس طرح بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو وہ انہیں رد بھی کر دیتا ہے اور بچے کی ناراضگی کی پروا نہیں کرتا۔اس طرح کبھی تو وہ پیار و محبت سے بچے کی تربیت کرتا ہے لیکن جب دیکھتا ہے کہ پیار اور محبت کا سلوک بچے پر اثر انداز نہیں ہوتا تو وہ اس کی گوشمالی کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔لیکن ہر حال میں اس کے پیش نظر بچے کی بھلائی ہی ہوتی ہے۔وہ اگر پیار اور محبت کرتا ہے تو بچے کے فائدے اور اصلاح کی خاطر، اور ڈانٹتا اور گوشمالی کرتا ہے تو بھی بچے کے فائدے اور اصلاح کی خاطر۔یہی حال اسلام کا بھی ہے۔وہ ضمیر انسانی کو تدریجاً پختگی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔اس غرض کو پورا کرنے کے لیے وہ سب سے پہلے والدین کی طرح اس کی تربیت پر زور دیتا ہے۔اسے کبھی محبت اور پیار سے کام چلانا پڑتا ہے اور کبھی سختی کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے لیکن ہر حال میں اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان آہستہ آہستہ اس منزل کے قریب ہوتا چلا جائے جو اس کے لیے متعین کر دی گئی ہے اور ان اعلیٰ اقدار کو پالے جو اس کا منتہائے مقصود ہیں اور جن کا ذکر بالتفصیل کلام اللہ میں کر دیا گیا ہے۔

انسانی ضمیر پر بسا اوقات جمود کی حالت بھی طاری ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نشوونما بالکل رک چکی ہے۔چنانچہ ہمارے زمانے میں مسلمانوں کے ادبار اور پستی کی وجہ یہی ہے کہ طبعی قوانین کے مطابق انسانی ضمیر پر جمود کی حالت طاری ہو چکی ہے لیکن جمود کی یہ حالت ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رہ سکتی۔یقیناً ایسا وقت آئے گا جب یہ حالت ختم ہو جائے گی، انسان کی مخفی صلاحیتیں ایک بار پھر بیدار ہوں گی اور انسانی ضمیر آہستہ آہستہ پختگی کی آخری حد تک پہنچ جائے گا۔یہ حالت خواہ صدیوں بعد پیدا ہو، بہرحال پیدا ضرور ہوگی۔یہی وہ دن ہوگا جب انسان اخلاق کے اس بلند ترین مرتبے تک پہنچ جائے گا جس کا اسلام اس سے تقاضا کرتا ہے۔زمین پر ہر طرف امن و سلامتی کا دور دورہ ہوگا اور بنی نوع انسان کی باہمی کدورت و شکر رنجی یکسر مفقود ہو جائے گی۔

لیکن یہ صورت حال تب ہی پیدا ہوگی کہ کل روئے زمین کے لوگ آسمانی آواز پر کان دھر کر اللہ کی بادشاہی میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ انسانی ضمیر جبھی حد کمال کو پہنچ سکتا ہے کہ زمین کا چپہ چپہ اللہ کے نور سے معمور ہو جائے۔ اگر زمین کا ایک گوشہ تو آسمانی نور سے حصہ پالے لیکن باقی حصے بدستور ضلالت و گمراہی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈھکے رہیں تو مناقشات اور جنگ و جدل کا سلسلہ ختم نہیں ہوسکتا۔ اس صورت حال کا مداوا کرنے کے لیے ہر زمانے میں ایسے انسان پیدا ہوتے رہیں گے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چل کر انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کا کام انجام دیں گے اور جس طرح والدین اور استاد ہر ممکن طریقے سے اپنے بچوں اور شاگردوں کی تربیت کرتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی بنی نوع انسان کی تربیت کے لیے مناسب حال طریقے استعمال کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔

انسانی ضمیر نے حد کمال کو پہنچنے کے لیے اب تک جو ترقی کی ہے اس میں بڑا اثر اسلامی تعلیمات کا ہے اور آئندہ بھی وہ ترقی کی منازل اس وقت طے کر سکے گا جب وہ اسلام کی پیش کردہ تعلیمات کو اپنا لے۔ یہ وقت یقیناً آئے گا اور زمین کا گوشہ گوشہ اللہ کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔

ہم یہ بات محض خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں کر رہے بلکہ مغربی مفکرین بھی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں ہم مشہور انگریز ادیب جارج برنارڈ شا کا ایک حوالہ پیش کرتے ہیں جسے پڑھنے سے ہماری رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ برنارڈ شا لکھتا ہے:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ دین کو ادیان عالم میں بہت ہی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ دیگر ادیان کے برعکس اس دین میں دائماً زندہ رہنے کی حیرت انگیز قوت موجود ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اپنے اندر مختلف طریقہ ہائے حیات کو سمونے کی اہلیت اور بنی نوع انسان کے ہر طبقے کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بھی اسے روز بہ روز مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ جہالت و تعصب کے باعث ازمنہ وسطی میں اسلام کو انتہائی بھیانک صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا گیا اور انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام یسوع مسیح کا سب سے بڑا دشمن ہے لیکن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتا ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ اگر آج بھی دنیا کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خو بو رکھنے والے کسی شخص کی خدمات میسر آجائیں تو بنی نوع انسان کی تمام مشکلات یکسر کافور ہو سکتی ہیں اور زمین میں امن و امان اور خوش بختی کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ آج زمانے کو انہیں چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

"انیسویں صدی عیسوی میں کارلائل اور گبن جیسے جلیل القدر مفکرین نے اسلام کو حقائق و انصاف کی کسوٹی پر رکھا اور جو نتائج اخذ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے ان کی بنا پر یورپ والوں کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی اور انہوں نے اسلام پر ہمدردانہ نظر سے غور و فکر کرنا شروع کیا۔ موجودہ بیسویں صدی میں تو اسلام کے متعلق اہل یورپ کے نقطہ نظر میں بہت زیادہ تبدیلی آچکی ہے اور نفرت و عداوت کی جگہ اسلام کی محبت نے لے لی ہے... اس رفتار کو دیکھتے ہوئے مجھے تعجب نہیں کہ اگلی صدی تک اسلام پورے طور پر اہل

یورپ کے دلوں میں گھر کر جائے اور اسے وہ نجات کا ذریعہ سمجھ کر جوق در جوق اس میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔"

"میری اپنی قوم اور یورپ کے دیگر ممالک کے متعدد اشخاص اسلام قبول کر چکے ہیں اور اب یہ بات بلاشک وشبہ کہی جا سکتی ہے یورپ کے کلیتہً اسلام قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔"

(کلمات برنارڈ شا۔ ماخوذ از رسالہ نور الاسلام نمبر ۴۰ صفحہ ۷۲ ۔ ۱۳۵۳ھ)

برنارڈ شا کے علاوہ دنیا کے اور بھی بڑے بڑے مفکرین نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ انسانی ضمیر آہستہ آہستہ تکمیل کے مدارج طے کر رہا ہے اور یہ مقدر ہو چکا ہے کہ جلد یا بدیر دنیا آلام و مصائب کے چکر سے نجات حاصل کر کے قرار واقعی امن وسکون حاصل کر لے۔ اس کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچ چکی ہیں۔ باشندگان ارض کو میل ملاپ کی جو سہولتیں آج میسر ہیں ایسی پہلے کبھی نہیں ہوئیں، چھاپا خانوں کی بدولت کتابوں کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے اور کبھی علم وفن اور مذہب وملت کے متعلق کتابوں کا دستیاب ہونا دشوار امر نہیں رہا۔ صحافت، جو خیالات وعقائد کی اشاعت کا سب سے موثر ذریعہ ہے، عروج پر ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیفون کے ذریعے سے سات سمندر پار کی خبریں پل بھر میں لوگوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ سب سامان اس یوم موعود کو نزدیک تر لانے کے لیے کیے جا رہے ہیں جب ساری دنیا کا ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی دین جو فضائیں آج جنگ کے نعروں سے گونج رہی ہیں وہ کل امن وسلامتی کے ترانوں سے معمور ہوں گی اور جہاں اس وقت تعصب اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں وہاں آفتاب اسلام طلوع ہو کر ہر قسم کی تاریکی دور کر دے گا۔

اس صبح درخشاں کا ظہور کب ہوگا اور آفتاب سعادت کب جلوہ دکھائے گا؟ گو ہمارے ظاہری اندازوں کے مطابق یہ وقت ابھی دور ہے پھر بھی اللہ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ یہ دن ہمارے لیے قریب تر آ جائے۔ اس دن انسان اپنے اوج کمال کو پہنچ جائے گا۔ عدل وانصاف، رحم وشفقت وتقویٰ سے زمین بھر جائے گی۔ ہر شخص اپنے بھائی کا خیر خواہ ہوگا۔ تمام اقوام بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے پیش آئیں گی۔ منافقت کا جذبہ بالکل مفقود ہو جائے گا۔ کوئی قوم دوسری قوم پر للچائی ہوئی نظر نہ ڈالے گی بلکہ ترقی کی راہ میں چھوٹی بڑی اقوام ایک دوسرے کے دوش بہ دوش گامزن نظر آئیں گی۔

اس دور کا انسان جب پچھلے زمانے پر نظر دوڑائے گا تو اس جنگ وجدل، قتل وغارت، خونریزی و سفاکی، عیاری ومکاری اور ظلم وتعدی کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا۔ وہ حیرت واستعجاب سے بنی نوع انسان کے ان کارناموں کو دیکھے گا جو انہوں نے شخصی مفاد اور ذاتی اقتدار کی خاطر انجام دیئے اور یہ کارنامے انجام دیتے ہوئے انہوں نے اخوت ومحبت، عدل وانصاف اور رحمت وشفقت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سنگ دلی اور ناانصافی کو شعار بنالیا۔ اپنے آباء واجداد کی یہ کارستانیاں دیکھ کر اس کا دل بے اختیار ان پر نفرین بھیجنے کو چاہے گا لیکن یکا یک اس کی نظر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نہایت مختصر مگر انتہائی درخشاں دور

حکومت پر پڑے گی اور وہ مبہوت ہو کر پکار اٹھے گا: ''اللہ کی ہزاروں برکتیں اور رحمتیں ہوں اس مقدس اور پاک باز انسان پر جس نے اپنی ساری حضرت عمر رسول اللہ ﷺ کی رفاقت اور اسلام کی اشاعت میں صرف کر دی۔ وہ ضعیف تھا لیکن دین کی راہ میں اس نے عدیم المثال استقامت کا ثبوت دیا۔ وہ غریب تھا لیکن اللہ کے راستے میں اپنا ایک ایک پیسہ خوش دلی سے خرچ کر دیا۔ اس کے راستے میں سنگ گراں حائل تھے مگر اس کے پائے استقلال میں خفیف سی بھی جنبش پیدا نہ ہوئی اور وہ اسلام کی کشتی کو خوفناک طوفانوں اور مہیب چٹانوں سے صحیح سلامت نکال کر لے گیا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کارناموں کو آنے والی کوئی بھی نسل فراموش نہ کر سکے گی اور قیامت تک ان پر سلام بھیجنے والے پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ ہم بھی ان کی مقدس اور مطہر روح پر ہزاروں سلام بھیجتے ہوئے ان کا مبارک تذکرہ ختم کرتے اور اللہ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم میں پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ عنہ جیسے صف شکن اولوالعزم اور پہاڑ کی مانند مستقل مزاج انسان پیدا کر دے جن کی اس وقت اسلام کی کشتی کو کھینچنے کے لیے اشد ضرورت ہے۔

29815

Rs. 700.00

طاہر سنز
042-37312159 فیکس: 042-37234137 فون:
www.tahirsonspublishers.com
E-mail: info@tahirsonspublishers.com